شانِ ہند
نئی دہلی
10 FEB 1986
J. M. I. New Delhi
جلد — ۷ئم
شمارہ — ۱
ایڈیٹر
سرور تونسوی

SAJIDA MIRZA

TODAY, there's one bicycle for every 24th person in india
IN 2001, THERE SHOULD BE ONE FOR EVERY 9th INDIAN

HERO
is gearing up for playing a major role to meet this growing demand.

Factually speaking today India s population is over 70 crores and the total production of bicycles in the past decade was about three crores That is to say, there is one bicycle for every twentyfourth person in the country

Tentatively speaking at the present 2 5% rise at an average India s population will cross the one-hundred-crore mark on turn of the century An envisaged average increase of 5% in production of bicycles would mean that by 2001 there would be over eleven crore bicycles on Indian roads In that event every ninth Indian should have a bicycle Therefore Hero, the largest manufacturer of bicycles in India has a major responsibility to meet this vital demand for an economic means of conveyance for the common man

Today HERO makes a positive commitment to ensure that it will produce the maximum number of bicycles that will out-class others in Quality, Economy and Durability.

HERO
HAS AN EYE ON THE FUTURE.

O CYCLES PRIVATE LTD., LUDHIANA
lling Agents Munjal Sales Corporation, Ludhiana

21 ویں صدی کی جانب
بلند پایہ تکنیکی جانکاری، کمپیوٹری کنٹرول،
فضائی سفر، بحری ہتوں کی چھان بین،
جنوبی منطقۂ باردہ کی کھوج۔
یہ عظیم تغیر ہر شعبہ پر چھایا منظر ہے۔
ہمیں ابھی سے اس کے لئے تیار ہونا چاہئے۔
مبادا ہم اس اُبھرتے انقلاب سے چوک جائیں
سائنس اور صنعت کی سمت سے
ہم غریبی کے مسائل پر قابو پا لیں گے
اور مل کر آگے بڑھیں گے
davp 85/420

Vijai Pal Singh Vijai
Samhana (Meerut)

Pinara Abdul Rab
'Nishtar' Fatehpuri

فون نمبر: ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپرز انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۴۴۶۲ رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۳۵۳

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریبان پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

جشنِ جمہوریت ایڈیشن

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ: ۲/۵۰ روپے
زر سالانہ: ۲۴/- روپے

شمارہ ۱	جنوری ۱۹۸۶ء	جلد ۲۷

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے ہر سال

۲۶ جنوری ہمیں یاد دلاتی ہے

کہ

ہم ایک ایسے جمہوری ملک کے باشندے ہیں جو دُنیا بھر میں اپنی کچھ روایات کیلئے مشہور ہے۔

آئیے آج ۲۶ جنوری ۱۹۸۶ء کو ہم پھر اس عہد کو دُہرائیں کہ ہم اپنے ملک کا کسی طور بھی سر نیچا نہیں ہونے دیں گے۔

اور وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی کے ہر ترقی پسندانہ قدم کو کامیابی کی منزل سے ہم کنار کرنے کے لئے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر دیں گے کیونکہ ہم اسی میں اپنی اور اپنے ملک کی بہتری سمجھتے ہیں۔

ہندوستان زندہ باد اور ہماری جمہوریت پائندہ باد

دیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے اور سرورق کے صفحات زین لیتھو پرنٹرز بلیماران سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ - الفاروق ۱۷ کیلاش دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

قولِ غالب

"میں نے ادب کے ساتھ گذارش کی کہ داغ کی اُردو کیسی ہے؟ (غالب) فرمانے لگے ایسی عمدہ کہ کسی کی کیا ہوگی۔ ذوق نے اُردو کو اپنی گود میں پالا تھا۔ داغ نہ صرف اس کو پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے"

("آئینہ داغ" صفحہ ۴۰ مصنفہ نثار علی شہرت دہلوی)

نامور شاگردان داغ نے

"اُردو زبان و ادب کی پرورش کا کام جاری رکھا۔ اور ان مستند اہل علم وفن کے تلامذہ نے اپنے سحر آفریں شعری افکار سے اس ورثے کی صالح روایات کو آج بھی امتیازی شان سے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

نقوشِ داغ

دبستان داغ کے معروف شعرائے کرام کی سوانح، کلام اور تصاویر پر مشتمل ایک نادر تاریخی اور ادبی دستاویز زیر اشاعت ہے۔ مزید تفاصیل کے لئے رابطہ قائم کیجئے۔

ساحر ہوشیارپوری

مکان نمبر ۲۲۶۹۔ سیکٹر ۲۸۔ فرید آباد ۱۲۱۰۰۳

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ صبا چہ کرد؟

دِلّی اُردو اکاڈمی اور خوشتر گرامی

گزشتہ دنوں شانِ ہند میں "دِلّی اُردو اکاڈمی اور خوشتر گرامی" عنوان سے ایک اداریہ سپردِ قلم کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں نہ صرف ہمارے اس موقف کی پُرزور حمایت کی گئی ہے بلکہ اکثر مکتوب نگار حضرات نے لکھا ہے کہ خوشتر گرامی صاحب کو اُن کی اجتماعی خدماتِ اُردو جو کہ اُنھوں نے گزشتہ پچاس سالوں میں ماہنامہ بیسویں صدی" اور دیگر تعلیمی انعامات وغیرہ کے ذریعہ انجام دی ہیں پر خصوصی ایوارڈ جو کم از کم گیارہ ہزار روپیہ کا ہونا چاہیئے دیا جانا چاہیئے۔ اور ایسی حالت میں جب کہ خوشتر گرامی گذشتہ کئی سالوں سے تشویشناک طور پر علیل ہیں اور برائے علاج بمبئی میں مقیم ہیں تو دِلی اُردو اکاڈمی کا یہ فریضۂ اولین تھا کہ وہ مشاعرہ۔ قوالی۔ ڈانس اور اسی قسم کے دیگر اللّوں تللّوں کی بجائے فوری طور پر اپنی خصوصی میٹنگ بُلا کر خوشتر گرامی کی فوری ضرورت کے پیشِ نظر خصوصی ایوارڈ دیئے جانے کی تجویز پاس کرتی اور جناب لیفٹیننٹ گورنر صاحب دِلی سے جلد از جلد اس کی منظوری لے کر اپنے کسی نمائندے کو بمبئی بھجواتی جو یہ ایوارڈ خوشتر صاحب کو انھیں بسترِ علالت پر پیش کرتا۔ جیسا کہ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی نے جناب راجندر سنگھ بیدی کو خصوصی ایوارڈ پیش کیا تھا۔

پہلے آپ ان متعدد خطوط میں سے صرف ایک خط ملاحظہ فرمائیے جسے ہندوستان کے مشہور و معروف شاعر جناب ساحر ہوشیارپوری نے تحریر فرمایا ہے۔

۲۱ر جنوری ۸۶ء

برادرِ محترم جناب سرور صاحب تسلیم!

نومبر ۸۵ء کے شمارے میں میری مطبوعہ نظم امر شہید کے تیسرے شعر کے مصرع اولیٰ میں سہوِ کاتب کے باعث "بدقدم" کے بجائے "بدقوم" چھپ گیا ہے۔ اصل اور صحیح مصرع یوں ہے: "بدرگ و بدقدم و وطن دشمن" اس نظم کے بارے میں اہلِ قلم کی آرائے گرامی کا اقتباس ۱۰ اکتوبر کے شانِ ہند میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن پریس میں بلاک گم ہو جانے سے آپ کے قارئین محترمہ اندرا گاندھی کی تصویر کے ساتھ اُردو اور دیوناگری رسم خط میں اس مطبوعہ نظم کی اصل صورت اور اندازِ پیش کش سے روشناس نہ ہو سکے میرے پاس چند فولڈرز محفوظ ہیں۔ اور طلب کرنے پر قارئین کی نذر کئے جا سکتے ہیں۔

"دِلّی اُردو اکاڈمی اور خوشتر گرامی" کے عنوان سے آپ نے جو اداریہ سپردِ قلم فرمایا ہے وہ آپ کی صحافتی دیانت داری اور حق گوئی کا مظہر ہے۔ خوشتر صاحب کو یہ ایوارڈ تو بہت پہلے ہی دیا جانا چاہیئے تھا۔ گزشتہ پچاس برس میں بیسویں صدی نے اُردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے۔ اُس کو فراموش کر دینا اور اُس سے چشم پوشی کرنا خود کو فریب میں مبتلا کرنا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد دِلّی میں آکر خوشتر گرامی نے نامساعد حالات اور اقتصادی دشواریوں کا سامنا کرتے ہوئے اس ماہنامے کو از سرِ نو جاری کیا اور قلیل مدت ہی میں ہندوستان کے جرائد کی صفِ اوّل میں اس کا شمار ہونے لگا۔ آج ۳۱، کی لیت اُن کی محنتِ شاقہ اور بے

ہم نے چمن میں جشنِ بہاراں منا لیا
یہ اور بات ہے کہ نشیمن جلا لیا

ساغرہ قزلباش نے اپنی آواز کے سحر سے سامعین کو مسحور کر لیا۔ اس سحر کو توڑنے کے لئے دہلی کی شاعرہ [illegible] کو دعوتِ سخن دی گئی انھوں نے تحت اللفظ میں ایک خوبصورت نظم سنائی۔ اس کے بعد رام پور سے آئی ہوئی کشور آرا شبنم نے سوز و مستی کا سماں باندھ دیا۔

سارے الزامِ جنوں میرے ہی سر جانے دے
عشق شعلہ ہی سہی دل میں اتر جانے دے
سوزِ دل سوزِ جگر لے کے کدھر جاؤں گی
تشنگی ہوں ترے ہونٹوں پہ بکھر جاؤں گی
رقص کرتی ہوئی ساغر میں اترتی ہے شراب
بے خودی ہوں تری دھڑکن میں اتر جاؤں گی

الزامِ جنوں، شعلۂ عشق، سوزِ دل، سوزِ جگر، ساغر و شراب اور بے خودی کی سرمستی کے بعد دہلی کی حفصت آرا زریں نے پختہ غزل سنائی۔

میرے ورثے میں نہ دولت ہے نہ جاگیر کوئی
میرے اجداد زمانے میں چلن چھوڑ گئے

اس کے بعد اورنگ آباد سے آئی ہوئی شاہین شہزاد نے اپنی غزل سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

سیرِ چمن کے واسطے جانا بھی اک غضب ہوا
بیٹھے ہیں اب لئے ہوئے دامن تار تار ہم

اس کے بعد بھوپال سے آئی ہوئی نگہ نسیم مالک نے [illegible]

سلگتی شام کی دہلیز پہ جلتا دیا رکھنا
جہاں خاموشیاں ہوں گی وہاں میری صدا رکھنا
صدا بن کر گھٹا بن کر دھنک بن کر ہوا بن کر
نہ جانے کب میں آ جاؤں دریچہ تم کھلا رکھنا

آپ نے سامعین سے خراجِ داد حاصل کی اور مشاعرے میں دو طرفہ گرمی آگئی۔ لدھیانہ سے آئی ہوئی شگفتہ لا شیر استو نے سنجیدہ اور متین کلام سنا کر سامعین کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔

ماتھے کی سلوٹوں میں کچھ بولتی لکیریں
کیا کیا نہ کہہ گئی ہے اس دل کی بے زبانی
دنیا کو ہم نے سمجھا دنیا کو ہم نے جانا
کچھ رنگ سب نئے ہیں تصویر ہے پرانی

اس سنجیدہ ماحول میں ڈاکٹر ذکیہ انجم نے اپنی غزل سے سامعین کو متاثر کیا۔ انھوں نے دورِ حاضر سے متاثر ہو کر فرمایا کہ ـ

تفرقہ پسندی کی ایسی تحریک چلائی لوگوں نے
جذبات میں آکر نفرت کی دیوار اٹھائی لوگوں نے
اب اس سے زیادہ گلشن میں توہینِ بہاراں کیا ہوگی
کانٹوں کو بچا کر پھولوں کی موٹری سے کلائی لوگوں نے

میسور کی معمر شاعرہ حسنی سرور نے ترنم سے اپنی غزل سنائی

دنیا کا درد لئے شام کے جھروکوں میں
اداس لمحوں کی چوکھٹ پہ ہے کھڑا کوئی

اس کے بعد ڈاکٹر ذکیہ انجم نے ناظمِ مشاعرہ رفیعہ شبنم کا تعارف کراتے ہوئے انھیں دعوتِ سخن دی۔

اسی لئے تو وہ آتا ہے دیر سے گھر کو
خدا کرے کہ لگے آگ اس کے دفتر کو

سامعین کی فرمائش پر انھوں نے دوسری غزل سنائی اس کے ایک شعر میں تلمیح ہے کہ خدائے پاک نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں اس سے متاثر ہو کر آپ نے یہ شعر کہا ہے۔

میں ہوں تیرا ناموس تو ملبوس ہے میرا
میں صورتِ قرطاس ہوں تو مانندِ قلم ہے

اس کے بعد دہلی کی مسعودہ حیات نے اپنی پختہ غزل اور ترنم سے ایک کیف پیدا کر دیا۔

کیا کہیں محفل سے تیری کیا اٹھا کر لے گئے
ہم متاعِ درد کو تنہا اٹھا کر لے گئے
وہ تو مجنوں تھا رہا جو عمر بھر صحرا نورد
ہم جہاں پہنچے وہاں صحرا اٹھا کر لے گئے

ایک بار پھر ایوانِ غالب کی فضا داد و تحسین سے گونج اٹھی آج کی اس رنگین محفل میں دہلی کی کہنہ مشق شاعرہ جمیلہ بانو نے پہلے تحت اللفظ میں پھر سامعین کی فرمائش پر ترنم سے غزل سنائی۔

حجابِ زیست اٹھے گا تو نور دیکھیں گے
تمہارے حسن کو اک دن ضرور دیکھیں گے

اس کے بعد دہلی ہی کی ایک اور باوقار شخصیت بیگم ممتاز مرزا نے اپنے مخصوص ترنم میں سنجیدہ کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

میں ہوں اک لفظ اور تو آواز
میں تیری بات بات کا حصہ ہوں

علی گڑھ سے آئی ہوئی پروفیسر نیاز بانو زیدی [illegible] نے ایک عجیب سماں پیدا کر دیا۔

ہر اک موج بلا ہے طلاطم بردوش
سفینۂ غم دل ہاں لگا دے پار مجھے

کانپور سے آئی ہوئی ترنم کانپوری نے دہلی میں پہلی بار مشاعرہ میں شرکت کی۔ سامعین کی فرمائش پر ایک ساتھ دو نظمیں سنائیں۔ ترنم کا بلند حوصلہ کلام سامعین کے دلوں میں اترتا چلا گیا۔

سر مقتل گاہ یہ ہے کہ ہے سرفروشی کا امتحان
ذرا آئیے تو میرے سامنے جسے میرے سر کی تلاش ہے
مراد دل ہے صاحب حوصلہ میرے دامن میں خود ہی آئے گا
وہ بلائیں میرا کریں گی کیا جنہیں میرے سر کی تلاش ہے

ترنم کے ترنم اور کلام سے ایوان غالب کے ہال میں ارتعاش کیفیت پیدا ہوگئی چاروں طرف سے کامیابی ان کے قدم چوم رہی تھی ان کی دوسری غزل کے تیور بھی ملاحظہ ہوں

گردش زمانہ کے حوصلے نکلتے ہیں
اب تو حادثے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں
اپنی نامرادی پر آندھیوں کو حیرت ہے
اک چراغ بجھتا ہے سو چراغ جلتے ہیں

سامعین کا اصرار تھا کہ بس ترنم ہی سناتی رہیں۔ لیکن ناظم مشاعرہ کو باقی شاعرات کا بھی خیال تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر اسما سعیدی کو اور آخر میں مہمان خصوصی شبنم گرور کے کلام پر مشاعرے کو اختتام تک پہنچایا۔ شبنم صاحبہ کے شعر ملاحظہ ہوں۔

[illegible] سے پیار کرتے ہیں
وفا کی راہ سے ہم اس طرح گزرتے ہیں
میں آئینہ ہوں حقیقت کا دل کا ذہن کا
اگر میں سامنے آؤں تو لوگ ڈرتے ہیں

رنگِ مشاعرہ اپنے عروج پر تھا اور ان کے کلام کو خوب سراہا گیا۔

دہلی کے کل ہند مسیحی اُردو مصنفین ایسوسی ایشن کے کانفرنس اور مشاعرے کی سرگذشت برگشتہ

جوزف انور

اس سال یعنی ۱۹۸۵ء کی کل ہند مسیحی اُردو مصنفین ایسوسی ایشن کی ساتویں سالانہ کانفرنس اور مشاعرے کا افتتاح ۱۲ راکتوبر کو دہلی میں ہونا تھا۔ آج تک ہم نے اپنی بیگم کو غالب نیک کے لحاظ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا مگر اب چونکہ انور کو ستر واں سال بیٹھ چکا تھا لہٰذا اس کی حیات و بقا کے سلسلے میں جہاں ہم قدرے مطمئن تھے وہاں بیگم کی جا و بے جا ناز برداریوں سے تنگ بھی آ چکے تھے۔ چنانچہ دل ہی دل میں تہیہ کر چکے تھے کہ دہلی کے میتھوڈسٹ چرچ کا بسترش پالی ہو کہ گیسٹ چیمبر "ہم تنہا ہی نعرۂ لبیک لگائیں گے۔ ایک دن بیگم جب اپنی روز مرہ کی زبان استعمال کرتے ہوئے تم سے جو تو پر آئیں تو ہم نے بھی ترپ کا غلام پھینکا۔

دیکھو بیگم تمہاری سینہ زوری کے لئے تو بفضلہ ابھی ہم میں سکت باقی ہے مگر تمہاری سینہ زوری اب ہمارے جیسے حساس شاعر کی برداشت کے باہر ہو چکی ہے لہٰذا ۱۱ راکتوبر ۸۵ء ہم تن تنہا انور ای کانفرنس میں شرکت کرنے دہلی تشریف لے جا رہے ہیں۔"

یہ سنتے ہی بیگم کا چہرہ فق ہو گیا جیسے رنگ بدلتے ہوئے گرگٹ کی دُم پر اچانک کسی نے پتھر دے مارا ہو۔ بیگم نے پہلے غور سے ہمیں دیکھا پھر مسحور کن تبسم سے ہمیں ہپناٹائز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گنگنانے لگیں۔ ع

تو جہاں جہاں چلے گا میرا سایہ ساتھ ہوگا۔

ہم نے انگریا ور کا والیوم زیادہ کرتے ہوئے خود کو سنبھالا کہ تم جس کی کانفرنس میں وہاں جا چکی ہو پھر وہاں نسوان جیسی خاطر خواہ انتظام نہیں۔ علی الصبح محدود حیات ہو کر شوہری سب کو ایک ہی صف میں کھڑے ہونا پڑ رہا ہے۔

لیکن یہ احتمالیات اپنے پاس رکھو۔ میں غالب کی طرح ... جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی چاہے مجھے کنجوس کی سرائے ہی میں ٹھہرنا پڑے۔"

میتھوڈسٹ چرچ ... تو کنجوس کی سرائے کے پائے کا ہے...

بات نکتہ زا بھی تھی کیونکہ کنجوس ... اور آتنک وادی کے درمیان ایک ما بین کی ... ہی کیا نازک رشتہ حائل ہے پھر جس کم ہو جانے پر اس جہاں میں ابھی کچھ ... امکانات و مکانات ہمارے پیش نظر ہیں لہٰذا ہمارا سر بیگم کے سامنے از خود خمیدہ ہو گیا۔ فارمیلیٹی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم نے جناب ای پیٹر راز صاحب کنوینر کانفرنس کو اطلاع دے دی کہ جوزف انور مع شریک حیات و ممات کانفرنس میں شرکت فرما رہے ہیں۔

۱۲ راکتوبر کی صبح جب ہم دہلی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترے تو حسب معمول خیر مقدم کو آئے وفود یعنی قلیوں اور رکشا والوں نے گھیر لیا۔ حشر وہی ہوا جو ہونا تھا اسٹیشن سے بٹلر روڈ تک پہنچنے میں اتنے ہی مراحل طے کرنے پڑے جتنے کالے گلاب کو حاصل کرنے میں کسی عاشق نامراد یا بامراد کو طے کرنے پڑے ہوں گے۔ دل خاکستر کی طرح بیگم کو خاکستر کرنے جو کنجوس کی سرائے کی تلاش کی تو کنجوس کی سرا تو نہیں البتہ میتھوڈسٹ چرچ ضرور مل گیا تاہم قلبی اطمینان ضرور ہوا کہ گرجے کے احاطے میں نفوس کم اور کنجوس زیادہ تھے پانچ کمروں میں سے تین کمرے یعنی خرابے مدعوین شعرا و ادبا کو خراب کرنے مختص کئے ہوئے تھے۔ کمرہ کا طواف کیا تو کنوینر مشاعرہ راز صاحب مل گئے۔

علیک سلیک کے بعد آگے بڑھے تو قربان صاحب شوق صاحب الفریڈ جگت سنگھ صاحب کے ساتھ ...

جی کے ممبر ہیں بہر حال شکر کیجئے کہ دیر ہوئی آنے میں لیکن شکر ہے
پھر بھی آئے تو ۔

اس دفعہ یارانِ طریقت نے ہم سے گہری چال چلی یعنی جو
حضرات مع شریکِ حیات آئے اُن کے ٹھہرنے کا انتظام
[illegible] یعنی دارالفلاح پیرش ہال تین میل دور کسی مشن اسکول
[illegible] ہوسٹل کے ایک کمرے میں کیا گیا۔

یہاں ایک بات اور صاف کردوں۔ الٰہ آباد کی سرگزشت
سرگزشت لکھتے وقت ہم نے صاف کہہ دیا تھا کہ کسی کی دل آزاری
مقصود ہے نہ ہی ہم فیلِ بدمست ہیں کہ خواہ مخواہ کسی کی دُم پر پاؤں
رکھ دیں تاہم الٰہ آباد کی سرگزشت پر جہاں کچھ پھول سر پر برسے
وہاں ایک پتھر بھی کنپٹی پر لگا۔ ہمارے ایک عزیز دوست کو شکایت
ہوئی کہ اُن کے نام کے ساتھ اُن کا خطاب اور صاحب نہیں لکھا گیا۔
اب ہماری سادہ لوحی ملاحظہ فرمائیے۔ کہ ہمیں تو حضرت انور کے ساتھ
جناب بھی بارِ گراں گزرتا ہے۔ کرشن چندر کے ساتھ ایم اے
لکھنے والوں نے کرشن چندر کی شخصیت میں کوئی چار چاند نہیں لگائے
رہا سوال خطابات کا تو ہم انھیں بھی بیساکھیوں سے زیادہ
وقعت نہیں دیتے۔ ایک لطیفہ سنیئے ہمارے ایک شاعر دوست
کو خطاب کا شوق تھا۔ ایک دن وہ ایک غزل کہہ کر ہمارے پاس مشورے
کے لئے آئے تو کاغذ کے کونے میں لکھا تھا ابوالمظفر اظہر صدیقی۔
ہم سے رہا نہ گیا پوچھا حضور یہ خطاب؟ فوراً ارشاد ہوا "کیوں میں
بیٹے ظفر صدیقی کا باپ نہیں"؟

خطاب رکھنا بڑا آسان ہے یوں بھی ہماری الیسوسی ایشن
بات کے سلسلے میں بڑی فیاض ہے یوں خطابات دیتی ہے جیسے
بات نہ ہوں ریوڑیاں ہوں۔

۱۲ اکتوبر کے دو بجے مجلس عاملہ کی میٹنگ تھی ہم پہنچے تو
[illegible] عشرت ادیب، کیفی اور فہیم صاحب کو منتظر
[illegible] کمرے میں ایک ہی کرسی تھی اور وہ بھی خالی، ہم اللہ ہو غنی
کہہ کر اس پر بیٹھ گئے چونکہ چیئر ایک ہی تھی اور ہم اُس پر بیٹھے تھے
کسی اور کو چیئرمین بنانے کا تو سوال ہی نہیں تھا لہٰذا ہمیں چیئرمین
بنا دیا گیا زندگی میں پہلی دفعہ چیئرمین بننے کا موقعہ نصیب ہوا تو کرسی
کے نشے سے سرمست ہو گئے۔ ایسا لگا کہ ہم جو [illegible] نہیں ادی

آئین میں۔ ظاہر ہے ہم چاہتے تو مجلس عاملہ کو برخاست کر سکتے تھے
ارکان مجلس عاملہ کا سر قلم کروا سکتے تھے مگر ادی امین کے عبرت
ناک انجام نے باز رکھا۔ ایجنڈے میں تو پر ستار تھے کام کا ایک
ہی تھا وہ یہ کہ ۔

ملک کی مختلف اکاڈمیوں میں ہمارا اسما شدہ بھی لیا جائے۔
تیری آواز مکے اور مدینے ۔

شام کو پانچ بجے کانفرنس کا باقاعدہ افتتاح عزت مآب
بشپ جے۔ آر۔ لینس صاحب کے ہاتھوں ہونا تھا۔ کنوینر
کانفرنس جناب ای پیٹر راؤ صاحب کانفرنس کے سوینیر میں
پیشگی بشپ صاحب کا شکریہ بھی ادا کر چکے تھے مگر ۔ ساڑھے پانچ
بجے تک بشپ صاحب تشریف نہیں لائے تو گھوڑے دوڑوائے
گئے اور جب یہ بھی اپنی نعلیں کھو کر بے نیل و مرام واپس لوٹے مجبوراً
قہرِ درویش بجانِ درویش کے مصداق کانفرنس کا افتتاح انجمن کے
نائب صدر جناب کیپٹن صاحب کیتھی کے ہاتھوں کرانا پڑا۔ انجمن کی
تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ اس کا افتتاح کسی بشپ صاحب
کے دستِ مبارک سے نہ ہو سکا۔

راؤ صاحب سے معلوم ہوا کہ بشپ صاحب میتھوڈسٹ جنرل
کانفرنس میں بشپ کی انتخابی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ ہمارے
کلیسائی نظام میں بشپ صاحب کا انتخاب بھی کسی ایم پی یا صدر
جمہوریہ ہند کے انتخاب سے کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں ہوتا۔
سیاسی اکابرین کی پوزیشن تو پانچ سال کے بعد مشکوک ہو سکتی ہے
مگر کلیسائی نظام میں تو ہمارے عمائدین کو پینسٹھ سال تک خدا کے
سوا کوئی ہلا بھی نہیں سکتا۔ بائبل میں [illegible] اور ایک مختصر
سی تقریر میں پانچ منٹ سے زیادہ [illegible] نہیں ہو سکتے۔ مگر
پانچ منٹ، پانچ سال اور پینسٹھ سال میں جو فرق ہے وہ ڈاکٹر [illegible]
ہی نہیں ہم بھی بتا سکتے ہیں۔ ای پیٹر راؤ صاحب نے بتایا کہ کانفرنس
کے سلسلے میں وہ دہلی چرچ کے تمام پادری صاحبان سے مل چکے ہیں۔
دو ماہ سے چرچوں میں اشتہار دیا جا رہا ہے علاوہ ازیں وہ بشپ
مقبول کیلب صاحب بشپ ای ڈی یلا نو صاحب اور سرا در [illegible]
دیہاتی بچارہ Y.M.C.A - YW.C.A کے عہدیداران
سے بھی بنفسِ نفیس مل کر تعاون کی اپیل بھی کر چکے ہیں۔

مگر یہ حضرات کرتے بھی کیا؟ پادری صاحبان اتوار کا گرجہ لیں گے کہ مشاعرے بازی کریں گے۔ مسیحی قوم میں بھائی چارے کے تصور کے پیشِ نظر برادر ملیڈ والے بھی کیا کرتے اور Y.M.C.A جس طرح مسیحی نوجوانوں سے منسوب ہے تو اسی طرح Y.W.C.A مسیحی نوجوان خواتین سے عبارت ہے۔ بڈھے ٹھڈے مسیحی اُردو شعراء سے ان لوگوں کا یوں بھی ایک نسل کا گیپ پڑ چکا ہے۔ رہے بشپ صاحبان تو یہ حضرات قوم کے غم میں اتنے مصروف و غمزدہ رہتے ہیں کہ بسا اوقات ڈیزر تک بھول جاتے ہیں۔ لبشپ کے نام پر کچھ لوگوں کو مغالطہ ہو سکتا ہے۔۔ بجائے شطرنج کے ایک اہم مہرے کا نام بھی بشپ ہوتا ہے مگر وہ بشپ سہے ٹیڑھی چال چلتا ہے۔ جب کہ ہمارے لشپ صاحبان مامور من اللہ ہوتے ہیں۔ خود بھی سیدھی راہ چلتے ہیں اور اہلِ ملت کو بھی راہِ راست پہ چلنے کی تاکید فرماتے ہیں۔

بہرحال مجبوریاں پھر مجبوریاں ہوتی ہیں۔ کسی شاعر نے صحیح کہا ہے

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

لغیہ مشاعرہ میں دو گھنٹے کے وقفے کے دوران جب بیشتر شعراء حضرات ان آیات پُر رکات پر کہ کیوں نئی نئے پرانی مشکوں میں بھرنے سے مشکیں پھٹ جاتی ہیں اور نئی مئے نئی مشکوں ہی میں بھرے جانے والے مغورے کا سائنٹیفک تجزیہ فرما رہے تھے تو عین اُس وقت ایک ادھیڑ عمر کی مفلوک الحال مسیحی بیوہ خاتون ڈورتھی جسے کانفرنس کے دوران باورچی خانے میں بطورِ خاص ملازمہ کیا گیا تھا اچانک ہمارے کمرے میں آگئی۔

"آپ لوگ پودینہ، سونف، اور زیرہ پر دبنگی کا تو خاص خیال رکھتے ہیں، مگر بیوہ کی دمڑی بھول گئے" یہ کہتے ہوئے اُس نے پلیٹ ہمارے آگے بڑھا دی اور ہم نے پانچ روپے کا نوٹ پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اپنا سر احساسِ ندامت سے جھکا لیا۔

شام کو لغیہ مشاعرہ دہلی ریڈیو ٹی وی کے گلوکار جناب میٹلے والڈکر کے زیرِ صدارت ہوا۔ میٹلے والڈ لفضلہ نوجوان ہیں دلکش و جاذب چہرہ پر کالے گنگریالے بالوں نے شخصیت کو اور جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔ یقیناً ہمیں اپنے قوم کے نوجوان اُبھرتے ہوئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے مش[illegible]

اچھا خاصہ جا رہا تھا کہ جناب نامی نادری صاحب نے جو [illegible] کے پھیرے میں ہیں۔ یہ کہہ کر کہ میں کسی شخص کی صدارت میں [illegible] نہیں پڑھ سکتا جس کے بال کالے ہوں غزل پڑھنے [illegible] انکار کر دیا تھا۔ حسنِ اتفاق دیکھیے یہی جواب لدھیانے [illegible] سردار انجم نے دیا بعینہ وہی جواب دہلی میں میٹلے والڈ[illegible] اور ہم اس بات کے قائل ہوگئے کہ فنکار رہا ہے وہ مو[illegible] ہو بُت تراش ہو شاعر اُس کے ادراک کی گرفت کسر[illegible] یکساں اور مضبوط ہوتی ہے ساتھ ہی اس بات کی خوشی ہوئی کہ مسیحی شعراء میں آج بھی ایسے شعراء حضرات موجود جو مشاعرہ کے دورِ قدیم کی روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں ہمارے خیال میں یہ روایت اُس وقت تک نہیں بدلے گی۔ جب تک ناظمِ مشاعرہ دعوتِ زحمتِ سخن کی ترکیب نہیں بدلیں گے۔

بہرکیف مشاعرہ کے اختتام میں جناب میٹلے والڈکر نے اپنے دو گیت سنا کر ہال میں وجد آفریں سماں پیدا کر دیا۔ یہاں بھی ایک لطیفہ ہوگیا۔ آپ کسی بھی قوال کی پارٹی میں جائیں اور دیکھیں کہ ہر شعر پر جو شخص ڈائس کے ایک کونے میں بیٹھا داد [illegible] وصولیابی کرتے ہیں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر آداب عرض کہہ رہا ہو غز[illegible] اُسی کی ہے مگر افسوس اس وقت والڈ صاحب لحن داد دی میں صوفی بدایونی کے بجائے خود اپنے ہی گیت سنا رہے تھے پھر بھ[illegible] صوفی صاحب کی ذرہ نوازی دیکھیے کہ پہلے گیت کے خاتمے پر بنفسِ نفیس مائک پر آ کر یہ مژدہ سنا کر کہ والڈ صاحب اُن کے شاگردِ رشید اور آج بھی اُن کا اتنا ہی احترام کرتے جتنا پہلے کرتے تھے والڈ صاحب کی حوصلہ افزائی کر فرمائی۔

رات کو جب ہم لوگ یعنی منظور، تمنا منظور، واقف[illegible] مع اپنی بیگم اور جوزف آزر مع اپنی شریکِ حیات اپنے حجلہ عروسی میں آگئے تو جمہور صاحب بھی دخل در معقولات بن کر ہمارے کمرے میں آگئے۔ ہم نے گھبرا کر دس ملی گرام ویلیم گولیاں نگل لیں۔ رات کے دو بجے منظور صاحب نے جب فلک شگاف نعرہ لگاتے ہوئے فرمایا۔

جن کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی، تو مجبور صاحب چھوڑ کر ہم سب بھاگ گئے۔ سوتے سوتے مجبور صاحب نے بھی ایک دہل جواب مصرع دیا۔

"اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو"

ہم لرزا اٹھے ہم نے اپنی بیگم کو دھیمے سے کہا "ارے یہ کہاں ہم گیہوں کے کھیت میں آ گئے اس سے تو اپنے باجرے کا کھیت ہی اچھا تھا۔ اور جب صبح کے چھ بجے تک یہ شکوہ اور جواب شکوہ سلسلہ چلتا رہا تو ہم سے بھی نہ رہا گیا۔

"ان دونوں کو للہ کوئی اب تو جگا دو"

اور جب ہم نے سوالیہ نظروں سے واقف صاحب کو دیکھا تو انھوں نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"اکور صاحب یہ پنجاب دا پانی ہے" اور ہم سوچنے لگے کہ اگر پنجاب دے پانی دا۔ اے اثر ہے تو دودھ دا کی ہوگا؟

دوپہر کی ادبی نشست میں جناب حکامیر کلی صاحب اور جناب واقف صاحب نے اپنے پُرمغز مقالات پڑھے۔

آیئے شام کو پُرتکلف کھانے پر جب کہ تمام شعرا حضرات کا جمع ہو جانا یقینی ہے کچھ دوستوں کا تعارف ہو جائے۔ آپ سے ملئے آپ ہیں۔

(۱) جناب تاجی نادری صاحب۔ مسیحی شعرا میں انگلیوں پر گنے جانے والے صفِ اوّل کے ایسے شاعر جنھیں چھوٹی انگلی پر گننا بھی اُن کے حق میں کسرِ شان ہوگا۔ عرصے تک ایک ادبی جریدہ ساز سرمدی نکالتے رہے۔ ماہرِ عروض اتنے کہ آپ کی نظر سے متروکات مشکل بچا سکتے ہیں مع تقابل الرد لفین۔ اپنے رباعیات کے مجموعے باب السما پر عصر حاضر میں (جس کا ذکر مسیحی اردو مصنفین کی مطبوعات کی فہرست میں شامل ہے) سب سے پہلے انعام حاصل کرنے والے شاعر۔ بذلہ سنجی اور خوش طبعی آپ کے مزاج کا حصہ ہے۔ جس محفل میں گئے زعفران زار بنا دیا۔ آپ انھیں اپنے مشاعرے میں بلائیے اور کرشن چندر کے افسانے "زعفران کے کھیت" کی یاد تازہ کر لیجئے۔ راقم الحروف کی روشنی طبع کو مزید روشن کرنے والے مخلص دوست۔

(۲) آپ سے ملئے آپ ہیں جناب ایم ایم داس منظور لکھنوی اور اُن کی ڈارلنگ تمنا منظور۔ منظور صاحب حضرت رعنا لکھنوی مرحوم کے فرزند ارجمند ہیں ان کا خیال ہے کہ وہ اپنے والد مرحوم کے انگوٹھے کے برابر نہیں مگر ہمارے اعتراف کے مطابق وہ گھٹنوں تک آ گئے۔ لال پیلی، ہری، گلابی رنگ میں رنگے ایسے جاذب قوسِ قزح شخصیت کے مالک جن کی زبان پر ریاض خیرآبادی کا دیوان رکھا ہے۔ شاعری اگر ورثے میں ملی ہے مگر تمنا منظور ان کے مصرعوں پر گرہ نہ لگائیں تو سمندر کی سیاہی جل بنا لیتے تو بھی ایک شعر نہ کہہ پاتے دونوں الگ الگ بھی غزل کہتے ہیں اور ساتھ بھی۔ ساجھے داری کی غزل میں ابھی بمشکل پانچ شعر کہہ پائے تھے کہ تمنا منظور نے مقطع کہہ کر قطع کلام معاف کہہ دیا بڑی پیاری ہنسوں کی جوڑی ہے۔ اللہ کسی شکاری کی نظر سے بچائے۔

(۳) آپ سے ملئے آپ ہیں جناب ایس ایم لال عاقل صاحب حال ہی میں عاقل بنے ہیں ریٹائرڈ گورنمنٹ ملازم ہیں اور وردی بود و باش رکھتے ہیں۔ شرافت اور وہ بھی ضرورت سے زیادہ اگر تعزیراتِ ہند کے کسی دفعہ کے تحت آتی ہو تو انھیں چوبیس گھنٹوں میں زیرِ حراست کیا جا سکتا ہے۔ پہلی غزل سن کر افسوس ہوا کہ اب تک آپ عاقل بننے سے کیوں غافل رہے۔ بہرحال جالندھر میں تو لال صاحب اب بھی مجذوب ہیں ورنہ بنا کسی صلے کی تمنا اور ستائش کی پرواہ کئے بغیر ہر سال اپنے وسائل و اخراجات پر ہوتے ہوئے دہلی کے رام لیلا میدان میں عیدِ ولادت پر بڑا سٹیج کرنا جس میں غیر مسیحی کلاکار بھی شامل ہیں کسی باہوش آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ ان کے لئے جگر کا ایک شعر سن لیجئے۔

اللہ اگر توفیق نہ دے ہر ایک کے بس کا کام نہیں
عرفانِ محبت عام تو ہے فیضانِ محبت عام نہیں

سال آئندہ کے لئے جلپورا اور امرتسر سے دعوت نامے آئے واقف جالندھری نے جب فرمایا۔ انور صاحب فکر نہ کریں گل شمع ایک شوا کو بنجابیں سر سے جھک کرا لیں گے تو ہم گھبرا گئے کہ اس سرائے فانی

میں اور کتنی سرائیوں میں قیام کرنا ہوگا بہرحال ووٹنگ کے وقت ہمارا ہاتھ جبلپور کے حق میں اٹھنا یقینی تھا۔

شام کو ادبی مشاعرے سے قبل جناب سرور تونسوی صاحب مدیر شانِ ہند نے جناب الفریڈ جگت سنگھ جی کی کتاب "مشیرِ اُمّہ" کی نقاب کشائی کرتے ہوئے فرمایا کہ اُردو کی بقاء حیات کی جنگ میں مسیحی شعراء و ادباء بھی دیگر اقوام کے اُردو شعراء و ادباء کے شانہ بشانہ ہوتے ہوئے بھی ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہی نہیں بلکہ حق تلفی بھی کی جا رہی ہے۔ سرور صاحب نے مسیحی شعراء و ادباء کے حقوق کے تحفظ کے لئے نعرۂ جہاد بھی بلند کر دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سرور صاحب سینکڑوں نقاب پوش دانشوروں کی نقابیں اتار چکے ہیں وہ دشمنوں کے دشمن اور دوستوں کے مخلص دوست ہیں آپ ایک قدم اٹھائیے وہ دو قدم اٹھائیں گے۔

کانفرنس کامیاب رہی۔ کھانے کا بھی عمدہ انتظام تھا مگر مشاعرے میں خالی کرسیاں سوالیہ نشان بنی ہوئی تھیں۔ ساگر صاحب نے صفائی پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

انور صاحب چھ ہزار ہینڈ بل چھپوا رہے ہیں۔ دو ماہ سے اخباروں میں اشتہار دیئے جا رہے ہیں۔ پچھلے دو ماہ سے راتوں کی نیند حرام ہو چکی ہے مگر حالاتِ حاضرہ میں ساگر صاحب اور ان کے چند دوست کر بھی کیا سکتے ہیں جب کہ ٹی وی نے اچھے اچھے سینما گھروں کو شاپنگ سینٹر میں بدل کر رکھ دیا ہے سچ تو یہ ہے کہ ہمیں ان چند نفوس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جو اتوار کے دن ٹی وی کی فلم چھوڑ کر ہمارے درمیان سمع خراشی کے لئے تشریف لائے۔

چلتے چلتے آخر میں ایک خاص بات اور بتا دوں۔ کانفرنس کے سوونیئر میں جہاں دیگر بہت سی کمیٹیوں کا ذکر ہے وہاں ایک طبی کمیٹی کا بھی ذکر ہے۔ ظاہر ہے شعراء حضرات قلبِ ناتواں ہی نہیں رکھتے بلکہ ازل ہی سے لاعلاج مرضِ عشق میں مبتلا بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسے نیم جاں نازک مزاجوں کا جو بعد از مرگ بھی کفن ہو ہلکا کے خواہاں ہوں اور جن کا علاج نہ TEXES والوں کے پاس ہے

نے SIOON KETTERRING ہسپتال میں پایاں ہمہ ڈاکٹر مہندر سنگھ جی اپنی ساکھ کو داؤ پر لگا کر بنفسِ نفیس ہماری کانفرنس میں آئے اور شعراء حضرات کو مفت طبی امداد کی پیش کش کی لہٰذا ہماری دانست میں تو ہمارے سکھ بھائی ڈاکٹر مہندر سنگھ جی اس کانفرنس و مشاعرہ کی کامیاب ترین شخصیت تھے۔

جو بولے سو نہال ۔ ست سری اکال

بقیہ: بھکارن

بدل سکتا ہے۔ لگن اور محنت کا جذبہ ہو تو غریبی دور ہو سکتی ہے۔ بنارس اور علی گڑھ یونیورسٹی قائم کرنے والے راجہ یا نواب نہیں تھے۔"

وہ سن تو رہی ہے لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس پر میری نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ وہ کچھ بھی ملنے کی آس چھوڑ کر خفگی کے ساتھ اٹھتی ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں اس کی بغل میں لگی پوٹلی نیچے گر گئی ہے۔ اور اس میں بندھی بیسن پھلکیاں روٹیاں کھل کر نیچے بکھر گئی ہیں۔ اس نے جلدی جلدی اٹھا کر انہیں کپڑے میں باندھ لیا ہے۔ یہ دیکھ کر میں اس سے کہتی ہوں "تم تو تین دن کی بھوکی تھیں اس کھانے سے تو تین چار آدمیوں کا پیٹ بھر سکتا ہے"

وہ بگڑ کر کہتی ہے "تم میرے پاس تین چار وقت کا کھانا دیکھ کر ہی تو ایسی بات کہہ رہی ہو اور جن کے پاس لاکھوں بوریاں اناج بھرا پڑا ہے اس پر کبھی دھیان گیا ہے"

وہ تیر سا مار کر چلی گئی۔ میں سمجھ رہی تھی وہ اپنے جھوٹ پر پشیمان ہوگی۔ معافی مانگے گی مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ الٹی شرم مجھے آ رہی ہے پشیمان میں ہوں۔

بھکارن

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

"بہن جی! بچہ بھوکا ہے کچھ کھانے کو دے دو بڑا پن ہوگا۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔"

میں اپنا چرخہ روکتے ہوئے اُدھر دیکھتی ہوں وہ ایک بھکارن ہے اس کی گود میں تقریباً ڈیڑھ دو سال کا ایک بچہ بھی ہے میں اُسے دیکھ کر کچھ سوچنے لگ گئی ہوں۔ جب اُسے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ بلا جھجک اندر داخل ہو گئی ہے اور میرے قریب ہی آکر کھڑی ہو گئی ہے۔ کچھ بھکاری بڑے ڈھیٹ ہوتے ہیں اور کچھ تو بھکاریوں کے بھیس میں چور ڈکیت مکار اور جاسوس بھی ہوتے ہیں۔ اُن کا گھر کے اندر آنا مضر ہوتا ہے جب وہ گھر میں گھس ہی آئی ہے تو باہر کو دھکیلا بھی کیسے جائے پھر بھی ہرج ہی کیا ہے۔ عورت ذات ہے دو گھڑی بات ہی کر لوں گی۔ ذرا دل بہل جائے گا۔

"اگر میں تم کو کچھ نہیں دوں تو کیا بھگوان میرا بھلا نہیں کرے گا" میں بات کرنے کے لئے اسے چھیڑتی ہوں۔ یہ سنتے ہی وہ میرے پاس بیٹھ گئی ہے اور بچے کو سنبھالتے ہوئے کہہ رہی ہے "ایسے کیوں کہتی ہو ناگوڑی وہ سب کا بھلا کرتا ہے جلدی سے کچھ کھانے کو دے دو" بھکارن کہہ رہی اور میں کل کا واقعہ یاد کر رہی ہوں دوپہر کے وقت ایک ضعیف آدمی میرے پاس آیا اور گڑگڑاتے ہوئے بولا "ہم پردیسی ہیں کسی نے گاڑی میں جیب کاٹ لی۔ ایک پیسہ بھی نہیں چھوڑا۔ ہو سکے تو مدد کرو تا کہ کچھ کھا پی سکیں اور گھر تک پہنچ جائیں" مجھے اس کی خستہ حالت پر ترس آ گیا میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اتنا بوڑھا آدمی بھی مکاری کر سکتا ہے ایک روپیہ دے دیا وہ خوش خوش چلا گیا۔ شام کے وقت جب میں بازار سے سودا لے کر آ رہی تھی تو وہی بوڑھا میرے پاس آیا اور پھرتی سے ہمکلام ہوا۔ "بہن جی مجھے کرایہ کے لئے دو روپے دے دو تاکہ میں اپنے گھر جا سکوں۔ ساٹھ روپے کی لوٹی لینے آیا تھا جیب کترے نے جیب کاٹ لی نہ روٹی لے سکا اور نہ گھر تک جانے کے لئے کوئی پیسہ باقی بچا" میں صبح کے وقت ہری دھوتی پہنے ہوئے تھی اور شام کو سفید پہن رکھی تھی۔ وہ مجھے پہچان نہ سکا تھا شاید بڑھاپے کی وجہ سے اس کو کم بھی نظر آتا ہو گا۔ میں نے اُسے پہچان لیا تھا اور اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ خود ہی ٹھگ بیٹھا تھا میں نے اسے کچھ بھی نہیں دیا اور ڈانٹ پھٹکار کر بھگا دیا تھا۔ اس کے بیٹھتے پیچھے ہی پڑوسن آ گئی میری ڈانٹ پھٹکار اس نے سن لی تھی آتے ہی بولی "مری تو ہے بُری کٹھور غریب بھکاری پر رحم بھی نہیں کرتی" مگر جب میں نے اسے اس بوڑھے بھکاری کی ساری بات بتائی تو وہ بھی حیران رہ گئی اور بھیک مانگنے والوں کو بُرا بھلا کہنے لگی تھی۔

کل کے اس واقعہ کی یاد میرے ذہن میں تازہ ہے۔ میں خاموش بیٹھی ہوئی ہوں۔ طرح طرح کی باتیں میرے دماغ میں آ رہی ہیں۔ اس بھکارن کو بھی اُسی ٹھگ کا ہمسر سمجھ رہی ہوں۔

"ایک بھوکے بچے کو روٹی دینے کے لئے اتنا سوچ بچار کر رہی ہو" بھکارن کے الفاظ مجھے چونکا دیتے ہیں میں اس کی طرف دیکھتی ہوں اور کہتی ہوں "نہیں میں یہ نہیں سوچ رہی تھی بلکہ مجھے اپنی مصیبت کا دردناک زمانہ یاد آ رہا ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ مجھ سے سٹ کر بیٹھ گئی ہے اور دلچسپی لیتے ہوئے بولتی ہے "وہ کیا؟"

میں اسے بتا رہی ہوں۔ "کبھی میں بھی تمہاری طرح بھیک مانگنے نکلی تھی میں بھی بے بس تھی دکھی تھی مجبور تھی۔ پریشان تھی مگر شرم و حیا بھی ساتھ تھی جس کی وجہ سے میں نے ایک حقارت انگیز پیشے کو چھوڑ کر چرخہ کاتنا شروع

کر دیا مگر تم لوگ مانگتے مانگتے بے شرم ہو گئے ہو اور اس پیشہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کام کرنا ہی پسند نہیں کرتے۔ در در کی ٹھوکریں کھاتی ہو بے عزتی سہتی ہو اور ذلیل زندگی جیئے جا رہی ہو"

وہ کہتی ہے "شرم درم تو سب کچھ آتی ہے مگر پیٹ کی آگ بھی تو بجھانی ہے کام دھام تو ملتا نہیں پھر کیا کریں ہمارا مقدر کا ساتھ دیتی ہے نہ بھاگ ساتھ دیتی ہے تمہاری طرح دھن والے لوگ اسی طرح اپدیش کرتے ہیں۔ تم نے کبھی بھیک مانگی تھی؟ ذرا سے نا؟ ۔

میں اس سے کہتی ہوں "کچھ لوگ باہر سے اتنے دکھی نظر نہیں آتے جتنے وہ اندر سے پریشان ہوتے ہیں میں بھی انہیں میں سے ایک ہوں تم جس مکان میں بیٹھی ہو یہ پہلے سے ایسا نہیں تھا ورنہ میں جتنی سکھی اب ہوں اتنی سکھی پہلے کبھی تھی۔

بھکارن گود میں بچہ سنبھالے ہوئے بغور سن رہی ہے میں سلسلۂ کلام آگے بڑھاتے ہوئے کہتی ہوں "سنو وہ میری زندگی کا بڑا منحوس دن تھا میں کھانا پکا رہی تھی بکری باہر چلی گئی تھی اس وقت میرا بچہ چھوٹا ہی تھا اس نے میرے پیچھے چولہے میں سے ایک جلتی ہوئی لکڑی نکال لی اور کھیل کھیل میں اتنی اونچی اٹھا دی کہ چھپر سے چھو گئی اور وہ جلنے لگا۔ شعلے تیز ہو گئے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ یہ باہر تھا ورنہ میرا تمام ہی ڈوب گیا ہوتا۔ اس کے پتا کھیت جوت کر ہارے تھکے آئے تھے اور گھر کے اندر پڑے سو رہے تھے۔ میں نے گھر میں آگ لگی دیکھ کر بندھی ہوئی بکری کو کھونٹے سے کھول دیا آگ کی لپٹیں بہت تیز ہو چکی تھیں گھر کے اندر کچھ میں لانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اپنے بیٹے موہن کو پکڑ کر گود میں اٹھا لیا تھا میں نے موہن سے پوچھا وہ کہاں ہیں اس نے بھاگتی ہوئی بکری کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ سمجھا میں بکری کو پوچھ رہی ہوں اس کا مطلب یہ سمجھی کہ وہ باہر کو گئے ہیں جلدی جلدی میں اس سے زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع بھی نہیں تھا۔

میں بے فکر ہو کر جلتے ہوئے گھر کو چھوڑ کے باہر بھاگ آئی جب آگ بجھ گئی تو گھر کو دیکھا اُن کی جھلسی ہوئی کایا گھٹیا [illegible]

سے اندر پڑی ملی انھوں نے اپنی جان بچانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اگر وہ لپٹوں کو جھیلتے ہوئے گھر سے باہر نکل آتے تو تھوڑا بہت جل ضرور جاتے مگر جان تو بچ ہی جاتی مجھ بدنصیب کا سہاگ آگ کے شعلوں نے راکھ کر دیا۔

اس کے بعد میں بالکل برباد ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک وقت بھی پیٹ بھر روٹی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ کھیتوں میں کچھ بویا نہیں گیا۔ تنگدستی ہر جگہ اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ پڑوسی لوگ ترس کھا کر باری باری کھانا بھجوا رہے تھے۔ جس سے گزارا ہو جاتی تھی۔ دھیرے دھیرے مجھے ان روٹیوں سے نفرت ہونے لگی کہاں تک کوئی مجھے کھلاتا رہتا اور کہاں تک حرام کی روٹی پر جیتی رہتی میری روح مجھے پھٹکارنے لگی دل سے گزارا نہ کوئی منصف ہوتا ہے نہ ناصح۔ میں نے گھر چھوڑ دیا۔ دیس چوری پردیس بھیک یہ کہاوت صحیح ہے میں موہن کو لے کر ہیر رشیا اور ناگا سانی کی طرح اجاڑ دو برات گھر کو چھوڑ کر باہر نکل گئی اس وقت میرے پاس کپڑے بھی صحیح سلامت نہیں تھے میری زندگی میں یہ تجربہ بھی شامل ہو گیا کہ گھر سے باہر نکل کر کسی بھی طرح راحت نصیب نہیں ہوتی ہے۔ ٹھوکریں ہی ٹھوکریں ملتی ہیں۔ یہ دنیا دور سے دیکھنے میں جتنی حسین لگتی ہے اتنی برتاؤ میں نہیں ہے بھیک مانگنا ہارے کا ہتھیار ہے۔ میں نے مجبور ہو کر ایک دوکان پر حلوائی کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا اور تمہاری ہی طرح الفاظ استعمال کئے وہ چھوٹتے ہی بولا "اچھی خاصی جوان عورت ہے۔ بھیک مانگتے شرم محسوس نہیں ہوتی کسی کی ہو رہے تب بھی تو اچھی رہے گی" دوکاندار کے یہ الفاظ مجھے اس وقت بہت برے لگے تھے۔ ویسے اب سوچتی ہوں تو اس نے ٹھیک ہی کہا تھا مگر میرے سامنے پیٹ کی آگ فوراً بجھانے کی سمت یا تھی بھوکا سب کچھ سن لیتا ہے سب کچھ برداشت کر لیتا ہے سب کچھ کر لیتا ہے یہ مجھے تجربہ ہو گیا میں نے پھر ایک جملہ تراشا "میں بہت مجبور ہوں لالہ جی کچھ تو میری مدد کرو" اس پر وہ پتھر کا انسان بولا "سبھی بھکاری اسی طرح کہتے ہیں" یہ کہہ کر وہ اپنے کام میں لگ گیا آج کل کے تجربہ کی بنا پر میں سمجھتی ہوں کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا اس کے [illegible]

...ہیں مثالیں ایسی ضرور ہوں گی - جو وہ بھکاریوں کی
...سے ایسا نظر ہو گیا تھا - فرش پہ بچھی بوری کے نیچے جو
...ے پیروں سے دبی ہوئی تھی نہ جانے کتنے نوٹ تھے - مگر
...بھاگ میں اس میں سے ایک سکہ بھی نہیں تھا -
میں اس کے ہاتھوں پیروں کی حرکتیں دیکھتی رہی اس کے
... دینے کی نیت نہیں معلوم ہو رہی تھی - میں نے ہمت کر کے
...ں کہا جب کسی داتا کو دکھی اور مجبور کی پہچان ہی نہ ہو تو
...ری کا نصیب ہے، کیا کرے "۔ یہ کہہ کر میں دوکان سے
...بڑھ گئی -
" دیکھا ان بھکاریوں کا ڈھنگ کچھ دے دو تو خیریت ورنہ
...ں دینے لگتے ہیں - دوکان دار کہہ رہا تھا - میں ابھی دوکان
...زیادہ دور نہیں گئی تھی صرف سڑک ہی پار کی تھی اس کی تمام
...مجھے سننے میں آ رہی تھیں - میں بھیک مانگنے سے متنفر ہو گئی
...جینے سے تو مر جانا اچھا "
اپنی رام کہانی سناتے ہوئے میں تھوڑا رک جاتی ہوں -
...پاس بیٹھی بھکارن کو دیکھنے لگتی ہوں - اس کی کھوپڑی تن
...ہیں جیسے وہ بھکاریوں اور ان کے پیشے کے خلاف کچھ بھی
...نا نہیں چاہتی وہ سچ مچ میری بات کا برا مان جاتی ہے -
...پھر بھی چپ چاپ سنتی رہتی ہے -
" وہاں تو پھر میں ایک امیر کی کوٹھی پر پہونچی جس پر کام چل رہا
...او وہاں کئی مزدور اور عورتیں بھی کام کر رہی تھیں وہاں کے
...ے سے میں نے بھیک نہیں کام مانگا - مالک ایکدم بولا تم
...بت میں مجبور ہو - مجھے معلوم ہے میں تمہیں تمہارے حساب سے
...ضرور دوں گا۔ یہ سن کر مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھ کو پہلے سے
...نتا تھا میں نے شکریہ ادا کرنے کے خیال سے اس سے پوچھا آپ
...ری مجبوری کو کیسے سمجھتے ہیں؟ وہ بولا " آنکھیں سچائی کو سمجھنے میں
...کرتی ہیں " بھگوان بھلا کرے اس کا بہت اچھا آدمی تھا -
...نے مجھ سے پوچھا تم پڑھی لکھی ہو؟ میں نے ہاں میں جواب
...یا وہ بولا تم شام تک اس کوٹھی پر جو مزدور آئیں گن کر لکھتی رہو میں تم کو
...[illegible] دوں گا اور کچھ جیب خرچ بھی " مجھے یہ کام آسان لگا اور
...[illegible] رہی -

شام کو لوہار مجھ سے بولا " تم گاؤں کی رہنے والی ہو؟ میں
نے خوشی خوشی منظور کیا یہ کہہ کر وہ کام میں لگ گیا اور میں کچھ دیر سوچنے کے
لئے اس کا منہ تکتی رہی مگر اس نے کچھ نہیں کہا چند منٹ ٹھہر کر
اس نے پھر کہا " تبھی تو تم لوگ غریب رہتے ہو " میں اس کی بات
کا مطلب نہیں سمجھ پائی کہ اس نے کیا سوچ کر یہ بات کہی تھی جب
میں کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکی تو اس سے پوچھ ہی بیٹھی اس پر وہ مسکرایا
اور چھاج سی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولا " اس زمانے میں سچ بولنے
اور پورا تولنے سے گذارا نہیں ہوتا گاؤں والوں میں یہ دونوں
باتیں ہیں وہ دھرم ایمان کے زیادہ مطیع ہیں تم جتنے سریے
گن رہی ہو اتنے ہی لکھ بھی رہی [illegible] میں بھر جانے کے بعد
کچھ بھی پتہ نہیں چلے گا دس بیس سریے بڑھا کر لکھ دو کچھ پیسے
بھی مل جائیں گے اور کچھ تمہارے پلے بھی پڑے گا - میں نے
کہا " تمہیں کیا ملے گا؟ وہ بولا " سریوں کی ڈھلائی کی مزدوری مجھے
ملے گی اور بڑھے ہوئے سریے بیچ لوں گا تمہیں پانچ روپیہ
دے دوں گا " پانچ کا نوٹ نکال کر مستری نے فوراً میری طرف
بڑھا دیا - میں نے بہت سی باتیں سوچیں اور وہ نوٹ لے کر مٹھی
میں کھونس لیا - اس کی نظر میں میں اس کی ہم خیال ہو گئی تھی جیسے
کہ اس نے مجھے پانچ روپے میں خرید لیا تھا - میں نے شام کو مالک
کے سامنے پانچ روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے ساری بات بتا
دی تو مالک بولا " تم اتنی ایمانداری سے کام کرتی ہو تو پانچ روپے
کا نوٹ لے کر کیوں رکھ لیا " میں نے کہا " اگر یہ نہ رکھتی تو وہ مستری
ناخوش ہو جاتا اور مجھے آپ کے سامنے کسی جھوٹے الزام میں
بدنام کر کے آپ کی نظروں سے گرا سکتا تھا اور میں بے روزگار
ہو جاتی کیوں کہ آپ نے میرا دیکھا ہی کیا تھا وہ آپ کا پرانا
بھروسے کا ملازم تھا اس کی بات تو آپ جلدی مان جاتے چاہے
وہ غلط ہی کیوں نہ کہہ رہا ہوتا " میری باتوں سے مالک بہت
خوش ہوا اور بہت دیر تک گالوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے سوچتا رہا
میں باٹ جوہ رہی تھی اس کے بولنے کی - وہ بولا " تم ہماری
کوٹھی پر ہو رہے تمام کام پر نگاہ رکھا کرو - اور شام کو سب بتا دیا
مجھے دیا کرو کہنا کسی سے کچھ نہیں " میں نے ویسا ہی کیا - ایک دن
اینٹ سے میرے پیر میں چوٹ لگ گئی اور مجھے چلنا پھرنا مشکل

ہوگیا۔ میں اُن دنوں مندر کی دھرم شالہ میں سوتی تھی اُس نے
مجھ پر کمال کی مہربانی دکھائی۔ میں مندر کی دھرم شالہ میں سوتی رہی
مجھے کسی نے بتایا کہ اور میں نے شام کو آکر دیکھا تو تعجب ہوا۔
بیچارا نیلو اب اس حالت میں تیار ہو گیا تھا جس میں تم دیکھ رہی ہو
مجھے خوشی تو ہوئی مگر کوفت زیادہ ہوئی۔ میں نے مالک سے
کہا "آپ کی یہ ہمدردی مجھے سماج میں بدنام کر سکتی ہے زیادہ تر یا
دھرم کبھی آدمی کے دشمن بن جاتے ہیں" مالک میرا منہ تکنے لگا۔
اور حیرت زدہ ہوکر بولا "وہ کیسے؟" میں بولی میں گاؤں والوں
کا منہ کیسے بند کروں گی بڑا ہونے پر لڑکے کو کوئی بولنے بھی نہیں دے
گا کہ تیری ماں ایک سیٹھ سے ....." میں کہتے کہتے رک گئی
وہ میرے دل کی بات سمجھ گیا اور بولا "راکھی کا تیوہار آنے دو میں
اس بات کا موقع ہی نہیں دوں گا۔ یہی ہوا راکھی کے تیوہار کو
انھوں نے آکر راکھی بندھوائی اور گاؤں والوں کے سامنے بھینٹ
میں پختہ مکان دے کر چلا گیا۔ میرا منہ ہمیشہ کو اُجاگر کر دیا۔ پھر مجھے
اس نے امبر چرخے کی ٹریننگ دلوا کر گاندھی آشرم سے ایک چرخہ
دلوا دیا"

"کیا وہ اب بھی راکھی بندھوانے آتا ہے؟" بھکارن سوال
ہے۔

"ہاں ہر سال آتا ہے اور میں بھی بہن بھائی دوج پر گوڑ کے
بتاشے لے کر اُس کے گھر جاتی ہوں" میں اسے جواب دیتی ہوں۔

"وہاں بھی کچھ ملتا ہوگا" بھکارن متعجب ہوکر پوچھتی ہے
میں اسے کہتی ہوں۔

"نہیں میں وہاں جاکر کوئی بھینٹ نہیں لیتی ہوں۔ پہلی بار جب
میں وہاں پہونچی تو اوپر سے کسی عورت نے جھانکا اور بولی "بھکارن
ہے" بعد کو پتہ چلا وہ اس کی بیوی تھی سیٹھ نے بھی جھانکا وہ مجھے
پہچان گیا اور جلدی جلدی نیچے اُتر آیا میں نے وہیں تلک کر کے
گوڑ کے بتاشے اس کی گود میں رکھ دیے وہ بولا "ارے آج تو بھیا
دوج ہے مجھے یاد ہی نہیں تھا چلو اندر چلو" میں نے مسکرا کے
کہا "میں محلوں سے نہیں بھیا سے سمبندھ رکھتی ہوں" وہ ابھی آیا کہہ
کر اوپر چلا گیا۔ شاید کچھ بھینٹ لینے گیا ہوگا۔ میں کچھ دیر وہاں
کھڑی رہی جب وہ اوپر پہونچا تو بیوی نے اُس سے کئی سوال پوچھے

ایک بات مجھے صاف صاف سنائی دے گئی "یہ سب لینے کھانے
کی باتیں ہیں اس زمانے میں کوئی کسی کی بہن نہیں ہے اور نہ کوئی
کسی کا بھائی ہے یہ تو مطلب کا زمانہ ہے بہن بھائی کے رشتے
کی آڑ میں نہ جانے کیا کچھ ہوجاتا ہے اور فریبی سماج اُدھر سے
نظریں بچا لیتا ہے کیونکہ وہ بہن بھائی کا سوانگ رچے بیٹھے
جو ہوتے ہیں" اس کی بیوی نے حقیقت کا جس طرح مذاق اڑایا
تھا مجھے بہت ہی دکھ ہوا میں وہاں سے چلی آئی شاید وہ اپنی بیوی
سے اس بات پر لڑا جھگڑا بھی ہو اور کچھ لے کر پیچھے بھی آیا ہو۔
میں اپنے گھر آ گئی وہ شام کو کسی بہانے سے میرے گھر آیا اور
معافی مانگتے ہوئے دکشنا دینے لگا میرے خلوص کو محض دکھاوا
سمجھے جانے پر جو میرے دل کو ٹھیس پہونچی تھی۔ وہ میرے چہرے
سے ظاہر تھی۔ میں اُس کی ہمدردی اور شرافت کو سب سے بڑا تحفہ
سمجھتی ہوں۔ ہم دونوں ابھی تک وہی ناتا نبھاتے چلے آرہے
ہیں۔ یہی میری کامیابی ہے"

بھکارن میری رام کہانی سن کر ششدر رہ جاتی ہے کہتی
ہے "میں بھی جانتی ہوں بھیک مانگنا بری بات ہے مگر کیا کروں
تین دن سے بھوکی ہوں" میں اُس سے کہتی ہوں "تمہارا چہرہ
تو ایسا ظاہر کرتا نہیں" اس پر وہ بگڑ جاتی ہے اور بولتی ہے
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں"

"میں تو ایسا ہی سمجھ رہی ہوں بھیک مانگتے مانگتے آدمی بے
شرم بھی ہو جاتا ہے اور جھوٹا بھی"

"پیٹ بھرے والے ایسے ہی اپدیش کرتے ہیں مگر ہاتھ کی
ساری انگلیاں تو یکساں نہیں ہوتی ہیں تم سبھی بھکاریوں کو
یکساں مت سمجھو۔ سچ مچ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی
مدد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ہم غریب نہ ہوتے تو ایسا کیوں سنتے"
یہ سن کر میں اُس سے کچھ نہیں کہتی ہوں اور سوچتی ہوں کیا پتہ وہ
میری ہی طرح ایک بھکارن ہو اور میں دوسرے مکار بھکاریوں
کی طرح اس کو سمجھ رہی ہوں میں بات کا پہلو بدلتی ہوں اور
اس کو سمجھاتی ہوں "تم ناراض مت ہو غریبی کوئی ایسا کلنک نہیں
ہے [illegible] نہ ٹیک۔ اور غریب کسی ایسے مجبور کا نام نہیں ہے جو
کچھ کر نہ سکے آدمی چاہے تو اپنا ہی نہیں دوسروں کا بھاگ بھی

باقی صـ پر

کالیداس گپتا رضا کی

تاحال مطبوعہ تصانیف

«شعلۂ خاموش» مجموعۂ کلام قیمت ۵۰ روپے	«ہندوستان مشرقی افریقہ میں» (تاریخ) قیمت ۱۹ روپے ۵۰ پیسے	«انتخاب آتش و غالب» چکبست قیمت ۳۰ روپے
«شورشِ پنہاں» مجموعۂ کلام قیمت ۲۰ روپے	«مکتوبات جوش ملسیانی» بنام رضا (خطوط) قیمت ۱۹ روپے ۵۰ پیسے	«چکبست اور باقیات چکبست» قیمت ۴۰ روپے
«شاخِ گل» مجموعۂ کلام قیمت ۱۵ روپے	«منشورات جوش ملسیانی» قیمت ۲۰ روپے	«کلیاتِ چکبست» (نظم) قیمت ۱۰۰ روپے
«اُجالے» نعت اور سلام قیمت ۳ روپے	«متعلقاتِ غالب» قیمت ۲۰ روپے	«سہو و سراغ» مجموعۂ مضامین قیمت ۳۵ روپے
«شورِ غم» سلام وغیرہ قیمت ۳ روپے	«دُعائے صباح» غالب کی ایک مثنوی قیمت ۱۵ روپے	«مقالاتِ چکبست» قیمت ۷۵ روپے
«شعاعِ جاوید» مجموعۂ کلام رباعیات قیمت ۴ روپے		
«دی سائیلینٹ فلیم» THE SILENT FLAME (ENGLISH) Rs 10/-	«غالبیات چند عنوانات» قیمت ۵۰ روپے	غیر مطبوعہ تصانیف کا اعلان طبع ہونے پر کیا جائے گا۔

وِدِل پبلیکیشنز

۲۰۵ چرچ گیٹ چیمبرز نیو میرین لائنز

چرچ گیٹ بمبئی ۴۰۰۰۲۰

چھ سال میں افسانوی دنیا پر چھا جانے والے

ڈاکٹر اودے سن ارمان کی تازہ ترین افسانوی پیش کش

ہر بار کہا دل نے

ایک ایسا افسانوی مجموعہ جسے آپ ایک نظر دیکھ لیں تو آپ کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑے گا کہ ایسی خوبصورت کتاب آپ نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔

جس کا ہر افسانہ

کسی نہ کسی ایسی حقیقت کا آئینہ دار ہے جو ہماری تہذیبی اقدار میں ناسور کی طرح پھیلتی جا رہی ہے اور ہم اُس کے بُرے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

قومی یکجہتی کسے کہتے ہیں؟ ہندو مسلم اتحاد کیا ہوتا ہے؟ اپنے ملک کا نام بلند کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ہم سماجی بُرائیاں کیسے دُور کر سکتے ہیں؟ اور شرافت۔ انسانیت اور یگانگت کے اصل معنوں سے واقف ہونا ہو تو پڑھیئے۔

ہر بار کہا دل نے

جسے سال ۱۹۸۵ء کا سب سے بہترین افسانوی مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔
لکھائی۔ چھپائی۔ کاغذ نیز گٹ اپ کے لحاظ سے شاید ہی کوئی افسانوی مجموعہ "ہر بار کہا دل نے" کا مقابلہ کر سکے۔

ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی کی ایک فخریہ پیش کش
ہر بک سٹال سے طلب کیجیے۔ اگر نہ ملے تو پھر دفتر شانِ ہند کو لکھیے۔

قیمت ۳۵ روپے علاوہ محصول ڈاک

ایکتا ایک فن

نثار چنگیزی

چلو دیپ ہم ایکتا کے جلائیں
اخوت کے سر کو ریخبرے لگائیں
مساوات ماہیں کے گیت گائیں
سکون و مسرت کی محفل سجائیں
محبت کی ہر دل میں دنیا بسائیں
چلو دیپ ہم ایکتا کے جلائیں

محبت، مساوات، قومی اخوت
انھیں کی ہے اپنے وطن کو ضرورت
وطن سے [illegible] نفرت کی لعنت
نہیں اس سے اچھی کوئی اور صورت
نہیں جو زباں سے وہ کرکے دکھائیں
چلو دیپ ہم ایکتا کے جلائیں

اگر ایکتا ہے تو قوت ملے گی
اگر دوستی ہے مروت ملے گی
محبت اگر ہے تو عظمت ملے گی
وطن کو اسی سے مسرت ملے گی
اٹھو مل کے ہر ایک کے کام آئیں
چلو دیپ [illegible] ایکتا کے [illegible] لائیں

محبت سے مل جل کے کھیتی لگائیں
تجارت کو مل جل کے آگے بڑھائیں
محبت سے ہم کارخانے لگائیں
جو پچھڑے ہیں ہم ان کو آگے بڑھائیں
مقدر کو ہم دیس کے جگمگائیں
چلو دیپ ہم ایکتا کے جلائیں

مرے دوستو! ایکتا فکر و فن ہے
نہ غم اس میں شامل نہ رنج و محن ہے
بزرگوں کا ہے کہنا بڑوں کا بچن ہے
کہ یہ ایکتا زیست کا بانکپن ہے
شعورِ محبت کے جادو جگائیں
چلو دیپ ہم ایکتا کے جلائیں

وطن میں نہ ہو ظلم یارو کسی پر
اہنسا ہے لازم ہر اک آدمی پر
نہ خوش ہو کسی کی کوئی بے لبسی پر
یقیں ہو سدا چین کی زندگی پر
کریں چین حاصل مسرت منائیں
چلو دیپ ہم ایکتا کے جلائیں

ہیں ہندی یہ ہندوستاں ہے ہمارا
ہر اک قوم نے مل کے اس کو سنوارا
ہمیں دل سے اور جان سے بھی ہے پیارا
نہ خوف آئے اس ایکتا پر خدارا
اسے پھر سے جنت نشاں ہم بنائیں
چلو دیپ ہم ایکتا کے جلائیں

غلط ہیں یہ باتیں کہ ہم منفرد ہیں
لگاؤ یہ نعرہ کہ ہم متحد ہیں
یہ آواز دو سب کو ہم مستعد ہیں
کہا کس نے؟ ہم منفصل منجمد ہیں
نثار اتحادی کمیٹی بنائیں
چلو دیپ ہم ایکتا کے جلائیں

نقوشِ تعمیرِ نو

توصیف علوی عاصی کیرانوی

ہر گوشۂ حیات کی تعمیر کیجئے
عزم و یقیں کے باب کی تحریر کیجئے
آئینِ عقل و ہوش کی تفسیر کیجئے
رنگین فکر و شوق کی تصویر کیجئے
اس طرح سے اس دور کی تعمیر کیجئے

برق و شرر کا رقصِ صحنِ چمن ہی کیوں ؟
بے کیف سایہ ساز ہر اک انجمن میں کیوں ؟
مایوسیاں ہی چار سُو اہلِ وطن میں کیوں ؟
زندہ ہر ایک خواب کی تعبیر کیجئے
اس طرح سے اس دور کی تعمیر کیجئے

آزادئ خیال کے نقشے نہیں جمے
اقدارِ زندگی کے گلستاں نہیں سجے
ظلم و ستم کے آج بھی بادل نہیں چھٹے
ٹکڑے ہر ایک جبر کی زنجیر کیجئے
اس طرح سے اس دور کی تعمیر کیجئے

راہیں بہت طویل ہیں منزل ہے دور ابھی
مدھم سا ہر چراغ ہے محفل ہے دور ابھی
طوفانوں کا ہجوم ہے ساحل ہے دور ابھی
ہر سُو چراغِ فکر کی تنویر کیجئے
اس طرح سے اس دور کی تعمیر کیجئے

جو باطلی ہوں منزلیں وہ راہ چھوڑیئے
مایوسئ حیات کا ہر ساز توڑیئے
تاریخِ زندگی میں نیا باب جوڑیئے
ہر اک ورق کو خون سے تحریر کیجئے
اسی طرح سے اس دور کی تعمیر کیجئے

امن و اماں کا چار سُو لے کر بڑھو علم
ہو منزلِ نشاط کا حامل ہر اک قدم
انسانیت کا نقش ہو ہر فکر اور قلم
ہر اک دل کو پیار سے تسخیر کیجئے
اس طرح سے اس دور کی تعمیر کیجئے

ہر خار اور گُل کو برابر ملے مقام
حق ہو ہر ایک رند کا مینا ہو یا کہ جام
ہاتھوں میں ہو خلوص کے انسان کی زمام
یوں آئینِ حیات کی تنفیذ کیجئے
اس طرح سے اس دور کی تعمیر کیجئے

حُبِ وطن کے نغموں کو ہر سُو گونجائیے
فکر و نظر کی جوت دلوں میں جگائیے
انسان کو اس جہاں میں پھر انسان بنائیے
پھر سے وطن کی خاک کو اکسیر کیجئے
اس طرح سے اس دور کی تعمیر کیجئے

آؤ کہ صلح و آشتی کی راہ دکھائیں
پیغامِ اخوت کا ہر اک سمت گونجائیں
ٹوٹے ہوئے دلوں کو پھر اک بار ملائیں
یکجہتی کے ترانوں کو دلگیر کیجئے
اس طرح سے اس دور کی تعمیر کیجئے

غزل

ڈاکٹر تفتہ (کورو کشیتر یونیورسٹی)

گھپ اندھیرا، ہُو کا عالم اور تنہا راستے
دیکھنا، ڈس لیں نہ مجھ کو ناشناسا راستے
کس جگہ ٹھہریں گے آخر بھٹکا با راستے
بھاگتے جاتے ہیں ہر سو بے تحاشا راستے
سر منزل دے گئے کیوں آ کے دھوکا راستے
بن گئے ہیں کس لئے آخر چھلاوا راستے
زندگی کی اُلجھنوں کا صاف دیتے ہیں پتہ
پیچ و خم کھاتے ہوئے یہ شہر یہ قریہ یا راستے
اہلِ ہمت کے لئے تو کچھ بھی ناممکن نہیں
کرنے والے آپ کر لیتے ہیں پیدا راستے
ایک مدت ہو گئی بچھڑے ہوئے ان کو مگر
کر رہے ہیں آج بھی اُن کی تمنا راستے
اے میرے خلوت نشیں! ان کو ذرا سی تو جھلک
کر رہے ہیں دید کی کب سے تقاضا راستے
اب ہمیں پہچاننا تک بھی نہیں بھاتا انھیں
ہاں کبھی تھے خوب، ہم سے شناسا راستے
منزلِ ہستی میں کوئی سست ہو یا برق رو
دیکھتے ہیں رات دن سب کا تماشا راستے
تفتہ اُن دریاؤں سے لے عزم راسخ کا سبق
چیر کر کہسار جو کرتا ہے پیدا راستے

غزل

وجے پال سنگھ "وجے" (سرحنہ)

محبت کی کہانی کا ستم کی داستاں ہونا
تصور میں نہیں آتا ترا نامہرباں ہونا
اگر وہ بے وفا ہوتا تو پھر محبوب کیوں ہوتا
کسی ظالم کا ہو سکتا ہے مقبولِ جہاں ہونا
کیوں چکنا چور ہونے پر مرے افسوس کرتے ہو
یہی ہوتا ہے اس بستی میں شیشے کا مکاں ہونا
جہاں تک حسن کے جلوے، جہاں تک عشق کی نظریں
وہیں تک شیخ میرا عاشقِ حسنِ بتاں ہونا
دلوں کے درمیاں حائل زمانہ ہے جدھر دیکھو
عجوبہ ہے محبت کا ہمارے درمیاں ہونا
قیامت عشق کی آتش کا جلنا تھا نہ بجھنا تھا
قیامت ہے تو کچھ اس آگ کا دل میں دھواں ہونا
ہو پھر اس میں دروازہ بنا دے گا مرے بھائی
دھرا رہ جائے گا دیوار کا یہ درمیاں ہونا
اب اس دنیا میں کیا معنی بھلا نام و نشاں کے ہیں
کہ خود مشکوک ہے جس کا وجے نام و نشاں ہونا

بقیہ: عروض شناسی

ق آبادی آنجہانی کے حلقہ سے منسوب حضرات یا اُن
جانشین برادر محترم حضرت زار علامی صاحب کے
و انعام کے حقدار نہیں ہوں گے۔ تفرقہ اور تنازعہ کی

صورت میں حضرت زار علامی صاحب کا فیصلہ آخری ہو گا۔
نمونہ تقطیع وصل۔
مصرعہ ۱۔ تجھ عشق میں تو مرنے کو تیار بہت ہیں
ارکان۔ مفعول مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن۔ بحر ہزج مثمن،
اخرب مکفوف، مکفوف محذوف۔
مصرعہ ۲۔ یہ جرم ہے تو ایسے گنہگار بہت ہیں
ارکان۔ مفعول، مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن۔ بحر ہزج مثمن،
اخرب مکفوف، مکفوف، محذوف۔

راقم الحروف۔ ایس۔ [illegible] معرفت دفتر شان ہند
فلیٹ ۸۵۔ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

عروض شناسی — پانچ صد نقد انعام

ماہنامہ "آج کل" اردو دہلی جون ۸۵ء کے شمارے صفحہ ۴۸ پر ایک مضمون "میر کی عروض شناسی" کے عنوان سے شائع ہوا۔ صفحہ ۵۱ پر میر کی یہ غزل رقم ہے جس کے مصرعوں میں وزن کے اعتبار سے تنوع پایا جاتا ہے۔

کچھ عشق میں تو مرنے کو تیار بہت ہیں
یہ جرم ہے تو ایسے گنہگار بہت ہیں
اک زخم کو مئی ریزۂ الماس سے چیرا
دل پر ابھی جراحتِ ناکار بہت ہیں
کچھ انگڑیاں ... اس کی نہیں اک
دل لو زینہار دیکھ خبردار بہت ہیں
بیگانہ نہ رو رقیب سے وسواس کچھ نہ کر
فرما ... زباں سے تو پھر یار بہت ہیں
کوئی تو زمزمہ کرے آ سا دل خراش
یوں تو قفس میں اور گرفتار بہت ہیں

فلک صاحب مطلب مضمون نے یہ غزل ارکان عشرہ کے ایک سالم رکن مفعولات سے بنائی گئی بحر مثمن مفعولی یعنی مفعولات شعر میں آٹھ بار، مزاحف ارکان مفعول

فاع لات مفاعیل فاعلن سے تقطیع کی اور اس مزاحف
مطوی مجبون مکشوف مطوی

وزن میں زحافات خبن و کشف کے اجتماع کی بنا پر مفعول
مرفوع
فاع لات مفاعیل فعولن کو بھی شامل کیا۔ جب
مطوی مجبون مکشوف مجبون

یوں ... تسلی نہ ہوئی تو پھر ...

غزل بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف مکفوف محذوف ارکان مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن میں منظوم ہونا تحریر کی اور اس وزن میں دبیر بنائے زحافات عرج (جس کے ذریعہ عروض و ضرب کے وتد مجموعہ کو وتد مفروق میں تبدیل کیا جاتا ہے) شعر اول کے مفاعیل کی جگہ فاع لات اور عروض و ضرب کے فعولن کی جگہ فاع لن کے لائے جانے کو از روئے عروض جائز قرار دیا۔ صاحب مضمون آگے لکھتے ہیں کہ "میر نے ان تصرفات سے عروض کو نئی راہ دکھائی ہے۔ کیونکہ بقول میر "مستند ہے میرا فرمایا ہوا"۔

کچھ مرحلے عروض کے دشوار بہت ہیں
اس فن میں اہلِ فن بھی خطادار بہت ہیں — کوکب

تمام اقتباساتِ مضمون باطل اور مظہر تضحیک ہیں کیسے؟ ماں حرام تو بچہ حرام۔ جب مفعولات کی تکرار سے یعنی مفعولات شعر میں آٹھ بار کوئی بحر نہیں تو حرام ہوئی پھر اس کے مزاحف ارکان از روئے عروض جائز کیونکر۔ شمارے کے صفحہ ۴۸ کالم ۲ سطر ۵ کو دیکھئے لکھتے ہیں۔ "رباعی میں مفعول اور مفاعیلن کا اجتماع جائز ہے ...... یہ مسلّم امر ہے کہ ان کے اجتماع سے وزن میں فرق نہیں پڑتا۔" اقتباس غلط۔ تصدیق غلط ہونے کی یہ ہے کہ اگر اجتماع جائز ہوتا تو رباعی کے معروف جملہ اوزان کے صدر و ابتدا و حشو اول میں کہیں نہ کہیں مزاحف ارکان مفعول مفعول یا مفاعیلن یا مفاعیلُ مفعول ضرور ملتے۔ جب نہیں ملتے تو تصدیق ہو جاتی ہے کہ اجتماع جائز نہیں۔

کلامِ میر اور اقتباساتِ مضمون کے پیش نظر اس غزل کا تجزیہ کیا جانا ضروری ہو گیا۔ لہٰذا جو صاحب تمام اشعار کی تقطیع متعلقہ بحر کے مطابق کرنے میں کامیاب ہوگا، بزم ادب بھیوانی کی جانب سے معقول اعزاز (مبلغ ۵۰۰ روپیہ کے نقد انعام) سے نوازا جائے گا۔ کامیاب ... کا نام اور حل بھی شائع ہوگا ورنہ یہی حل بزم ادب کی طرف سے شائع کیا جائے گا۔ دو کامیاب حضرات ہونے کی صورت میں رقم انعام دونوں میں برابر تقسیم کی جائے گی۔

شرائط: بحر کا نام مزاحف ارکان کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ غزل اگر مشکوک ہے تو دوسرا حل بھی لازمی ہوگا۔ تقطیع غیر حقیقی تسلیم نہیں کی جائے گی۔ حل نام اور پتہ کے ساتھ نمونے کے مطابق ۱۵ مارچ ۸۶ء سے پہلے بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ ذیل کے پتے پر آنے لازمی ہیں۔

استاد معظم سید القلم خاتم العروض حضرت علامہ سحر

ر فرد ہے سپاہی

ڈاکٹر
قیر
ستانی

بیدار ہو گیا ہے بھارت کا بچہ بچہ
میدان جنگ کا ہے بھارت کا چپہ چپہ
بارود بن چکا ہے بھارت کا ذرہ ذرہ
دیکھو ہوا اُجالا، دیکھو دُھلی سیاہی
دیکھو مرے وطن کا ہر فرد ہے سپاہی

ہر شے سے ہو رہا ہے حبِ وطن نمایاں
ایثار کا تقدس، سچی لگن نمایاں
ہر موڑ پر شجاعت کا بانکپن نمایاں
ہر سمت جراتوں کی دیکھو تو کج کلاہی
دیکھو مرے وطن کا ہر فرد ہے سپاہی

دہقان کی مشقت، مزدور کی ریاضت
جب ملک نے پکارا، بدلی ہر اک طبیعت
اول بھی جس کی عظمت، آخر بھی جس کی عظمت
اب رنگ لا رہی ہے ہر آہ صبحگاہی
دیکھو مرے وطن کا ہر فرد ہے سپاہی

ہم امن کے پجاری تیغ و تبر کو لے کر
اہلِ جنوں کو لے کر، اہلِ نظر کو لے کر
دیکھو نکل پڑے ہیں عزمِ سفر کو لے کر
ہم ہیں رہِ شہادت کے خوش نصیب راہی
دیکھو مرے وطن کا ہر فرد ہے سپاہی

ہم کو قسم خرد کی، ہم کو قسم جنوں کی
اب تک جو بہہ چکا ہے اُس بے گناہ خوں کی
سرحد پہ اب جو دشمن نے بھول کر کبھی چوں کی
تو اُس کو بھون ڈالیں گے خیلِ مرغ و ماہی
دیکھو مرے وطن کا ہر فرد ہے سپاہی

دیکھو سبھی ہتھیلی پر لے کے جاں نکلے
افلاک میں اُڑانے قومی نشان نکلے
باشندگانِ بھارت آخر کہاں نکلے
مولا ترا سہارا، یا رب المدد الٰہی
دیکھو مرے وطن کا ہر فرد ہے سپاہی

قسط ۱۰

دھرتی کانپ اٹھی

احمد حسین شمس ایڈووکیٹ کشن گنج

"دو جوان جوان لڑکیاں پال رہا ہے۔ اپنے گھر میں نہ روپیہ ہوتا ہے نہ شادی ہوتی ہے۔"

"جب وہ اتنا مانگ رہے ہیں تو دوسرے بھی اتنا مانگ رہے ہوں گے۔"

"یہی تو چال کھیل رہا ہے اپنے لڑکے پر اس نے دس ہزار کی بولی لگائی ہے اور پھر چار چار ہزار میں دو لڑکے تلاش کرے گا۔"

"تو کیا ارادہ ہے تمہارا۔"

"ہاں یہی تو سوچ رہا ہوں لڑکا مجھے پسند آگیا ہے گھر بھی کچھ خراب نہیں اب اگر دس ہزار کا انتظام ہو جائے تو بات پکی کر لوں۔"

"خدا تمہاری مدد کرے۔"

"مگر مجھے خدا سے زیادہ تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

میں ہر ممکن مدد کرنے کے لئے تیار ہوں اگر کہو تو میں پانچ چھ ہزار تمہیں آج ہی دے دوں۔

"نہیں ابھی تمہاری فکر بھی تو مجھے پہلے تمہاری شادی کرلوں گا تب اپنی لڑکی کی بارات گھر پر بلواؤں گا۔"

نسیم بخش مسکرائے ان کے دل میں گدگدی سی پیدا ہوئی۔

منگلو نے گاڑی ہانک دی۔ کشن لال کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

سات

چاندنی رات اور گرمی کا دن ۔ دن بھر لوگوں کو سکون کی تلاش تھی رات سکون کی دیوی بن کر آگئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا یہ چلی دن بھر جو گرمی سے پریشان تھے اب اطمینان کا سانس لینے لگے ہر شخص چاندنی کا لطف اٹھانے لگا ۔ کوئی چبوترے پر کوئی آنگن میں ۔

سنیچر کی رات تھی موہن بابو چاندنی سے زیادہ اپنی چھٹی کا مزا لے رہے تھے آنگن میں ایک چارپائی ڈال کر لیٹے ہوئے سگریٹ کا کش کھینچ رہے تھے ان کی بیوی سرلا باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ ماں ایک طرف بیٹھی موہن سے منوہر کی تعلیم کے بارے میں کچھ پوچھ رہی تھی۔

موہن نے کہا "ماں منوہر بہت تیز لڑکا ہے۔ بہت جلد وکالت پاس کر کے آجائے گا۔"

"اور گرمی کی تعطیل کب ہو رہی ہے۔"

"بس پچیس روز اور ہیں۔"

"تعطیل میں منوہر آئے گا نا۔"

"آنا تو چاہئے۔"

سرلا باورچی خانے ہی سے بول اٹھی "منو کی بات چیت بھی کہیں ہوگی۔ وہ زندگی بھر میرے ہاتھ ہی کا پکا ہوا کھائے گا۔"

"وہ تو شادی کے بعد بھی تمہارے ہاتھ ہی کا کھائے گا۔" موہن بول اٹھا۔

ماں نے کہا "قسمت میں جہاں ہوگا شادی ہوگی۔"

ایک لمبی سانس لے کر موہن نے کہا "غریب ہونا بھی جرم ہے ماں۔"

"ایسے کیا غریب ہیں کہ کوئی اپنی لڑکی بھی ہمیں نہ دے گا۔" ماں نے کہا۔

"لڑکیاں تو بہت سی ہیں ماں مگر شادی تو ایک ہی سے ہوگی۔"

"ہزار میں چن کر ہم اپنے بیٹے کی شادی کریں گے۔"

سرلا بول اٹھی "ماں کو تو بس یہی سب باتیں آتی ہیں لڑکے کی پسند سے تو سروکار نہیں۔"

"تو کیا بول رہی ہے۔"

موہن نے کہا "وہ ٹھیک کہتی ہے ماں۔"

"کسی کل موہی نے لوٹا کیا ہے میرے لال کو۔"

"کل موہی نہ کہو ماں۔" موہن نے کہا "وہ بڑی نیک لڑکی ہے بڑی سندر دیکھو گی تو بس پھڑک جاؤ گی۔"

"کالج کی کوئی لڑکی تو نہیں سنا ہے؟ آج کل لڑکے لڑکیاں سب ساتھ ہی پڑھتے ہیں یہ کیا ظلم ہے کہ جوان جہان لڑکیاں جوان لڑکوں کے ساتھ گھل مل کر پڑھیں لکھیں کس موئے نے یہ راج دیا ہے" ماں بڑبڑائی۔

"رواج تو عام ہو چکا ہے مگر ہمارا منوہر کچے دل کا انسان نہیں۔

سرلا نے کہا: ایک ساتھ پڑھنے سے آپ کو تو اتنا ڈر ہے اور ایک ساتھ کھیل کر جوان ہوئے ہوں۔

"لو کیا بولتی ہے"

موہن نے کہا "ماں وہ ٹھیک ہی کہتی ہے"

"تم تو بات میں اسی کی حمایت کرتے ہو"

"اگر اس کی باتیں جو معقول ہیں پانی سر سے اونچا ہو چکا اب کچھ تدبیر سوچنی چاہیئے"

"تم دونوں جنے کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں"

موہن چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور ماں سے کہا "ذرا ادھر نزدیک آؤ ماں"

موہن کی ماں چارپائی کے نزدیک ایک مونڈھا لے کر بیٹھ گئی۔

موہن نے کہا "یہ کشن لال جو ہیں نا وہ اپنی لڑکی کی شادی راجکمار سے کرنا چاہتے ہیں"

"تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے"

اتنے میں سرلا اپنے کام سے فارغ ہو گئی اور وہیں ایک چٹائی پر بیٹھ گئی۔

"ہاں یہی تو میں کہتا ہوں کہ ہم لوگ بھی زمیندار نہ ہوئے نہ ہی کوئی ایسی جائداد نہ چھوڑی کہ اسے ہی لے کر عیش میری تعلیم بھی اعلیٰ نہ ہوئی کہ کہیں ڈپٹی مجسٹریٹ ہی تا لے دے کر تیس بیگھہ زمین وہ آدھی بٹائی پر ایک وہ بھی گرانی کی اور خرچ دیکھو تو کمائی سب برابر" نے پھر ایک لمبی سانس لی۔

سرلا نے کہا "مگر کشن لال تو بنک میں دس ہزار روپے کی رہے ہیں"

ہاں حوصلہ تو کچھ ایسا ہی کیا ہے۔ انھوں نے"

تو یہ دس ہزار روپے کیا کم ہیں"

"دولت دولت کو کھینچتی ہے اور ہم لوگ اس سے محروم ہیں"

موہن کے چہرے پر ایک افسردگی سی چھا گئی۔

"تمہیں دولت کی کیا ضرورت پڑ گئی" ماں نے پوچھا "کیا منوہر کو جتنے روپے بھیجتے ہو کیا اس کا کام نہیں چلتا۔

سرلا نے کہا "ماں آپ تو سمجھتی نہیں۔

"اے بھائی کھل کر کہو تو سمجھوں تم لوگ تو معمہ بول رہے ہو"

"معمہ نہیں ماں" موہن نے کہا "کشن لال کے چھوٹے لڑکے کشور نے مجھ سے ایک روز منوہر کے بارے میں کچھ کہا تھا۔ اسی دن سے میں سوچ رہا ہوں کہ بھگوان نے ہم لوگوں کو غریب بنایا ہی کیوں تھا"

"کیا کہا تھا کشور نے!"

"منوہر کی شادی ہیرا سے ہو جاتی تو بہتر تھا۔

ماں یہ سن کر بھونچک رہ گئی۔ اس کے وہم میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ منوہر کی شادی کشن لال کی لڑکی سے بھی ہو سکتی ہے کہاں راجہ بھوج کہاں بھجوا تیلی زمین کو آسمان سے کیا نسبت ایک کے گھر میں روپیوں کی جھنکار ہے دوسرے کے یہاں چوہے ڈنڈ پیلتے ہیں۔ ایک علاقہ کا رئیس اعظم دوسرا ایک معمولی انسان منوہر وکیل بن کر بھی کشن لال کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس نے ایسی ہمت کی کیسے۔

ماں نے دھیرے دھیرے سر ہلا کر کہا "جھونپڑی میں رہ کر محل کا خواب نہیں دیکھتے بیٹا"

"مگر منوہر؟"

"اسے سمجھانا ہوگا اسے اس خیال سے . . ."

سرلا بات کاٹ کر کہا "اور ہیرا؟"

"ہیرا؟" ماں نے تعجب سے پوچھا "ہیرا کیا کہتی ہے"

"ہیرا بھی تو وہی کہتی ہے جو ہمارے دیور جی کہتے ہیں" سرلا ذرا مسکرائی۔

"ہائے دیا" ماں چونک کر بول اٹھی "اب تو تم لوگ اس بستی میں ہمیں رہنے نہ دو گے۔ کشن لال سنیں گے تو آگ لگا دیں گے گھر میں۔ کشن لال اور حسین بخش اس علاقہ میں دو راکشش ہیں جنہیں بھگوان نے ہم لوگوں پر مسلط کر دیا ہے موہن! تم فوراً خط لکھ منوہر کے خیال بدل ڈالو"

(باقی آئندہ)

ناشرین اور تاجران کتب

متوجہ ہوں!

دلی اردو اکادمی اردو ناشرین اور تاجران کتب کی ایک جامع اور ضخیم ڈائرکیٹری شائع کر رہی ہے۔ اس ڈائرکیٹری کے لئے اپنے ادارے کا مختصر تعارف (کب قائم ہوا/ کتنی کتابیں شائع کی ہیں۔ کسی دوسری زبان کی کتابیں شائع/ فروخت کرتے ہیں۔ نصابی کتابیں شائع/ فروخت کرتے ہیں یا متفرق وغیرہ) اور دیگر تفصیلات زیر ترتیب ڈائرکیٹری کے لئے ذیل کے پتہ پر جلد از جلد ارسال فرمائیں۔

اردو ڈائرکیٹری
دلی اردو اکادمی۔ سن لائٹ بلڈنگ
آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون ۲۷۶۴۲۱

غلط قسم کے
لوگوں کے
ہاتھے نہ
چڑھئے...
ریل ٹکٹیں
دلالوں سے ہوشیار!
پبلک ریلیشنز
ناردرن ریلوے

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 Phone: 275602
Regd with the Registrar of Newspaper at R No 644/57
Regd No D- (DN) 353
JANVARY 1986

خرید کر پڑھئے :
مانگ کر پڑھئے
یا پھر
چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شاندار ادبی دستاویز ہے۔ اس میں شامل ہیں:

قیمت : پندرہ روپے

- ★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
- ★ نادر و نایاب تصویریں۔
- ★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
- ★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اٹھایا گیا ہے۔
- ★ ہندوستان، پاکستان، روس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اردو ڈائجسٹ آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شانِ ہند
نئی دہلی
ایڈیٹر
سرور تونسوی
Sa

رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۲۵۴

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریبان پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ
۲/۵۰ روپے
زرسالانہ :- ۲۴/- روپے

شمارہ ۲	فروری ۱۹۸۶ء	جلد ۲۷

ادارۂ شانِ ہند کی جانب سے
۱۹۸۶ء کی بہترین شعری پیشکش

اَفکارِ گریزاں

جناب ڈاکٹر حقیر آستانی کا مجموعۂ کلام جو اک مقصدی ادبی پیش بہا اور قابلِ قدر مجموعہ ہے جہاں کتابت کے لحاظ سے بے مثال، چھپائی دیدہ زیب اور کاغذ بائیڈ یا نگ نیز سرورق بھی ایسا کہ ذوقِ سلیم داد دئے بغیر نہ رہ سکے۔

ہر سخن شناس اور صاحبِ نظر افکارِ گریزاں کو پہلی نظر ہی میں اس سال کا بہترین شعری مجموعہ قرار دینے پر مجبور ہوگا۔ دنیا بھر میں اردو کی پہلی کتاب جس میں کتابت کی معمولی سی بھی غلطی ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکے گی۔ اگر آپ اپنی ذاتی لائبریری میں ایک ایسی کتاب کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں جو واقعی نعمتِ غیر مترقبہ کی حامل ہو تو آج ہی افکارِ گریزاں اپنے لئے اپنی فرمائش بھجوا لیجئے۔

ڈیمائی سائز کے ۲۱۶ صفحات۔ قیمت مجلد : چالیس روپے۔

دفتر ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ ۸ - انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر پبلشر سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے اور سرورق نئے صفحات زین ٹیلیاران دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۸ - انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

نئی نئی خوبصورت معیاری اور دیدہ زیب کتابیں

کتاب	موضوع	مصنف	قیمت
ہر بار کہا دل نے	افسانے	ڈاکٹر اُدے سرن ارمان	۵/-
اپنا دامن اپنی آگ	افسانے	ڈاکٹر کیول دھیر	۱۰/-
گہری پرچھائیاں	ناول	بی - ایس بادل	۶/-
دیوان	شاعری	ناصر کاظمی	/۵۰
جوگن	شاعری	کے کے سنگھ میئنگ	۱/-
سپنے	شاعری	چندن بھارتی	۱/-
ساحر لدھیانوی نمبر	خاص نمبر	فن و شخصیت بمبئی	۸۰/-
غالب	ناول	قاضی عبدالستار	۳۰/-
اردو ہندی ڈکشنری	ڈکشنری	انجمن ترقی اردو ہند	۵۰/-
اسٹینڈرڈ انگلش اردو	ڈکشنری	انجمن ترقی اردو ہند	۹۵/-
صد چاک	شاعری	ذواکر راہی	۴۰/-
کراچی کا تاریخی مقدمہ	رپورتاژ	مرزا عبدالقادر بیگ	۲۰/۵۰
آزادی کی نظمیں	نظمیں	مرتب سبط حسن	۱۰/-
متاع صبا	شاعری	صبا افغانی	۳۵/-
غذائی مسئلے کا حل	غذائی مسئلہ	اے جگت سنگھ	۱۸/-
اردو کلاسیکی ہندی اور انگریزی	ڈکشنری	جان ٹی پلیٹس	۷۲/-
راز و نیاز	شاعری	راز لائلپوری	۲۵/-
جاناں جاناں	شاعری	احمد فراز	۱۶/-
نصیب دشمناں	طنز و مزاح	وجاہت علی سندیلوی	۱۵/-
بیس نئی کہانیاں	افسانے	علی احمد فاطمی	۲۰/-
[illegible] بوڑھے پودے	افسانے	سہیل عظیم آبادی	۱۴/-
تنکے کا سہارا	افسانے	شکیلہ اختر	۱۶/-
مجبور	ناول	اظہار صہبائی	۲۰/-
[illegible]	افسانے	رام لعل	۱۰/-
زرد پتوں کی بہار	سفرنامہ پاکستان	رام لعل	۱۳/-
نیا ساز نیا انداز	شاعری	نازش پرتاپ گڈھی	۱۵/۳۵

اس کے علاوہ ہر موضوع پر اپنی پسندیدہ کسی بھی کتاب کے لئے ہمیں لکھئے۔ یاد رکھئے ہندوستان بھر میں چھپنے والی کسی بھی اردو کتاب کے لئے آپ کو کہیں بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہے ہماری خدمات آپ ہی کیلئے

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

مشاعرہ لال قلعہ زوال کی آخری حد پر

مشاعرۂ لال قلعہ جشن جمہوریت کی تقاریب کا ایک جزو ہے جس کے
ت کیلئے وزارت دفاع ہر سال اُردو، ہندی اور پنجابی زبان کے
ن کیلئے پینتیس پینتیس ہزار روپیہ دیتی ہے۔ پہلے یہ مشاعرے وزارت دفاع
ت ہوا کرتے تھے اور شاعروں اور گویوں کے انتخاب کیلئے
رت دفاع کے اعلیٰ افسران، دلی انتظامیہ کے
راہ اور عوامی نمائندوں کی ایک مشترکہ میٹنگ ہوتی
اور کو اس وقت بھی دو چار سفارشی شعرا کسی نہ کسی
مشاعرۂ لال قلعہ میں داخل در معقولات کرنے میں
ب ہو جاتے تھے اس کے بعد رفتہ رفتہ وزارت دفاع
ان مشاعروں کا انتظام دلی انتظامیہ کے ہاتھ میں
دیا اور دلی انتظامیہ اور ساتھ ہی پردیش کے افسران اور
نمائندوں کے صلاح و مشورہ سے شعراء کا انتخاب
نے لگا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سفارشی شعراء
لیف دہ شرکت کے باوجود یہ مشاعرے خاصے مقبول
رہے مگر جوں جوں وقت گذرتا رہا ہندی کے
لین کامیابی کی راہ پر گامزن رہے۔ پنجابی کوی
ایک مخصوص طبقہ کی زبان ہونے کے باعث
ہے اور اُردو مشاعروں میں انحطاط آتا گیا اور
ہو گئی کہ گذشتہ کچھ سالوں سے یہ مشاعرے
رف رسمی بنکر رہے ہیں۔ اور اب کے برس
اعرہ محض نام کا ہی مشاعرہ تھا ورنہ اسے
کا مشاعرہ کہتے ہوئے لال قلعہ اور اُن شاہانِ
دہیں سے جن کے عہد حکومت میں یہی لال قلعہ
اعری کی آماجگاہ تھا۔

جشنِ جمہوریت سارے ملک کا ایک ایسا قومی تہوار ہے
جس کی تقریبات میں اگر کوئی شخص رخنہ اندازی کرتا ہے
یا اسے ناکام کرنے کی در پردہ کوشش کرتا ہے تو یقیناً وہ
فرد یا افراد ملک کے تئیں صحت مندانہ رویہ نہیں اپناتے۔
حکومتِ ہند کی ہدایات ہیں کہ یہ مشاعرہ چونکہ قومی سطح پر
ہوتا ہے اس لئے اس میں ایسے شعراء کا انتخاب کیا جائے
جو قومی شہرت رکھتے ہوں یا شعری طور پر ان کا مقام ایسا
ہو جس پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے اور چونکہ یہ مشاعرہ
سارے ملک میں ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ سنوایا جاتا ہے
اس لئے بہتر ہے کہ ملک بھر کی ہر ریاست کے سرکردہ اور
مقبول شعراء کو مدعو کیا جائے۔

مگر اس مرتبہ مشاعرۂ لال قلعہ نے ناکامی اور غیر مقبولیت
کے گذشتہ ۳۵ پینتیس برسوں کے سارے ریکارڈ توڑ
دیئے ہیں۔ اور اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی تفصیل جو کچھ مشاعرہ
کمیٹی کے مختلف ممبران کی زبانی معلوم ہو سکی اس کی تفصیل
بیان کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ "نقل کفر کفر
نہ باشد" کے قول کے مطابق یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ
سب مشاعرہ کمیٹی کے مختلف ممبران کی زبان سے نکلے ہوئے
الفاظ ہیں۔ مدیر شانِ ہند تو محض ان الفاظ کو کاغذ
پر لکھنے کا گنہگار ہے۔ کیونکہ مشاعرہ کمیٹی کے اکثر و
بیشتر ممبران ہمارے کرم فرما ہیں اس لئے اُن سے پیشگی
معافی چاہتے ہوئے اس گستاخی کی جرأت کی جا رہی
ہے کیونکہ سچائی کا اظہار شانِ ہند کا روزِ اول سے
خاصہ رہا ہے۔

۱۔ چونکہ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ بارہا اعلان فرما چکے ہیں کہ جو شعرا لال قلعہ کے مشاعرہ جشنِ جمہوریت میں مدعو کیے جائیں گے انھیں مشاعرہ ۱۵ اگست میں مدعو نہیں کیا جائے گا۔ مگر وہ ہر مشاعرہ میں اپنے شاگرد مسٹر رعنا سحری کو مدعو کراتے ہیں۔ اس بار شاید اس کی مخالفت ہوتی لہٰذا جناب ڈاکٹر خلیق انجم نے کنور صاحب کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے رعنا سحری کا نام پیش کیا جسے کنور صاحب کی غزل [illegible] خاطر سے یا لحاظ سے ہم مان تو گئے کے بقول رعنا سحری کا نام منظور کر لیا چونکہ خلیق انجم صاحب نے کنور صاحب پر اپنی عیارطبع سے غیر شعوری طور پر یہ احسان کر دیا تھا لہٰذا اب کنور صاحب خلیق انجم کے پیش کئے گئے دوسرے ناموں کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ خلیق انجم صاحب نے فہرست میں [illegible] کی اور اپنے [illegible] شعرائے کرام کے ناموں کا اندراج کرایا۔ جناب کامل قریشی نے خلیق انجم اور کنور صاحب کی خوشنودی کی خاطر ان کا ساتھ دیا اور [illegible] سمجھوتے کے ساتھ مخالفت میں آواز نہیں اٹھائی۔ [illegible] کل ڈھائی ممبران یعنی کنور صاحب اور خلیق انجم اور نصف ڈاکٹر کامل قریشی نے ساری فہرست مکمل کر دی۔

۲۔ عالیجناب گورنر صاحب کے [illegible] جناب [illegible] احمد صاحب نے کسی شاعر کا نام پیش کیا اور کنور صاحب نے نامنظور فرمایا جس پر [illegible] احمد صاحب میٹنگ سے اٹھ کر چلے گئے۔

۳۔ مشیر اکادمی جناب [illegible] تقوی صاحب نے ان شعرائے کرام کے نام [illegible] کرنے کی بارہا کوشش کی جن کے بارے میں ان کے پاس مختلف ذرائع سے نام آئے ہوئے تھے۔ مثلاً کسی [illegible] نے کسی شاعر کی سفارش کی تھی اور کسی دوسری سرکردہ شخصیت نے کسی دوسرے مشہور شاعر کا نام بھجوایا تھا۔ مشیر اکادمی نے یہ نام پیش کئے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی غوغا آرائی، کنور صاحب کی خفگی اور کچھ ممبران کی جی حضوری نے تقوی صاحب کی تجاویز پر غور کرنے کا موقع ہی نہ آیا۔ اور کنور صاحب نے اعلان فرما دیا کہ یہ فہرست رکھی ہے جس کا جی چاہے اس فہرست میں سے نام چاہے کاٹ دے اور جس کا نام درج کرنا ہو کر دے۔

۴۔ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب نے کا [illegible] وزن [illegible] اعتراض کئے تو کنور صاحب نے فہرست ان کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا کہ آپ نے جو کچھ رد و بدل کرنا ہو کر دیجئے۔ اس پر ڈاکٹر صلاح الدین نے فرمایا کہ میں رد و بدل تو نہیں کر سکتا۔ ہاں آپ لوگوں کے مجوزہ شاعروں کی زمرہ بندی کر دیتا ہوں کہ ان میں درجہ اول کے کون شاعر ہیں اور درجہ دوم، سوم اور چہارم کے شاعر کون سے ہیں۔ اور انھوں نے ایسی حد بندی کر بھی دی۔ مگر ہوا وہی جو ڈھائی ممبران فیصلہ کر چکے تھے۔

۵۔ کنور صاحب نے گلزار [illegible] بھارتی صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اب یہ فہرست آپ کے ہاتھ میں ہے آپ جس شاعر کو چاہیں رکھیں اور جس کو چاہیں فہرست سے کاٹ کر اس کی جگہ اپنی مرضی سے کسی دوسرے شاعر کا نام لکھ دیں۔ اس پر بھارتی جی نے فرمایا کہ میں ہندی کا آدمی ہوں مجھے اردو کے شاعروں کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے لہٰذا میں یہ ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا آپ لوگ جو فہرست بنا کر دے جائیں گے میں اس پر دستخط کر دوں گا۔

مندرجہ بالا پانچ جھلکیاں مشاعرہ کمیٹی کی میٹنگ کی دیکھنے کے بعد اب ذرا ان معروضات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

۱۔ مدیر شانِ ہند نے یہ احتجاج کیا تھا کہ جب سے لال قلعہ کا مشاعرہ (۱۹۵۰ء سے) جاری ہوا ہے یا پچھلے دو برسوں سے ۱۵ اگست کا مشاعرہ شروع ہوا ہے۔ اب تک گذشتہ [illegible] سالوں میں ملک بھر کے کسی عیسائی شاعر کو مدعو نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں دلی کے ایک اچھے اور بہترین گلوکار عیسائی شاعر جناب نحیف دہلوی نے اخبارات میں دلی اردو اکادمی دوردرشن اور آکاش وانی کو مخاطب کر کے اخبارات میں احتجاج کیا تھا کہ اسے اپنے کلام کے سنانے کا موقع کیوں نہیں دیا جاتا جب کہ اردو اکادمی کے مشاعروں اور دوردرشن نیز آکاش وانی پر ایسے شعرا کو پیش کیا جاتا ہے جو محض نام کے ہی شاعر ہیں اور مسٹر جولیس نحیف نے یہ اعتراض کیا تھا کہ جو اردو اکادمی اس کے مجموعہ کلام پر ایوارڈ دے سکتی ہے۔ اس اکادمی کے مشاعروں میں اسے مدعو نہیں کیا جاتا۔ کے علاوہ جولیس نحیف صاحب نے کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

مطالبہ کرتے ہوئے اپنے احتجاجی اخباری بیانات میں یہ گزارش کی
تھی کہ وہ عیسائی قوم سے انصاف کرتے ہوئے لال قلعہ کے مشاعرہ
اور ۱۵ راگست کے سرکاری مشاعرے میں عیسائی شاعروں کو بھی موقع
دیں ۔ چنانچہ مشیر اردو اکاڈمی نے مدیر زبان ہند سے عیسائی شعرا
کے نام اور پتے دریافت کئے اور مسٹر جولیس نحیف نے مدیر
زبان ہند کی موجودگی میں مشیر اردو اکاڈمی سے ملاقات کی ۔
انھیں اپنا کلام سنایا جو اُن کئی شاعروں سے کہیں بہتر کلام تھا
جن کو لال قلعہ اور ۱۵ راگست کے مشاعروں میں پیش کیا جاتا ہے۔
اور [illegible] تو واقعی اتنا اچھا تھا کہ نقوی صاحب نے بھی تعریف کی۔
اور نقوی صاحب نے فرمایا کہ نحیف صاحب آپ کا نام اور پتہ ہمارے
یہاں درج ہے آپ کو لال قلعہ کے مشاعرہ میں ضرور مدعو کیا جائے گا
اور اردو اکاڈمی ایک اور طرحی مشاعرہ بھی کرا رہی ہے جس میں
آپ کو بلایا جائے گا ۔ مگر جب مشیر اکاڈمی نے نحیف صاحب کا نام
پیش کیا تو ان اڑھائی [illegible] ان کمیٹی نے اس کا بھی کوئی خیال نہ کیا کہ
اردو سب کی زبان کا ہم دعوے کرتے ہیں تو پینتیس سال میں ایک
عیسائی شاعر کو مشاعرہ میں مدعو کر کے اس کا عملی ثبوت دیں کہ اردو
سب کی زبان ہے ۔

۲ ۔ رعنا جگی ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام کو کسی بھی ہندوستانی
[illegible] شاعر کے کلام کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا
ہے ۔ جناب [illegible] چکوالی اور جناب ضیا فتح آبادی
استاد کا درجہ رکھتے ہیں ۔ مگر ہماری مشاعرہ کمیٹی کو بھی
یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی کہ ان شاعروں کو کبھی تو لال
قلعہ یا ۱۵ راگست کے مشاعرہ میں مدعو کریں ۔ کیونکہ نہ تو
ان تینوں حضرات کو عالی جاہ کے حضور حاضری دینے
کا موقع ملتا ہے اور نہ ہی یہ کسی سے سفارش کرا سکتے ہیں
اس لئے ان تینوں قابل تعظیم شعرائے کرام کو ہماری مشاعرہ
کمیٹی اس قابل ہی نہیں سمجھتی کہ انھیں بھی کبھی مدعو کیا جائے۔

ایک صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جناب کنور رضا صاحب نے
یہ تجویز رکھی کہ لال قلعہ کے مشاعرہ میں کسی مقامی شاعر کو مدعو
نہ کیا جائے اس پر جناب الکور دہلوی نے فرمایا کہ دلی کی
نمائندگی ضرور ان مشاعروں میں ہونی چاہئے لیکن ایسا ہرگز
نہ ہونا چاہئے کہ ملک بھر سے کم شاعر بلائے جائیں اور مقامی
شعرا کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی دی جائے اور وہ بھی
ایسے شعرا جن کو آج تک مشاعرہ کمیٹی کے کسی ممبر نے بھی کسی معمولی
سے معمولی مشاعرہ میں کلام سناتے نہیں دیکھا ۔ اس
پر کنور رضا صاحب [illegible] ناراض ہو گئے کہ میں کمیٹی سے مستعفی ہوتا
ہوں جس پر سب [illegible] خاموش رہے ۔

جشن جمہوریت کی تقاریب کے ایک خوشگوار پروگرام کو
مشاعرہ کمیٹی کے اڑھائی [illegible] نے قطعاً ناکام بنانے میں
[illegible] ۔ احباب پرستی اور چند عجیب غریب شعرائے
کرام کو [illegible] مدعو [illegible] فرائض منصبی سے روگردانی کی ہے
وہ یقیناً افسوسناک ہے [illegible] کی یہ حرکت تو یقیناً
[illegible] مشاعرے کو اپنی اردو
[illegible] مطابق [illegible] اور بھی [illegible] قطعاً ناکام
اور بیہودہ مشاعرہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ۔ دوردرشن
پر اس مشاعرہ کی جو کارروائی دکھائی گئی [illegible] اس سے کسی ایسے اردو دشمن
نے [illegible] کیا کہ جیسے [illegible] اردو دشمنی کا [illegible] ثبوت دینے کی
ضرورت تھی [illegible] بریلوی وغیرہ بارہ شعرائے
کرام کو [illegible] نظر انداز کیا اور پیش بھی کیا تو ایسے شعرائے کرام کو
جن کو [illegible] ہندوستان تو کیا دلی کے عوام اور خواص نے
پہلی بار دیکھا اور ان شعرا [illegible] ۔ انتہائی معمولی اور
فن کے لحاظ سے غلط کلام [illegible] عوام میں لال قلعہ کے اردو
مشاعرے سے نفرت ہوئی ۔ دوردرشن کو داد دینی چاہئے کہ
[illegible] ایسے شاعر کو خصوصی طور پر کافی وقت تک سکرین پر
رکھا کیونکہ ان کا کلام انتہائی غلط، مبہم اور مشاعرے میں ہوٹنگ
کو [illegible] دینے والا تھا ۔ ہم چاہتے ہیں کہ مشیر اردو اکاڈمی دلی
اس سلسلے میں دوردرشن کے ڈائریکٹر جنرل اور متعلقہ وزیر
کو دوردرشن کی اس اردو دشمنی کے بارے میں احتجاجی خطوط
لکھیں ۔ اور وزارت دفاع کو بھی لکھیں کہ جشن جمہوریت کی
تقاریب کے سلسلے میں لال قلعہ کے مشاعرہ کو دوردرشن نے
غلط انداز سے پیش کر کے ملک کی ایک مسلمہ زبان کی مقبولیت
کو کم کرنے کی ناپاک کوشش کی جو کہ ملکی مفاد کے خلاف ہے ۔

مسٹر کلدیپ شرما اور سا آر ٹیشا اوری کا لال قلعہ کے مشاعرہ میں بطور شاعر ورود مسعود جس بوقس ڈرباطریق سے ہُوا۔ اس کی داستان اس قدر پُر لطف اور افسوسناک ہے کہ مدیر شان ہند شائع کرتے ہوئے بھی ندامت محسوس کرتا ہے۔ ہاں اس کی وضاحت انتہائی ضروری ہے کہ ان دونوں حضرات کے اسمائے گرامی نہ تو مشاعرہ کمیٹی میں پیش ہوئے اور نہ ہی منظور ہوئے اور نہ ہی محترمہ اُردو اکاڈمی نے ان ناموں کی سفارش کی۔

مشاعرہ کمیٹی کے اکثر و بیشتر ممبران ہمارے کرمفرما ہیں لہٰذا ہم ان کی خدمت میں بصد انکسار گزارش کریں گے کہ وہ اس خالص قومی مشاعرے کو ذاتی تقریب نہ سمجھیں اور ملک بھر سے ایسے شعرائے کرام کا انتخاب کیا کریں جو واقعی اس مشاعرے کے وقار کو قائم رکھنے والے ہوں۔ اور اس تعصب کو بھی خیرباد کہنا چاہئے کہ کسی عیسائی اُردو شاعر کو ۵۳ سال سے اس قابل ہی نہ سمجھا جائے کہ وہ اس مشاعرے میں شریک ہو سکے جب کہ ایسے ایسے شعرا کو اس مشاعرے میں پیش کیا گیا جن کے شاعر ہونے میں بھی شک ہے۔

اُمید ہے کہ اُردو اکاڈمی کے مشیر اکاڈمی کی بدنامی نہیں ہونے دیں گے اور آئندہ اگر اکاڈمی کا کوئی ممبر اکاڈمی اور اُردو کو بدنام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اُس کی ڈٹ کر مخالفت کریں۔

اُردو صحافت سیمنار

اُردو اکاڈمی دہلی نے جتنے بھی سیمنار مختلف موضوعات پر کرائے اُن میں قریب قریب سب سیمناروں کے ڈائریکٹرز نے احباب نوازی یا بھائی بھتیجہ واد کو مدنظر رکھا ہاں ڈاکٹر صلاح الدین نے دلی والے سیمنار میں کسی حد تک دوست نوازی کی وگرنہ اُن کا انتخاب کافی حد تک ایماندارانہ تھا۔ اس کی تعریف کی جانی چاہئے کہ جناب انور علی دہلوی ڈائریکٹر اُردو صحافت سیمنار نے سو فیصدی مقالہ نگاروں کا انتخاب ایسا کیا کہ جس پر کوئی انگلی نہیں اُٹھا سکتا اور تو اور آزاد صاحب نے زیادہ تر ایسے اصحاب کو مدعو کیا جو کسی نہ کسی وجہ سے ان کے مخالف تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ سیمنار اپنی نوعیت اور افادیت کے پیش نظر انتہائی طور پر کامیاب رہا اور مولانا امداد صابری، جناب دیوان بریندر ناتھ (ظفر پیامی صاحب) جناب گوربچن چندن، جناب راج نرائن راز، جناب اعجاز امام، جناب سید ضمیر حسن، جناب رشید حسن خان، جناب مہدی نظمی، جناب ظ۔ انصاری۔ بیگم ممتاز مرزا۔ جناب جمنا داس اختر، جناب جے۔ پی بھٹناگر، جناب رضوان احمد، جناب حیات اللہ انصاری۔ جناب مجتبیٰ حسین، جناب خواجہ حسن نظامی ثانی، جناب سلامت علی مہدی وغیرہم کے مقالات نے صحافیوں کو لمحۂ فکریہ کی ضرورت کا احساس دلایا۔ لہٰذا انور علی صاحب دہلوی مبارکباد کے قابل ہیں کہ اُنھوں نے مقالہ نگاروں کے انتخاب میں نہ تو دوست نوازی کی اور نہ ہی کسی طور ذاتی مفاد کا خیال رکھا اور سیمنار ہر انداز سے قابل تعریف رہا۔ سیمنار کے آخری اجلاس میں جناب گیڈ گل صاحب وزیر نشریات نے تشریف لاکر اُردو اخبارات کے بارے میں اعداد و شمار پیش کئے۔ پریس انفارمیشن بیورو نے صحافیوں کو رات کے کھانے پر ہوٹل سمراٹ میں مدعو کیا۔ اور جناب جگ پرویش چندر چیف میٹرو پالیٹن کونسل نے سیمنار کا افتتاح فرمایا۔ سیمنار کے پہلے دو دنوں میں بارش اور تیسرے روز دلی بند کے باوجود سیمنار قابل تعریف حد تک کامیاب رہا۔ جس پر اُردو اکاڈمی دلی بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ اس سیمنار کی کامیابی کا ایک مُنہ بولتا ثبوت یہ بھی ہے کہ روزنامہ قومی آواز نے اس سیمنار کی روداد کی رپورٹنگ میں انتہائی ایمانداری سے کام لیا۔

اس سلسلے میں اُردو اکاڈمی کے اکابرین سے یہ گزارش ہے کہ اگر وہ سیمناروں میں مقالہ نگاروں کو کم تعداد میں مدعو کریں تو ہر مقالے پر سامعین بہتر انداز میں بحث کر سکتے ہیں۔ مقالہ نگاروں کو پندرہ بیس منٹ میں مقالہ پڑھنے کے لئے وارننگ دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ آپ مقالے کا اختصار سنا دیجئے مکمل مقالہ کتابی شکل میں چھپ جائے گا۔ اگر معاملہ محض کتابی شکل میں مقالات کی اشاعت کا ہے تو پھر سیمنار کا بکھیڑا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بہتر سے بہتر لوگوں

لیے مقالے مناسب اُجرت پر لکھوا کر کتاب شائع کی جا سکتی
ہے اور اس طرح سے سیمینار پر ہونے والے زرِ کثیر کو بھی بچایا
جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد سیمینار میں جناب احمد سعید ایڈیٹر ہند
کلکتہ ایسے کچھ حضرات مقالے سُنا ہی نہیں سکے جب کہ ہر مدعو
مقالہ نگار کو چار صد روپیہ آنے جانے کا فرسٹ کلاس ریل کرایہ
اور ایک صد روپیہ سفر خرچ وغیرہ دیا جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ
آئندہ منعقد ہونے والے سیمینارز کے ڈائریکٹرز صاحبان اپنے
محدود احباب کو ہی نوازنے کی کوشش کریں گے اور ہر کہہ و مہہ
کو مدعو نہیں کریں گے۔

لال قلعہ کا کوی سمیلن

جشن جمہوریت کے تقاریب کے سلسلے میں ہر سال لال قلعہ
میں ہندی کا کوی سمیلن بھی منعقد ہوتا ہے۔ اور یہ کوی سمیلن عام
طور پر کامیاب رہتا ہے۔ کیونکہ ایک تو ہندی کویتا سننے والے
عوام ہوٹنگ کو غیر مہذب حرکت سمجھتے ہیں اور دوسرے ہندی کوی
عام طور پر اخلاقی قدروں کے مالک ہوتے ہیں اور کم از کم
کوی سمیلن میں شراب پی کر آنا گناہ سمجھتے ہیں اور ویسے بھی ہندی
کویوں کی اکثریت شراب کی رسیا نہیں ہوتی اور تیسرے یہ کہ
کویوں کا انتخاب بھی اچھا ہوتا ہے۔ اور پھر ایسے کوی بلائے
جاتے ہیں جن کا قومی طور پر بھی اچھا مقام ہوتا ہے۔
ایڈیٹر شان ہند لال قلعہ کے اُردو مشاعرے میں شرکت
کرے یا نہ مگر ہندی کوی سمیلن میں شریک ضرور ہوتا ہے کیونکہ
اردو شعرا سنہ ۱۹۸۶ء میں بھی وہ کلام سُنا رہے ہیں جو کہ سنہ ۱۹۵۰ء
میں سُنایا تھا اور ہندی کوی کم از کم لال قلعہ کے اس کوی
سمیلن میں لازمی طور پر نئی کویتا پیش کرتے ہیں۔
اور جب سے جشن جمہوریت کے کوی سمیلن کے انتظامات
میں ہندی اکاڈمی دلی شریک ہوئی ہے یہ کوی سمیلن اور
بھی بہتر انداز میں ہونے لگا ہے کیونکہ ہندی اکاڈمی دلی کے
سکریٹری جناب [illegible] لال صاحب خود ایک اعلیٰ پایہ کے
ادیب ہیں اور وہ ملک بھر کے ہندی کویوں اور لیکھکوں کو
ذاتی طور پر جانتے ہیں اس لئے ان کی نظرِ انتخاب محض اچھے
اور عوام پسند ہندی کویوں کے اسمائے گرامی تک ہی جاتی ہے
سفارشی یا بھائی بھتیجہ واد کا سہارا لینے والے کویوں کو وہ
اپنی شاعری کو اور بہتر بنانے کا مشورہ دیتے ہوئے کسی قسم
کی کوئی رعایت نہیں کرتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ لال قلعہ کا کوی
سمیلن ہر سال پچھلے سال سے بہتر انداز میں ہوتا ہے۔ کاش
کہ اُردو مشاعرہ والے اس سے سبق لے سکتے۔

ساحر ہوشیارپوری کے اشعار
صدر جمہوریۂ ہند کی زبان پر

ساحر ہوشیارپوری برصغیر ہند و پاک کے ایسے مقبول اور
ہر دل عزیز شاعر ہیں کہ جن کے سینکڑوں اشعار عوام کو زبانی
یاد ہیں اور اکثر مشاعروں میں سامعین کی خاصی تعداد ساحر
ہوشیارپوری سے اپنی [illegible] کی غزل سننے کی فرمائش کرتے ہوئے
اُس غزل کے اشعار سُنا کر یاد دلاتے ہیں کہ فلاں غزل
سُنائیے۔
پچھلے دنوں غالب ایوارڈز کی تقسیم کے وقت عالیجناب گیانی
ذیل سنگھ صاحب صدر جمہوریۂ ہند نے اپنی تقریر میں جناب ساحر
ہوشیارپوری کی ایک غزل کے متعدد اشعار سُنا کر ساحر صاحب
کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی پر مزید مُہرِ ثبت فرما دی کہ ساحر
صاحب کے کلام کی پسندیدگی محض عوام تک ہی محدود نہیں بلکہ
ایوان صدر تک بھی احاطہ کئے ہوئے ہے۔
کاش اُردو اکاڈمی دلی کے ارباب متعلقہ کے کانوں پر کوئی
جُوں رینگتے ہوئے انھیں یاد دلاتی کہ اصل حق داروں کو ایوارڈ
دیئے جاتے تو ساحر ہوشیارپوری کو اب تک یہ ایوارڈ مل چکا تھا۔

"اُردو اکاڈمی دلی"
باہوش ہونے کا ثبوت دے

گذشتہ پون صدی سے ماہنامہ "رہنمائے تعلیم" شائع ہو رہا
ہے اور آج تک اس کی اشاعت میں کبھی ناغہ نہیں ہوا
تعلیم کی اشاعت میں جس قدر بہترین خدمات رہنمائے تعلیم کے
ذریعہ اس کے بانی اور مدیر ماسٹر جگت سنگھ (مرحوم)

(جنھیں بابائے تعلیم کہا جاتا تھا) نے انجام دیں اگر کوئی
اُن سے واقف نہیں تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر چمگادڑ کو
روشنی میں نظر نہیں آتا تو اُس میں سورج کا کیا قصور ہے۔
ماسٹر جگت سنگھ صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے
فرزند ارجمند سردار ہربھجن سنگھ تھاپر گذشتہ کئی سالوں سے
اپنے والد بزرگوار کی روایات کو زندہ رکھتے ہوئے "رہنمائے
تعلیم" شائع کر رہے ہیں۔ کوئی وقت تھا کہ تعلیمی دُنیا میں
"رہنمائے تعلیم" ایک درخشندہ ستارے کی حیثیت رکھتا تھا
اور کوئی اسکول ایسا نہ ہوتا تھا جہاں یہ ماہنامہ نہ جاتا ہو۔
مگر اب ہمارے یہاں سکولوں سے چونکہ اُردو کو دیش نکالا
مل چکا ہے لہٰذا "رہنمائے تعلیم" کی حالت بھی غیر ہو رہی ہے
اور عین ممکن ہے کہ یہ ماہنامہ دو تین ماہ ہی میں دم توڑ
دے۔

"رہنمائے تعلیم" کے ایڈیٹر کی واقفیت نہ تو اُردو
اکاڈمی کے اُن حضرات کے ساتھ ہے جو اپنے ذاتی مفاد
کی خاطر کسی ماہنامہ کی مالی مدد کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔
اور نہ ہی سردار ہربھجن سنگھ تھاپر کے ایسے ذرائع ہیں کہ
وہ کسی سفارش کے ذریعہ ان ارباب متعلقہ کو مجبور کر سکتے ہیں
کہ اکاڈمی "رہنمائے تعلیم" کو مالی مدد دے۔ اور نہ ہی "رہنمائے
تعلیم" کی کسمپرسی کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ایسے
بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادیب اور تنقید نگار کو
کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس ہوگی کہ وہ اس ماہنامہ کے
ذریعہ اپنی شہرت میں اضافہ کر سکیں۔ لہٰذا اس غریب ماہنامے
کی واقعی تاریخ ساز تعلیمی خدمات کو دیکھنے والا کوئی نہیں
ہے۔ لہٰذا ہم جناب لیفٹننٹ گورنر دہلی سے مودبانہ
گذارش کرتے ہیں کہ وہ ذاتی طور پر دہلی اُردو اکاڈمی کو
فہمائش کریں کہ وہ فرض شناس ہونے کا ثبوت دے۔ اور جو
ماہنامہ گذشتہ تین چوتھائی صدی سے اُردو تعلیم کی اشاعت
میں اپنا سب کچھ نثار کرنے کے بعد اب ختم ہو رہا ہے اس
کی مالی مدد کرے۔ کیا المیہ ہے کہ ایسا ماہنامہ جو اُردو
تعلیم کے لئے تین چوتھائی صدی سے وقف ہے اُسے
اُردو اکاڈمی نظر انداز کر رہی ہے۔ اور ہم جناب نقوی
صاحب مُشیر اکاڈمی سے بھی یہ اُمید رکھتے ہیں کہ جس طرح
انھوں نے "سائنس کی دنیا" کی ہر اسکول کے لئے دو دو
کاپیاں ہر شمارہ کی خریدنے کا اعلان "اُردو صحافت سمینار"
میں فرمایا تھا "رہنمائے تعلیم" کی خریداری بھی ہر اسکول اور
لائبریری کے لئے کی جائے۔

لفٹننٹ گورنر دہلی کی خدمت میں التماس

دہلی اُردو اکاڈمی کے غیر سرکاری ممبران میں سے کچھ حضرات
"چلتے پرزے" ہونے کے باعث اپنی ممبرشپ کو "خدمتِ
اُردو" کی بجائے اپنی ذاتی خدمت کا ایک اچھا ذریعہ
سمجھنے لگے ہیں اور اُن کی مالی ہوس اس قدر بڑھ گئی ہے کہ
اگر ان کے بس میں ہو تو اکاڈمی کا سارا بجٹ آپس میں بانٹ
لیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اب کی مرتبہ آپ ممبران
کا انتخاب کرتے وقت سابقہ ممبران (غیر سرکاری) کا محاسبہ
ضرور کیجئے۔ اور مشیر اکاڈمی سے رپورٹ طلب فرمائیے کہ
کس ممبر نے اکاڈمی سے کس کس طور کس قدر روپیہ حاصل کیا ہے
اور کس کس ممبر نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو کسی
نہ کسی بہانے مالی فائدہ پہنچایا ہے تاکہ آپ آئندہ کے
لئے ایسے ممبران کو اکاڈمی کا ممبر منتخب کر سکیں جو اپنی ممبرشپ
کو محض خدمتِ اُردو کے لئے وقف کر سکیں نہ کہ اسے ذاتی مفاد
کا ذریعہ بنائیں۔

اُردو رائٹرس گلڈ کی مطبوعات کیلئے ضروری اطلاع!

اگر آپ کو "اُردو رائٹرس گلڈ" کی مطبوعات کی ضرورت ہو تو
درج ذیل پتہ سے خط و کتابت کریں۔ براہ راست گلڈ کو خط
نہ لکھیں

لائبریری بک سنٹر - ۱۲۶ چک شمبھو پرشاد لال روڈ - الہ آباد - ۳

یا

شب خون کتاب گھر - ۳۱۳ رانی منڈی - الہ آباد - ۳

(دستخط) سکریٹری: اُردو رائٹرس گلڈ - الہ آباد

کُل ہند مشاعرہ کامٹی

خلیل انجم کامٹی

کامٹی کے متعدد شعرائے کرام میں ایک نام منشی محمد ابوبکر "شہرت" کا بھی ہے۔ آپ مولانا ناطق گلاؤٹھوی کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ آپ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸ر مارچ ۱۹۷۷ء کو ۸۵ سال کی عمر پا کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کا ذریعۂ معاش پارچہ بافی تھا۔ بڑے نیک اور صالح انسان تھے۔ تصوف اور سلوک میں بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں سماجی اور قومی تحریکوں میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہے۔

آج مورخہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۸۵ء کامٹی کے تاریخی میدان محمد علی گنج میں حضرت منشی محمد ابوبکر "شہرت" کی یاد میں ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد انجمن عصری ادب کے زیر اہتمام عمل میں آ رہا ہے۔ "انجمن عصری ادب" کامٹی کے نوجوان فن کاروں کی ایک سرگرم ادبی تنظیم ہے جس کا قیام ۱۹ر نومبر ۱۹۷۹ء میں آیا ہے۔ اس انجمن کے قیام کا بنیادی مقصد علم و ادب کی اشاعت اور باذوق حضرات [illegible] کا سامان فراہم کرنا ہے۔ اس مختصر سے عرصہ میں انجمن ہٰذا نے جو کچھ بھی عملی طور پر کیا ہے وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ آج کا یادگاری مشاعرہ جو انجمن عصری ادب کا پانچواں کل ہند مشاعرہ ہے۔ اسٹیج کو خوب سجایا گیا ہے۔ انجمن کا بینر کے ایک طرف حضرت منشی محمد ابوبکر شہرت کی بڑی سی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اسٹیج پر بیرونی و مقامی شعرائے کرام کے علاوہ انجمن کے چند منتظمین بھی تشریف فرما ہیں۔ دائیں اور بائیں طرف خواتین کے لئے خصوصی انتظام ہے اور سامنے ایک بڑے اور خوبصورت پنڈال میں ہزاروں کی تعداد میں اہلِ ذوق حضرات جمع ہیں۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے ہیں اور مشاعرے کی کارروائی شروع ہو رہی ہے۔ مشاعرے کی صدارت ایڈوکیٹ قیام الدین فرما رہے ہیں اور پانچ مہمانانِ خصوصی ہیں جن میں "آئینہ غزل" کے شریکِ مرتب ڈاکٹر ونے وائیکر صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ انجمن کی جانب سے ایک مجلہ "انجمن" کے نام سے شائع کیا گیا ہے جس کا اجرا، صدرِ مشاعرہ کے مبارک ہاتھوں سے ہو رہا ہے اس کے بعد کامٹی کے نوجوان شاعر ڈاکٹر خلیق الزماں انصاری کے شعری مجموعہ "نئے مکان کا ببول" کا اجرا، ڈاکٹر ونے وائیکر کے دستِ مبارک سے کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے بعد مشاعرے کی باقاعدہ کارروائی شروع کی جاتی ہے۔ سہیل انجم سے درخواست کی جا رہی ہے کہ وہ حضرت منشی محمد ابوبکر "شہرت" کی کوئی غزل اپنی مترنم آواز میں نذرِ سامعین کریں۔ سہیل انجم مائک پر آ کر صدرِ محترم کی اجازت لے کر اپنی خوش لحن آواز میں حضرت "شہرت" کی ایک بہت مشہور و مرصع غزل سنا رہے ہیں اور سامعین سے داد وصول کر رہے ہیں۔ غزل کے یہ اشعار بہت پسند کئے گئے ؎

تباہ کرنے کو عہدِ شباب آئے گا
کہاں کہاں دلِ خانہ خراب آئے گا
میں ایک بار جو سویا تو عمر بھر رویا
تمہارے سر کی قسم اب نہ خواب آئے گا
پڑے گا عکس رخِ یار کا جو ساغر میں
نظر شراب میں اک آفتاب آئے گا
یہ وقت پھر بھی غنیمت سمجھ لے اے شہرت
زمانہ اس سے بھی آگے خراب آئے گا

اب مائک پر نقیبِ مشاعرہ حاجی منیر الذاری آ گئے ہیں۔ حاجی منیر نظامت کا فن خوب جانتے ہیں مگر مشہور ناولسٹ محترم ثقلین صدر صاحب کی طرح یہ بھی شاعر نہیں ہیں۔ حاجی منیر اپنی مختصر سی بات کے بعد مشاعرے کا آغاز کرنے کے لئے کامٹی کے

کھل کر اور جم کر پڑھ رہی ہیں ۔ مینا اپنی غزل ختم کر کے مائیک
سے لوٹیں تو پھر ایک بیرونی شاعر نعیم اختر برہان پوری کو
آواز دی گئی ہے ۔ نعیم اختر مائیک پر آ کر خوشگوار ترنم میں اپنی
غزل کا مطلع ارشاد کر رہے ہیں ؎

طلاق دے تو رہے ہو غرور و قہر کے ساتھ
مرا شباب بھی لوٹا دو میرے مہر کے ساتھ

شاہ بانو کیس کے فیصلے پر جو ہندوستان میں کھلبلی مچی ہے اس
اعتبار سے مطلع داد کا حق دار ہے۔

چلو کہ گاؤں میں چل کر سکون تلاش کریں
فساد ہو گئے وابستہ اب تو شہر کے ساتھ

نعیم اختر کامیاب ہیں ۔ سامعین انھیں داد دے رہے ہیں۔
غزل ختم کر کے نعیم اختر مائیک سے واپس ہوئے تو سامعین کا
مزاج بدلنے کے لئے طنز و مزاح کے شاعر دردؔ حسینی کو زحمت
دی جا رہی ہے ۔ دردؔ حسینی امراؤتی سے تشریف لائے ہیں ۔
اور سامعین کو ہنسانے میں کامیاب ہیں ۔ میں اس وقت
چائے کی چسکیاں لے رہا تھا اس لئے کچھ بھی نوٹ نہیں کر پایا
البتہ سامعین کا ساتھ ضرور دے رہا تھا ۔ دردؔ حسینی رخصت
ہوئے تو ناگپور کے نوجوان اور [illegible] شاعر ظہیر عالم کو آواز دی گئی
[illegible] کا یہ شعر اچھا لگا ؎

گھر سے نکلو تو پتہ جیب میں رکھ کر نکلو
حادثہ چہرے کی پہچان مٹا دیتا ہے

[illegible] بڑے اہتمام کے ساتھ حق کانپوری کو زحمت دی
[illegible] مشاعروں کی دنیا میں حق کانپوری تعارف کے
[illegible] سے کم مگر اپنی خوش الحانی کی وجہ سے
[illegible] بیشتر اشعار سطحی ہوتے ہیں ۔ مائیک پر
[illegible] میں کوئی ہلچل نہیں ہے ۔ اپنی
[illegible] کے نوجوان شاعر اور [illegible] حلقوں میں
[illegible] الاختر کو دعوتِ سخن دی گئی ہے ؎

[illegible] ہوس مجھے
[illegible] ہے بس مجھے

ہر چیز کس نے وقت کے ہاتھوں سے چھین لی
تیرے معاملے میں رہا پیش و پس مجھے

مدحت الاختر کے بعد ایک اور بیرونی شاعر عرفان پربھنی کو
آواز دی گئی ہے ۔ عرفان پربھنی مائیک پر آئے مگر کوئی خاص
رنگ نہیں جما سکے ۔ اب کامٹی کے مزاحیہ شاعر نصرت ولی کو
دعوت دی جا رہی ہے ۔ نصرت ولی صاحب اپنی صورت شکل
سے بھی ولی سے کم نظر نہیں آتے ۔ آج کل مشاعروں میں ان کی مانگ
بہت بڑھ رہی ہے ۔ مائیک پر آ کر اپنے مخصوص ترنم میں ایک غزل
سنا رہے ہیں اور پنڈال میں ہنگامہ مچا ہوا ہے ۔ نصرت ولی
کے یہ دو شعر بہت پسند کئے گئے ؎

کہا ڈاکٹر نے اجی تیل پہ کر دو اسٹاپ
جب چھوہارے کی طرح مجھ کو پچکتے دیکھا
دل میں تارے نظر آنے لگے اے مائی ڈیر
گھر جب اپنے تیرے ڈیڈی کو ٹپکتے دیکھا

نصرت ولی شاد و کامران مائیک سے کھسکے تو انجم رہبر کو
آواز دی گئی ۔ انجم رہبر اپنے ترنم اور حاضر جوابی کی بدولت سامعین
کو محظوظ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں ۔ مائیک پر آ کر غزل سنا رہی ہیں ؎

ملنا تھا اتفاق بچھڑنا نصیب تھا
وہ اتنی دور ہو گیا جتنا قریب تھا
میں اس کو دیکھنے کو ترستی ہی رہ گئی
جس شخص کی ہتھیلی میں میرا نصیب تھا

بیچ بیچ میں جب انجم رہبر سامعین سے الجھ گئیں تو مجھے یہ شعر
یاد آ جاتا ؎

اتنا غرور و ناز بھی فرمائیے نہیں
صورت خدا نے دی ہے تو اترائیے نہیں

بہرحال جب وہ اس شعر پر پہنچیں تو پنڈال میں ایک بھونچال
سا آ گیا ؎

بستی کے سارے لوگ ہی آتش پرست تھے
گھر جل رہا تھا اور سمندر قریب تھا

اور جب شور کم ہوا تو پھر ہنگامہ برپا کرنے چلی ہیں ؎

دفنا دیا گیا مجھے چاندی کی قبر میں
میں جس کو چاہتی تھی وہ لڑکا غریب تھا

انجم رہبر بہت کامیاب جا رہی ہیں۔ اِدھر ان کی غزل اختتام پذیر ہوئی اُدھر "ایک اور ایک اور" کا زوردار نعرہ بلند ہوا۔ کچھ من چلوں نے گیت کی بھی فرمائش کی ہے مگر فرمائش کو نظر انداز کر کے انجم رہبر ایک اور غزل سُنا کر سامعین کو محظوظ کر رہی ہیں۔ فرما رہی ہیں ؎

چہرے سے دل کی بات جھلکتی ضرور ہے
چاندی کا ہو چاہے برق چمکتی ضرور ہے

سامعین اتنے نا اہل تو نہیں ہیں جو انجم رہبر برق کے معنی بتا رہی ہیں۔ انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ شہر کامٹی میں اُردو جاننے والوں کی ایک کثیر تعداد ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں اُردو میڈیم کے تین اسکول ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن عصری ادب بذاتِ خود ایک ایسی تنظیم ہے جو اُردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں بے لوث خدمات انجام دے رہی ہے۔ بہرحال انجم رہبر نے مشاعرے میں جان ڈال دی ہے — سامعین سے ان کی نوک جھونک بھی جاری ہے۔ لیجئے وہ پھر محفل کو گرمانے چلی ہیں ؎

ہم جھک کے مل رہے ہیں تو کمزور مت سمجھ
پھل دار شاخ ہو تو لچکتی ضرور ہے
دل تو کوئی دلوں سے کہیں کھو گیا مگر
پہلو میں کوئی چیز دھڑکتی ضرور ہے

غزل ختم کر کے انجم رہبر اپنا مشہور گیت "بنجارہ" سنا رہی ہیں مگر انھیں کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔ انجم رہبر گیت ختم کر کے بہت کامیاب لوٹیں تو ایک اور بیرونی شاعر خلش آکولوی کو زحمت دی جا رہی ہے۔ خلش آکولوی سے کامٹی ہی میں انجمن غنچۂ اسلام کلب کے مشاعرے میں تقریباً پانچ سال پہلے ملاقات ہو چکی ہے۔ اس وقت انھیں مشاعرے میں کافی پسند کیا گیا تھا مگر آج وہ کچھ بجھے بجھے سے لگ رہے ہیں۔ نہ تو ان کے ترنم میں سوز ہے اور نہ ہی اشعار میں کوئی کیفیت ہے۔ بہرحال ان کے یہ دو شعر درج کر رہا ہوں۔ ممکن ہے آپ کو پسند آئیں ؎

لوگوں سے ملیں گے تو ہنس لیں گے ہنسا لیں گے
دنیا سے بہرصورت غم اپنا چھپا لیں گے

کل میرے پڑوسی سے بیوی نے کہا اس کی
بچوں سے بچے گا تو ہم لوگ بھی کھا لیں گے

* خلش آکولوی مائیک سے ہٹے تو کامٹی کے ممتاز و باکمال شاعر ڈاکٹر عبدالرب عرفان کو آواز دی گئی۔ ڈاکٹر عرفان میرے ہم جماعتوں میں سے ہیں۔ گیارہ سال تک ان کا میرا ساتھ رہا ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ اچھے شعر کہتے چلے آئے ہیں۔ تحت میں کلام سناتے ہیں اور چونکہ ان کے اشعار میں عصری آگہی کے نکات نمایاں طور پر ہوتے ہیں اس لئے سامعین سے داد و تحسین ضرور وصول کر لیتے ہیں۔ آج بھی مشاعرے میں بہت کامیاب ہیں بلکہ میں کہوں گا کہ مشاعرے میں شرکت فرما کر انھوں نے کامٹی کے شعری وقار کو برقرار رکھا ہے ورنہ کامٹی کے دیگر ممتاز شعرائے کرام آج شریکِ مشاعرہ نہ ہو سکے یا انھیں مدعو نہیں کیا گیا۔ عرفان صاحب کیا خوب کہتے ہیں ان کا یہ شعر آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے درج ہے ؎

بیساکھیاں ہٹا کے ذرا سامنے تو آ
سب کو دکھائی دے گا ترا قد گھٹا ہوا

ڈاکٹر عرفان مائیک سے کامیاب لوٹے تو مشاعرے کی آخری شاعرہ ترنم انور کانپوری صاحبہ کو زحمتِ سخن دی جا رہی ہے۔ ترنم کانپوری دبلی پتلی سی سانولے رنگ کی شاعرہ ہیں۔ آج پہلی بار کامٹی کے مشاعرے میں شرکت فرما رہی ہیں — مائیک پر آ کر بڑے اہتمام و ادب کے ساتھ اپنے مخصوص ترنم میں غزل چھیڑ رہی ہیں ؎

نہ کسی کی بے رخی کا نہ کسی کی برہمی کا
کوئی کیا کرے گا میرا مجھے ڈر نہیں کسی کا

شعلہ سا لپکتی آواز۔ شعر میں الفاظ کی نشست و برخاست پھر کیوں نہ اہلِ ذوق داد دیتے۔ ترنم صاحبہ بڑی سادگی سے اور معصومیت کے ساتھ غزل سرا ہیں۔ داد و تحسین کا شور خوشگوار کم ہوا تو محفل کو پھر یوں گرمانے چلی ہیں ؎

بھلا آپ کے سوا کیا کوئی آشیاں جلاتا
کہ میں خوب جانتی ہوں یہ کرم ہے آپ ہی کا
مرے خدا — ایک قطرہ تری ذات اک سمندر
یہ کہاں مجال میری کہ کروں دعویٰ ہمسری کا

تو جہانِ عارضی پر نہ غرور کر ترنم
کہ جہاں میں چند روزہ ہے قیام ہر کسی کا

ترنم صاحبہ بہت بہت کامیاب ہیں۔ جس خلوص اور سلیقے
ساتھ وہ پڑھتی ہیں وہ ان شاعرات کے لئے ایک عبرت ہے
مشاعروں میں پڑھنے کے ساتھ اپنی ناز و ادا کے جوہر بھی دکھاتی
ں۔ ملکہ نسیم اور کشمیری شاعرہ ماجدہ تبسم کی طرح ترنم کانپوری
محفل مشاعرہ کے ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنا
سناتی ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل سے مشاعرے کا ماحول
ور خوشگوار ہو گیا ہے جو کبھی مشاعرے کا ماحول ہوا
ا۔ ترنم کانپوری غزل ختم کرکے سامعین کے بے حد
ا ایک اور غزل سنا رہی ہیں۔ فضا میں پھر نغمگی بکھرنے
۔ آپ پھر اسی اہتمام و اعتماد کے ساتھ نذر کر رہی ہیں ؎

بولے گا کوئی جھوٹ تو سچا کہیں گے لوگ
یوں بھی حقیقتوں کا فسانہ کہیں گے لوگ
تائید کر رہے ہو ستم کے اصول کی
یہ بھی نہیں خیال تمہیں کیا کہیں گے لوگ
بڑھتی رہی جو تنگ نگاہی تو دیکھنا
شیشے کو سنگ سنگ کو شیشہ کہیں گے لوگ
تنقید کی کسی میں جسارت نہیں رہی
کوئی برا بھی ہوگا تو اچھا کہیں گے لوگ
سازِ غزل میں سوزِ ترنم بھی چاہئے
تب جا کے تیرے شعر کو اچھا کہیں گے لوگ

م کانپوری اپنی نغمگی کا جادو چلا کر نہایت کامیابی کے
ہی ہیں۔

اس وقت رات کے دو بج چکے ہیں۔ سامعین کے
کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ ایسا اتفاق مشاعروں میں بہت
ہے۔ مشاعرہ اپنی آخری منزل میں ہے اور شباب پر
مشاعرے کے آخری شاعر راحت اندوری کو زحمتِ سخن
رہی ہے۔ ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی میں شائع ہونے
یشتر مشاعروں کی تفصیلی رودادوں سے پتہ چلتا ہے کہ
اندوری مشاعروں کی دنیا میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں

گرچہ تحت میں پڑھتے ہیں مگر اپنے رواں دواں اشعار اور گرجتی
ہوئی آواز سے سامعین کو اپنے بس میں کر لیتے ہیں۔ کامٹی
میں پہلی بار تشریف لائے ہیں مگر ان کے بیشتر اشعار ان سے
پہلے یہاں پہونچ گئے ہیں۔ خاص طور سے ان کا یہ شعر بہت
مقبول ہے ؎

جن چراغوں سے تعصب کا دھواں اٹھتا ہے
ان چراغوں کو بجھا دو تو اجالے ہوں گے

راحت اندوری مائک پر آکر گرج رہے ہیں ؎

کبھی دماغ کبھی دل کبھی جگر میں رہو
یہ سب تمہارے ہی گھر ہیں کسی بھی گھر میں رہو

داد ہے کہ اس مطلع کا حق ہے۔ مطلع بار بار پڑھا جا رہا ہے۔
داد کا شور کم ہوا تو اسی گرج کے ساتھ ارشاد ہو رہا ہے ؎

ہے اب یہ حال کہ در در بھٹکتے پھرتے ہیں
غموں سے میں نے کہا تھا کہ میرے گھر میں رہو

داد و تحسین کے شور سے شاعرے کی چھت اڑی جا رہی
ہے مگر راحت صاحب اسی انداز سے فرما رہے ہیں ؎

ہمیں چراغ سمجھ کر بجھا نہ پاؤ گے
ہم اپنے گھر میں کئی آفتاب رکھتے ہیں
یہ میکدہ ہے وہ مسجد ہے اور وہ بتخانہ
کہیں بھی جاؤ فرشتے حساب رکھتے ہیں

داد عالم شباب پر ہے اور راحت صاحب سامعین سے
مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں "اب آپ میری مٹھی میں ہیں اس لئے
جی بھر کے سناؤں گا" واقعی راحت صاحب کے اشعار کا جادو
سامعین پر چل گیا ہے۔ فرما رہے ہیں ؎

ابھی تو صرف پرندے شمار کرنا ہے
پھر بتائیں گے کس کو شکار کرنا ہے
بہت غرور ہے تجھ کو اے سرپھرے طوفان
مجھے بھی ضد ہے کہ دریا کو پار کرنا ہے

راحت اندوری کو بھی اشعار سنانے میں بہت لطف آ رہا ہے
سامعین بھی بھرپور تعاون دے رہے ہیں ؎

میری خواہش ہے کہ آنگن میں نہ دیوار اٹھے
میرے بھائی مرے حصے کی زمیں تو رکھ لے

اور جب وہ اس شعر پر پہونچے ـــ

گاؤں کی بیٹی کی عزت تو بچا لوں لیکن
کہیں مکھیا نہ مجھے گاؤں کے باہر کر دے

تو آہ اور واہ . . کا شور اتنا بلند ہوا کہ داد کا سابقہ ریکارڈ بھی ٹوٹ گیا۔

اس طرح مشاعرے کا پہلا دور ختم ہوا۔ مشاعرے کا دوسرا دور بھی کامیاب رہا جس میں انجم رہبر۔ صنا تیموری۔ ترنم کانپوری اور راحت اندوری کو خوب سراہا گیا۔ اس طرح یہ مشاعرہ ساڑھے تین بجے اختتام کو پہونچا۔ چھ سال پہلے ۲۷ر جنوری ۸۰ء کی شب میں انجمن غنچۂ اسلام کلب کامٹی کی جانب سے ایک کل ہند مشاعرہ اسی محمد علی گنج میں منعقد ہوا تھا جس کا افتتاح مہاراشٹر کے وزیر اوقاف و مہاراشٹر اُردو اکیڈمی کے چیرمین ڈاکٹر اسحاق جم خانہ والا نے فرمایا تھا۔ یہ مشاعرہ فجر کی اذان کے ساتھ اختتام کو پہونچایا تھا ایسے کامیاب مشاعرے کامٹی کی ادبی تاریخ میں کچھ ہی بار ہوئے ہیں۔ انجمن عصری ادب کا یہ مشاعرہ بھی گرچہ کہیں کہیں نشیب و فراز سے گزرتا رہا مگر مجموعی طور پر بہت کامیاب رہا۔ ڈاکٹر عشرت جاوید انصاری، عبدالحفیظ وطیرہ، نصرت زماں۔ رفیق اے۔ ایس۔ نشاط اختر انصاری جابر ملیبی، عبدالغفار انصاری، ڈاکٹر شمیم انصاری، سہیل اختر ثانی، عبدالستار انصاری۔ نصرت کمال وغیرہ مبارکباد کے مستحق ہیں جن کی انتھک کوششوں اور مسلسل جدوجہد سے اہلِ کامٹی و ناگپور کو ایک خوشگوار ادبی محفل سے لطف اندوز ہونے کا سامان فراہم ہوا۔

بقیہ : درمال

میرے سر پر یہ سب باتیں اچانک برسنے والے ہتھوڑے کی طرح پڑ رہی تھیں۔ میری زبان گنگ تھی۔ عقل و سمجھ گم تھے اور میں بے حس و حرکت، ساکت و جامد بیٹھا تھا

چار روز تک شہر میں کرفیو نافذ رہا۔ اخباروں کے ذریعہ روز اطلاع ملتی رہی کہ اب حالات قابو میں ہیں۔ اب حالات درست ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مدد کے لئے فوج بھی بلائی گئی جب کرفیو اٹھا اور باہر خبریں آنے لگیں تب پتہ چلا کہ دیہاتوں پر منظم حملے گئے تھے اور شہر کے باہر گزرنے والی سڑکوں پر گاڑیوں کو روک کر اور چھین کر مسافروں کو قتل کیا گیا۔ سرکار نے مرنے والوں کی تعداد پچاس بتائی اور بس کے مالکان نے مرنے والوں کو دس دس ہزار روپئے دینے کا اعلان کیا۔ دکانوں اور مکانات کی مرمت کا وعدہ کیا گیا۔ غیر سرکاری حلقوں نے مرنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ بتائی۔ مالی نقصانات ان کے علاوہ ہیں۔ دوسرے شہر میں رہنے والے ایک شخص نے گھر سے ایک طالب علم لڑکے کی موت کا بڑا چرچا رہا جو دھوکے سے چلتی بس سے اتار کر قتل کر دیا گیا تھا۔

میں نے نواب صاحب کی کوٹھی پہنچ کر دربان سے کو پیغام بھجوایا کہ میں ان سے ملنے کا وعدہ پورا نہیں کر سکوں گا اس لئے کہ میں ان کے کوئی کام نہیں آسکتا۔ اب میں اسے آگرہ جا رہا ہوں کیونکہ مجھے تلاش ہے اور تنہا نہ پہنچا . . . . .

بُغدم چچا کی تہنیت

جوزف انور

قسط ۳

انسان کے اعضائے رئیسہ میں دل ہی ایک ایسی شے ہے جس کے آتے اور پھرتے دیر نہیں لگتیں۔ ہمارے ہوش تو اسی دن فاختہ ہوگئے تھے جب ایک دن بُغدم چچا منقبت کے اشعار لکھ کر لائے اور فرمانے لگے۔

بھائی انور تم تو جانتے ہی ہو کہ اُردو زبان میرے گھر کی لونڈی ہے۔ لغت کے ہزار ہا اوراق الفاظ میری نگاہِ عمیق کے زیرنگیں ہیں پھر بھی اقبال والی مجازی شاعری اب مجھ پر متروک ہو چکی ہے۔ میں اپنے لامحدود مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آج تک اُردو زبان کا تجزیہ محقق تو لدہی نہیں ہوا۔ اُردو زبان ابھی تک واقعی منت پذیر شانہ ہے۔ شاعروں کی افراط نے بھی اس میں کافی تعریط کی گنجائش پیدا کردی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ مجھے اس جانب اپنی توجہ مبذول فرمانی چاہیے۔

یہ کہہ کر بُغدم چچا چلے گئے۔ چھ ماہ دیدار کو ترس گئے۔ ہزاروں وسوسے پیدا ہوئے۔ اللہ جانے چپات ہیں کہ واصل جنت ہوگئے۔

ایک شام دروازے پر اچانک کسی نے دستک دی۔

دروازہ کھولا تو ہم ہکا بکا رہ گئے۔ باہر بُغدم چچا کھڑے تھے چہرے پر ریش دراز اور زلفیں شانوں تک جھول رہی تھیں۔

”اماں کہاں چلے گئے تھے“ ہم نے پوچھا۔

نہایت پُروقار لہجے میں بولے۔ عزیزم حج کو گیا تھا اپنی گنہگار زندگی سے ہجرت کرگیا ہوں تمہیں بھی اپنی گُمراہی زندگی سے مراجعت کی تاکید کرنے آیا ہوں۔ یہ کہہ کر بُغدم چچا ہمیں ششدر چھوڑ کر چلے گئے۔

قریبی احباب بُغدم چچا کی اس کایا کلپ پر حیران تھے۔ کل تک بُغدم چچا اپنے تمام دوستوں کو القاب و خطاب ہی سے یاد فرماتے تھے مگر اب جو ملتے تو اللہ اللہ کا ورد فرماتے۔ راہ چلتے راہ گیروں کو روک کر خیر و شر کے رموز سمجھا تے۔

بُغدم چچا اب حاجی ماموں رشید بن چکے تھے۔ محلے والوں نے بھی ایک میٹنگ بلائی اور طے پایا کہ بُغدم چچا کی اس ترقی پر اگلے جمعہ کو ان کے اعزاز میں ایک تقریب منائی جائے اور اس تقریب کا نام ”شام ماموں رشید“ رکھا جائے۔

چار دن باقی تھے مگر محلے کے نوجوانوں نے حاجی ماموں رشید کے پند و نصائح پر مشتمل پوسٹر چھپوا کر ہر ممنوع و غیر ممنوع دیواروں پر چسپاں کر دیے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا حاجی صاحب کے اعزاز میں بروز جمعہ بھری تلیاں کے مشہور عالم خواجہ امام بخش بلبلہ بطور خاص خصوصی مہمان شرکت فرمائیں گے۔

دوسرے دن رات کے نو بجے بُغدم چچا بڑی سراسیمگی کے عالم میں گھر تشریف لائے۔ کہنے لگے بھائی انور افتاد آپڑی ہے پرسوں میرے اعزاز میں شام حاجی ماموں رشید منائی جانے والی ہے محلے میاں کا ترنم اچھا ہے سوچا کہ اپنی تہنیت میں ایک غزل کہہ کر دے دوں تو سماں بندھ جائے مگر مصروفیت کے باعث ایک مصرع ہی کہہ پایا ہوں آپ غزل مکمل کر دیں تو عنایت ہوگی۔

اجی ابھی لو پانچ منٹ میں پچاس شعر کہے دیتا ہوں آپ مصرعہ تھمائیے گنگناتے ہوئے فرمایا۔

”آج ماموں رشید حاجی ہیں“

ہم جو مصرعے پر طبع آزمائی کرنے بیٹھے تو پندرہ منٹ میں پسینے چھوٹ گئے مگر گرہ ہی نہیں لگا سکے۔ مجبوراً عرض کیا حاجی جی غزل تو میں بقیہ ایک قافیہ بھی کہہ سکتا ہوں مگر بہتر ہوگا کہ اس مبارک موقع پر آپ کوئی بصیرت افروز تقریر فرمائیں۔

”مشکل تو یہ ہے کہ میری تقریر دل پذیر کی زبان عوام کے پلّے نہیں پڑے گی بہر حال...“

شام حاجی ماموں رشید کا منظر واقعی دیدنی تھا۔ شامیانہ میں ہزاروں کا اژدہام اور آتش پر چھوکوں سے لدے پھندے

خواجہ امام بخش، حاجی مامون رشید اور شہر کے کچھ رؤسا تشریف
رکھتے۔ ہم سامنے فرش پر گوش بر آواز کا مجسمہ بنے بیٹھے تھے۔
ابتدائی مبارک خراشی کے بعد جب حاجی مامون رشید اپنی تقریر دلپذیر
کرنے اُٹھے تو تالیوں کے شور سے شامیانہ اُڑتے اُڑتے بچا۔

بزرگانِ دین، مادرانِ و دخترانِ ملّت اور رفقائے حیات۔
مجھے خوشی ہے کہ آج کی شام آپ لوگوں نے میرے نام معنون کر کے
میرے عزائم جن میں پختگی تو پہلے ہی تھی اُسے سربلند کرنے کا موقع
فراہم کیا۔ آپ حضرات سے کیا ڈھکا چھپا میری زندگی ہمیشہ ایک
کھلی کتاب کی طرح رہی ہے (ہجوم نے تالیاں بجائیں) میری
ورق ورق زندگی کا وہ ورق جو یقیناً سنہرے حروف سے لکھا گیا
جب میرے سامنے آیا اور میں نے اس پر غور فرمایا تو یہ دنیا
مجھے ہیچ نظر آنے لگی۔ قلب کی طہارت کے لئے حج ضروری ہے
مگر حج کے لئے رقم اس سے بھی زیادہ ضروری ہے مگر اللہ بڑا کارساز
ہے۔ میری [illegible] سے بھی بڑا ہے لہٰذا اس نے ہماری بیگموں
کو ترغیبِ حسنہ سے مستفیض فرمایا اور انھوں نے اپنا اپنا ایک
ایک زمینی زیور گروی رکھ کر اللہ اور اس کے بندے کے سامنے
[illegible] کر شکوہ کا رہنے کا ثبوت دیا یعنی اس زمینی زیور کے
بدلے اس بہشتی زیور سے مکمل [illegible] ہیں جو کہ
جنت یا دنیا کے چوڑیاں والے محلے کے سوا کہیں دستیاب
نہیں (تالیاں) آج آپ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ آپ کے
محلے کا یہ خادم الخدام بھی حاجی لق لق اور حاجی مستان کی صف
میں آچکا ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ آج ہمارے درمیان مچھری
ملیاں کے مشہور و معروف فن کار جناب خواجہ امام بخش صاحب بھی اتنے
دور دراز مقام سے [illegible] آپ کے اس خادم حقیر کو تہنیت
پیش کرنے آئے۔ آپ کا نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں
آپ ملک کے [illegible] شارح دیوان الشعراء ہیں علاوہ
ازیں ریڈیو کے فرمائشی [illegible] کے وقت بھی آپ حضرات نے
[illegible] صورت کا اسم گرامی سنا ہوگا۔ (تالیاں)
آپ نے وعدہ فرمایا ہے کہ خاکسار کے دیوان پر بھی
[illegible] دیوان خانے سے نکال کر حق ترمیم و تنسیخ کی منزلیں
[illegible] ہے۔ دیوانِ غالب کے فکر کی شرح فرمائیں گے

آپ کی پُرجلال شخصیت پر غالباً ابتدا ہی یہ شعر یاد آ رہا ہو

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مگر یہ دنیا سرائے فانی ہے جو پیدا ہوتا ہے ناپید
بھی ہوگا مگر میں آپ حضرات کے سامنے خواجہ صاحب کو
یقین دلاتا ہوں کہ جس طرح آج وہ مچھری ملیاں نزول
فرمائے گا ساتھ ہی تالیوں کے بے ہنگم شور میں خواجہ
امام بخش کو کسی کلمے کا ورد کرتے ہوئے سنا گیا۔

ایک نامکمل غزل

غازی سیکروڈہ

حشر کا یوں بھی حشر ہو لیکن
حشر کے دن کی دھوم بہت ہے
میری غزل میں لفظ تو کم ہیں
ہاں لیکن مفہوم بہت ہے
دُور نہیں ہے منزلِ جاناں
راہ میں لیکن گھوم بہت ہے
آج کی ہنستی گاتی دُنیا
جانے کیوں مغموم بہت ہے
سب کی نظر نے دھوکا کھایا
ہے قاتل معصوم بہت ہے
دل کا بینک خوب ہے غازی
قسمت کا محروم بہت ہے

غزل

ایس۔ پی تفتہ۔ کورو کشیتر

خوشبو و رنگ و نور کا اک ماحصل ہیں آپ
میری نظر میں میرؔ کی رنگیں غزل ہیں آپ
قد میں ہیں سروِ حسن میں تازہ کنول ہیں آپ
نکہت میں اور ناز میں ضرب المثل ہیں آپ
شعر و سرود و کیف کا وہ ماحصل ہیں آپ
بے شک شرابِ ناب کا نعم البدل ہیں آپ
اخلاص کی ہیں شبیہ تو کیوپڈ کا روپ ہیں
سچ جانئے کہ پیکرِ حسنِ ازل ہیں آپ
ہر اک تازہ شعر ہے مطلع ہے چاند سا
کس شاعرِ عظیم کی رنگیں غزل ہیں آپ؟!
حسن و ادا میں روپ میں رامش میں رنگ میں
القصہ ہر لحاظ سے ضرب المثل ہیں آپ
دنیا اگر ہے شاعرِ مطلق کی اک غزل
شعر و سخن کی جان ہیں بیت الغزل ہیں آپ
جس سے مرے نصیب کو رخشندگی ملی
میری تمام زیست کا وہ ایک پل ہیں آپ
میری نظر میں آپ ہیں اک پیکرِ جمیل
میرے تصورات کا ردِ عمل ہیں آپ
نسبت ہے مجھ کو آپ سے میرے کہاں نصیب
پچھلے جنم کے خاص ہی کرموں کا پھل ہیں آپ
تفتہ ہے ذوقِ درس گل آپ کے طفیل
ارواحِ نیک بخت کا حسنِ عمل ہیں آپ
تفتہ کی زندگی ہے اگر خوشنما غزل
جانِ بہار! بالیقیں، جانِ غزل ہیں آپ

غزل

اختر شاہجہاں پوری

ہم جس کے غم میں کھیل گئے اپنی جان پر
حرفِ دعا بھی آیا نہ اُس کی زبان پر
اب کوئی بھی پرندہ نہیں آسمان پر
بیٹھے ہیں لوگ تیر چڑھائے کمان پر
مجھ کو اگر گمان ہے کہ میں تیرا دوست ہوں
لاکھوں یقین صدقے ترے اس گمان پر
دیوار و در کی قید سے باہر نہ جا سکا
وہ کیا کرے گا تبصرہ میری اُڑان پر
تا عمر تیز دھوپ میں جلنا پڑا اُسے
جس نے بھی اعتبار کیا سائبان پر
اخترؔ نہ جانے کتنے فسانوں میں منتظر
ہے عافیت اسی میں کہ رہئے مکان پر

غزل

ڈاکٹر کے۔ مدنا منظر بنگلور

میں تھا اک حسیں تصور، حدِ کن فکاں سے پہلے
ہوا خود ہی جلوہ گر تو، مرے ہر گماں سے پہلے
تو ہی بحرِ بے کراں تھا، میں تھا آبجو کا قطرہ
کبھی مجھ کو پوچھ لیتا، مرے امتحاں سے پہلے
نہ عیاں نہ میں نہاں تھا، نہ کہیں مرا نشاں تھا
کوئی وہم لامکاں تھا، مرے دو جہاں سے پہلے
ترے نقشِ پا کو جس نے کبھی جامِ جم بنایا
کوئی دوسرا نہیں تھا کسی کارواں سے پہلے
کہیں منظرِ حسیں تھا، کہیں عشق بھی نہاں تھا
کہیں موسمِ جنوں تھا، غمِ ناگہاں سے پہلے

غزل

ڈاکٹر کے۔ کے رشی کورو کشیتر

جی میں آتا ہے ہم اُن سے اک دن جاکر بات کریں
جب بھی ہم سے بات کریں کیوں آنکھ چرا کر بات کریں

اک ذرا سی رغبت تم سے۔ اور تو کوئی بات نہیں
وہ دِن کب آئے گا جب ہم پاس بٹھا کر بات کریں

لاکھ تصور میں تو اُن سے ہم نے کیں ہیں باتیں اکثر
وہ دن کب آئے گا جب ہم پاس بٹھا کر بات کریں

سب عُقدے حل ہو جاتے ہیں باہم کہنے سُننے سے
آپ ہی آکر بات کریں یا ہمیں بُلا کر بات کریں

چھُپ چھُپ کر جو دیکھ رہے ہیں ہم کو ترچھی نگاہوں سے
گھر کے دروازے تو کھولیں سامنے آکر بات کریں

دھرتے ہیں الزام جو ہم پر اُلفت کی پامالی کا
رکھ کر دِل پر ہاتھ وہ ہم سے آنکھ مِلا کر بات کریں

دشمن ہوں تو خوف نہیں ہے۔ سوچ مگر اس بات کی ہے
دوست ہمارے ہو کر بھی وہ آنکھ دِکھا کر بات کریں

جام ملیں کچھ لوگوں کو تو ہم کو رنج نہیں ہے ساقی
رنج مگر ہوتا ہے جب وہ ہمیں ستا کر بات کریں

سینے میں سو زخم لئے ہم بیٹھے ہیں خاموش رشی
کون یہاں ہمدرد ہے اپنا جسے دِکھا کر بات کریں

غزل

زیڈ۔ اے۔ بلال
ایڈووکیٹ ساود

سامنے اُن کے حدیثِ دل بیاں ہوتی نہیں
اب زبانِ عام کوئی داستاں ہوتی نہیں

اک بُتِ توبہ شکن کی بزم میں
دل پہ کیا گزری بیاں ہوتی نہیں

صرف اقرارِ وفا کے واسطے
حُسن کے مُنہ میں زباں ہوتی نہیں

اب سوائے آپ کی ہر اک ادا
دشمنِ ایمان و جاں ہوتی نہیں

جستجوئے راحتِ دل ہے فضول
زلفِ جاناں میں اماں ہوتی نہیں

آپ کی رسوائیوں کے خوف سے
کثرتِ غم میں فغاں ہوتی نہیں

چھیڑ مضرابِ نظر کی آج کل
حضرتِ دل پر گراں ہوتی نہیں

کیا کہیں گے اس نظر کو اے بلالؔ
مہرباں ہوتی نہیں نامہرباں ہوتی [?]

غزل

یوسف پالوی پالی مارواڑ

اپنے اخلاق کو تہذیب میں ڈھالا جائے
لاکھ دشمن بھی ہو کیچڑ نہ اچھالا جائے

غیر پہ انگلی اُٹھانا تو ہے آساں لیکن
پہلے خود اپنا گریباں ہی سنبھالا جائے

گرچہ پیتل ہے تو پیتل ہی رہے گا یارو
لاکھ پیتل کو کسوٹی پہ اچھالا جائے

جن کے الفاظ سے آئے نہ وفا کی خوشبو
ایسے کم ظرف کو محفل سے نکالا جائے

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی (بمبئی)

سکون دائمی کو ڈھونڈتے ہیں آپ
ے کدوں میں روشنی کو ڈھونڈتے ہیں آپ

یہ دورِ مہر و آشتی کا دور ہی نہیں
بے سود مہر و آشتی کو ڈھونڈتے ہیں آپ

تو رہی وہ آپ کی ہونے سے دیکھئے
ہاں ہے جس خوشی کو ڈھونڈتے ہیں آپ

یوں ہی برائے نام سہی عمر کے دیکھئے
شام و سحر جو زندگی کو ڈھونڈتے ہیں آپ

ں سے کوئی کیسے کہے کب سنیں گے وہ
ر گئی ہے جس پری کو ڈھونڈتے ہیں آپ

کب سے لہو لہان ہے یہ جسم آپ کا
حیرت ہے پھر بھی دوستی کو ڈھونڈتے ہیں آپ

چھوڑ کے سارے جہان کو
ں میں آدمی کو ڈھونڈتے ہیں آپ

غزل

ڈی۔ اے۔ ہیرلیسن قربان
سہارنپور

میری زبان پہ جب تیرا نام آیا ہے
تیری گلی میں سبھوں نے بہت ستایا ہے

میری حیات کا ہر نقش ہی پرایا ہے
میرا وجود بھی شاید کسی کا سایا ہے

زمانہ عشق کے سربستہ راز کیا سمجھے
کسی نے کس کے لئے کیوں لہو بہایا ہے

نہ ہوش باقی رہے اور نہ تاب نظارہ
یہ اچھا آپ نے جلوہ ہمیں دکھایا ہے

تمہاری یاد کے سایہ میں اک ذرا سو لوں
غموں کی دھوپ نے دل کو بہت جلایا ہے

تمام عمر کہیں پہ سکوں نہیں پایا
گلے لگا کے مجھے موت نے سلایا ہے

ہمارے دم سے چمن میں ہے روشنی قربان
بجھے چراغوں میں ہم نے لہو جلایا ہے

غزل

راجیش کمار اوج
(ڈی۔ آئی۔ جی پولیس شملہ)

طبیعت بے نیازِ لذتِ غم ہوتی جاتی ہے
کسی سے کیا مری دل بستگی کم ہوتی جاتی ہے

نظر تم نے چرالی ہم کسی صورت نہیں ملتے
ابھی سے ابتدائے دردِ پیہم ہوتی جاتی ہے

وہ شے جس کو ہر رنگ عشق میں تریاق سمجھا تھا
وہی شے آج میرے واسطے سم ہوتی جاتی ہے

یہ دل ٹوٹا ہے جب سے اشک آنکھوں میں نہیں تھمتے
مری ہستی غمِ الفت کی محرم ہوتی جاتی ہے

یہ دنیا عشق کی دنیا ہے یاں دل کی حکومت ہے
محبت یاں ہر اک شے پر مقدم ہوتی جاتی ہے

سمائے جا رہے ہیں تیرے جلوے میری آنکھوں میں
تری ہستی مری ہستی میں مدغم ہوتی جاتی ہے

وداعِ فصلِ گل نزدیک ہے اے اوج شاید
وگرنہ کیوں مری دیوانگی کم ہوتی جاتی

اور دھرتی کانپ اُٹھی

قسط ۱۱

احمد حسین شمس ایڈوکیٹ (کشن گنج)

سرلا نے دھیرے سے کہا: "اور منوہر نے کچھ کھا کے سو رہے تب؟"

"کیا کرتی ہے تو بھی" ماں نے ذرا کرخت لہجے میں کہا: "ایسی بری بات منہ سے نہیں نکالتے۔"

موہن نے کہا: "ماں بات تو واقعی یہاں تک پہونچ گئی ہے۔"

اتنے میں باہر کسی نے آواز دی موہن اٹھ کر باہر گیا سامنے کشور کھڑا تھا اسے دیکھ کر موہن کو بڑی خوشی ہوئی اس نے کہا: "بہت وقت آئے کشور ابھی دل ہی دل تمہیں یاد کر رہا تھا میں۔"

"جی ہاں یاد کیوں نہ کیجئے گا یہ کیوں نہ کہ بھابھی سے باتیں ہو رہی تھیں اور میں بے موقع آ پڑا کہو بھابھی خیریت سے ہیں نا۔"

"اب اندر چلو اپنی بھابھی ہی سے خیریت پوچھ لو ماں بھی یہاں بیٹھی ہیں۔"

دونوں آنگن میں آئے کشور کو دیکھ کر سرلا نے سر کا آنچل درست کر لیا اور اسے بیٹھنے کو کہا ماں نے پوچھا: "کشور بابو یہ رات گئے کیسے آ گئے تم"

"یوں ہی چلا آیا" کشور نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "منوہر زیادہ ہی بستر پر گئے ہیں اور میں ان دونوں کی نظریں بچا کر یہاں آ گیا ورنہ وہ دونوں میری جان ہی کھا جاتے اور دارو غہ صاحب تو چار بجے دن ہی سے بڑا ہلکان ہیں۔"

"اب کس کی شامت آئی ہے گاؤں میں۔"

"بھگوان جانے۔"

موہن نے سرلا سے کہا: "اے جی ذرا کشور کے لئے چائے تو بنا لو۔"

"موہن بھابھی کو تکلیف نہ دو ورنہ وہ مجھے رات بھر گالی دیتی رہیں گی۔"

"گالی تو یوں بھی دیتی رہیں گی" سرلا نے مسکرا کر کہا اور وہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

موہن نے کہا: "کشور ابھی ماں سے باتیں ہو رہی تھیں تم نے ایک روز جو مجھ سے منوہر کے بارے میں کہا تھا نا اس کی تصدیق تمہارے بھیا بھی کر رہے تھے۔"

ماں نے کشور سے پوچھا: "کشور اس نالائق نے کیا خود اپنی زبان سے تمہارے بھیا سے کہا تھا۔"

کاکی! اس میں ناراض ہونے کی کون سی بات ہے منوہر نے اگر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ تو اس میں خفا ہونے کا کیا کارن ہے میرا میری بہن ہے جس قدر وہ پتا جی کو عزیز ہے اس سے زیادہ مجھے پیاری ہے۔"

"مگر اس میں منوہر کو کیا پڑی تھی کہ ایسی بات وہ اپنے منہ بول آیا" ماں کہنے لگی: "اگر ایسی ہی اس کی خواہش تھی تو اپنی بھابی سے کہتا پھر ہم لوگ اس بات کو چھیڑتے بڑھ لکھ کر تو وہ بڑا نالائق بن گیا ہے۔"

موہن نے کہا: "تم تو سمجھتی نہیں ہے۔"

میں خوب سمجھتی ہوں تمہارے ہی دلار نے اسے چڑھا دیا ہے تمہارے پتا جی ہوتے تو اس کی کھال ادھیڑ لیتے ایسی بات نہ کبھی دیکھی نہ سنی ہائے رام۔"

"مگر مجھے تو بڑی خوشی ہوئی" کشور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سرلا نے دو پیالی چائے سامنے رکھ دی اور پان بنانے لگی۔

"مگر سوچو تو بابو ذرا" ماں نے کہنا شروع کیا: "اگر یہ بات لالہ یعنی تمہارے باپ کو معلوم ہو جائے تو پھر کون سی آفت آ جائے گی ہماری جھونپڑی پر اسے تو کبھی تم لوگوں نے سوچا ہی نہیں کتنا ایک ہی ضدی ہے جو بات ایک مرتبہ طے کر لیتا ہے اسے کر کے چھوڑتا ہے اگر تم چاہتے ہو تو ہم لوگوں کو کھڑے کھڑے اس گاؤں سے نکلوا دے منوہر ابھی ناداں ہے۔ بچہ ہے اس نے زمانہ

بچے نیچے کو دیکھا نہیں کشن لال کے غصے سے وہ واقف نہیں ہم
لال کو جانتے ہیں آج کل وہ ذرا اپنے کو دھرم اوتار ثابت کرتا
۔۔ وہ کون ہے جو اس کے ظلم سے کراہتا نہیں بیٹا کشور اگر ہم اس کے
ی داستان سنانے لگیں تو تم اگرچہ اس کے لڑکے ہو مگر تمہارا
دل نفرت سے بھر جائے گا اور اس پر تماشا یہ ہوا کہ اس کا ساتھی
بیٹھا حسین بخش ۔ بھگوان ان دونوں سے سمجھے اس دن سلیم کی
ی میرے یہاں آئی تھی اور آ کر دکھڑا رونے لگی کہ میرا دل پسیج گیا کشن
ہے یہ ظالم حسین بخش بھی مرے گا تو کیا بنے گا ۔ ان امی ۔ ہمارے
رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس بیوقوف منوہر کو تو دیکھو ایسی
یہ دلیری چلا ہے سیرا سے شادی کرنے۔"

"مگر یہ شادی ہو کر رہے گی کاکی"، کشور نے چائے کی آخری
ی لی اور زمین پر پیالی رکھ دی سرلا نے پان کی طشتری چارپائی پر
رکھ دی تھی کشور نے ایک گلوری منہ میں رکھ لی۔

موہن نے کہا "کشور تمہارے بھیا اگر راضی ہو جائیں تو۔۔۔"
خود بول اٹھا "میری بھابھی تو بالکل راضی ہیں بھیا کو راضی
میں کتنی دیر لگے گی۔ اعتراض انھیں صرف اتنا ہے کہ
ناستک ہو گیا ہے اور بس اگر منوہر کی طرف سے ہم لوگ صرف
ت کر دیں کہ اب وہ ناستک نہیں رہا تو شاید بھیا کو کوئی عذر
ا اور پھر ہم سب مل کر پتا جی کو مجبور کر ڈالیں گے۔"

"یہ ناستک کون سی بلا ہے" ماں نے پوچھا۔

"یعنی کہ وہ بھگوان کا قائل نہیں۔"

ہائے رام" موہن کی ماں نے کانوں میں انگلی ڈال لی
نے میرے بچے کو بالکل بگاڑ ڈالا۔ میں کہتی تھی۔ اسے
مت پڑھاؤ۔"

ن بول اٹھا "انگریزی تو میں نے بھی پڑھی ہے مگر میں
یں۔"

ب تمہیں سوچ، منوہر کو کون لڑکی دے گا یہ تو کرسٹان ہو گیا
ر ماں نے سر پیٹ لیا۔

نے پوچھا "فرض کرو ماں منوہر کی شادی سیرا سے

ب دیکھنے سے فائدہ۔"

کشور نے کہا "نہیں کاکی ہم لوگوں نے طے کر لیا ہے۔"

"اگر سیرا میرے گھر بہو بن کر آ جائے تو میں اپنے سہاگ کو
سراہوں گی وہ عورت نہیں دیوی ہے جس گھر میں جائے گی وہ روشن
ہو جائے گا مگر میرے سہاگ ایسے کہاں۔"

اسی کی تو کوشش کر رہا ہوں کاکی تم بھی تو ایک دفعہ پتا جی
سے بات کر دیکھو۔"

"نا بابا نا مجھے تو معذور ہی سمجھو میں ایسی ہمت نہیں کر سکتی ہاں اگر
کشن لال خود میرے یہاں آ کر بات چھیڑیں تو میں انکار بھی نہ کروں گی۔"

"تمہاری نیت کا پتہ چل گیا کاکی۔"

سرلا نے کہا "مگر تمہارے پتا جی میرے گھر آنے ہی کیوں
لگے۔"

"اسی کا انتظام تو میں کر دوں گا میں تو صرف یہ ملنے آیا ہوں
کہ کاکی کی مرضی کیا ہے۔ اسے تو میرے پتا جی سے چڑ ہے مگر بھگوان
کا شکر ہے کہ میری بہن کی طرف سے اس کا دل صاف ہے اب
صرف بھیا کو راضی کر لینا ہے آج تو اب موقع نہ ملے گا دروازے پر
داروغہ صاحب اور میاں حسین بخش موجود ہیں، اور بھیا ان لوگوں
کی خاطر مدارات میں لگے ہوئے ہیں۔"

سرلا نے پوچھا "داروغہ صاحب کیوں آئے ہیں۔"

"وہی آگ لگی مقدمے کی تفتیش کرنے۔"

"مگر واقعہ کو تو کافی دن ہو گئے" موہن کی ماں نے کہا۔

"ہاں دن تو کافی ہو گئے مگر پولیس والوں کی چال کون سمجھے۔"

"مگر کشور" موہن نے ذرا مسکراتے ہوئے کہا "اس مقدمے
کے باعث میاں حسین بخش مالا مال ہو گئے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

ماں نے کہا "دولت تو ان کے گھر کی داسی ہے بیٹا میاں
صاحب کے دادا کو ایک جن نے اشرفیوں سے بھری کئی گگریاں دی
تھیں اور پھر ان کے پاس ایک رومال ہے جو دولت میں کمی آنے
نہیں دیتا۔"

اس کی بات سن کر سرلا بھونچک رہ گئی اور یہ دونوں کھلکھلا کر
ہنس دیے۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" ماں نے پوچھا۔

"اس رومال کو میں نے دیکھا ہے ماں" موہن کشور کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"ہاں کاکی" کشور نے کہا "اس رومال کو جب وہ ہوا میں ہلاتے ہیں تو اس سے چھنا چھن روپے برسنے لگتے ہیں اور صرف روپے ہی نہیں اشرفیاں اور زیورات بھی"

"اور جانتی ہو ماں یہ سب چیزیں آتی ہیں کہاں سے؟" موہن نے کہا۔

"وہی جن بابا لاتے ہوں گے" ماں نے کہا

"لاتے تو بیشک وہ جن بابا ہی ہیں مگر جن بابا کے یہاں ٹکسال تو نہیں"

"ارے جن بابا چاہیں تو مٹی کو سونا بنا دیں"

"اور واقعی حسین بخش مٹی کو سونا بنا دیتے ہیں مگر جانتی ہو یہ سب ہوتا کیسے ہے یہی جن بابا علاقے کے تمام کسانوں کے گھر گھر گھس کر روپے اور زیورات اڑا لیتے ہیں اور لا کر دیتے ہیں حسین بخش کے قدموں پر اس آگ لگی کے مقدمے میں جن بابا ہی نے تو حسین بخش کو نہال کر دیا" موہن نے کہا۔

"کاکی وہ علاؤالدین کا چراغ تھا نا وہی جن آج کل حسین بخش کے یہاں ہے" کشور نے کہا۔

سرلا نے پوچھا "تم نے اس جن کو دیکھا ہے؟"

"کیوں نہیں اکثر وہ سانپ کی صورت میں آتا ہے اس کے کاٹے کا کوئی منتر ہے نہ اتارا جسے ڈس لیتا ہے وہ پانی تک نہیں پی سکتا اور جب وہ بچھو بن کر ڈنک مارتا ہے تو اس بدنصیب کی حالت نہ پوچھیے زمین پر وہ مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے اس کی چیخ پکار سے زمین آسمان کانپ اٹھتے ہیں اور جب وہ انسان کی شکل میں ہوتا ہے تو ہو بہو ....." اس نے سرلا سے ذرا ادھر سے کہا "تم نے دلاور خاں برق انداز کو دیکھا ہے؟"

سرلا سہم اٹھی اس نے کہا۔ "ہاں دیکھا تو ہے"

"تو بس ہو بہو اسی کی شکل بن جاتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ انسان ہے حالانکہ وہ جن بابا ہیں"

ہائے رام یہ دلاور خاں! ماں بھی چونک گئی۔

"راکشش بھوت وہ تو بھیس بدل کر آدمی بنا ہوا"

"چھوڑو ان باتوں کو خواہ مخواہ ڈر لگ رہا ہے" ماں

"تو کاکی" کشور نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا "رہی بات پکی"

سرلا بول اٹھی "سولہ آنے بات پکی"

ماں نے کہا "اب تم لوگ جو چاہو کرو مجھے تو بس سے ڈر ہے"

"گائڑی کا جاپ کرو کاکی"

"ہاں اب جا رہا ہوں رات زیادہ ہو گئی"

"اچھا جاؤ" اور موہن سے کہا بیٹا اسے گھر تک پہونچا دو

"میں اکیلے چلا جاؤں گا میاں صاحب کا جن میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا میرے پاس یہ طلسمی انگوٹھی جو ہے" اور اس نے اپنی انگوٹھی موہن کی ماں کو دکھلائی .... "اس انگوٹھی کو دیکھ کر بڑے بڑے بھوت چڑیل اور جن تھر تھر کانپتے ہیں"

موہن نے کہا "ماں کی بات بھی رہ جائے چلو میں تمہیں پہونچا آؤں۔"

دونوں نکلے اور خراماں خراماں ٹہلتے ہوئے کشن لال کی گلی کی طرف چل دیئے۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی چاند نے ساری دنیا کو دودھیا چادر سے لپیٹ لیا تھا قدرت کی اس فیاضی سے امیر غریب چھوٹے بڑے یکساں طور پر مستفید ہو رہے تھے اگر عالیشان محلوں سے چاندنی پھسل پڑتی تھی تو غریب کی جھونپڑیوں کے روزنوں سے جھانک جھانک کر ان کے بال بچوں کو خوشیاں اور مسرتیں بخشتی رام پور اگرچہ بہت بڑا گاؤں ہے مگر شام تو دس بجتے بجتے ساری بستی خواب کی آغوش میں کروٹیں لیتی سڑک بالکل سنسان البتہ کہیں کہیں کتے موقع بہ موقع بھونکتے کبھی کسی مکان سے بچے کے رونے کی آواز آتی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے فضا کو بہت خوشگوار بنا دیا تھی۔ دور سے خس حنا کی خوشبو آ رہی تھی اور یہ دونوں گپیاں کرتے ہوئے راستہ طے کر رہے تھے۔

(باقی آئندہ)

درماں

عبدالصمد

بس، کوئی رکی چوڑی چکنی سڑک پر آس پاس کے ترقی پذیر
[illegible]وں کو چھوڑتی ہوئی تیز رفتاری کے ساتھ چلی جا رہی تھی
[illegible] کنڈکٹر سے دریافت کرکے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ بس
[illegible] دو گھنٹے سے قبل منزل مقصود پر نہیں پہنچائے گی۔ وقت
[illegible]ی کے لیے میرے پاس کوئی کتاب یا رسالہ نہیں تھا۔
[illegible]ے ایک قومی آواز، کے جسے میں بہت مرتبہ پڑھ چکا
اور اب اشتہارات سمیت اس کی بیشتر خبریں مجھے
[illegible] گئیں تھیں [illegible] اسے چوتھی مرتبہ پڑھنے کی بجائے
[illegible]ناسب سمجھا کہ تصورات کی حسین وادیوں میں کھو جاؤں۔
[illegible] کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں جا پہنچی تھی۔

[illegible]ات کے کھانے کے بعد میں اپنے مہربان و معزز میزبان
[illegible] ساتھ دیر تک خوبصورت اور دلکش باتیں کرتا رہا۔ جب
[illegible]ت کافی ہو گئی تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کو شب بخیر کہا
[illegible] اپنے سونے کے کمرے میں چلے گئے۔ نیند میری آنکھوں
[illegible] دور تھی اور اپنے میزبان کی دلچسپ باتیں میری پلکوں میں
[illegible] کی طرح سمٹی ہوئی تھیں۔ جانے کون سی ساعت
[illegible]کے حسین جزیرے میں لے گئی [illegible] پتہ ہی نہیں [illegible] اسے
[illegible]تھا۔ کوئی بہت ہی بے چینی اور پاگل پن کے انداز
[illegible] ہا تھا اور ساری فضا تھرتھرا رہی تھی۔

[illegible]ارو ...... پکڑو .... ہائے مار ڈالا ..... ہائے
... ہائے ذبح کر ڈالا ..... ہائے آگ لگا دی
... بھاگو ..... نعرۂ تکبیر اللہ اکبر .....
.....

[illegible] آدمیوں کے دوڑنے کی آوازیں
[illegible]
[illegible]

پائیں باغ میں کوئی شخص مسلسل چیخ رہا تھا۔ اُچھل رہا تھا اور
بہت سے لوگ اسے تھامے ہوئے اوپر لا رہے تھے لیکن وہ
کسی سے سنبھل نہیں پا رہا تھا روشنی میں آنے پر میں نے اس کی
شکل دیکھی تو چونک پڑا۔ یہ تو میرے معزز میزبان کے وہی
صاحبزادے تھے جن کو میں نے سارے گھر میں خاموشی سے ٹہلتے
ہوئے دیکھا تھا بالکل چپ چاپ اور گم [illegible] ہے پاجامہ
اور کُرتا پہنے ہوئے چہرے پر بے ترتیب [illegible]
آنکھیں بڑی بڑی لیکن ان میں بے پناہ ویرانی اور وحشت
— سامنا ہونے پر جب میں نے سلام کیا تو اس کا بہت
سنجیدگی سے جواب ملا اور بس۔ ایسا لگتا تھا جیسے انھیں
کسی کا بے چینی سے انتظار ہے جس کے لیے وہ ٹہل ٹہل
کر بہت خاموشی کے ساتھ وقت کاٹ رہے تھے اور اب
اس وقت —

اتنے میں کسی نے دھیرے سے [illegible]
رکھا۔ میں چونک کر مڑا تو میرے میزبان نائٹ گاؤن پہنے
چپ چاپ کھڑے تھے۔ میرے منہ سے بہت چاہنے کے بعد
بھی کوئی آواز نہیں نکلی تو وہی بولے۔

"بس یہی حال ہے اس کا [illegible] دو بجے کا
بے چینی سے انتظار رہتا ہے اور جب دو کا گھنٹہ بجتا ہے تب [illegible]"

"میں سمجھا نہیں حضور!"

اتنے میں لوگ ان صاحبزادے کو پکڑ پکڑ کر ہم لوگوں کے
قریب لے آئے تھے۔ چیختے چیختے وہ بے ہوش ہو چکے تھے اور
لوگوں کے ہاتھوں میں جھول رہے تھے۔ منہ سے سفید سفید
جھاگ سا نکل کر کپڑوں پر گر رہا تھا۔ میرے میزبان کے
اشارے پر لوگ انھیں سامنے والے کمرے میں لے گئے
اور وہاں بچھی ہوئی مسہری پر لٹا دیا۔ پھر سب [illegible] کرے

"حضور۔ اس واقعہ کے بعد کیا آپ پھر انھیں اپنے گاؤں لے کر گئے تھے۔"

"گاؤں ـــ!" نواب صاحب بہت کرب سے مسکرائے "اب وہاں دھرا ہی کیا ہے۔ لوگ تھے سو نہیں رہے۔ زمینداری تھی سو ختم ہو گئی، زمینیں تھیں سو بٹ گئیں۔ ماضی تھا جو برباد ہو گیا، حال کا وجود تھا ہی نہیں، مستقبل وہاں ہے نہیں۔ صرف ایک ویران اور اداس مکان ہے، اس پر پہلے لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اب وہی لوگ رسمی اجازت لے کے ساتھ وہاں رہتے ہیں۔ اس کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے۔"

نواب صاحب چپ ہو گئے۔ میں نے بھی کوئی بات نہیں کی حالانکہ میرے ذہن میں بہت سی باتیں جاگ اٹھی تھیں۔ رات کا پہر باقی تھا اور اب کچھ سویا جا سکتا تھا۔ میں نے نواب صاحب سے درخواست کی کہ وہ جا کر آرام فرمائیں۔ نواب صاحب ایک سرد آہ بھر کر اٹھ گئے۔ میں کچھ سوتے، کچھ جاگنے کی کیفیت میں صبح تک کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح ناشتے پر میں نے اپنے میزبانوں کو اطلاع دی کہ میں ان کے گاؤں جانا چاہتا ہوں۔ نواب صاحب چونک پڑے۔

"آپ ـــ ڈاکٹر صاحب! آپ تو آگرہ جانے والے ہیں۔ تاج محل اور لال قلعے کے بارے میں......"

"وہ سب ٹھیک ہے حضور۔ لیکن میں زندہ یادگاروں کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ ان مردہ یادگاروں میں کیا رکھا ہے سوائے خوبصورتی کے۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب! اب اس گاؤں میں رکھا ہی کیا ہے کچھ بھی تو باقی نہیں ہے وہاں۔"

"میں ان ہواؤں میں سانس لینا چاہتا ہوں جن کے اس وقت کی مقدس امانت کے شعور کو سمو رکھی ہوئی ہیں۔ میں وہاں سے واپس آکر آپ سے ملوں گا اور آپ کو آپ کے صاحبزادے کی محبت دے جاؤں گا۔ ممکن ہے کہ آپ کو خوشیاں دیکھنا نصیب ہوں۔"

نواب صاحب مسکرائے۔ تشکر کے جذبات ان کے سرخ و سفید چہرے پر دیکھے جا رہے تھے۔

"اگر آپ جانا ہی چاہتے ہیں تو میں اس کا انتظام کرا دوں؟"

"اس تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں حضور۔ میں ایک انجان آدمی

"جیسی آپ کی مرضی۔ ویسے میں ابھی بھی یہی سمجھتا ہوں کہ آپ وقت ضائع کریں گے۔"

سچ پوچھیے تو حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس ان کی بات کا کوئی جواب بھی نہیں تھا۔

"لیکن میں آپ کا انتظار ضرور کروں گا۔"

نواب صاحب کے چھوٹے سے جملے میں امیدوں کی ایک ایسی دنیا آباد تھی جس میں، میں کھو کر رہ گیا۔

ایک عظیم قومی شاہراہ نواب صاحب کے گاؤں کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ کوئی باقاعدہ بس [illegible] لیکن ایک چھوٹا سا کچا پڑاؤ سڑک پر ہی ڈال کر بس پڑاؤ بنا دیا گیا تھا۔ جس پر چند منٹ کے لیے بسیں رک جاتی تھیں۔ اسی پڑاؤ پر بس نے مجھے اگل دیا اور نظر والوں سے اوجھل ہو گئی۔ میرے پاس صرف ایک بریف کیس تھا۔ سڑک کے کنارے ہی ایک چھوٹے سے چائے خانے میں، میں نے دو بسکٹ کے ساتھ ایک پیالی چائے پی اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں سے گاؤں کے بارے میں تفصیلات معلوم کیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ لوگ مجھے حیرت اور تجسس کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ شاید میری زبان سے ش اور ع کی ادائیگی سے ان لوگوں نے سمجھ لیا کہ میں مسلمان ہوں ورنہ میرے لباس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اُن سے اپنی آمد کا مقصد واضح نہیں کر سکا کیونکہ جس مقصد کو لیکر میں یہاں آیا تھا انھیں گویا اس کی بھنک بھی نہیں تھی۔ بہر کیف ایک نوجوان کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ میرے ساتھ گاؤں چلے اور میری رہنمائی کرے۔ وہ شاید مجھے کوئی سرکاری افسر سمجھ کر [illegible] وہ گاؤں کا ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا جو سائیکل پر تین میل کالج میں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ گاؤں کے باہر کوئی بارہ فٹ پر ایک مزار نظر آئی جو خوبصورت کپڑوں سے مزین تھا۔ لکڑی سے شامیانہ سا تنا ہوا تھا۔ آس پاس صفائی پاکیزگی کے آثار نمایاں تھے۔ میں ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر آگے بڑھنا چاہ رہا تھا کہ اس نوجوان نے ادب کے ساتھ ہاتھ رکھ کر گویا سلام کیا اور مجھ سے بولا۔

"صاحب! پیر صاحب کو سلام کر کے آگے بڑھیے۔ ان کو سلام کیے بغیر کوئی آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

[illegible]

"یہ پیر صاحب کون ہیں؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا صاحب، مگر یہاں [illegible] کل نہیں یک دم
[illegible] ہے بہت بڑے رشی مُنی ہیں۔ آس پاس کے گاؤں میں
[illegible] کا پانی گھس جاتا ہے اور ہر سال لاکھوں روپے کی بربادی
ہے لیکن ہمارے گاؤں میں کبھی پانی نہیں آتا۔"

"لیکن تمہارا گاؤں تو اونچائی پر ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے صاحب، گنگا کا پانی اونچان نیچان
[illegible] دیکھتا ہے وہ تو بس ان کا آشیرواد ہے کہ ہم لوگ
بچے ہیں۔"

"اس بستی میں مسلمان بھی ہیں کیا؟"

"کبھی تھے صاحب، اب تو نہیں ہیں۔ ہاں پاس کے
[illegible] میں کچھ مسلمان ہیں۔"

مجھے یاد آیا کہ یہاں آتے وقت ایک گاؤں کے پاس
ڈرائیور نے گاڑی کو آہستہ کیا تھا اور ڈرائیور سمیت بہت
مسافروں نے چادر سے ڈھکی ایک بڑی مزار پر بہت سے
[illegible] پھینک دیئے تھے۔ ایک باریش بوڑھا آدمی آکر بول
[illegible] تھا جب بس چلی تو میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔
[illegible] ادھر ادھر بکھرے ہوئے سکوں کو سمیٹ رہا تھا۔

"پھر اس مزار کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟"

"ہم لوگ کرتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ کرتے ہیں۔ ہم لوگ
پیسے نہیں مانگتے صاحب، بلکہ ہر آدمی اپنی خوشی سے جو کچھ
[illegible] ہے۔ دے دیتا ہے۔"

"تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس سلسلے میں آپ لوگوں کے
بیچ بھید بھاؤ والی کوئی بات نہیں۔"

"بات یہ ہے صاحب کہ یہ رشی منی صرف مسلمانوں کے تھوڑے
[illegible] ہندوؤں کے بھی ہیں! سب کے ہیں اور
[illegible] کہ ہمارے گاؤں میں جب بھی کسی کے یہاں شادی
[illegible] ہوتا ہے یا بچہ پیدا ہوتا ہے تو [illegible]
[illegible] ان کے یہاں آنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بعد
[illegible] جاتے ہیں۔"

[illegible] گاؤں کی مذہبی رواداری سے بہت متاثر ہوا [illegible]
[illegible] بار اپنے ذہن میں ۱۹۴۶ء کو تازہ کرنے کی
ناکام کوشش کر رہا تھا۔

گاؤں میں خوشحالی اپنی زبان سے بول رہی تھی۔ کھپریل
کے مکانات تھے لیکن سلیقے کے، کہیں کہیں پختہ دو منزلہ،
سہ منزلہ مکانات بھی تھے۔ کھیتوں میں ٹیوب ویل کا ایک
جال سا بچھا ہوا تھا۔ ہل بیل کے ساتھ جگہ جگہ پر ٹریکٹر بھی
نظر آرہے تھے۔ ہر مکان کے باہر دودھ دینے والا کوئی نہ
کوئی جانور بندھا ہوا تھا۔ گاؤں کے لوگ مجھے حیرت اور
تجسس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شاید میرے راہبر
نے اشاروں میں انھیں سمجھا دیا تھا کہ میں کون ہوں۔ میں ان کی
نظروں میں اپنے لئے احترام پا رہا تھا۔ [illegible] صاحب کا
قلعہ نما مکان گاؤں میں سب سے ممتاز تھا۔ اس کی چھت
پر سفید اور سرخ کپڑے [illegible] ہوئے کئی جھنڈے سے لہرا رہے
تھے مکان کا رنگ روغن اڑا ہوا تھا۔ مکان کے ٹھیک
سامنے لیکن [illegible] وہ ہٹ کر ایک کالی سی لمبی دیوار کھڑی
تھی جس پر [illegible] سے تھے اور آس پاس کھیتوں میں
فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ قریب جا کر دیوار پر ابھرے اکھڑے
نقوش سے میں نے جانا کہ یہ عیدگاہ کی دیوار ہے میں نے
اپنی جانکاری کو محفوظ کر لیا۔ گاؤں کے چند اور افراد میرے
ساتھ ہو لیے تھے اور میں ان سے گاؤں میں تعلیم، صحت صفائی
اور آبپاشی کے موضوعات پر گفتگو کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے
بہت ہی مہذب انداز میں باتیں کر رہے تھے۔

گاؤں میں اندر جا کر ایک چوراہے پر ایک بڑی مسجد تھی جو
اب بارش اور زمانے کی ہوا کھاتے کھاتے بوسیدہ اور بوسیدہ
ہو چکی تھی اوپر سے نیچے تک کائی میں لت پت وہ سیاہ
مسجد تنہائی اور اداسی کا ایک عبرت ناک نمونہ تھی جب میں
مسجد میں جانے لگا تو ایک شخص نے مجھے ٹوک دیا۔

"آج نہ جائیے صاحب! آج جمعرات ہے اور جمعرات کو
اس میں نہیں جایا کرتے۔"

"کیوں؟"

"بات یہ ہے صاحب کہ جمعرات کی رات میں اس مسجد سے
رونے کی آوازیں آیا کرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس میں بہت
سے لوگ بکھرے ہوئے ہیں اور [illegible] بھی دکھائی پڑتی ہے

...ار کرائے اور آونے پونے بیچ ڈالا دیں، مسجد کی
...باڑہ اور عید گاہ کو بیچ ڈالا۔ اب ان جگہوں پر
...ہے۔ لینے والا خوب جان رہا تھا کہ کا جذبات نفسی
...وہ ان کی اتنی کم قیمت دے رہا تھا کہ اس کی زبان پر
...نہ سکی اور جب یہ جو بھی پیسہ جا رہا تھا وہ قانون کی
...بار رہا تھا۔
...حقدار پھر کبھی نہیں آئے؟"
...— ضرور آئے، لیکن اب ان کے لئے یہاں
...تھا۔ ان کے پاس اتنا پیسہ اور وقت تھا نہیں
...کہ کنگال کر سکتے۔ جو کچھ بھی ہوا تھا وہ قانون
...میں ہوا تھا۔ اس لئے کچھ بولنے کی، کچھ کرنے کی
...ہی نہیں تھی چپ چاپ واپس چلے گئے۔"
...لوگوں نے ان اجڑے ہوئے لوگوں کو پھر بسانے
...ش نہیں کی۔؟"
...جی — بسنا اور بسانا کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں
...کو برسہا برس اور نسل در نسل کی ایک مسلسل کوشش
...ہے تب کہیں جا کر ایک گھر بستا ہے اور پھر گاؤں میں
...لئے زمین چاہیئے۔ کھیت چاہئے۔ اس ملک میں
...ایسا نہیں کہ اپنی زمین دے دے۔ اپنا کھیت بانٹے

...صاحب — بات یہ ہے کہ یہ مسلمان بھی ٹھیک سے
...رہنا نہیں چاہتے۔ بس ہر موقع پر پاکستان کا منہ دیکھیں
...پیش آتا دیکھا تو اس رات کتنے مسلمانوں کے یہاں
...کیا۔ بھٹو کو پھانسی ہوئی تو یہاں کے مسلمانوں کو
...پہنچا۔
...نے ایک صاحب نے اپنی یادداشت اور سیاسی
...ہنا چاہا۔
...اسے آپ غداری نہیں کہہ سکتے۔ وہ پاکستان
...اپنے بھائیوں۔ بہنوں اور رشتہ داروں
...نہیں اور بھی ہو سکتے تھے۔ آپ جانتے ہیں
تقسیم کیا ہے۔ بنگلہ دیش میں

ہزاروں ہندوستانی مارے گئے جن کے رشتہ داروں کو
ہندوستان میں رہتے ہوئے صدمہ پہنچنا فطری تھا اور بھٹو کی
موت پر تو آپ لوگوں کو بھی صدمہ ہے۔ یہ ردعمل تو وہاں کی
موجودہ حکومت کے خلاف ہے۔
وہ تو ٹھیک ہے لیکن مسلمان فخریہ باہر کا ذکر کرتا ہے
تو اس سے تلخی بڑھتی ہے۔ اب دیکھئے نا۔ پاس کے گاؤں میں
مسلمان ہیں۔ ان کے پاس عرب سے پیسہ آتا ہے تو دھڑا دھڑ
زمینیں خرید رہے ہیں۔ بڑے بڑے مدرسے بنا لیے ہیں ایسا
لگتا ہے جیسے ان کے پاؤں زمین پر نہیں۔ ان سب باتوں
سے غصہ پھیلتا ہے اور غیریت کا احساس ہوتا ہے۔
عرب سے پیسہ آتا ہے تو اصول ضابطے کے تحت آتا ہے
اور مسلمانوں کی معاشی حالت سدھر رہی ہے تو یہ تو خوشی کی
بات ہے کہ سماج کا ایک اہم طبقہ ترقی پر گامزن ہے۔
لیکن ترقی کا یہ راستہ صرف ایک ہی اور جاتا ہے اسی سے
تو اسنتولن پیدا ہوتا ہے۔
وہ شخص بحث کرنے پر آمادہ تھا اور بحث غیر مقصد تھا نہیں
اس لئے میں نے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔
دیکھئے یہ ذرا لمبی بحث ہے جس کا ابھی موقع نہیں۔ میں
صرف یہ کہنا چاہتا ہوں اگر اسی طرح بھیڑ بنا بنا کر ہم بستے رہے
تو ہماری قومی، سماجی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی ہماری
پرانی اور قابل فخر تہذیب کے پرخچے اڑ جائیں گے اور ان
ہیروں کی روشنی جو ہم نے اپنے قومی تاج میں جڑے ہیں، جن
سے ساری دنیا کی تاریکی روشن ہو رہی ہے۔ مدھم پڑ جائے
گی۔ یہ وقت ہمارے لئے سخت غور و فکر کا ہے کہ آخر ہم اب اپنے
کس حیثیت سے منوانا چاہتے ہیں۔
آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں صاحب! — مکھیا نے بولنا
شروع کیا تو سب خاموش رہے۔ اگرچہ اس کو بہت دن ہو گئے
مگر مجھے ابھی وہ دن خوابوں کی طرح یاد آتے ہیں جب اسی
گاؤں میں ہندو مسلمان مل جل کر رہتے تھے ایک کے یہاں شادی
بیاہ ہوتا تو دوسرے کی دیوار توڑ دی جاتی اس طرح دونوں گھر
ایک گھر بن جاتے۔ دونوں ایک دوسرے کی اچھائیوں کو اپنانے

ہو فخر سمجھے اور برائیوں کو پہچاننے کی تمیز اُن میں خود بخود پیدا ہو جاتی۔ عید اور ہولی کو ساتھ ساتھ منانے میں جو لطف تھا وہ اب کہاں ہے۔

میں تقریباً چالیس سال سے پان بیچتا ہوں صاحب — بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک بوڑھے شخص نے کہنا شروع کیا پہلے ایک لکڑی کی کشتی پر بیٹھتا تھا۔ آج دو دو دکانیں پکی بن گئی ہیں۔ لیکن اب وہ مزہ نہیں آتا۔ میرے رنگین حسین شاموں میں ململ کے کرتے پہنے خوشبو میں بسے ہوئے لوگ جب خوشبودار قوام دیئے ہوئے پان مجھ سے بنواتے تو آپ یقین مانیے۔ مارے خوشی کے میرے ہاتھ کانپ ضرور جاتے لیکن ان میں ایسی پھرتی آجاتی، ایسی پھرتی آجاتی کہ مانو یہ ہاتھ لوہے کی بنی مشین ہوں۔ اب تین سو نمبر اور پانچ سو نمبر کھانے والوں میں وہ بات ہی نظر نہیں آتی۔ بات تو بس اسی پان کی تہذیب میں تھی۔

مان لیجیے۔ آپ کے گاؤں میں اب بھی کچھ مسلمان آکر بسنا چاہیں تو؟ میں نے اچانک ان کے درمیان ایک سوال اچھال دیا۔

وہ سر آنکھوں پر رہیں گے۔ لیکن جو مشکلات ہیں۔ وہ میں آپ سے بتا چکا ہوں اور آپ یقین جانیے کہ ان کا کوئی حل نہیں۔ مکھیا نے بہت ہی نرمی اور سنجیدگی سے کہا۔ ہم لوگ تو خود چاہتے ہیں کہ مسلمان کاریگر یہاں آکر بسیں، آج بھی ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑوں میں جو بات ہے وہ مشین کے کپڑوں میں نہیں۔ درمیان میں ایک شخص بول اٹھا جس نے اب تک کوئی بات نہیں کی تھی۔

اگر نواب صاحب یہاں آنا چاہیں؟ میں نے دریافت کیا۔

ارے وہ تو اپنے ہی ہیں۔ اس گاؤں کے ہیں۔ ہم ان کا دل کھول کر سواگت کریں گے آپ جانتے ہیں صاحب کہ نواب صاحب اس گاؤں کے چھوڑ دینے ہی سے یہ افراتفری ہے وہ اگر یہیں رہتے تو اور لوگ بھی رہتے۔ ہر کوئی [illegible] چاہتا ہے نواب صاحب کا اس طرح اس جگہ کو چھوڑنا [illegible] اپنی زمین جائداد کو چھوڑ کر جانا چاہیے تھا انھوں نے یہ کام [illegible] کیا؟ مکھیا نے بہت ہی پُرجوش انداز میں کہا۔

ترقی یافتہ گاؤں میں لوگوں کی مصروفیت شہر کے لوگوں سے کم نہیں ہوتی۔ لہٰذا لوگ آہستہ آہستہ چھٹنے لگے۔ مکھیا میری خاطر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ خوشبودار باسمتی چاول، گی دال، آلو کا بہت مزیدار سالن، پاپڑ، دہی، اچار، بہت لذیذ پیڑے۔ مکھیا کے ساتھ کئی افراد مجھے بس تک چڑھانے بھی آئے۔ بس آنے میں دیر ہوئی تو وہاں بھی ان نے مجھے پان، سپاری، لونگ، اور الائچی پیش کیے۔ ان کی وجہ سے مجھے بس میں آسانی سے جگہ مل گئی اور جب بس چل کر دور ہو تو میں نے جھانک کر دیکھا۔ وہ لوگ سڑک پر کھڑے ابھی تک ہاتھ ہلا رہے تھے۔

میں خیالوں میں مگن تھا کہ اچانک، بس کو بہت سے لوگوں گھیر لیا۔ میری بغل میں بیٹھے ہوئے سفید دھوتی، سفید کرتا، پر تلک لگائے اور سنہری فریم کا چشمہ لگائے شخص نے جھپٹ کر میرے ہاتھوں سے "قومی آواز" چھین لیا اور مروڑ کر باہر پھینک دیا۔ یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔ بس رکی تو اس میں کچھ لوگ گھس آئے ان کے چہروں سے وحشت ٹپک رہی تھی اور ان کے ہاتھوں میں کئی ہوئے ہتھیار تھے انھوں نے بغور سب مسافروں کو دیکھنا شروع کیا اور ایک اونگھتے ہوئے شخص کو اُتار کر لے گئے جس نے سر پر ٹوپی پہن رکھی تھی اور کچی پکی داڑھی رکھے ہوئے تھا۔

اتنے میں میری بغل والے مسافر نے زور سے کہا۔

"اب کوئی نہیں ہے — اس بس میں اب کوئی نہیں ہے چلو جلدی آگے بڑھاؤ دیر ہو رہی ہے۔

ان کے کہنے کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے بس کو آگے جانے دیا ڈرائیور نے تیزی سے بس کو بڑھایا تو اتارے گئے مسافر کی ایک دردناک چیخ فضا میں ابھری لیکن جلد ہی بس کی آواز میں [illegible]

کیا بتاؤں۔" میرے ہم سفر نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہنا شروع کیا "آج صبح اچانک پاس والے شہر میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ گیا۔ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے لیکن شہر باہر گذرنے والی شاہراہوں پر بسوں، ٹیکسیوں اور چلتے مسافروں کو روک روک کر ان کو پہچان کر مارا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں [illegible] کب ختم ہوگی؟

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 Phone: 275602

Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644,57

Regd No D- (DN) 353

FEBEVRARY 1986

سرور تونسوی
7 APR 1986

کتابیں ہی کتابیں

نیشنل بک ٹرسٹ نے انگریزی اور ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری بڑی زبانوں میں اہم اور معلوماتی موضوعات پر کتابیں شائع کرنے کے ساتھ ساتھ مشترکہ ادب کی اشاعت بھی کی ہے۔ ٹرسٹ کی مطبوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ٹرسٹ کے اشاعتی پروگرام میں بچوں کے ادب کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ یقیناً ہر قاری کے لیے ٹرسٹ کی مطبوعات میں اس کی پسند کی کتابیں مل سکتی ہیں۔ اردو کی مطبوعات میں سے چند درج ذیل ہیں۔ ٹرسٹ کی کتابیں ملک بھر میں اردو کے تمام کتب فروشوں، ریلوے بک اسٹالوں اور این بی ٹی بک شاپس سے مل سکتی ہیں۔

شیخ نظام الدین اولیاء — از خلیق احمد نظامی — قیمت ۵۰ — ۸ روپے
عوامی ترسیل — از آر۔ کے۔ چٹرجی — مترجم: عرفان صدیقی — قیمت ۷۵ — ۱۹ روپے
آپ اور آپ کی غذا — از کے۔ ٹی۔ اچایا — مترجم: من موہن تلخ — ۲۵ — ۱۴ روپے
آدرش ہندو ہوٹل — از بِبھوتی بھوشن بندوپادھیائے — مترجم: اشرف عابدی — ۲۵ — ۱۹ روپے
درد کے رشتے — از امرت رائے — مترجم: بلراج ورما — ۰۰ — ۲۰ روپے
اردو افسانے — مرتب: رضیہ سجاد ظہیر (نیا ایڈیشن) — ۰۰ — ۱۱ روپے
اردو طباعت و اشاعت کے مسائل — مرتب: انور کمال حسینی — ۰۰ — ۷ روپے
آزادی کی چھاؤں میں — از بیگم انیس قدوائی — ۵۰ — ۱۲ روپے
پریم چند کے مختصر افسانے — مرتب: رادھا کرشن (نیا ایڈیشن) — ۵۰ — ۱۸ روپے
امیر خسرو — از غلام ربانی — ۷۵ — ۹ روپے
ٹیپو سلطان — از بی۔ شیخ علی — مترجم: ظفر احمد نظامی — ۵۰ — ۸ روپے

بچوں کے لئے:

ہم ہندوستانی — از پروجے واڈیا — مترجم: ایس۔ اے۔ رحمٰن — ۵۰ — ۲ روپے
ننھے پاپا سونا — از جگدیش جوشی — ۵۰ — ۲ روپے
چھوٹی سی ایک لہر — از ایس۔ چندرا ورکر — ۵۰ — ۲ روپے
کتابوں کی انوکھی دنیا — از سیموئل اسرائیل — مترجم: سید احسان الرحمٰن — ۵۰ — ۲ روپے
دمدار کہانی — از ایم۔ سی۔ گبریل — انیس مرزا — ۵۰ — ۲ روپے
مہا بھارت — از کے۔ کٹمب راؤ — تعظیم احمد — ۵۰ — ۲ روپے
جنگل میں تالاب — از اوما آنند — عابدہ بیگم — ۵۰ — ۲ روپے
جانوروں کے ایک نگہبان کی باتیں — از ای۔ آر۔ سی۔ داویدار — امر سنگھ — ۵۰ — ۲ روپے
عقلمند اور چالاک — از کملا نہرانی — صادقہ ذکی — ۵۰ — ۲ روپے
سوناسانی تحفہ — از موہن سندر راجن — خالدہ ناہید — ۵۰ — ۲ روپے
گلی محلے کے کھیل — از ملک راج آنند — اوما گپتا — ۵۰ — ۲ روپے
بس کی سیر — از وی۔ کی۔ کن۔ ن — ایس۔ اے۔ رحمٰن — ۵۰ — ۲ روپے
یہ دنیا پیاری پیاری — از جینتی منوکرن — اردو تحریر: سعدیہ رحمٰن — ۵۰ — ۲ روپے
دس کہانیاں — مرتب: سراج انور — ۰۰ — ۴ روپے
بھارت کے بہادر بچے — از سگرن سرواستوا — مترجم: سعید الرحمٰن — ۵۰ — ۲ روپے
عیدگاہ (نیا ایڈیشن) — از پریم چند — ۵۰ — ۲ روپے
گوتم بدھ — از لیلا جارج — مترجم: سید ضمیر حسن — ۵۰ — ۲ روپے

منتخب قومی شاعری — مرتب: سردار جعفری — زیر طبع
پنجاب: ادب اور ثقافت — از ایس۔ ایس۔ بیدی — مترجم: اسلم پرویز — زیر طبع
آوارہ مسیحا — از وشنو پربھاکر — راشد سہسوانی — زیر طبع
تاریکیاں — از بھیشم ساہنی — شہلا نقوی — زیر طبع
سکھ دھرم اور سیکولرازم — از کرتار سنگھ دگل — زبیدہ ملک — زیر طبع
گیانی گرمکھ سنگھ مسافر — از کرتار سنگھ دگل — زبیدہ ملک — زیر طبع

فہرست کتب اور دیگر تاجرانہ معلومات کے لیے لکھیں:

ڈائرکٹر، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، (شعبہ سیلز اینڈ مارکیٹنگ) اے ۵، گرین پارک، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

آر۔ این ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۳۵۳

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریبان پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے نیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں، انسان پرست ہوں
نیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زر سالانہ: -/۲۴ روپے

جلد ۲۷ | مارچ ۱۹۸۶ء | شمارہ ۳

ودیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس چتلی قبر مٹکلو جامع مسجد دہلی سے اور سرورق کے صفحات دین پرنٹرز بلیماران دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بُلبُل چہ گُفت؟ گُل چہ شُنید؟ وصبا چہ کرد؟

دِلّی اُردو اکاڈمی —— ایک جائزہ

دلی انتظامیہ اُردو اکاڈمی۔ ہندی اکاڈمی اور پنجابی اکاڈمی کو برابر برابر تیس تیس لاکھ روپیہ سالانہ دے رہا ہے۔ ہندی اور پنجابی اکاڈمیاں بھی اپنے اپنے دائرے میں ضرور مناسب طور پر ہندی اور پنجابی زبانوں کے لئے کام کرتی ہوں گی مگر بظاہر ان دونوں اداروں کی سرگرمیاں ایسی نہیں ہیں جن پر فخر کیا جا سکے یا جنہیں ہندی اور پنجابی کی ترقی کا ضامن قرار دیا جا سکے۔ ان دونوں اداروں کے بارے میں کبھی کبھار اخبارات میں یہ اطلاعات ضرور نظر سے گذرتی ہیں کہ ہندی اور پنجابی کے سرکردہ ادیبوں کو ایوارڈ دیئے گئے یا کتابوں پر مصنفین کو انعامات دیئے گئے۔ ہندی کوی سمیلن اور پنجابی دربار کی پبلسٹی ساہتیہ پریشد کے تعاون سے ضرور کی جاتی ہے۔

مگر آج تک کسی اخبار میں ان دونوں اکاڈمیوں کے خلاف ایک لفظ تک پڑھنے میں نہیں آیا۔ مگر اس کے برخلاف دلی اُردو اکاڈمی جو آئے دن کوئی نہ کوئی قابلِ ذکر پروگرام کراتی رہتی ہے اور اُردو کے طلبا کے لئے انعامات وغیرہ کا اعلان کرتی رہتی ہے اُس کے خلاف اخبارات میں دلی تو دلی بیرونِ جات کے "اُردو دوست" بھی لکھتے رہتے ہیں۔ اُردو دوستوں کی دلی اُردو اکاڈمی کے تئیں یہ دلچسپی واقعی قابلِ تعریف ہے مخالفت اگر محض برائے مخالفت ہو تو شرفا کی زبان میں اس کو محض کہا جاتا ہے۔ اور اگر مخالفت اصلاح کی ہو اور دلائل و براہین کے ساتھ ہو تو اسے قدر و منزلت سے دیکھا جاتا ہے اور اُصولی مخالفت کرنے والے کا وقار قائم ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے ہرگز ہرگز یہ مطلب اخذ نہ کیا جائے کہ ہم اُردو اکاڈمی کی کسی طور بھی وکالت کر رہے ہیں یا اُردو اکاڈمی کے ارباب لبت وکشاد کی خوشامد کر رہے ہیں مگر ہاں یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اُردو اکاڈمی کی کارکردگی کا جائزہ ضرور لیجئے مگر غیر جانبدار ہو کر۔ مخالفت کی یہ وجہ تو ہرگز نہیں ہونی چاہئے کہ اگر کسی شاعر کو مشاعرہ میں مدعو نہیں کیا گیا تو وہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے اخبارات میں ہائے توبہ مچانے لگے۔ ہندوستان کی ستر کروڑ آبادی میں ساڑھے بارہ کروڑ شاعر ہیں۔ دلی اُردو اکاڈمی تو کیا اگر سارے مُلک کی اُردو اکاڈمیاں اور دوسری ادبی انجمنیں مل کر بھی کوشش کریں تو ان خود رَو شعرائے کرام کو خوش نہیں کر سکتیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے منتظمین مشاعرہ شعراء کے انتخاب میں دوست نوازی کے علاوہ ناجائز سفارشوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور اُردو اکاڈمی دلی کے مشاعروں میں بھی یقیناً ایسا ہوتا ہے۔ اور آپ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اگر آپ خود کسی مشاعرے کے کنوینر یا منتظم ہوں تو آپ بھی ایسا ہی کریں گے کیونکہ ہماری سرشت میں طویل غلامی کے طفیل جو بدعتیں گھر کر چکی ہیں یہ بدعت بھی اُن میں سے ایک ہے۔ یہ الزام سو فیصد درست ہے کہ اُردو اکاڈمی کے اکثر سمیناروں کے ڈائریکٹر صاحبان نے محض اپنی جان پہچان کو تقویت پہنچانے۔ اس ہاتھ دے اور اُس ہاتھ لے۔ (یعنی آج میں آپ کو بُلا رہا ہوں کل آپ مجھے بُلانا) نااہل حضرات سے خاکے اور مقالے محض دوست نوازی کے تحت پڑھوائے۔ یا اپنے گرگوں سے نظامت اور صدارت کروا کر معاوضہ دلایا۔ مگر اس سے بھی انکار کرنا کفرانِ نعمت سے کم نہیں کہ کچھ سمینار اپنی نوعیت سے بے مثال تھے خصوصاً افسانہ ورکشاپ / سمینار نے تو بین الاقوامی شہرت پائی۔ یہ خیال مت کیجئے کہ افسانہ ورکشاپ / سمینار کی تعریف

سے ہماری مُراد جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو خراجِ عقیدت پیش کرنا ہے یا اُن کی خوشامد کر کے اکاڈمی کا کوئی ایوارڈ حاصل کرنا ہے۔ دیکھو نا، آج کل دنیا میں اُردو کے ہر ایوارڈ کی الاٹمنٹ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی دسترس میں ہے) اور یہ بھی مسلّم ہے کہ نارنگ صاحب نے اس سیمینار میں دوست نوازی کی سب حدیں پار کر دیں مگر ان سب کے باوجود افسانہ ورکشاپ / سیمینار اپنی نظیر آپ تھا۔ اور اسی طرح کچھ اور سیمینار بھی خوب اور قابلِ تعریف تھے۔

ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ اُردو اکاڈمی کے بعض ممبران نے اپنی ممبری کو بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا کے مصداق سمجھا اور جی بھر کر اکاڈمی سے روپیہ بٹورنے کی کوشش کی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ یہ ممبران ایک خادمِ اُردو کی حیثیت سے اُردو کے لئے کچھ کرتے کیونکہ ان کی گرہ سے کچھ بھی نہ لگتا مگر انھوں نے یہ باور کر لیا کہ اکاڈمی کو جو لاکھوں روپیہ دلی انتظامیہ دیتی ہے وہ محض اکاڈمی کے ممبران کی شکم پُری کے لئے دیا گیا ہے اور بعض ممبران نے اس پر عمل بھی کیا اور ہر طرح سے لوٹ [illegible] کو اپنا ایمان سمجھا خود تو خود اپنے احباب کو بھی ناجائز طور پر روپیہ دلوایا۔ آپ ناجائز [illegible] نہیں۔ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ غیر مستحق لوگوں کو ایسا کام سونپا گیا جو اس کے اہل نہیں تھے۔ پچھلے دنوں [illegible] میں یہ اطلاع شائع ہوئی تھی کہ اُردو اکاڈمی والے دیتے اڑھائی سو روپیہ ہیں اور رسید پانچ سو کی لکھواتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جھوٹ اگر کسی حد تک مصلحت کے پیش نظر بولا جائے تو اللہ میاں معاف کر دیتے ہیں مگر اس سلسلے میں تو جھوٹ بولنے والے نے تمام حدیں پار کر دیں۔ اکاڈمی کا حساب کتاب جناب محمد عارفین صاحب ڈپٹی سکریٹری اور اکاڈمی کے ایڈمنسٹریٹر کے ہاتھوں میں ہے اور محمد عارفین صاحب کے بارے میں ایسا سوچنا بھی گناہ ہے اور اگر کوئی ناہنجار ایسا لکھتا ہے تو نہ صرف وہ اپنی زبان گندی کرتا ہے بلکہ اپنے [illegible] بارے میں بھی شک کی گنجائش رکھتا ہے۔ اس [illegible] آپ کی واقفیت کے لئے یہ بیان کر دینا ضروری

ہے کہ ہمارے ہاں بھی ایک صاحب یہ شکایت لے کر آئے تھے کہ ایک سیمینار کے ڈائرکٹر صاحب نے اُن سے مقالہ پڑھانا اس شرط پر منظور کیا تھا کہ نصف معاوضہ ڈائرکٹر صاحب کو دیا جائے۔ مگر شکایت کنندہ نے اپنی شکایت لکھ کر دینے سے معذوری ظاہر کی اس لئے دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ مگر مدیر شانِ ہند جب ادارتی نوٹ لکھتا ہے تو بقول سوار دیوان سنگھ مفتون منہ سپریم کورٹ کی طرف رکھتا ہے تاکہ بعد میں بغلیں نہ جھانکنا پڑیں۔

آپ کا یہ فرمان بھی بجا ہے کہ اُردو اکاڈمی نے شامِ غزل، شامِ افسانہ، جشن مختلف شعراء۔ داغ سیمینار۔ چار بیت۔ فیض۔ راجندر سنگھ بیدی اور ساغر نظامی کی یاد میں تعزیتی جلسے۔ پاکستانی مہمانوں (ادیبوں اور شعراء) کا استقبال۔ مشاعرہ، شاعرات، محافلِ موسیقی۔ دلی والے اور اسی قسم کے درجنوں پروگراموں کی باڑھ لگا دی اور بقول شخصے کوئی ہفتہ بلکہ بعض ہفتوں میں تو دلی اُردو اکاڈمی کے دو دو تین تین پروگراموں کے دعوت نامے موصول ہوتے ہیں۔ مگر خدا لگتی کہئے گا کہ اُردو سے متعلق ان پروگراموں میں اُردو دلی میں کہاں کہاں پہنچی ہے نو آباد کالونی نانگلوئی اور اسی طرح دلی کے دور دراز علاقوں اور نوا اور ہریانہ۔ یوپی اور پنجاب سے باذوق حضرات اکاڈمی کے پروگراموں کو دیکھنے آتے ہیں۔ ایک وہ وقت تھا کہ اگر بس میں سفر کے دوران آپ کے ہاتھ میں اُردو کتاب یا رسالہ ہوتا تھا تو آپ اُسے اپنے زانوں پر اُلٹا کرتے تھے کیونکہ بس کے دوسرے مسافر آپ کو اُردو والا کہ کر آپ کا مذاق اُڑاتے تھے۔ اور آج یہ حالت ہے کہ آپ ہوائی جہاز کے سفر میں بھی قومی آواز مل سکتا ہے۔ اُردو اکاڈمی میں ہزار نقائص نکالنے کے لئے آپ مختار ہیں مگر اس سے انکار نہ کر سکیں گے کہ دلی میں رہنے والے غیر اُردو حضرات اُردو سے شناسا ہوئے ہیں اور اُنھیں یہ زبان اچھی لگی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ سینکڑوں غیر مسلم لڑکے لڑکیاں اُردو لکھنا پڑھنا سیکھ رہے ہیں اور اُردو شناسی پیدا ہو رہی ہے اس کا کریڈٹ اُردو اکاڈمی کو جاتا ہے

ہم آپ سے متفق ہیں کہ اب اردو اکاڈمی کو سیناروں ۔
ا رسے پرہیز کرنا چاہیئے۔ سال میں زیادہ سے زیادہ چار
رہوں مگر وہ ہوں واقعی سینار
آپ کا یہ فرمان بھی سر آنکھوں پر کہ اکاڈمی اگر کسی شاعر کے
ر میں کوئی تقریب منعقد کرتی ہے تو پھر وہ شاعر جگن ناتھ آزاد
ن مُلّا جیسے باوقار اور واقعی شاعر ہونے چاہئیں۔ نہ کہ مُطرب
لا ایسا معمولی قسم کا شاعر اور لوگ ان سنگھ .... ایسا متشاعر —
نہ ورکشاپ / سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں جس انداز سے
تان اور لندن کے اردو شعرائے کرام کا استقبال کیا گیا تھا
ہند قومی یکجہتی مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعرا کو اکاڈمی
استقبالیہ ہونا تھا ایسی تقاریب سے واقعی اکاڈمی اور اہل
تعریف ہوتی ہے مگر ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو
یسا اعزاز بخشا جائے تو باعثِ بدنامی ہے —
مشاعرہ جشن جمہوریت کے بارے میں ہم شان ہند کی
[illegible] اشاعت میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں اگر اردو اکاڈمی
[illegible] بھی یوم آزادی اور جشن جمہوریت کے مشاعروں میں ایسی
[illegible] کا منہ دیکھتی ہے تو پھر یہ سمجھنے میں کوئی باک نہیں کہ
[illegible] قومی تہواروں کی توہین کی مرتکب ہوگی ۔ رہا مشاعرہ
شاعرات [illegible] اگر اس میں بھی سفارش ۔ ذاتی پسند اور تسکین دل
[illegible] طاق رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ مشاعرہ ناکام
سکے۔

[illegible] اکاڈمی میں اردو اکاڈمی کے "جشن بہاراں" کے سلسلے
میں [illegible] اسلے بڑے تیکھے انداز میں شائع ہوئے ہیں
اس [illegible] مدیر شان ہند کو بھی ایک مکتوب گرامی موصول ہوا
[illegible] مطالبہ کیا گیا ہے کہ اگر مدیر شان ہند سچائی پسند ہے
[illegible] ف کے اداریٔ نوٹ لکھتا ہے تو اردو اکاڈمی
[illegible] بہاراں پر اپنی را ۔ئے شان ہند میں شائع
[illegible] مکتوب موصول نہ بھی ہوتا تو بھی مدیر شان ہند
[illegible] جشن بہاراں پر اپنی ایماندارانہ رائے بیان
[illegible] ۔
[illegible] بہاراں کے ڈائرکٹر جناب کنور مہندر سنگھ بیدی

سحرؔ تھے مگر انھوں نے اپنے جملہ اختیارات بڑی حد تک جناب
مجتبےٰ حسین کو تفویض کر رکھے تھے۔ ویسے بھی آج کل حالت یہ
ہے کہ اگر کوئی منسٹر مہاراشٹرین ہے تو وہ مہاراشٹر والوں کو
زیادہ سے زیادہ قابلِ قدر سمجھتا ہے ۔ اگر کوئی افسر مدراسی
ہے تو وہ مدراسیوں کو ہی چاہتا ہے ہر کوئی راجیو گاندھی تو
ہو نہیں سکتا جو سارے دیش کو اپنا دیش سمجھے اور دیش کے
ہر باشندے کو اپنا جیسا سمجھے ۔ اور حیدرآباد میں تو ازل سے
مُلکی اور غیر ملکی کا اصول کار فرما رہا ہے لہٰذا جناب مجتبےٰ حسین
صاحب نے غیر مُلکیوں کی نسبت اپنے مُلکی حضرات کو زیادہ
ترجیح دی اور اردو اکاڈمی کا یہ جشن بہاراں اچھا خاصا زندہ
دلان حیدرآباد کا منی شو ہو کر رہ گیا ۔ پاکستان بننے سے
پہلے پنجاب کے بڑے بڑے زمیندار اور رئوسا تفریح طبع کے
لئے بٹیر بازی، تیتر بازی، مُرغ بازی اور کشتیوں وغیرہ کے
مقابلے کرایا کرتے تھے ۔ اور مراثیوں اور نقلچیوں اور بھانڈوں
سے ایسے ایسے لاجواب طنز و مزاح کے پروگرام دیکھتے تھے کہ طبیعت
جیسے خوش رہتی تھی ۔ مراثیوں کی حاضر جوابی ۔ نقلچیوں کی
اصل سے بھی بہتر نقل اور بھانڈوں کے ذو معنیٰ الفاظ ہنساتے
ہنساتے دیکھنے اور سننے والوں کے پیٹ میں بل ڈال دیتے تھے
جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ بہ نفسِ نفیس ان رئیسانہ ٹھاٹھوں
سے لطف اندوز ہو چکے ہیں ۔ کیا وہ صرف انگلی کہہ سکیں گے کہ
فکری آنند، بی کے سود، سوم ناتھ ناگر اور دولت رام وغیرہم
کے طنز و مزاح کے کمالات سے ان روایتی مراثیوں اور نقلچیوں
کا طنز و مزاح کہیں بہتر ہوتا تھا ۔ ہمیں خوشی ہوگی کہ جناب سید
مظفر حسین صاحب برنی گورنر ہریانہ جشن بہاراں کے افتتاحی
اجلاس میں تشریف نہیں لائے کیونکہ یہ اجلاس اس قابل ہی
نہ تھا کہ جس کی صدارت جناب برنی صاحب فرماتے ۔ ہم برنی صاحب
کے متعدد اوصاف کے مداح ہیں مگر یہ اُس روز ہی معلوم ہوا کہ
برنی صاحب علم غیب سے بھی واقف ہیں ۔ ہاں مصطفیٰ علی بیگ
اس اجلاس کے سرور رہے اور انھوں نے زندہ دلانان حیدرآباد
کی لاج رکھی ۔ "جشن بہاراں" کا دوسرا دن بھی کافی پھیکا رہا ۔
یوسف ناظم کی صدارتی تقریر اچھی تھی مگر مقالہ اچھا نہیں تھا

ضمیر حسن خاں کا مقالہ خوب تھا۔ بمبئی کے ایک صاحب غالباً فیضی صاحب کا مقالہ طنز و مزاح کی نسبت کوک شاستر کا بہترین آئینہ دار تھا۔ کھانے کے بعد تو سامعین کی تعداد صرف چودہ رہ گئی تھی مگر دوسری نشست میں جناب مجتبےٰ حسین، جناب دلیپ سنگھ کے مقالے ہی اچھے تھے باقی کے مقالے جشنِ بہاراں کی بجائے اگر کسی ماہی اجلاس میں پڑھے جاتے تو بہتر تھا۔

مشاعرہ جشنِ بہاراں کی نظامت قطعاً کمزور تھی۔ اکثر شعرا کے کلام میں فنی سقم تھے۔ جناب اسمٰعیل خالف حیدرآبادی جس شعر کو بار بار سنا رہے تھے۔ اس میں ایک لفظ کی ہی گرہ تھی۔ خندان دہلوی، فیل رہے۔ ساغر خیامی، پاپولر میرٹھی، مصطفےٰ علی بیگ، مقرب حسین، ہلال سیوہاروی وغیرہم کامیاب رہے مگر پاپولر میرٹھی بھی فنی سقم کے مرتکب ہوئے۔ آفتاب لکھنوی نے وہی کلام سنایا جو وہ گذشتہ سینتیس ۳۷ سالوں سے سنا رہے ہیں۔ قومی آواز میں مراسلہ نگار نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ آفتاب صاحب کے پاس اس کلام کے علاوہ اور کچھ ہے نہیں۔ یہ مشاعرہ اُردو اکاڈمی کے نئے دفتر بیلا روڈ کے سبزہ زار پر ہوا۔ اکاڈمی نے مشاعرہ کے لئے جو انتظام کر رکھا تھا۔ وہ یقیناً قابلِ تعریف تھا۔ ہم چاہتے ہیں کہ آئندہ اکاڈمی کی جملہ تقریبات بجائے غالب اکیڈمی۔ فکی آڈیٹوریم یا ساحل بھون وغیرہ کے اکاڈمی کے دفتر میں ہوں۔ اکاڈمی کا پانچ سو نشستوں کے لئے مکتفی ہے اور اس سے زیادہ سامعین اکاڈمی کی تقاریب میں آتے بھی نہیں۔ بہر کیف جشن بہاراں [illegible] اگر یہ کہا جائے تو موزوں رہے گا کہ طنز و مزاح کو اب پاپڑ بازی سمجھ لیا گیا ہے۔ اور جب کوئی پھکڑ باز طنز و مزاح کا منہ چڑاتا ہے تو ذوقِ سلیم کے لئے بارِ گراں سے کم نہیں ہوتا۔

دوردرشن نے ۲۶ مارچ کو رات کے ساڑھے دس بجے جو ہندی مشاعرۂ طنز و مزاح پیش کیا اگر اُردو اکاڈمی کے ارکان یا جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور جناب مجتبےٰ حسین صاحب ہندی کا یہ ہاسیہ کوی سمیلن دیکھا اور سنا ہو تو انھیں بخوبی اندازہ ہوا ہوگا کہ طنز و مزاح کسے کہتے ہیں۔ اس ہاسیہ کوی سمیلن کی ایک ایک کوتا جشنِ بہاراں کے سارے مشاعرۂ طنز و مزاح پر بھاری تھی

۔۔۔ باقی ہے

پاکستانی سفارتخانہ کے ویزا آفس پر غلط الزام

روزنامہ قومی آواز کی اشاعت ۲۶ مارچ ۱۹۸۶ء میں "پاکستانی سفارتخانہ کے ویزا آفس پر الزام" کے تحت جناب الرشید، صدر مسلم ویلفیر ایسوسی ایشن ضلع پٹیالہ کا بیان ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "آج کل پاکستان جانے کے ویزا حاصل کرنا اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے کے مترادف اس کا ثبوت یہ ہے کہ مورخہ ۷ مارچ کو ہوئی دھکم پیل میں دو بچوں کی موت واقع ہو گئی۔ ایک دوشیزہ جو بمبئی سے ویزا لینے آئی تھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی اور اس کے رشتہ داروں کو اس کی لاش بھی بمبئی لے جانا پڑی۔ ان سانحات کا اہم سبب صرف دہلی ہی میں ویزا آفس کا ہونا ہے وغیرہ

جہاں تک دو بچوں اور ایک نوجوان لڑکی کا دھکم پیل میں انتقال کر جانا ہے وہ یقیناً قابلِ افسوس ہے اور یقیناً طور پر سفارتخانہ پاکستان کے جملہ ارباب بست و کشاد کو اس سانحہ کا اتنا ہی افسوس ہوگا جتنا کہ کسی بھی ہندوستانی کو۔ پاکستانی سفارتخانے کے تمام ارکان اہل و عیال والے ہیں اور خدا کے فضل سے وہ صاحب ایمان ہیں لہٰذا وہ بچوں اور نوجوان لڑکی کی بلاوجہ موت پر افسوس کناں ہیں۔

جناب عبد الرشید صاحب صدر مسلم ویلفیر ایسوسی ایشن ضلع پٹیالہ کیا ایمانداری سے کہہ سکتے ہیں کہ اس سانحہ میں پاکستانی سفارتخانہ کا ویزا آفس کس طرح ذمہ دار ہے؟ سانحہ کے کچھ دیر بعد مدیر شانِ ہند خود جائے وقوعہ پر دیکھا تو کچھ جوتے پھٹی ہوئی قمیضیں اور بنیان ادھر بکھرے پڑے تھے۔ وہاں پر سیکورٹی والوں موجود نے بتایا کہ صبح چار بجے لائن لگا دی گئی۔ چونکہ دروازہ کا دروازہ زنجیر سے اس طرح محدود کر دیا گیا ہے کہ لائن میں سے ایک آدمی ہی ایک وقت میں اندر ہے۔ چونکہ ویزا لینے والوں کی تعداد زیادہ تھی ہندوستانی نوجوان مسلمانوں نے لائن کو توڑا اور دھکم پیل کرتے ہوئے جبراً ضعیف اور نوجوان

وں، بوڑھوں اور کمزور لوگوں کو ادھر اُدھر دھکیلتے ویزا
بخش میں داخل ہوئے۔ اگر کسی نے مزاحمت کی تو اُسے
پیٹا گیا اور اس افراتفری میں یہ سانحہ رُونما ہوا کہ دو
ادر ایک نوجوان لڑکی کی جان گئی۔ ویزا اسیکشن کے
ی دروازہ پر ہندوستانی پولیس کے صرف دو کانسٹبل
تے ہیں جو اس بھیڑ کو قابو رکھنے میں یقینی طور پر ناکافی تھے
یہ بتایا گیا کہ ہمارے نوجوان اور جوشیلے مسلمانوں نے
لیس مینوں کو بھی دھکے دیئے۔ ویزا آفس کی حدود کے
انتظام کی تمام تر ذمہ داری ہندوستانی انتظامیہ کی ہے
پاکستانی سفارتخانہ کی حدود کے اندر پاکستانی انتظامیہ
جو کچھ ہوا۔ ویزا آفس کی حدود کے باہر ہوا اس لئے
ستانی ویزا آفس کو کس طرح ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے؟
عبد الرشید صاحب نے وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی سے
مداخلت کا مطالبہ کیا ہے۔ تاکہ وہ ویزا کا موجودہ
م تبدیل کراسکیں۔ ہمارے وزیر اعظم مسٹر عبد الرشید
رح جذباتی نہیں ہیں کہ جھٹ سے پاکستانی ویزا آفس
وروار قرار دے دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت
ستان نے ویزا آفس کے لئے جو سٹاف مقرر کر رکھا ہے
کے اخراجات اُس وصولی فیس سے کہیں زیادہ ہیں جو
ینے کے لئے وصول کی جاتی ہے۔ ہر ماہ پاکستانی
فارتخانہ بمبئی میں عارضی ویزا آفس کھولتا ہے جہاں سے
ایک ہفتہ تک پانچ صد ویزا روزانہ جاری کیا جاتا ہے
اور پانچ صد ویزا دہلی ویزا آفس ہر روز جاری کرتا ہے۔
عبد الرشید صاحب کو غالباً یہ معلوم نہیں کہ ہر حکومت
غیر کے سفارتخانوں میں ایسے افسران اور عملہ کو بھجواتی
سی کے جملہ اوصاف سے کماحقہ طور پر واقف ہوتے
افسران اور عملہ کا خوش خلق۔ خوش طبع اور مہذب
ہوتا ہے۔ یقینی طور پر پاکستانی سفارتخانہ کے
اور دیگر عملہ بھی فارن سروس کے جملہ لوازمات
رتا ہے اور جب حالت یہ ہو کہ انکوائری کی
وں حضرات ایک ہی قسم کے سوالات دہرا رہے

ہوں تو انکوائری کونٹر کا انچارج کب تک مغزپچی کرتا رہے
گا۔ جب کہ ویزا حاصل کرنے کا ہر قاعدہ قانون تحریری طور پر
ویزا اسیکشن میں بورڈوں پر تحریر ہے۔ ویزا آفس میں کثرتِ
کار کا یہ عالم ہے کہ جناب مبین احمد صاحب کو صبح نو بجے سے
شام چھ بجے تک سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی اور ایسی حالت
میں بھی وہ ہر روز اوسطاً دو صد اشخاص سے بالمشافہ گفتگو
کرکے اُنھیں مطمئن کرتے ہیں۔ جناب محبوب عالم صاحب سیکنڈ
سکریٹری اعلےٰ تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ جناب
شمیم الحق صاحب ویزا کونسلر اور دیگر جملہ اعلےٰ افسران پوری
پوری کوشش کرتے ہیں کہ اُن کے ملک کی مثالی تہذیب
شرافت اور ثقافت کو کسی طور بھی دھکا نہ لگے۔ جناب
اشفاق گوندل پریس اٹیچی نے اپنے پیش رو جناب حسن عسکری
کی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا جناب عبد الرشید صاحب
بہ نفس نفیس کسی روز ویزا آفس میں آکر اپنے ہم وطن مسلمانوں
کی حرکات کو ملاحظہ فرمائیں تو اُنھیں پتہ چل سکے کہ سفارتخانہ کے
بعض ملازمین کے رویہ میں تلخی کیوں آجاتی ہے۔ اس کی
ایک مثال عرض ہے۔ ویزا اسیکشن سے سفارتخانہ کی عمارت
میں داخل ہونے کے لئے جو گیٹ ہے وہاں ایک صاحب کی
ڈیوٹی ہوتی ہے کہ صرف ان حضرات کو اندر جانے دے جو
ری سیپشن سے کسی افسر سے ملنے کی تحریری اجازت لے کر آئے۔
کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی افسر سے ملنا ہے تو وہ
ری سیپشن میں اس کی اطلاع دیتا ہے۔ ڈیوٹی افسر فون پر متعلقہ
افسر سے اجازت طلب کرتا ہے کہ فلاں صاحب آپ سے ملنا چاہتے
ہیں تم انھیں اندر بھجواؤں یا نہ۔ اگر افسر متعلقہ اجازت دیتا
ہے تو ڈیوٹی افسر ملاقاتی کو چٹ دے دیتا ہے جو اس آہنی
گیٹ پر دکھانے کے بعد اندر جانے کی اجازت ملتی ہے
ضرورت مند ملاقاتیوں کی وافر تعداد اس آہنی گیٹ پر متعینہ
صاحب سے بار بار اندر جانے کے لئے بحث ہوتی ہے
اور وہ بار بار یہی کہتا ہے کہ ری سیپشن سے اجازت لے
آئیے تب میں آپ کو اندر جانے دوں گا۔ میں یہ اختیار
نہیں رکھتا کہ آپ کو اندر جانے دوں۔ اس پر بھی ہر روز اُس
گیٹ پر متعلقہ شخص سے کئی بار ترش کلامی ہوتی ہے اگر ایسی صورت میں متعلقہ شخص
بھی تیز کلامی سے کام لے تو قصور کس کا ہے۔

اُردو اکاڈمی، دہلی کی علمی سرگرمیاں

ایوارڈ کمیٹی کے زیرِ اہتمام اکاڈمی حسبِ ذیل کام کرتی ہے

- صاحبِ فن قلم کاروں، صحافیوں اور شاعروں کی علمی خدمت کے اعتراف میں اُردو اکاڈمی ہر سال ایوارڈ دیتی ہے۔ ۸۴ء کیلئے یہ ایوارڈ خواجہ احمد عباس (۱۰۰۰۰/- روپے) پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، مفتی شوکت علی فہمی اور پنڈت آنند زتشی گلزار دہلوی کو (۵۱۰۰/- روپے) فی کس اکاڈمی کا تمغہ، سند اور شال (ہر ایک کو) دئے گئے۔
- نادار اور مستحق قلم کاروں یا پس از مرگ ان کے پسماندگان کی مالی امداد کے طور پر ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران اکادمی نے تین تین سو روپے ماہوار کے حساب سے ۱۱ پنشنز دی ہیں۔
- اس مد پر اس مالی سال میں ۳۹۶۰۰/- روپے خرچ کئے گئے۔

اُردو اکادمی ہر سال معیاری کتابوں کی تصنیف اور ان کی طباعت پر مصنفین اور ناشرین کو انعام دیتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت مالی سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں دس انعامات دو دو ہزار روپے کے اور چار انعامات ایک ایک ہزار روپے کے دیئے گئے۔

- دو دو ہزار روپے کے انعامات دو ناشرین کو اس سال معیاری کتابیں شائع کرنے پر دئے گئے۔ کل ملا کر اس مد پر ۲۸۰۰۰/- روپے کی رقم خرچ کی گئی۔
- کمیٹی کی سفارش کے مطابق اکادمی نے اس سال سے ضرورت مند اور مستحق قلم کاروں اور شعرا کی ہمت افزائی کے لئے ان کی تصنیف کی اشاعت میں مالی امداد دینا منظور کیا۔ اس مقصد سے ۱۶ افراد کو مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ اس مد پر ۷۵۰۰۰/- روپے خرچ کرنے کا تخمینہ ہے۔
- کمیٹی کی سفارش پر اُردو کے ایک نمایاں ماہنامے کی مالی امداد ۲۰۰۰/- روپے کا چیک بھیج کر کی گئی۔
- افسانہ ورکشاپ / سیمینار کا انعقاد مارچ ۱۹۸۵ء میں غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں ہوا جس نے بین الاقوامی نوعیت اختیار کر کے شایانِ شان شہرت حاصل کی۔
- کمیٹی کی سفارش پر اکادمی نے اس بات کی منظوری دے دی ہے کہ اکادمی اب تک منعقد ہوئے سبھی ادبی پروگراموں بالخصوص افسانہ ورکشاپ / سیمینار داغ دہلوی حیات اور کارنامے" اور "دلّی والے" کے موضوعات پر سیمینار میں پیش کئے گئے ادبی مضامین مقالے تجزیاتی مضامین اور کہانیوں کو کتابی شکل میں شائع کرے گی۔ ● دہلی کی مشترکہ تہذیب کے موضوعات پر دو کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا منصوبہ ہے۔ ● اُردو اکادمی کا ایک خبرنامہ بہت جلد منظرِ عام پر آجائے گا۔
- اُردو ادیبوں صحافیوں اور شعرا کی ایک ڈائرکٹری کی اشاعت کا بھی منصوبہ ہے۔

خلیل انجم کامٹی

قومی ایکتا مشاعرہ بھنڈارہ

سال گزشتہ کی طرح اس سال بھی قومی ایکتا دیوم ہورہے کی تقریب کے سلسلے میں مسلم لائبریری بھنڈارہ کے زیر اہتمام ایک کل ہند مشاعرہ ۲۶ ؍ جنوری ۸۶ء کی شب میں منعقد کیا جا رہا ہے ۔ مسلم لائبریری کا گراؤنڈ بقعۂ نور بنا ہوا ہے ۔ اسٹیج کو دلہن کی طرح سجایا گیا ہے اور پنڈال میں روشنی کا مناسب انتظام ہے ۔ پنڈال کے ایک طرف خواتین کے لئے خوبصورت طریقے سے انتظام کیا گیا ہے ۔ قومی یکجہتی کو فروغ دینے میں مسلم لائبریری بھنڈارہ کا رول بہت موثر رہا ہے ۔ اور جب سے بھنڈارہ ضلع کی قومی ایکتا کے صدر میونسپل کونسلر جناب بشیر پٹیل صاحب کی نگرانی میں مسلم لائبریری کا نظام آیا ہے ۔ مسلم لائبریری ترقی کی راہ پر گامزن ہے یہ بشیر پٹیل صاحب کی انتھک جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں لائبریری کی مستقل آمدنی کے لئے مزید پانچ دوکانیں لائبریری کے احاطہ میں تعمیر کی گئی ہیں جن کا افتتاح بھی آج ہی عمل میں آیا ہے ۔ اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ لائبریری کے گراؤنڈ پر ایک ایسا ہال تعمیر کیا جائے جو شادی بیاہ و دیگر تقریبات کے لئے کام میں آسکے ۔

بہر حال ! مشاعرہ گاہ اہل ذوق حضرات سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے ۔ جن میں کامٹی ، ناگپور ، گوندیا اور تمسر سے تشریف لائے ہوئے سامعین کی بھی ایک کثیر تعداد ہے ۔ مشاعرہ کی صدارت عالیجناب رلیش اوبالے سی ای او ضلع پریشد فرما رہے ہیں ۔ اور بنواری لال پروہت ۔ ایم پی ... کے منیجنگ ایڈیٹر اور جناب کیدارناتھ اکلم ڈپٹی کمشنر مہمانانِ خصوصی ہیں ۔ مہمانوں کی گل پوشی کی جا رہی ہے مگر یہ تقریب گل پوشی کا انکسار ہو رہی ہے ۔ نعیم خاں صاحب جو ابتدائی کارروائی کی نظامت کر رہے ہیں اُردو سے ناواقف ہیں اسی لئے وہ مہمانِ خصوصی کی جگہ "پرمکھ اتیتھی" تشریف لا رہے ہیں کی بجائے "پدھار رہے ہیں" استقبال کی جگہ "سواگت" اور صدر کی بجائے "[illegible]" وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کر رہے ہیں ۔ مشاعرہ کی تاخیر میں مزید اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے مگر سامعین بڑے صبر و ضبط کے ساتھ یہ سب برداشت کر رہے ہیں ۔ ابتدائی کارروائی ختم ہوتے ہی جوں ہی ثقلین حیدر صاحب کو مشاعرے کا آغاز کرنے کے لئے زحمت دی گئی سامعین نے پرزور تالیوں سے اپنی خوشی کا اظہار کیا ۔ ثقلین حیدر صاحب مائک پر آکر قومی یکجہتی اُردو اور جمہوریہ پر بڑی اچھی تقریر کر رہے ہیں جسے سامعین بڑے ذوق و شوق اور انہماک سے سماعت فرما رہے ہیں ۔ تقریباً پندرہ منٹ تک سامعین سے مخاطب رہنے کے بعد ثقلین صاحب نے مشاعرہ کا آغاز کرنے کے لئے حامد بھراچی کو آواز دی ۔ حامد بھرائچی اس علاقہ میں پہلی بار آئے ہیں ۔ جنھوں نے مائک پر آکر پہلے ایک قومی گیت اپنی مدھر آواز میں سنایا ہے ۔ گیت کا مکھڑا ہے ۔ یہ ہے میرا ہندوستان میرے سپنوں کا جہان ، مجھ کو پیارا ہے اس سے ۔ گیت ختم کرنے کے بعد حامد بھرائچی چھوٹی بحر میں ایک غزل سنا رہے ہیں اور داد وصول کر رہے ہیں ؎

پہلے میری وفا کا صلہ دیجئے

بعد میں چاہے مجھ کو سزا دیجئے

مطلع میں کوئی نئی بات تو نہیں ہے مگر خوش گلوئی کے سبب سامعین انھیں داد دے رہے ہیں اور حامد بھرائچی مست ہو کر سنائے چلے جا رہے ہیں ؎

بزم میں نور ہی نور ہو جائے گا

آپ اگر ایک پل مسکرا دیجئے

؎ یہ گیت تو پچھلی تہائی صدی سے جناب زبیر رضوی سے سن رہے ہیں اور ملک کے بیشتر رسائل [illegible] یہ منظر عام پر آچکا ہے جناب حامد بھرائچی نے اپنا بنالیا ۔ (ایڈیٹر)

میری نظریں ہیں دیدار کی منتظر
اپنے چہرے سے زلفیں ہٹا دیجئے

اور جب وہ اس شعر پر پہونچے تو پنڈال میں قیامت برپا ہوگئی ۔

شہر کو جن سے جلنے کے خطرات ہیں
ان چراغوں کو فوراً بجھا دیجئے

ماہ پارہ [illegible] غزل [illegible] سنا [illegible] مائیک سے لوٹ رہے ہیں۔ مشاعرے کا آغاز بہت اچھا ہوا ہے۔ ثقلین [illegible] اشعار کی [illegible] پیروڈی کر رہے ہیں تاکہ وہ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ شاعر نہیں ہیں۔ اسٹیج پر شعرائے کرام کے علاوہ [illegible] ہیں۔ ثقلین صاحب ماہ پارہ کے ایک شعر کی یوں پیروڈی کی جس پر ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا ۔

میری نظریں ہیں دیدار کی منتظر
منہ کر پیچھے کی جانب گھما دیجئے

ثقلین حیدر حسب معمول اپنے لطیفوں اور حاضر جوابی سے سامعین کو ہنسا رہے ہیں۔ اب فیروزآباد کی نوجوان اور مقبول صورت شاعرہ حنا تیموری کو آواز دی جا رہی ہے۔ لال شال اوڑھے حنا تیموری شائستگی کا پیکر نظر آ رہی ہیں مائیک پر غزل سرا ہیں ۔

[illegible] کشتی کا بیڑا لاؤں گی
[illegible] اٹھا لاؤں گی

اپ چراغ [illegible] ہاتھوں میں
تیرے ہاتھوں کی لکیریں بھی چرا لاؤں گی

حنا تیموری کامیاب رہیں تاہم اتنی کامیابی نہیں مل سکی جو انہیں ۲۱ دسمبر ۱۹۸۵ء کو انجمن عصری ادب کانٹی کے مشاعرے میں حاصل ہوئی تھی۔ غزل ختم کرکے سامعین کی فرمائش پر ایک گیت پیش کر رہی ہیں جس کے بول [illegible] بن [illegible] کی [illegible] ۔ گیت میں حنا کو کامیابی نہیں مل سکی ۔ ویسے میری نظر میں شاعروں کا اسٹیج گیت کے لئے موزوں نہیں ہے لیکن نہ جانے کیوں لوگ "گیت گیت" کی آوازیں لگاتے ہیں۔ حنا تیموری مائیک سے رخصت ہوئیں تو وشنو ناتھ جوشی صاحب کو آواز دی گئی جو ہندی کے مزاحیہ شاعر ہیں۔ جوشی صاحب اپنی طنز و مزاح بھری رچنا سے سامعین کو خوب خوب ہنسا رہے ہیں اور ماحول کو زعفران زار بنا رہے ہیں اپنی رچنائیں ختم کرکے جوشی صاحب تالیوں کی گونج میں مائیک سے رخصت ہو رہے ہیں۔ بیٹری کے کنوؤں پر جو کلینڈروں کی زینت بنتے ہیں ان پر جوشی جی نے خوب طنز کئے تھے اسی سے مطابقت رکھتے ہوئے ثقلین حیدر صاحب ایک شعر سنا رہے ہیں جسے سن کر آپ بھی ہنس پڑیں گے

قسمت کی بات دیکھئے آئے وہ کب کہ جب
بیٹری جلا رہے تھے چراغ سحر سے ہم

ماحول پھر سنجیدگی کی طرف لوٹ رہا ہے کیونکہ اب ایک ایسے شاعر کو آواز دی جا رہی ہے جو اپنی نظموں کے ذریعہ بقول ثقلین حیدر نئے ہندوستان کی تعمیر کر رہے ہیں یہ ہیں گلشن بھارتی جو مرادآباد سے تشریف لا رہے ہیں۔ گلشن بھارتی اپنی وضع قطع سے بھارتی تو بالکل نہیں لگ رہے ہیں بلکہ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے وہ برطانیہ یا امریکہ سے سیدھے یہاں پہونچے ہیں۔ یہ اپنی تازہ نظم "غلامی کا مزاج" گرجتی ہوئی آواز میں سنا رہے ہیں۔ ان کی نظم کا حاصل اقبال کا "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" ہے۔ جب پڑھ کر ہٹے تو ثقلین حیدر مائیک پہ آکر فرما رہے ہیں کہ ہندوستان اچھا تھا اب نہیں ہے۔ اس کی مثال انھوں نے ایک لطیفے سے یوں دی کہ ایک میڈم نے اپنے طالب علم سے پوچھا "بتاؤ میں خوبصورت ہوں" کا کیا [illegible] ہے"؟ طالب علم نے جواب دیا "تھی" جو لوگ سمجھ گئے وہ تو کھلکھلا کر ہنس پڑے مگر جن کے سمجھ میں نہیں آیا وہ ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں۔ اب جرار اکبرآبادی کو زحمت دی جا رہی ہے جرار اکبرآبادی وضع قطع سے شاعر تو ضرور لگ رہے ہیں لیکن سامعین سے داد لینے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان کا ترنم اچھا ہے مگر اشعار میں چند ایسے الفاظ کا استعمال انھوں نے کیا ہے جو ان کے مفہوم کو واضح نہیں کر پا رہے ہیں۔ مثلاً طبع پیران کا یہ مطلع دیکھئے ۔

دلش کی دھرتی بانٹنے والے کر نہ سکے بٹوارے من کے
روٹھ کے ان سے ہم نے ڈھونڈے جگ میں لاکھ سہارے من کے

سامعین بور ہو رہے ہیں مگر جرار صاحب سنائے چلے جا رہے ہیں۔ جب اپنی دوسری غزل کے بھی چند شعر سنا کر مائیک سے ہٹے تو ثقلین صاحب نے محترمہ ترنم کانپوری کو آواز دی حالانکہ ابھی ترنم صاحبہ کی باری میں کچھ اور تاخیر کی جا سکتی تھی مگر اس کی وضاحت کرتے ہوئے ثقلین صاحب کہہ رہے ہیں کہ ترتیب میں ترمیم صدر مشاعرہ کی درخواست پر کی جا رہی ہے کیونکہ صدر محترم تشریف لے جانا چاہتے ہیں۔ لیجئے ترنم کانپوری مائیک پر تشریف لے آئی ہیں سنئیے ترنم نے ترنم میں غزل چھیڑی ہے۔

کیا دشمنوں کو جان سے پیارا کہیں گے لوگ
تم کو نہیں تو پھر کسے اپنا کہیں گے لوگ

ایسا لگ رہا ہے گویا ترنم صاحبہ رات کے اس پُر کیف ماحول میں پوری کائنات سے مخاطب ہیں۔ اور جب وہ اس شعر پر پہنچیں تو مجمع بے قابو ہو گیا ؎

حیرت یہ ہے کہ خون بہانے کے بعد بھی
قاتل کو ہے یقین کہ مسیحا کہیں گے لوگ

ہر طرف سے "مکرر ارشاد" "مکرر ارشاد" کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اور ترنم صاحبہ اسی اعتماد و اہتمام کے ساتھ تعمیلِ حکم میں ارشاد کر رہی ہیں۔ ایسی ہی بلند آواز میں حضرت دل لکھنوی بھی اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ میرے دوست امتیاز احمد اور شیخ حفیظ صاحب بھی میرے اس خیال کی تائید کر رہے ہیں۔ ترنم صاحبہ بہت کامیاب جا رہی ہیں اور اب اپنی ایک تازہ غزل سنا رہی ہیں۔ اس میں بھی وہ خوب داد سے نوازی جا رہی ہیں۔ چند شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

کیوں نہ ہو پھر دامن آنسوؤں سے تر میرا
آہ رائیگاں میری نالہ بے اثر میرا
ذکر ہوتا رہتا ہے موڑ موڑ پر میرا
اہلِ دل کی دنیا میں ہے بہت اثر میرا
تیغ دست قاتل کی کہہ رہی ہے مقتل میں
انتظار کرنا ہے تجھ کو عمر بھر میرا

مفلسی میں بھی رکھی میں نے شرطِ خودداری
اپنے ہم نشینوں میں ہے بلند سر میرا
میرے شعر کو پڑھئے لہجۂ ترنم میں
میرے بعد محفل میں ذکر ہو اگر میرا

صدر مشاعرہ جناب ریش اوپالے صاحب تشریف لے جا چکے ہیں۔ اور ان کی جگہ محترم شمسی مینائی مسندِ صدارت پر رونق افروز ہو رہے ہیں۔ اب نظر ایٹوی کو زحمتِ سخن دی جا رہی ہے لیجئے نظر ایٹوی مائیک پر آ کر یوں غزل سرا ہیں ؎

راستہ فرار کا یوں نہ اختیار کر
موت کی طرف نہ جا زندگی سے پیار کر

مطلع اچھا ہے اور سامعین داد بھی دے رہے ہیں۔ ابھی نظر ایٹوی آگے بڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ شیشہ جس کے اندر شمع پگھل رہی تھی چھن سے ٹوٹ پڑا جس پر نظر ایٹوی صاحب فرما رہے ہیں کہ شیشہ بھی غزل کی آنچ کی تاب نہیں لا سکا۔ اس پر سامعین ہنس پڑے اور مجھے محترم حفیظ میرٹھی صاحب کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے
دل ٹوٹے آواز نہ آئے

بہرحال نظر ایٹوی نے ایک سماں باندھ دیا ہے اور مشاعرہ کامیابی کی منزل سے ہم کنار ہو رہا ہے۔ نظر ایٹوی اپنی مخصوص اسٹائل میں رواں دواں شعر سنا رہے ہیں اور سامعین سے داد کا تحفہ سمیٹ رہے ہیں ؎

ہم ہی راہِ عشق میں کوئی نقش چھوڑ دیں
سینکڑوں چلے گئے زندگی گزار کر
میرے لب پہ آ گئی ان کو دیکھ کر ہنسی
مطمئن تھے جو مجھے پتھروں سے مار کر

نظر صاحب غزل ختم کر چکے تو سامعین نے ایک اور ایک اور کا نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ "گیت گیت" کی آوازیں نہیں آئیں۔ بہرحال نظر صاحب ماحول کا جائزہ لے کر اپنی دوسری غزل سنا رہے ہیں ؎

جن سے معصوم خطائیں بھی نہیں ہوتی ہیں
ان کی مقبول دعائیں بھی نہیں ہوتی ہیں

تیری زلفوں کے مقابل میں کیسے پیش کروں
اتنی آوارہ گھٹائیں بھی نہیں ہوتی ہیں

اور جب اس شعر پر پہونچے ؎

وہ مجھے قتل سرِ شام بھی کر سکتا ہے
اب عدالت میں سزائیں بھی نہیں ہوتی ہیں

تو پنڈال میں "آہ اور واہ" کے شور و غل سے ہنگامہ بپا ہو گیا۔ بار بار شعر کو دہرانے کے بعد نظر ایٹوی آخر میں فرماتے گیا... ؎

ایک ہی جیسا نوازا نہیں جاتا سب کو
سب پہ یکساں [illegible] کبھی نہیں ہوتی ہیں

نظر ایٹوی بہت کامیاب اپنی غزل ختم کر کے رخصت ہو رہے ہیں۔ ثقلین حیدر ان کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے دریا بہتے بہتے رک گیا ہو۔ اور اب سامعین کا موڈ بدلنے کے لئے مشہور ظریف گو شاعر آفتاب لکھنوی کو زحمت دے رہے ہیں۔ آفتاب لکھنوی اب چراغ سحر ہو گئے ہیں۔ انھیں اب مشاعروں کی دنیا سے ریٹائر ہو جانا چاہئے۔ بہرحال آفتاب لکھنوی سامعین کو ہنسانے میں کامیاب ہیں۔ میں ان کا ایک ہی شعر ریکارڈ کر سکا۔ آپ بھی دیکھئے ؎

وہ مجھ سے ہنس کے جو بولے تو مجھ کو پیار آیا
پھر اس کے بعد کئی روز تک بخار آیا

آفتاب لکھنوی مائک سے کھسکے تو لکھنؤ کی نوجوان شاعرہ نسیم نکہت صاحبہ کو آواز دی جا رہی ہے۔ نسیم نکہت صاحبہ مائک پر آ کر پہلے چند متفرق اشعار تحت میں سنا رہی ہیں اور سامعین سے داد وصول کر رہی ہیں۔ اور اب اپنی اوقات پر اُتر آئی ہیں اور غزل سنا رہی ہیں ؎

ہم اپنے رشتوں کی تجارت نہیں کرتے
ہم لوگ دکھاوے کی محبت نہیں کرتے

سامعین بے تحاشا داد دیے چلے جا رہے ہیں اور نسیم نکہت بار بار مطلع دہرا رہی ہیں گرچہ یہ غزل چند ماہ قبل جامعہ نگر دہلی کے مشاعرے پر نسیم نکہت سنا چکی ہیں۔

داد کا شور کم ہوا تو نسیم نکہت پھر محفل کو گرمانے چلی ہیں ؎

ملنا ہے تو آ جیت لے میدان میں ہم کو
ہم اپنے قبیلے سے بغاوت نہیں کرتے

طوفان سے لڑنے کا سلیقہ ہے ضروری
ہم ڈوبنے والوں کی حمایت نہیں کرتے

پلکوں پہ ستارے ہیں نہ شبنم ہے نہ جگنو
اس طرح تو دشمن کو بھی رخصت نہیں کرتے

نسیم نکہت بہت کامیاب ہیں۔ غزل ختم کر کے سامعین کے اصرار پر ایک گیت سنا رہی ہیں جس کا عنوان ہے جہیز اور گیت کا مکھڑا ہے "یہ کیسا چنگلی بھر سیندور" گیت ختم کر کے نسیم نکہت مائک سے رخصت ہوئیں تو مقامی شاعر محمود خاں محمود کھنڈاروی کو آواز دی جا رہی ہے۔ محمود خاں نوجوان شاعر ہیں۔ محمود خاں مائک پر آ کر خوشگوار ترنم میں غزل سرا ہیں ؎

دوستوں سے مت رکھئے آرزو وفاؤں کی
ناریل کے پیڑوں سے کیا اُمید چھاؤں کی

سامعین داد دے کر نوجوان شاعر کا حوصلہ بڑھا رہے ہیں
محمود صاحب آگے بڑھ رہے ہیں ؎

ڈوب رہی تھی جب کشتی چیختے سمندر میں
ہنس رہی تھی ساحل پر بھیڑ ناخداؤں کی

جب محمود صاحب اولیٰ مصرع پڑھ رہے تھے تو چند اہل ذوق ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ مجھے بھی مصرع کھٹکنے لگا۔ تو امتیاز صاحب سے آہستہ سے کہہ رہا ہوں کہ مصرع یوں ہونا چاہئے ؎ "ڈوبتی تھی جب کشتی چیختے سمندر میں" [illegible] غزل میں ان کا یہ مصرع بے اثر ہے کیوں آخر تاثیر [illegible] خارج از بحر ہے۔ محمود صاحب شاد و ناشاد مائک [illegible] رخصت ہوئے تو ثقلین صاحب مائک پر آ کر محمود صا[حب کو] مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ غزل کہنے کے بعد کسی استاد [سے اصلاح] کریں۔

اب ڈاکٹر ساغر اعظمی صاحب سے درخواست کی جا[رہی ہے] سامعین پھر سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں پنڈال میں خاموشی [طاری] ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر ساغر اعظمی مائک پر آئے تو رات

بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ سب کی نگاہیں مائیک کی
طرف لگی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر ساغر اعظمی ویسے بھی خوش پوش
اور جاذب نظر شخصیت کے مالک ہیں۔ ماحول پر ایک نظر ڈال
کر غزل سرا ہیں ؎

لفظ میں دل کا درد سمو دو حسنِ غزل بن جائے گا
پتھر کو آنسو دے دو تو تاج محل بن جائے گا

رات کا دامن نم ناک ہو چلا ہے۔ پنڈال ہرا بھرا ہے تِل دھرنے
کی جگہ نہیں ہے اور جوں ہی ساغر اعظمی نے غزل کے تاروں
کو چھیڑا "واہ وا" اور "سبحان اللہ" کے شور و غل سے پنڈال میں
طوفان مچ گیا۔ لہراتا ہوا ترنم۔ دل لوٹنے کی ادائیں اور نوجوان
دلوں کو گھائل کرنے کا ہنر ڈاکٹر ساغر اعظمی خوب جانتے ہیں۔
گویا آواز تری گیسوئے شب کھول رہی ہے کی تفسیر بن گئے
ہیں۔ داد کا ہنگامہ کم ہوا تو ارشاد کر رہے ہیں ؎

گاؤں کی کچی دیواروں سے پوچھ رہا تھا کل کوئی
کتنے گھر ڈھائے جائیں تو ایک محل بن جائے گا

مجمع پھر بے قابو ہوا جا رہا ہے۔ سامعین جھوم جھوم کر شاعر
کو داد و تحسین کے پھولوں سے نواز رہے ہیں۔ مشاعرہ پوری طرح
اپنے شباب پر ہے۔ داد و تحسین کا ہنگامہ کم ہوا تو ساغر اعظمی پھر
محفل کو گرما رہے ہیں۔ دو شعر اور ڈاکٹر ساغر اعظمی ایک
غزل سنا رہے ہیں ؎

پاؤں میں ہیں زنجیریں اور زباں پہ تالے ہیں
آج ہم نہ جانے کیا ان سے کہنے والے ہیں

داد اس مطلع کا حق ہے۔ شاعر اپنے ماحول کی بھرپور عکاسی
کر رہا ہے اسی لئے کامیاب بھی ہے۔ ساغر صاحب نے مجمع
پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور ارشاد کر رہے
ہیں ؎

مفلسی کی دھوپ اس کا گھر جلا کے چھوڑے گی
جس نے اپنے آنگن کے پیڑ بیچ ڈالے ہیں

اور اب وہ شعر سماعت فرمائیں جس کو سنانے سے پہلے ڈاکٹر
ساغر اعظمی دعویٰ کر رہے ہیں کہ اگر اس شعر پر بھرپور داد نہ
ملی تو وہ یہ سمجھیں گے کہ شعر کمزور ہے ؎

جس نے کل ہزاروں کی قسمتیں خریدی تھیں
آج اس حویلی کے دام لگنے والے ہیں

پنڈال میں ایسا ہنگامہ ہوا کہ مشاعرہ گاہ کی چھت اڑنے
لگی اور ڈاکٹر ساغر اعظمی بار بار اس شعر کو دوہرانے کے
بعد اسی اعتماد کے ساتھ فرما رہے ہیں ؎

جن کے واسطے اپنا گھر سجا رہا تھا میں
سن رہا ہوں وہ میرا گھر جلانے والے ہیں
ماں کی لوریاں ان کو اب سُلا نہ پائیں گی
یہ اداس بچے تو وقت کے حوالے ہیں

غزل ختم کر کے ڈاکٹر ساغر اعظمی کچھ متفرق اشعار سنا رہے
ہیں اور خوب خوب کامیاب ہیں۔ اس وقت رات کے تین بجا
چاہتے ہیں۔ ساغر اعظمی مشاعرہ لوٹ کر چلے گئے تو ہم لوگ بھی
چائے کے لئے باہر نکل آئے۔ ابھی بھی ہزاروں کی تعداد میں سامعین
جمع ہیں اور لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ہندی کے کوی وسنت
دیوان جو ڈاکٹر ساغر اعظمی کے بعد آئے کامیاب ہیں۔ مگر افسوس
کہ میں ان کا کوئی بند نوٹ نہیں کر سکا۔ مقامی شاعر شاکر بھنڈاروی
بھی آ کر سامعین کو محظوظ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا یہ شعر
بہت پسند آیا ؎

میں شاخ شاخ پہ رکھ دوں گا زخمِ دل کا چراغ
اگر بہار کا موسم اِدھر سے گزرے گا

اب مشاعرے کی ایک ہی شاعرہ رہ گئی ہیں۔ یہ ہیں ہما
پروین جو لکھنؤ سے تشریف لائی ہیں جوں ہی ان کے نام کا اعلان
ہوا لوگ پھر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ہما پروین کو گرچہ مشاعرے میں
پہلی بار سن رہا ہوں مگر ان کی کچھ غزلیں میری نظر سے گزر
چکی ہیں۔ ان کا ایک خوبصورت شعر میں کبھی نہیں بھول سکتا
جسے میں کبھی کبھی اپنے خطوط میں استعمال کرتا رہتا ہوں۔ شعر
آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے درج کر رہا ہوں ؎

بہت دنوں سے تمنا ہے اے بہارِ چمن
نواز دے کبھی میرے غریب خانے کو

ہما پروین مائیک پر آ کر چند قطعات کہتے ہیں سنا کر
کی بیداری کا امتحان لے رہی ہیں۔ سامعین امتحان میں

ہیں۔ اب ہما پروین ترنم میں غزل سنا رہی ہیں۔ ان کے ترنم میں مشرقیت ہے۔ داد مطلع ہی سے عروج پر ہے ؎

بہکنے والے اچانک سنبھل گئے کیسے؟
چراغ تیز ہواؤں میں جل گئے کیسے؟

ان کے پڑھنے کا انداز بھی خوب ہے۔ مطلع دوہرا کر پھر محفل کو گرم کر رہی ہیں ؎

جو دوسروں کے گھروں کو جلانے نکلے تھے
یہ کیا ہوا یہ مکان اُن کے جل گئے کیسے؟

ہما پروین سیدھے سادے اور عام فہم زبان میں اچھے اور بامعنیٰ اشعار سنا رہی ہیں اس لئے کھل کر داد مل رہی ہے اور اس شعر نے تو قیامت کا روپ اختیار کر لیا ہے ؎

دہکتی آگ میں تو میں نے ہاتھ ڈالا تھا
میں بچ گئی ہوں ترے ہاتھ جل گئے کیسے؟

شعر بار بار دوہرانے کے بعد ہما پروین۔ پھر ایک دھماکہ خیز شعر سنا رہی ہیں۔ دیکھئے ؎

تمام عمر جھٹکتی رہی میں ہاتھوں کو
پھر آستینوں میں یہ سانپ پل گئے کیسے؟

میں سمجھتا ہوں اسی شعر کے لئے ہما پروین کو پوری غزل کہنی پڑی ہوگی۔ اب مقطع پر آ گئی ہیں ؎

یہ جانتے ہوئے وہ جھوٹ بھی تو لکھتے ہیں
ہما ہم ان کے خطوں سے بہل گئے کیسے؟

ہما پروین بہت کامیاب ہیں۔ غزل ختم کر کے رخصت ہونا چاہتی ہیں۔ مگر سامعین کے اصرار نے ان کے پیروں میں بیڑی پہنا دی۔ اپنی دوسری غزل میں بھی وہ کامیاب ہیں۔ اس غزل کے جو اشعار سامعین نے پسند فرمائے انھیں آپ بھی سماعت فرمائیں ؎

کبھی دل میں کبھی خوابوں میں کبھی پلکوں پر
آپ کے غم نے بھی بدلے ہیں ٹھکانے کتنے؟
بجھنے والے کی تو پرسش پہ کبھی آتے ہیں
ڈوبنے والے کو آتے ہیں بچانے کتنے؟
دور تک کوئی نہیں شمع جلانے والا
آج نکلے ہیں یہاں شہر جلانے کتنے؟

میرا غم آپ کا غم وقت کا حالات کا غم
آج آئے ہیں مجھے اپنا بنانے کتنے؟

ہما پروین داد سمیٹے مائیک سے شاداں و کامران لوٹ رہی ہیں۔ اب شاداں بارہ بنکوی کو زحمت دی جا رہی ہے۔ شاداں صاحب گرچہ اچھے ترنم میں پڑھ رہے ہیں مگر زیادہ داد وصول نہ کر سکے۔ ان کے یہ دو شعر بڑی مشکل سے نوٹ کر سکا ؎

بال ہوئے جب چاندی اپنے تب ہم نے یہ جانا ہے
زندہ رہنا آج کے یگ میں پتھر سے ٹکرانا ہے
خوشحالی میں شام و سحر جو آ کے دعائیں دیتا تھا
وقت پڑا تو شاداں اس نے مشکل سے پہچانا ہے

چلو، کسی نے انھیں پہچان تو لیا، یہی کیا کم ہے۔ اب ارمان وارثی صاحب کو زحمت دی جا رہی ہے جو جوڑیوں کے شہر فیروزآباد سے تشریف لائے ہیں۔ اس کے پہلے میں نے انھیں کٹک میں سنا تھا ارمان صاحب وہی غزل سنا رہے ہیں جو انھوں نے کٹک کے مشاعرے میں سنائی تھی۔ بہر حال ارمان وارثی بہت کامیاب ہیں۔ مطلع سماعت فرمائیے ؎

ہر دعا بے اثر ہو گئی ٭ وہ نہ آئے سحر ہو گئی

اس وقت صبح کے چار بج رہے ہیں مگر سامعین کے ذوقِ سماعت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ برابر داد دیے جا رہے ہیں اور ارمان وارثی صاحب بڑے اعتماد کے ساتھ اشعار کر رہے ہیں ؎

بس ذرا مسکرایا تھا میں ٭ بلا میرے سر ہو گئی

پنڈال پھر "واہ وا" کے ہنگاموں سے گونج رہا ہے۔ ارمان صاحب متفرق اشعار سنا رہے ہیں۔ لیجئے وہ پھر ایک دوسری غزل کے شعر سنا رہے ہیں اور داد وصول کر رہے ہیں۔ دو آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

خوشی چاہتے ہیں نہ غم چاہتے ہیں
تمہاری نگاہِ کرم چاہتے ہیں
تمہاری رضا میں ہماری رضا ہے
جو تم چاہتے ہو وہ ہم چاہتے ہیں

اب ارمان صاحب گیت سنا رہے ہیں۔ گو وہ بہت کامیاب ہیں اور سامعین ان کے ہر بند پر

رہے ہیں۔ میں گیت کا کوئی بند نوٹ نہیں کر سکا۔ گیت کا ٹکڑا ہے ؎

جیون موت کا کھیل ہے پگلے کاہے رونا دھونا رے
جگتی رام نے بھر دی چابی اتنا ناچے کھلونا رے

ارمان صاحب بہت کامیاب مائیک سے رخصت ہوئے ہیں۔ اور اب بڑے احترام وادب کے ساتھ صدر محترم جناب شمسی مینائی کو زحمت دی جا رہی ہے۔ اب پنڈال میں وہ لوگ زیادہ ہیں جو اطراف کے شہروں یا دیہاتوں سے مشاعرہ سننے کی غرض سے آئے ہیں۔ شمسی مینائی متفرق اشعار سنا رہے ہیں۔ سامعین بڑی توجہ سے انھیں سماعت فرما رہے ہیں۔ اشعار سنانے کے بعد شمسی صاحب ایک نظم سنا رہے ہیں۔ شمسی صاحب نظم کے بہترین شاعر ہیں۔ اور مشاعروں میں بہت مقبول ہیں۔

اس طرح ساڑھے چار بجے مشاعرے کا پہلا دور ختم ہوا۔ اگر مشاعرہ وقت پر شروع ہوتا تو اب تک دوسرا دور بھی ختم ہو چکا ہوتا۔ دوسرے دور میں حنا تیموری، ترنم کانپوری، نسیم نکہت، ہما پروین اور ڈاکٹر ساغر اعظمی ہی کو موقع مل سکا۔ اور اس طرح ساڑھے پانچ بجے فجر کی اذان کے ساتھ یہ مشاعرہ اختتام کو پہنچا۔ مشاعرہ میں وہ تمام شعراء و شاعرات نے شرکت فرمائی جن کے ناموں کا اعلان اشتہاروں اور اخبارات کے ذریعہ کیا گیا تھا۔ سوائے بنارس کی شاعرہ وسیما مشرا کے۔ بہرحال مشاعرہ بہت کامیاب ہوا۔ جس کے لئے منتظمین صاحب اور دیگر منتظمین مشاعرہ میں شمیم خاں، نعیم الرحیم اور اللہ خاں وغیرہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

فارم ۴ بابت ملکیت وغیرہ رول ۸

۱۔ نام رسالہ ——— شانِ ہند
۲۔ مقام اشاعت ——— فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
۳۔ میعاد اشاعت ——— ماہنامہ
۴۔ پرنٹر پبلشر، ایڈیٹر اور مالک ——— وِد یا پرکاش سرور
۵۔ قومیت ——— ہندوستانی
۶۔ پتہ ——— فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

میں ودیا پرکاش سرور مالک پرنٹر پبلشر ماہنامہ شانِ ہند اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست اور صحیح ہیں۔

ودیا پرکاش سرور
۲۸ فروری سنہ ۱۹۸۶ء

لفظوں کا قتلِ عام اور گیلے حرف کے افسانے

طاہر تونسوی

نیا افسانہ پرانے افسانے سے انحراف کی ایک صورت ہے۔ اس لئے آج کا افسانہ نگار نہ تو پلاٹ میں گرہیں ڈالتا ہے کہ کہانی پن اور دلچسپی کا عنصر قائم رہے اور نہ ہی اُن گرہوں کو خود بخود کھولنے لگ جاتا ہے بلکہ وہ چونکانے کے طریقے کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ آج کا افسانہ نگار زندگی کے ایک پہلو کا انتخاب کرتا ہے اور پھر علامت کے حوالے سے فنی مہارت کے ساتھ بیان کرتا ہے وہ صرف خرابیوں کی نشان دہی کرتا ہے حل نہیں بتاتا یوں آج کا فن کار قاری میں صرف بے بسی کا احساس پیدا کر دیتا ہے اس سارے تخلیقی عمل میں علامت ایک پُل کا کام دیتا ہے۔ اگر علامت رابطے کا کام نہ دے سکے تو کہانی رائیگاں جاتی ہے اور افسانہ نگار خود اپنے پیدا کردہ ابہام کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں قاری کو علامتی افسانے سے ابلاغ نہ ہونے کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ اس اختلافی مسئلے پر کافی بحث ہو چکی ہے اس لئے میں اس میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ علامتی افسانہ نگار کو جناتی علامتیں برتنے کی بجائے زمینی علامتیں استعمال کرنی چاہئیں۔ تاکہ قاری اور فن کار کا رشتہ برقرار رہے اور آج کا فن کار اگر مفہوم کو قاری کے ذہن میں نہ بٹھا سکے تو کم سے کم احساس تو منتقل کر دے۔ افسانہ صولت نے علامتی افسانہ نگار ہونے کے باوجود اس بات کو نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ ایسا کر بھی دکھایا ہے یہی وجہ ہے کہ اُس کے سترہ افسانوں کا احساس قاری کے ذہن میں منتقل ہو جاتا ہے۔

گیلے حرف کے افسانے دو خانوں میں بٹے ہوئے ہیں زندگی کے خلاف کہانیاں اور زندگی کے لئے [illegible] کہانیاں۔ زندگی کے خلاف کہانیاں یاسیت کا پرتو لئے ہوئے ہیں اور زندگی کے لئے کہانیوں میں خوشگواریت کا احساس ہے۔ ایک میں بیشی اور ایک میں کمی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ افسانہ نگار کا رویہ زندگی کے خلاف زیادہ شدید ہے۔ ان کہانیوں کے تجزیاتی مطالعے سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں اُس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے

گیلے حرف :۔ آشوبِ ذات کی تنہائی اور محرومی کے حوالے سے اجتماعی کرب کا نوحہ ہے۔

نہ میں نہ تو پھر کون :۔ بوٹیوں میں بٹی ہوئی ذات کے پس منظر میں انسان کی آپس میں نفرتوں پر بھرپور طنز ہے۔

نور کا ظہور :۔ معاشرے اور سوسائٹی کے منافقانہ رویئے کے خلاف بھرپور احتجاج ہے۔

آدھی رات کی دھوپ :۔ خیر و شر کی تفریق کا بیباکانہ اظہار ہے۔

بھنگی :۔ سماجی ناانصافی پر گہرا طنز ہے۔

آگ مٹی اور پانی :۔ انسانی اقدار کے مٹ جانے کا ماتم ہے۔ دھرتی کے اناج پیدا کرنے کی بجائے بارود اگانے کے المیہ کا اظہار ہے۔

آج کا نوحہ :۔ عنوان کے حوالے سے یہ انسان کی اپنی ذات سے دشمنی کا بیان ہے کہ آدمی کا [illegible]

درد کا زرد سمندر :۔ آج کے ادیب کی [illegible] ہے وہ جس طرح ناقدریٔ زمانہ کا شکار ہے اور [illegible] کی صلیب پر لٹکا ہوا ہے۔ اس کا موضوع ہے۔

ڈم کٹا انسان :۔ رنگ و نسل کے امتیاز [illegible] بڑھے لوگوں کے پس منظر میں استحصالی قوتوں کے ہتھکنڈوں [illegible] کی کہانی ہے۔

صاحبِ حال مولوی، مفتی، حکیم، حاجی محمد عمران نور اللہ مرقدہٗ

۱۹۸۶ء

منجانب عماد الدین خاں م آو سعیدی
۱۴۰۶ھ

لحدِ قاضی محمد عمران

۱۴۰۶ھ

مسلسل خزینہ اشعار

ہے واقعی یہ نازشِ ہندوستاں کی موت
جاکر جو پاک میں ہوئی عمران خاں کی موت

ہر آنکھ میں ہے اشک ہر اک لب پہ ہے فغاں
عالم کی موت ہوتی ہے سارے جہاں کی موت

اس طرح رو رہا ہے ہر اک پیر ناتواں
جیسے کہ ہو گئی ہو کسی نوجواں... کی موت

مغموم لوگ ہیں اور بھی سب میکشانِ علم
کس وقت اور کہاں ہوئی پیرِ مغاں کی موت

کیسے نہ ہوگا گلشنِ دینِ متیں اداس
صحنِ چمن میں ہو گئی جب باغباں کی موت

تبلیغِ دینِ حق میں جو مصروف تھا مدام
اے دینِ حق ہوئی ہے ترے پاسباں کی موت

تیرہ ہی جنوری کو گیا تھا یہاں سے پاک
تیرہ ہی فروری کو ہوئی جانِ جاں کی موت

اے ارضِ پاک زیر ہے وہ مردِ حق
روزِ ازل سے جس کے لئے تھی یہاں کی موت

حکمت مآب فاضل شرعِ محمدی
اللہ نے نصیب میں لکھی کہاں کی موت

دکھلا کے ہند میں وہ مسیح الزمانیاں
پھر پاک میں ہوئی ہے مسیح الزماں کی موت

فیضانِ ذوالجلال کے قربان جائیے
عرفانیت کے ساتھ ہے عمراں خاں کی موت

عامر ہوں یا عمر ہوں کہ عارف ہوں جیتے جی
کیسے بھلائیں گے پدرِ مہرباں کی موت

رو رو کے کہہ رہے ہیں ہر اک سے حبیبِ دیں
کیسی ہوئی یہ حامیٔ بیچارہ گاں کی موت

کہتے ہی ہیں ٹونک کے سب عالمانِ دین
عمران خاں کی موت ہے سب ہمرہاں کی موت

غم سے زبوں ہے مفتی احمد حسن کا حال
جب سے سنا ہے ہو گئی عمران خاں کی موت

گریاں کناں ہیں قاضی و منظور اس طرح
جیسے ہوئی ہو حاصلِ عمرِ رواں کی موت

اک مولوی سعید کی آنکھیں نہیں ہیں نم
ہے موت تیری کشورِ ہندوستاں کی موت

مغموم ہو کے کہتے ہیں مرزا رفیع بیگ
اے موت یہ ہے ہند کے رفعت نشاں کی موت

صدمے سے اُن کے حضرت شوکت ہیں جاں بلب
جاں کاہ اُن کے حق میں ہے عمران خاں کی موت

اک ٹونک ہی نہیں ہے ترے غم میں سوگوار
ہے موت تیری عالمِ ہندوستاں کی موت

آئے گی یوں تو موت ہر اک شخص کو مگر
اے موت یہ ہے نائبِ پیغمبراں کی موت

آہ بزرگار خُلدِ بریں دے اسے م آو
دینِ محمدی کے سے ... کی موت

تین عورتیں، تین کہانیاں

زندگی کے اس سفر میں کبھی.....

بات انہونی سی لگتی ہے اور عجیب سی لگتی ہے۔ سترہ سال سے
ایک سال تک کے میرے سارے کے سارے نو بچے ساتھ تھے۔
جب بھی سفر کرتی تو ٹرین کی دوسری عورتیں حیران ہو کر پوچھا کرتی تھیں،
کیا یہ سب بچے تمہارے اپنے ہیں ۔ ؟ میں جواب دیتی۔ کچھ میرے
شوہر کی پہلی بیوی کے ہیں اور کچھ میرے پہلے شوہر کے ہیں۔ حالانکہ
میں اپنے شوہر کی واحد بیوی تھی۔ اور وہ میرے واحد شوہر تھے۔
اس بار جب میں سفر میں تھی۔ تھرڈ کلاس کا کمپارٹمنٹ تھا اور
بری طرح بھرا ہوا تھا۔ عشرہ محرم گزارنے ہم لوگ [illegible] اپنے قصبے
جاتے تھے۔ گورنمنٹ ملازمت کی وجہ سے پوسٹنگ مختلف جگہ ہوتی
رہتی تھی۔ ان دنوں بنارس میں تھی۔ ٹرین جس اسٹیشن پر رکتی
میں ایک شخص کو اپنے کمپارٹمنٹ کے سامنے اسٹیشن پر دیکھتی
اچھی شکل اور اوسط قد و قامت کا آدمی تھا۔ کئی بار دیکھنے
کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

میری شادی کو بائیس سال گزر چکے تھے۔ بارہ بچے ہوئے
تھے۔ گھر کی مرغی تو بیوی ایک ہی سال میں ہو جاتی ہے عام سی
زندگی تھی ۔ شروع شروع میں میں نے بھی معیاری بیوی بننے
کی کوشش کی تھی ۔ بچوں کو صاف رکھنے اور وقت پر انہیں
کھلانے پلانے، سلائی، کڑھائی اور پکانے میں مہارت
حاصل کرنے کی۔ لیکن جب لاتعداد بچے ہو گئے۔ آمدنی اس
تناسب سے بڑھتی نہیں ۔ میں کچھ بھی کروں میاں اس کو میرا
فرض یا عام بات سمجھ کر کسی قدر کا اظہار یا تعریف نہ کرتے
تھے۔ ہر وقت میری گود یا کوکھ میں بچہ ہوتا تھا۔ میں نے بھی بور
ہو کر زندگی کو ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ ضرورت سے کم رقم دے کر
فضول خرچی یا بدانتظامی کا الزام۔ خود بھی بچوں کی تعلیم و تربیت
میں عملی حصہ نہ لے کر صرف اعتراض کرتے رہنا۔ [illegible]
کرنے کی کوئی کوشش نہ کرنا۔ یہ رویہ تھا میرے شوہر کا۔

ہمارا قصبہ آگیا۔ ہم سب تانگوں میں بیٹھ کر اپنے گھر پہنچے
بارہ دن ٹھہرے اس کے بعد کی بات ناقابل یقین معلوم ہو
واپسی کے دن وہی شخص اسٹیشن پر موجود تھا۔ جس ٹرین سے
ہم لوگ واپس جا رہے تھے۔ وہ بھی اسی میں سوار ہو گیا۔ جہاں
جہاں ٹرین رکتی وہ ہمارے کمپارٹمنٹ کے سامنے آکر کھڑا
ہو جاتا۔ میرے شوہر دوسرے کمپارٹمنٹ میں تھے اس لئے کوئی
شک نہ رہا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ سفر ختم ہوا۔ بنارس
آگیا۔ ہم پھر تانگوں میں سوار ہو کے اپنے گھر آپہنچے۔ کئی دن ان
نگاہوں کا خیال مسلسل آتا رہا۔

میرے شوہر تعلیم نسواں کے بھی خلاف تھے لڑکیوں کو
اسکول جانے نہیں دیتے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ لڑکیاں تعلیم
حاصل کر لیں۔ بڑی لڑکی کوئی تیرہ سال کی تھی۔ پردے کا
بھی رواج تھا۔ بیچ میں پردہ ڈال کر پڑھوانے کی کوشش
کی۔ لڑکی نے ایک دن کہا کہ میں اس ماسٹر سے نہیں پڑھوں
اور میرے بہت پوچھنے پر بتایا کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔
مجھے ایک عیسائی خاتون کا پتہ لگا جو پرائیویٹ پڑھایا کرتی
تھیں۔ مگر ان کے گھر پر جا کر پڑھنا ہوتا تھا۔ میں نے [illegible]
کر لیا کہ چاہے مجھے خود اس کے ساتھ جانا پڑے۔ لڑکی کم
سے کم میٹرک کا امتحان تو دے ہی دے۔ جو رکشا میرے
شوہر کو کچہری پہنچانے کے لئے آیا کرتا تھا۔ سامنے
باندھ کے میں لڑکی کو لے کر جاتی تھی۔ اسی رکشا
ایک دن رکشا میں رکوا کر ایک دکان سے کچھ
خریدنے لگی۔ وہی ٹرین والا شخص کسی دن سائیکل پر
اسی دکان سے کچھ خرید رہا تھا۔ پھر اس نے رکشا کے سا

نا شروع کر دیا اور گھر تک آیا۔ گیں، اور لڑکی اُتر کر گھر
چلے گئے۔ میں پھر باہر نکلی اور گملے میں ایک پرچہ پڑا پایا
پر پتہ لکھا تھا۔ اب مجھ پر منحصر تھا کہ بات ختم کر دوں یا
ھاؤں۔

میں جو بارہ بچوں کی ماں تھی۔ لڑکیاں جس کی جوان ہو رہی
ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ شوہر اب حسن و جمال کی تعریف اور اچھے
نے کے دور سے گزر چکے تھے۔ اس خیال سے کہ مجھے دیکھ کر
ی وارفتہ ہو سکتا ہے۔ میں بہک گئی۔ اور غلط راہ اختیار
...... اس نے لکھا کہ بچے سمجھ دار ہیں اُن پر بُرا
ر پڑے گا۔ شوہر تک بات پہنچی تو کیا ہو گا۔؟ سب کچھ
ول کر اسی رکشا والے سے خط بھجوانے لگی۔ جو میرے
ہر کے لانے لیجانے پر مقرر تھا۔

اُن دنوں میری سوچ بھی بہک گئی تھی۔ سوچتی تھی تو کیا کہ
یاں کی نظر میں پھوہڑ ہوں، فضول خرچ ہوں تو کیا کسی کی نظر میں
بت کے لائق تو ٹھہری ہوں۔ اب میں اچھے اچھے کپڑے پہن
برآمدے میں کھڑی رہتی اور ایم۔ اسلم سڑک کی دوسری جانب
خت کے نیچے سائیکل روک کر کھڑا دیکھتا رہتا تھا۔ اس نے
ے اپنے پہلے خط میں لکھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پہلی نظر میں
نے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ ۲۰ دن قصبے کے اسٹیشن پر
پس جانے والی ہر ٹرین کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم لوگ
ئے تھے۔ بات ختم ہو گئی۔ مگر قسمت نے دوبارہ دکھلا
ر پہچان گیا۔

پردے کی پابند اور قدامت پسند گھرانے کی تھی
ھا تو ایک طرف اُس سے ملنے جانے لگی۔ اور اس کشا
یں میرے شوہر آتے جاتے تھے۔ بچی کی حفاظت
ساتھ جاتی تھی اور خود یہ حرکت کرتی تھی۔ بچی پڑھنے
رمیں دیوار کے پاس جا کے اس سے باتیں کرنے لگتی۔
ماطے میں ایک مسلم فیملی رہتی تھی — مجھے پتہ چل گیا۔
الطہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ایم۔ اسلم
ہے۔ بعد میں ویسے بھی معلوم ہو ہی جاتا۔ بڑی بچی
تحان ہو رہے تھے۔ میں ساتھ جاتی تھی۔ بچی، امتحان

ہال میں چلی جاتی۔ اور وہ اور میں تین گھنٹے باتیں وغیرہ کرتے
رہتے۔ ایک دن بچی پرچہ حل کر کے جلدی آگئی۔ وہ اٹھ
کر سائیکل لے کر بھاگا اور میں بھی گھبرا گئی ......

عام طور پر پوسٹنگ چار سال کی ہوتی تھی۔ مگر بنارس سے
سال بھر ہی میں کانپور تبادلہ ہو گیا۔ میرے شوہر چلے گئے مجھے اور
بچوں کو بعد میں جانا تھا۔ اسکول کا سال ختم کرا کے۔ اس کو میں نے
بتا دیا تھا کہ کسی ٹرین سے جانا ہے وہ بھی اس ٹرین پر پہنچا۔
ایک شخص اس کے پاس آیا اور بولا۔

"کہاں جا رہے ہو۔ ہلسی دھر؟" فرقو یہ تھی ایم اسلم کی حقیقت)
تمام راستہ میں کمپارٹمنٹ کی کھڑکی سے چہرہ نکالے
روتی رہی۔ یہ چند ماہ میرے لئے نئی زندگی کی طرح تھے۔ کوئی
تھا جو مجھے اپنی محبت کا مرکز سمجھتا تھا۔ میں جس کی نظر میں صرف
بچوں کی ماں اور گھر والی نہیں تھی، آہ آگے فراق کی گھڑیاں
تھیں۔ مجھے اُس کے مقابلے میں اپنے شوہر اور بچے بھی غیر لگنے
لگے تھے۔ اُس سے ملنے جلنے کے لئے میں نے گھر سے قدم نکالا
بازار اور راستے دیکھے۔ کانپور میں بھی وہ ہمارے گھر تک ساتھ
ساتھ گیا۔ بچے بھی اُس کو پہچاننے لگے تھے۔

ٹرین میں ایک اینگلو انڈین نرس تھی اس نے پوچھا تھا کیا
یہ ان لوگوں کے ڈیڈی ہیں۔؟ اور بچے اسے ڈیڈی مذاقاً کہتے تھے
آپس میں۔ وہ کانپور بھی مجھ سے ملنے آنے لگا۔ تب بات میرے
شوہر تک پہنچ گئی۔ انھوں نے باز پرس کی اپنے طور پر وہ مجھ سے
محبت کرتے تھے اور گھر کی عزت کا معاملہ تھا۔ میں نے ایم اسلم
سے کہہ دیا کہ اب میں تم سے نہیں ملوں گی۔ شوہر سے بھی وعدہ کیا
کہ آئندہ صحیح راستے پر رہوں گی۔ معافی بھی مانگی۔ مگر پھر بھی بات
پہلے جیسی نہ بن سکی۔ گھر میں پہلے بھی ہمیشہ سمجھتی تھی کہ اخراجات
کے لئے رقم کم ہو جاتی ہے۔ افراتفری مچی رہتی تھی۔ بچوں میں
تنظیم و تربیت صحیح نہیں تھی۔ بغیر عملی مثال کے وہ کسی کی
طرف دیکھتے شوہر سے تعلقات خراب سے خراب تر ہونے لگے
لڑکیوں نے تعلیم نسواں تو حاصل کر لی مگر تربیت نسواں سے
محروم رہیں خود ہی یونیورسٹی سے لڑکے پسند کر کے مختلف
عقیدے کے لوگوں سے شادیاں کر لیں۔

لڑکے بھی کوئی خاص مقام حاصل نہ کرسکے بس کھانے پینے بھر کا کما لیتے ہیں۔ ایک لڑکی گھر سے فرار ہوئی تھی غلوت ہے وکاج کرکے امریکہ میں ہے۔ ایک لڑکے نے خودکشی کرلی۔ شوہر کا انتقال ہوگیا۔ آخر تک ان سے تعلقات خراب تھے۔ خاندان نیک نام نہ رہا۔ بچوں میں نہ آپس میں محبت ہے نہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ جہاں جہاں پڑی رہتی ہوں روٹی مل جاتی ہے۔

اب پچھتاوے پرورش کرتے ہیں کاش میں نہ بھٹکتی اور گھر شوہر اور بچوں کی دیکھ بھال پر پوری توجہ دیتی کچھ نہ ہے تو اس وقت سمجھدار تھے ان کو اب تک یاد ہے میں کوئی کمسن بچی نہیں تھی۔ اس کے بعد میرا قدم گھر سے نکل گیا اور پھر میں باہر پھرنے لگی اور رفتہ رفتہ پردہ ختم کردیا۔ لڑکیوں نے بھی پردے کو ترک کرڈالا۔ اور بالکل مختلف ماحول ہوگیا۔ پھر جب تنہا ہوتی ہوں تو کبھی کبھی اس کی شکل اس کی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ وہ جو ایک بار مجھے دیکھا تو بارہ دن اسٹیشن پر ٹہلتا دیکھتا رہا اور دوبارہ اتفاق سے نظر آجاتا یہ قسمت ہی تھی۔ ملنا ہی تھا نا اور دوسرے شہر آنا ملنے کو ہر بات جانتے ہوئے بھی کہ حاصل کچھ نہیں نجانے اس کا کیا انجام ہوا کس گلی کی دھول ہو کر وہ بھی مٹ گیا۔

(تسنیم بانو۔ موسوی کراچی)

سر راہ جو مل گئے تھے

موسم گرما میں، میں اپنے دوستوں نجف سہیل اور مجید کے ہمراہ مری جا رہا تھا۔ ہم شام پانچ بجے کوٹ اُدو سے ٹرین پر سوار ہوئے جب اندر ڈبے میں پہنچے تو وہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اگلے ڈبے میں گئے تو وہاں بھی کافی مسافر بیٹھے تھے ایک سیٹ پر ایک برقعہ پوش خاتون اکیلی بیٹھی تھی ایک چھوٹا لڑکا اس کے ہمراہ تھا۔ سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے ہم نے مجبوراً اس کی سیٹ پر بیٹھنے کا ارادہ کیا لیکن عورت کو اکیلا بیٹھا دیکھ کر نامناسب سا لگتا تھا کہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ جائیں کچھ دیر کھڑے رہے لیکن آخر کب تک سفر لمبا تھا لہٰذا میں نے خاتون کو مخاطب کیا۔ اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو ہم بھی آپ کے ساتھ بیٹھ جائیں

اس نے میری طرف دیکھنے کے بعد مجھے بیٹھنے کی اجازت دی ہم چاروں دوست سیٹ پر بیٹھ گئے۔

گاڑی اپنی رفتار سے چلتی رہی۔ سفر طے ہوتا رہا دوست باتوں میں مصروف تھے۔ ہمیں رات ہو جانے کا بھی نہ ہوا نہ ہی کھانے کا احساس ہوا ٹرین رکی تو ایک بیرہ اندر آگیا۔ ہم نے اس سے کھانے کی ٹرے لی۔ کھانے لگے۔ تو بچے نے اس خاتون کو کہا۔ باجی مجھے بھی بھوک ہے۔ بچہ بار بار اس کو باجی کہہ رہا تھا۔ تب میں نے سمجھا لڑکا اس عورت کا بھائی ہے۔ لڑکی خاموش بیٹھی رہی تو کھانے کی دوسری ٹرے اٹھا کر اس لڑکی کو دے دی۔ وہ انکار کرنے لگی اور میں اصرار کرنے لگا۔ آخر اس نے ٹرے رکھ لی۔ خود بھی کھانا کھایا بچے نے بھی کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے کھانے کی ٹرے کی قیمت مجھے دینا چاہی جو میں نے نہیں لی۔ وہ شکریہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔ یوں ہم دونوں کا خاموش سا تعارف ہوگیا۔

رات گہری ہوگئی ٹرین چلتی جا رہی تھی۔ میرے دوست سو چکے تھے۔ لیکن مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔

وہ عورت بھی جاگ رہی تھی پھر اس نے نقاب اٹھا دی ٹرین کی دھیمی دھیمی روشنی میں اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل رہا تھا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی خوبصورت ہوگی میرے تصور سے بھی زیادہ حسین چہرہ مگر اس کی افسردگی میری اور گھائل کر رہی تھی۔ پھر میں نے ہمت سے کام لے کر اس سے پوچھ ہی لیا۔ آپ کہاں جا رہی ہیں؟ اور کہاں سے آرہی ہیں — اس نے بتایا کہ میں کوٹ ادو میں رہتی ہوں میرے والدین غریب ہیں۔ والد بیمار رہتا ہے۔ [illegible] ہمسائیوں کے گھر کام کرتی ہے دو چھوٹے بھائی ہیں۔ میں نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اور اب ایک گرلز ہائی اسکول میں کلرک ہوں تنخواہ اور والدہ کی آمدنی سے گھر کا خرچ چلتا ہے۔ باپ کی بیماری سے بھی پریشانی رہتی ہے اور ان کا علاج کرا رہے ہیں میں نے اس سے پوچھا کہ کہاں جا رہی ہو۔ میرے اس سوال پر کچھ پریشان سی ہوگئی۔ میں نے پھر اصرار سے پوچھا تو

میرے والدین میری شادی میرے ماموں کے لڑکے سے کرنا چاہتے ہیں جو نہایت بدقماش آدمی ہے۔ سارا دن آوارہ پھرتا ہے۔ شراب اور نشہ کا عادی ہے۔ مجھے اُس سے سخت نفرت ہے۔ میں اُس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ کیونکہ پھر میری زندگی عذاب ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن والدین چونکہ کمزور ہیں لہٰذا ان کو ڈرا دھمکا کر میرا رشتہ حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہو گیا ہے۔ جب سے میرے والدین نے اس رشتہ کے لئے حامی بھری ہے میں سخت پریشان ہوں اور مشورہ لینے کے لئے اپنی ایک عزیز سہیلی کے گھر جا رہی ہوں جو مری میں رہتی ہے۔ یہ میرے بچپن کی سہیلی ہے۔ شاید وہی میری کچھ مددگار ثابت ہو سکے۔ ہم نے اس کو بتایا کہ ہم بھی مری جا رہے ہیں اگر تم وہاں آؤ تو تفصیل سے بات کر لیں گے۔ اس نے میرا مری کا پتہ لے لیا۔

بعد تین دن کے وہ اپنی سہیلی کے ہمراہ مجھ سے ملنے مری آ گئی۔ وہ اب بھی بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا تمہارے مسئلے کا کیا حل نکلا۔ تو وہ رونے لگی۔ کہنے لگی اس مسئلے میں میری سہیلی میری کیا مدد کر سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ میں یہیں پڑی رہوں اور والدین وہاں میری گمشدگی سے پریشان ہوتے رہیں۔ آخر اس نے مجھے کہا کہ آپ ہی کوئی راستہ بتائیے۔ میں نے راضیہ سے کہا کہ اگر تم محسوس نہ کرو تو میں تم سے ایک بات کہوں۔ وہ بولی کہیئے۔ میں نے کہا کہ راضیہ تم فوراً واپس اپنے گھر چلی جاؤ۔ تمہارے والدین بوڑھے اور پریشان ہیں۔ اور اپنے اس بدمعاش بھانجے کی بلیک میلنگ کا شکار ہیں۔ اس دوران اگر انھیں کسی اچھے اور شریف نوجوان کا سہارا مل جائے تو وہ کبھی اپنی بیٹی کا ہاتھ اس نشہ باز کے ہاتھ میں نہیں دیں گے۔ تم گھر چلو اپنا پتہ مجھے دے دو میں آ کر تمہارے والد صاحب سے بات کرتا ہوں اگر انھوں نے میرا رشتہ منظور کر لیا تو تمہاری عزت کے ساتھ شادی ہو جائے گی۔

راضیہ میری بات پر بھروسہ نہیں کر رہی تھی۔ اس لئے وہ مجھے اپنا پتہ دینے سے ہچکچا رہی تھی۔ مگر اس کی سہیلی نے جرأت کا ثبوت دیا اور اس کا کورٹ ادو کا پتہ مجھے دے دیا۔ اگلے دن وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ گھر روانہ ہو گئی۔ دو دن بعد ہم بھی مری سے واپس گھر روانہ ہو گئے۔ گھر جا کر میں نے اس کو خط بھیجا دو دن بعد اس کا جواب آ گیا۔ ایک ہفتے کے بعد ان کے گھر چلا گیا۔ اس کے والد سے میں نے اپنا تعارف کرایا اور ان کو تمام بات سچ سچ کہہ دی۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں ایک اچھی فیملی سے تعلق رکھتا ہوں اور میرا اپنا کاروبار ہے شہر میں اتنی عزت ہے کہ اگر چاہوں تو آپ کو ہر قسم کی مشکل سے نجات دلا دوں آپ کو کسی شخص سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

میری صاف گوئی انھیں پسند آ گئی۔ اور وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے پر تیار ہو گئے۔ راضیہ کے والد کہنے لگے بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنی بیوی کے بھانجے سے بہت خوف زدہ تھا کیونکہ اگر میں اس کا رشتہ رد کرتا تھا۔ تو وہ مجھے پریشان کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتا مگر اب مجھے تمہارا سہارا مل گیا ہے بیٹے اللہ تعالیٰ میری بیٹی کی قسمت اچھی کرے۔

دوسرے روز خاموشی سے میرا نکاح راضیہ کے والد نے اپنی بیٹی سے کر دیا۔ رات ہم نے وہیں بسر کی۔ دوسری صبح میں نے ان سے اجازت لی اور بیوی کو لے کر اپنے شہر آ گیا۔ راضیہ کو میں نے اپنے ایک دوست کے گھر ٹھہرا دیا۔ اور خود گھر آ گیا۔ امی جان اور ابا جان سخت غصے میں تھے انھوں نے میرے اطلاع گم ہونے کی وجہ پوچھی۔ تو میں نے ان کو الگ کمرے میں بلا کر اپنی اور راضیہ کی آپ بیتی سنا دی۔ اور امی جان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے کہ ابا جان کو راضی کرنا اب آپ کا کام ہے۔ تاکہ میں آپ کی بہو کو گھر لے آؤں۔

امی جان پہلے تو چراغ پا ہو گئیں پھر خاموش ہو گئیں۔ کیونکہ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا پھر میں ان کا چھوٹا بیٹا تھا۔ وہ مجھے جان سے زیادہ چاہتی تھیں۔ انھوں نے بڑی مشکل سے ابا جان کو منایا اور میں راضیہ کو گھر لے آیا۔

راضیہ کی دردبھری کہانی سے ابا جان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے ہم دونوں کو معاف کر دیا۔ آج میں اور راضیہ بڑی سکھی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے میری اس نیکی کا اجر مجھے ایک پھول سے بیٹے کی صورت میں دے دیا ہے۔

(ف۔ ح ڈیرہ غازی خاں)

جس نے بُرا کیا؟

سراج سرائے صرف تین چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھی اور بسوں کے اڈے کے پاس ہی لب سڑک واقع تھی ایسی چھوٹی موٹی سرائیں تقریباً ہر جگہ بس اڈے کے پاس ہوتی ہیں اس لئے اس میں بھی ایسی کوئی خاص بات نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ اس کے مالک کا نام سراج تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اس مسافر خانے کا نام سراج سرائے رکھ دیا تھا۔

سراج ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند نہ تھا۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ یہی تین کچے کمروں کی سرائے ہی تھی اس میں اکثر اکا دکا مسافر ٹھہرتے رہتے تھے۔ سراج کثیر العیال آدمی تھا لہٰذا اس کا گزارہ بڑی تنگی سے ہوتا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ ہیرا پھیری سے بھی روزی پیدا کر لیتا تھا۔ اس کے اخلاق ضابطے اور اصول کچھ ایسے مضبوط بھی نہ تھے۔ اگر اس کو اپنی وراثت میں یہ تین کمروں پر مشتمل جائیداد نہ ملتی جس کو اس نے سرائے بنا لیا تھا۔ تو شاید وہ کسی کالے دھندے سے بھی گریز نہ کرتا کیونکہ وہ طبعاً سست آدمی تھا محنت مشقت اس کے بس کا کام نہ تھا۔ تعلیم اس نے اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے حاصل نہ کی تھی۔

اس روز وہ اپنی سرائے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا یہ کوئی شام پانچ بجے کا وقت تھا۔ جب ایک نوجوان عورت ریشمی برقعہ میں لپٹی ہوئی آئی اور اس سے پوچھنے لگی کہ یہاں کسی عورت کے ٹھہرنے کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ وہ ابھی ابھی بس سے اتری تھی۔ اور اڈے سے سیدھی سراج سرائے کی طرف چلی آئی تھی۔ کیونکہ یہی عمارت سب سے نزدیک تھی۔ اور اوپر سراج سرائے کا بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ جس پر لکھا تھا کہ رہائش کا معقول انتظام ہے۔
یہ عورت جس کو آگے کہیں جانا تھا۔ غلطی سے [illegible] میں بیٹھ گئی تھی۔ اور اب اڈے پر آکر اس کو پتہ چلا تھا کہ وہ غلط بس میں سوار ہو گئی ہے وہ ایک میٹرک پاس نوعمر لڑکی تھی۔ جس نے ٹیچر ٹریننگ کی تھی اور اب نوکری کے لئے انٹرویو دینے جا رہی تھی۔ اس کو انٹرویو کا اور وہ گھبراہٹ میں دوسری بس میں سوار ہو گئی تھی۔ اگلے روز اس کا تھا اور شام کو کسی بس کا پکڑنا محال تھا۔ واپس جانا بھی گویا وقت ضائع کرنا تھا۔ پس اس نے یہی سوچا کہ کل صبح سویرے چھ بجے جو بس آئے وہ اس کو اپنی منزل مقصود تک پہنچا دے گی اور وہ نو بجے تک انٹرویو بورڈ کے سامنے جا پہنچے گی یہی سوچ کر وہ اس سرائے کی جانب آئی۔

سراج نے سر سے پاؤں تک اس کو بغور دیکھا پھر کہنے لگا بی بی تم اندر چل کر کمرے میں بیٹھ جاؤ۔ یہاں میری سرائے میں تو لوگ ٹھہرتے ہیں۔ جو سب کے سب مرد ہوتے ہیں۔ میں کسی عورت کو سرائے میں نہیں ٹھہرا سکتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے رہنے کا کہیں اور معقول بندوبست کر لوں۔ لڑکی نے پوچھا کہاں۔ وہ بولا، مثلاً مولوی صاحب کے گھر، وہاں کوئی بھی لڑکی حفاظت سے ٹھہر سکتی ہے۔

کوثر بھی یہی چاہتی تھی کہ کسی معزز شخص کے یہاں ایک رات کی مہمان رہ جائے۔ لیکن یہ شہر اس کے لئے اجنبی تھا۔ وہ یہاں کسی کو نہ جانتی تھی نہ ہی مسجد کے کسی امام صاحب کے گھر تلاش کر سکتی تھی۔ شام ہو رہی تھی اس نے سوچا سرائے کا مالک کوئی شریف آدمی لگتا ہے۔ اس پر اعتبار کر لیا جائے۔ وہ جا کر سرائے کے اندر ایک کمرے میں بیٹھ گئی۔ سراج کو ایک گھنٹہ گزر گیا اور وہ نہ آیا۔ شام گہری ہونے لگی سردیوں کے دن تھے۔ دن چھوٹے ہو گئے تھے۔ رات جلدی کالے پر پھیلا دیتی تھی کوثر کا دل گھبرا رہا تھا اس کا کوئی بھائی چچا ماموں بھی نہ تھا کہ جس کو وہ اس سفر میں ساتھ لاتی۔ بوڑھے اور بیمار ماں باپ تھے اور یہ نوکری اس کی مجبوری تھی۔ اگر وہ معاشی طور پر اس قدر پریشان نہ ہوتی تو یقیناً وہ واپس لوٹ گئی ہوتی۔

وہ انہی خیالوں میں گم تھی کہ اتنے میں ایک بچہ آیا وہ سراج کا لڑکا تھا۔ باپ کو ڈھونڈتا وہ کمرے میں آیا پر ایک برقعہ والی عورت کو بیٹھا پایا۔ گھبرا کر

درسرائے کی پچھلی طرف تھا۔ لہٰذا وہ واپس بھاگا ہوا گھر گیا
ور ماں سے کہنے لگا۔
"اماں۔ ابا تو سرائے میں نہیں ہے۔ مگر وہاں ایک
برقعہ والی عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ عورت کے نام پر سراج
ی بیوی کے کان کھڑے ہوگئے۔
سراج اکثر ازدواجی زندگی میں ہیرا پھیری اور نت نئے
زالقوں کا رسیا تھا۔ بیوی اس کی عادت سے خوب واقف
تھی ابھی پچھلے ہی دنوں شہر کی نوجوان بھٹیارن سے اس کا
معاشقہ چلتا رہا تھا وہ اکثر راتوں کو گھر سے غائب رہتا تھا۔
بڑی مشکل سے سراج کی بیوی نے اپنے بھائیوں سے ہنگامہ
کراکر اس عشق کا پتہ کاٹا تھا تو آج پھر یہ دوسرا معاملہ سامنے
آگیا تھا ٹھیک ہے وہ بولی اس بار تو میں خود نمٹتی ہوں جاکر
اس نے برقعہ اوڑھا اور سرائے کے اندر چلی گئی۔ اتفاق سے
اس روز کوئی مسافر نہیں ٹھہرا ہوا تھا۔
اب کوثر ہی اکیلی بیٹھی تھی۔ سراج کی بیوی منظوراں نے
دیکھا تو ایک خوش لباس پڑھی لکھی لڑکی اس سے متعارف
تھی۔ منظوراں نے اس سے متعدد سوالات کئے کوثر نے
اس کو اپنی مصیبت اور مجبوری سے آگاہ کیا تو منظوراں کو
ایک عجیب شرارت سوجھی اس نے کوثر کو کہا۔ بہن اگر سراج
تم کو کسی محفوظ جگہ ٹھہرانا چاہتا تو اس کے اپنے گھر سے زیادہ
محفوظ جگہ اور کون سی ہوسکتی تھی۔ یہ پچھلی دیوار کے ادھر تو ہے
میرا گھر تجھے اس کے ارادے اچھے نظر نہیں آتے یہ آدمی
ویسے بھی ٹھیک نہیں میرا شوہر ہے اور میں اس کو اچھی طرح
جانتی ہوں۔ تم میرا برقعہ اوڑھ لو اور میرے جوتے پہن لو
میں تمہارا برقعہ اوڑھ لیتی ہوں تم میرے بچے کے ساتھ میرے
چلی جاؤ اور آرام سے وہاں بیٹھو۔ میں اس سے خود
ٹ لوں گی۔
کوثر بے چاری کو سوائے اس کے چارہ بھی کیا تھا کہ وہ
کی بات نہ مانتی۔ وہ بچے کے ساتھ سراج کے گھر چلی گئی۔
سراج کی بیوی کوثر کا برقعہ پہن کر وہاں بیٹھ گئی۔ لالٹین بھی
ی ہوئی تھی۔ کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ ابھی تک سراج نہ
لوٹا تھا۔ منظوراں سوچ رہی تھی کہ نجانے آج کہاں غارت ہو
گیا ہے کہ اب تک نہیں لوٹا۔ کم از کم لالٹین ہی جلا جاتا۔ ابھی
وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ اور سراج
اندر آگیا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ اور مردوں کی آواز سنائی دی
دوسرے مردوں کے ساتھ اندر آجانے سے وہ گھبرا گئی۔ اور
اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی انھوں نے اندھیرے کمرے میں بیٹھی
منظوراں کا منہ زور سے بند کرکے کس کر کپڑے سے باندھ دیا
اور پھر نہ جانے کیا دوا سنگھائی کہ منظوراں بیہوش ہوگئی۔
ٹرک کو یہ لوگ سرائے کے احاطے میں لے آئے تھے۔ برقعہ میں لپٹی ہوئی
بیہوش منظوراں کو انھوں نے نہایت سرعت کے ساتھ اس میں
ڈال دیا اور آناً فاناً وہ تو ہوا ہوگئے۔ سراج نے سمجھا کہ آج
اس نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ دس ہزار کی موٹی رقم کے
بدلے اس نے ایک معصوم اور پناہ کی خواستگار لڑکی کو بیچ دیا
تھا۔ ٹرک انجانی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ اور سراج گھر کی جانب
آگیا۔
کوثر ابھی تک بیٹھی سراج کی بیوی کا انتظار کر رہی تھی۔ یکایک
سراج اندر آیا۔ اور بیوی کو آواز دینے لگا۔ بچے نے کہا ابا وہ
تو سرائے میں بیٹھی تیرا انتظار کر رہی ہے۔ اور سرائے والی یہاں
بیٹھی ہے۔ سراج کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا کہنے لگا۔ ہیں۔ یہ کیسے؟
اس لڑکی کو تو میں دس ہزار میں بیچ آیا ہوں۔ اور تیری ماں تو
گھر میں تھی۔ یہ سنتے ہی کوثر سرعت سے اٹھی۔ اور کھلے
دروازے سے باہر نکل گئی۔ خدا نے اس کی عزت رکھنی تھی رکھ
لی۔ اس کے بعد وہ مسجد کے امام صاحب کا پتہ پوچھ کر اس کے
گھر چلی گئی اور دوسروں کی عزت کو نیلام کرنے والا اپنی عزت کو لوٹتا
دیکھتا گھر سے نکل گیا۔ وہ ان بردہ فروشوں کے اڈے پر گیا۔
مگر وہاں ان کا نشان بھی نہ تھا۔ وہ لوگ مال خرید کر آگے
فروخت کرکے نفع کمانے جاچکے تھے۔ اور سراج سرائے کا مالک
ہمیشہ کے لئے زندہ درگور ہو چکا تھا۔
(مہ جبیں بابر ڈیرہ غازی خاں)

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گرد و پیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
- ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف و شفاف کیوں نہ رکھیں جنھیں ہم سب استعمال کرتے ہیں۔
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں اور در حقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گرد و پیش کو صاف و شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلے میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں آپ صرف اتنا خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف و شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں اور یہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ صرف آپ کی خدمت کے لئے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے ادھر ادھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑا دان میں پھینکا جائے۔ آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھئے

ناردرن ریلوے

اور دھرتی کانپ اٹھی

قسط ۱۲

(احمد حسین شمس ایڈوکیٹ دکشن گنج)

اب یہ دونوں کشن لال کی کوٹھی کے قریب آگئے کشور
سامنے کا راستہ چھوڑ دیا وہ ایک گلی سے ہو کر چلا یہ گلی اس
سکے پچھواڑے جاتی ہے جب یہ دونوں کشن لال کے
ے کے نزدیک پہونچے تو کشن لال کی آواز سنائی دی
کہا چھپ کر سننا چاہیئے کیا باتیں ہو رہی ہیں "
دونوں دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے ۔
شن لال بول رہے تھے ۔ داروغہ صاحب اس چال سے
میں سے ہر شخص کے لیے دس دس ہزار کی موٹی رقم
کہئے آپ کو منظور ہے مگر یہ راز راز ہی بن کر رہے"
مجھے منظور ہے "
پھر مجھے بھی اعتراض نہیں"، یہ آواز حسین بخش کی تھی ۔
مگر منگلو اور داور خاں کا حب ابھی ہی بھر دینا چاہیئے
زور" حسین بخش نے کہا " کام تو انھیں دونوں کو کرنا ہے ۔
کو تو صرف ..." اور پھر آواز سنائی نہ پڑی پھر فدا
انھوں نے کہا ہم تینوں حلفیہ وعدہ کریں "
تھوڑی دیر تک سکوت رہا اس کے بعد کشن لال نے
ین بخش تم جمیل فہمی کو اپنا وکیل ٹھیک کر لو اور میں
بابو کو "
نہیں یہ رائے غلط ہوئی " حسین بخش کی آواز تھی یہ
اگرچہ دہریئے نہیں " بڑے وسیع الخیال ہیں ہم لوگوں کو
مان اور کٹر ہندو چاہیئے "
یار تم نے ٹھیک کہی" کشن لال نے کہا منظور احمد
بابو کیسے رہیں گے ؟"
بس انھیں دونوں کو میں نے بھی منتخب کیا ہے
دوسرا اچھا سمجھائی ذہنیت کا "
ہاں یہ دونوں ٹھیک ہیں "

" اچھا تو بات ہو چکی اب کھانا کھا لیا جائے "، اور پھر
کشن لال نے شنکر کو آواز دی دو تین مرتبہ پکارنے کے بعد
آنگن کی طرف سے شنکر کی آواز آئی ۔
یہ دونوں جلد جلد قدم بڑھاتے ہوئے پچھواڑے کی
طرف چل دیئے ۔
آنگن میں داخل ہو کر کشور نے کہا " اچھا موہن رخصت ۔
دونوں ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر رخصت ہو گئے اور
موہن تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا اپنے مکان آیا اس کی بیوی
نے کھانا اس کے سامنے رکھا مستقبل کی دو متضاد تصویریں
موہن کی نظروں کے سامنے پھر گئیں ایک دفعہ اسے ایسا محسوس
ہوا جیسے وہ اپنے منوہر کو دولہا بنا کر کشن لال کی ڈیوڑھی
کی طرف خنداں خنداں چلا جا رہا ہے برات خوشیاں منا
رہے ہیں آتش بازیاں چھوٹ رہی ہیں ۔ اور پھر اس نے
دیکھا ۔ ایک چنگاری اس کے مکان پر آ گری اور سارا مکان
جل رہا ہے وہ سہم اٹھا ۔

آٹھ

خدا گنج عدم آباد کا نام نہیں بلکہ یہ ایک موضع ہے گوپال
گنج سب ڈویژن کا اس سب ڈویژن میں سب سے بڑی ہاٹ
یہیں لگتی ہے ۔ رام پور سے دو میل پچھم اور گوپال گنج سے چار
میل پورب دکھن یہ موضع واقع ہے یہاں جمعرات کے
دن ہاٹ لگتی ہے اس ہاٹ میں میاں حسین بخش کے دادا میاں
امام بخش نے ایک مسجد اپنے خرچ سے بنوا دی ہے بہت
بڑی مسجد تین گنبدوں والی ۔ مسجد کے بغل میں حسین بخش کے
والد کی بنوائی ہوئی ایک کچہری بھی ہے اکثر ہاٹ کے دن
میاں حسین بخش اپنے کارندوں کے ساتھ یہاں موجود رہتے ہیں ۔

ہندوستان اور پاکستان کے قیام کے بعد بہت سے
بنگالی ہندو جو پاکستان میں رہ نہ سکے بھاگ بھاگ کر اس علاقے
میں آئے اور یہیں بس گئے یہاں کے مسلمانوں نے ستر سال تھی
ہندوؤں کو گلے سے لگایا اور انھیں بے وطن اور بے سہارا سمجھ کر
ان کی کافی امداد کی۔

مگر آج کی ہاٹ کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا اجتماع اگرچہ بدستور
تھا مگر لوگوں کے چہرے خوفزدہ نظر آرہے تھے۔ ہندوؤں کو گمان تھا
مسلمان پیش قدمی کریں گے مسلمان یہ سوچ رہے تھے ہندوؤں
کی طرف سے حملہ ہوگا ایک سو جوان مسجد اور کچہری میں منتظر تھے اور
اتنے ہی ہندو ہاٹ سے متصل ایک گاؤں میں مقیم تھے۔ کشن لال
ہاتھی پر سوار ہاٹ کا جائزہ لے رہے تھے میاں حسین بخش اپنی
کچہری میں بیٹھ کر لمحہ لمحہ کی خبریں لے رہے تھے۔ منگلو ایک طرف
لاٹھی سنبھالے ٹہل رہا تھا۔ دلاور خاں دوسری طرف مونچھوں
پر تاؤ دے رہا تھا۔۔۔ مگر خرید و فروخت بدستور جاری تھی
حسب معمول سپاہی ہاٹ میں گشت کر رہے تھے داروغہ کے
بی اگروالا ایک ہندو کی دوکان پر بیٹھ کر ہاٹ پر طائرانہ نگاہ
ڈال رہا تھا ہر شخص کے چہرے سے پرخوف وحسرت کے ملے جلے
آثار تھے۔

ایک مسلمان نے کسی مچھلی والے سے دو سیر مچھلی خریدی
مچھلی کے دام دے کر اس نے اسی مچھلی والے کے پاس مچھلی
رکھ دی کہ دوسری چیزیں خرید کر جب وہ آئے گا تو اپنی
مچھلی لے لیگا۔

میاں حسین بخش کے پاس مولوی عنایت اللہ صاحب
گلوریاں چبا چبا کر پیک ادھر اُدھر پھینک رہے تھے اور اپنی
داڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر مسلمانوں کے اسباب تنزلی پر روشنی ڈال
رہے تھے اور اپنے نوجوانوں کو مرنے مارنے پر آمادہ کر رہے
تھے انھوں نے ایسی پرجوش اور نفرت انگیز تقریر کی کہ مسلمانوں
کا دل جوش وخروش سے بھر گیا ان کی رگ حمیت پھڑک اٹھی۔

اور ہندوؤں کی جماعت میں کاشی کے ایک پنڈت
ٹھاکر سچیتانند اپنی ہاتھ بھر کی چٹیا ہوا میں لہرا لہرا کر ہندو نوجوانوں
کو مسلمانوں کے خلاف ابھار رہے تھے مسلمانوں کو ملکش ثابت
کر کے انھوں نے کہا کہ بھارت ورش سے مسلمانوں کو پاک کر دو۔
انھوں نے ایسی بھاشن تقریر کی کہ ہندوؤں کا دل مسلمانوں سے
انتقام لینے کے لئے بیقرار ہو گیا۔ ہندو نوجوانوں نے انگڑائیاں
لیں اور اعلان جنگ کا انتظار کرنے لگے۔

ادھر کشن لال ہاتھی پر سوار ہاٹ کا جائزہ لے رہے
تھے ابھی تک جنگ چھڑی نہیں تھی تھانے کے سپاہی بڑی تیزی
سے ادھر اُدھر گشت لگا رہے تھے دلاور خاں اور منگلو اپنی
ڈیوٹی پر تعینات تھے خرید وفروخت بدستور جاری تھی۔

اتنے میں منگلو کشن لال کے پاس سے گزرا انھوں نے
منگلو کو آواز دی اور جب منگلو نزدیک آیا تو اسے ہاتھی پر
آجانے کو کہا۔

کشن لال نے پوچھا "دیر کیوں ہو رہی ہے تین بج رہے
ہیں اور ابھی تک کسی قسم کی چھیڑ نہ ہوئی۔"

"معلوم ہوتا ہے میاں صاحب چال چل گئے"

"کیا وہ کچہری میں نہیں ہیں؟"

"ہاں وہ کچہری میں تو ہیں اور مولوی عنایت اللہ صاحب
تقریر کر رہے ہیں"

"اور مسجد"

"وہاں لوگ انتظار کر رہے ہیں"

"اور اپنے پنڈت جی کیا کر رہے ہیں"

"وہ تو مت پوچھئے۔ سرکار ایسا بھاشن دے رہے
کہ ایک مرتبہ میرا دل بھی مسلمانوں سے متنفر ہو گیا"

"منگلو! جذبات پر قابو رکھنا ہی بہادری ہے مولوی
پنڈت نہ رہیں تو ہم لوگوں کا کام کیسے چلے ان لوگوں کو تو
ہی موقعوں کے لئے گھی اور ملائی کھلا کھلا کر پا
ہے یہ لوگ خدا کے نہیں ہم لوگوں کے ایجنٹ ہیں کیا ہما
نوجوان مرنے مارنے کے لئے تیار ہیں؟"

"تیار ہی نہیں دیوانے ہو رہے ہیں صرف چھیڑ کی دیر ہے"

"یہی تو میں پوچھتا ہوں دیر کیوں ہو رہی ہے؟"

"سمجھ میں نہیں آتا میاں صاحب دغا تو نہ دیں گے"

"نہیں حسین بخش کو میں جانتا ہوں" (با

غزل

محسن ہاشمی ۔ بلاری

یہ کون کھائے گا پیچ و تاب مقتل میں
اب آنہ جائے کوئی انقلاب مقتل میں

ہمارا نام ہی لکھا گیا سرِ فہرست
برائے ستم جو ہؤا انتخاب مقتل میں

وہ بے گناہ تھا کیسے رنگ لاتا خوں
بلا وجہ تو نہیں انقلاب مقتل میں

ہمیں تو اپنے تحمل کا پاس تھا ورنہ
ستم سے دیتے ستم کا جواب مقتل میں

نہیں ہے تیغ تو ہم یوں بھی جان دے دیں گے
وہ اپنے رخ سے اٹھا دیں نقاب مقتل میں

عجب نہیں کہ فراغت نصیب ہو غم سے
چلا ہے لے کے مجھے اضطراب مقتل میں

وفورِ شوق شہادت میں دل ہے یوں رقصاں
پئے ہوئے کوئی جیسے شراب مقتل میں

خبر نہیں تمہیں محسن یہ کوئے قاتل ہے
بچھا رہے ہو کہاں فرشِ خواب مقتل میں

غزل

اسلام اقدس ۔ ساگری

جو بھلا ہے بُرا سا لگتا ہے
جو بُرا ہے بھلا سا لگتا ہے

مرض جو لا دوا سا لگتا ہے
عارضہ عشق کا سا لگتا ہے

اپنا چہرہ ہے بُرا لئے ہم کو
جو بُرا بھی، بھلا سا لگتا ہے

دیکھ لیتا ہوں خود کو، کیا ہوں میں
دل مرا آئینا سا لگتا ہے

یہ یقیناً ہے عشق کا صدقہ
زہر بھی اب دوا سا لگتا ہے

تیر مژگاں پہ چُھبے، ہوئی مدت
زخم اب تک ہرا سا لگتا ہے

لاکھ دُنیا بُرا کہے لیکن
جو بھلا ہے بھلا سا لگتا ہے

اشک میرے وہ دیکھ کر بولے
دل غموں سے سجا سا لگتا ہے

کیا بتائیں کہ اب ہمیں اقدس
کیوں حرم بُتکدا سا لگتا ہے

غزل

یوسف ثانی سلیمانی (دیانی)

بے نور سی مسجد ہے بے آب شوالہ ہے
ہیں چرچ کی شمعیں گل کچھ دال میں کالا ہے

ڈنڈے پاتھ کی چھاتی پر آنکھیں ہیں دریچوں کی
ہشیار سڑک والو کچھ ہونے ہی والا ہے

مجبور ہو مانا تم سچ بولتے ڈرتے ہو
پابند زباں ہے تو، کیا دل پہ بھی تالا ہے

پنجرے میں تھا پنچھی جب کچھ پر تو سلامت تھے
کس دن کا ستمگر نے بدلا یہ نکالا ہے

صیاد دوپہری میں کچھ گھونسلے تاکے تھا
ہے رات اماوس کی پھر کیسا اُجالا ہے

مرت اُن کو ڈراتی ہے کیا خاک بنے صحت
تلوار سروں پر ہے اور منہ میں نوالہ ہے

اُس رین بسیرے میں ٹھہرا جو کوئی ثانی
پو پھٹنے سے پہلے ہی سامان سنبھالا ہے

سائنس داں سے

توصیف علوی قاسمی کیرانوی

اے حاملِ ہوش و خرد اے صاحبِ فکر و نظر
تجھ کو سائنس داں کہوں یا آج کا نورِ سحر

[illegible] نے تجھے اک قوتِ پرواز نو
تو نے پایا علم و حکمت کا نرالا ساز

[illegible] نے انساں کی بدل دی ہے حیات
تیرے فن پاروں نے کر دی ہے مزین کائنا

کاوشوں نے تیری دنیا میں جگایا ہے فسوں
تو نے تحقیق و تجسس کے اٹھائے ہیں ستو

جگمگا اٹھے ہر طرف تو نے نئے شمس و قمر
کر دئے تو نے منور زندگی کے بام و د

اس طرح سے تو نے ڈالی ہے ستاروں پر کمند
بن گیا ہے تیرا بامِ شوق یہ چرخِ بلن

بارہا تو چاند پر اترا ہے خود با کرّ و فر
اس سے آگے "زحل" اور "مریخ" پر بھی ہے

تو نے دنیا کو دئے وہ تحفہ ہائے زندگی
جن سے پائی آج انساں نے نرالی سرخو

تیرے دم سے مل گئے ہیں آج کے انساں کو پر
تو نے رنگیں کر دئے اس دور کے شام

تو نے انساں کو دئے ایسے نرالے "جامِ جم"
جن میں آتے ہیں نظر سب بحر و بر، مصر و عج

تیری ہر ایجاد میں فطرت کا اک اعجاز ہے
در حقیقت آج کا تو اک کرشمہ ساز ہے

یہ تو مانا آگئی تیرے کرشموں سے بہار
دے دیا ہے تو نے دورِ نو اک رنگین نکھا

ہاں مگر دنیا بنا دی تو نے اک آتش فشاں
آگیا بالکل تباہی کے دہانے پر جہا

تو نے بخشے آج کے انساں کو وہ آلاتِ جنگ
ہو گیا ہے قافیہ، جن سے کہ اس دنیا کا تن

چار سو نقشے ہیں اب بربادیٔ انسان کے
ہر طرف آثار ہیں طوفان ہی طوفان کے

ہو گیا ہے سانس بھی اس دور میں لینا حرام
بات ہے امن و اماں کی اور تباہی کا نظا

ہر طرف شعلوں کا عالم، ہر طرف آگ اور خوں
ہر طرف اک حشر برپا، ہر طرف انساں زبو

کیا کبھی سوچا ہے تو نے یہ تیری فنکاریاں
بن رہی ہیں صحنِ عالم کے لئے چنگاریا

جب لگے گی آگ ہر سو پھر کہاں فصلِ چمن
جب نہ پروانے رہیں گے کیا سجے گی انجمن

بزمِ رنداں جب نہ ہو گی میکدہ کیا جام کیا
پینے والے جب نہ ہوں گے پھر مئے گلفام ک

اہلِ محفل گر نہ ہوں تو کیا چراغوں کا بیاں
ہوں نہ گر اربابِ گل کیا گلکدوں کی داستا

ہے ضروری اب کہ تو اس خواب سے بیدار ہو
جائزے کو اپنی گلکاری کے تو تیار ہو

ورنہ یہ تیرے کرشمے اک قیامت ڈھائیں گے
آئینے پرواز کے تیری تجھے دکھلائیں گے

تجھ سے ہی اجڑے گا اک دن یہ گلستانِ حیات
خاک ہو گی تجھ سے ہی یہ رنگ و بوئے کائنات

تجھ سے ہی برباد ہو گا تیرے خوابوں کا محل
تجھ سے ہی مرجھائیں گے تیری امیدوں کے کنو

تیری اک لغزش سے ڈوبے گی یہ کشتیٔ جہاں
خون اگلے گی زمیں ماتم کرے گا آسما

عہد کر انسانیت کی اب بقا کا عہد کر
امنِ عالم کے حقیقی ارتقا کا عہد کر

Phone: 275602 Regd No D- (DN) 353

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 MARCH 1986

Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57

جلد — ۴۷
شمارہ — ۲

نمبر ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۲۴/۵۷ رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۵۴

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
یعنی وطن پرست ہوں، انساں پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ
۲/۵۰ روپے
زر سالانہ -/۲۴ روپے

جلد ۲۷ | اپریل ۱۹۸۶ء | شمارہ ۴

شعرائے کرام اور ادیب حضرات توجہ فرمائیں

آپ میں سے کتنے ہی حضرات ایسے ہوں گے جو اپنی تخلیقات کو کتابی شکل میں دیکھنا چاہتے ہوں گے۔ مگر یاد رکھیے کہ شاعری اور ادبی تخلیقات شاعر یا ادیب کی اپنی دماغی کاوش کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مگر ان تخلیقات کو موزوں اور دلکش انداز میں کتابی شکل میں پیش کرنا ہر شاعر یا ادیب کے بس کا روگ نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ مالی طور پر آسودہ ہیں تو اپنی شعری تخلیقات یا ادبی مضامین کا مجموعہ اچھا بُرا شائع کر سکتے ہیں۔ مگر سب سے بڑا اور اہم مسئلہ کتاب کی فروختگی کا ہوتا ہے اور یہ مسئلہ ایسا ہے جو کسی بھی شاعر یا ادبی شخصیت کے مزاج کے خلاف ہے۔ مگر

ادارۂ شانِ ہند

یہ دونوں خدمات بطریقِ احسن سر انجام دے رہا ہے۔ یعنی اچھی کتابوں کی بہترین انداز میں اشاعت اور جدید طریقوں سے کتابوں کی نکاسی۔ اگر آپ بھی اپنی تخلیقات کو بہترین اور دلکش انداز میں شائع کرانا چاہتے ہیں۔ تو پھر ادارہ ماہنامہ شانِ ہند کی خدمات حاصل کیجیے۔ جو آپ کی تصنیف کی نکاسی میں بھی ہر ممکن طریقے سے مدد دے گا

خیال رہے کہ ادارہ شانِ ہند سے شائع ہونے والی ہر کتاب پر کسی نہ کسی اُردو اکاڈمی یا کسی ادارے سے انعام ملا ہے۔

پہلی فرصت میں لکھیے

دفتر ماہنامہ شانِ ہند۔ فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

دویا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے اور سرورق کے صفحات رین بو پرنٹرز بلیماران دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

دلی اُردو اکاڈمی کی تشکیلِ نو

لیفٹیننٹ گورنر جناب کپور صاحب نے دو سال کی مدت کے لئے دلی اُردو اکادمی کی تشکیلِ نو میں جہاں بیگم صالحہ عابد حسین جیسی نیک، ایماندار اور موزوں ترین نیز ڈاکٹر اسعد سعیدی جیسی صاف گو، نڈر اور دیانت دار خواتین کو اس بار کمیٹی میں نہیں رکھا، ہاں خواجہ حسن ثانی نظامی اور حمیدہ قدوائی صاحبہ کو نئی کمیٹی میں لے کر اپنے حسنِ انتخاب کی داد چاہی ہے۔

اس بار ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور پروفیسر ظہیر احمد صدیقی تعلیمی دانشوروں کو نئی کمیٹی میں لے کر لفٹیننٹ گورنر نے اپنے طور پر یہ اعلان فرمایا ہے کہ وہ اُردو کے اساتذہ کو اُردو کی بقا و حیات کا امین سمجھتے ہیں کیونکہ مندرجہ بالا فاضل حضرات کی شمولیت سے اب غیر سرکاری ممبران کی نصف کے قریب تعداد ایسے حضرات پر مشتمل ہے جو درس و تدریس سے ہی متعلق ہیں۔ ان تینوں ماہر تعلیم حضرات کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں شاستروں میں گورو (مدرس) کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ وہ مجسم طور پر تہذیب، اخلاق، سچائی، ایمانداری اور حسنِ قناعت کا ایک چلتا پھرتا نمونہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ اپنی نظروں کو نیچے رکھتا ہے۔ اور طالب علموں کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتا ہے اور ان کی درس و تدریس کے سلسلے میں کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھتا [illegible]

(اگر ہم اس کی تفصیل میں گئے تو معاملہ بڑا طویل ہو جائے گا) اور دوسری صفت آج کل اُردو پروفیسروں اور خصوصاً پی۔ ایچ۔ ڈی سے مُزین پروفیسروں میں یہ پائی جاتی ہے کہ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا اُن کا ایمان ہو گیا ہے (جو حضرات اس صفت سے محروم ہیں اُن سے معافی کے ساتھ) لہٰذا باشعور طبقہ یہ یقین رکھتا ہے کہ اُردو کے بدترین دشمنوں میں اُردو سے متعلق درس و تدریس رکھنے والے حضرات اولین درجہ رکھتے ہیں۔

دلی میں بھی درس و تدریس سے تعلق رکھنے والے اُردو دانشوروں میں کئی گروپ ہیں اور ہر گروپ اپنی جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے کو مات دینے میں ید طولیٰ رکھتا ہے خواہ اُردو کا جنازہ بھی انھیں اپنے کندھوں پر ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ چنانچہ اُردو اکاڈمی اب ان اُردو پڑھانے والے کوالیفائیڈ دانشوروں کی گروپ بازی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔

ہاں اُردو اکاڈمی کی نئی کمیٹی کے ارکان کے اسمائے گرامی پڑھنے کے بعد کسی حد تک یہ یقین ہوا کہ پچھلی کمیٹی کے بعض ممبران نے جس جائز ناجائز طور پر اکاڈمی سے روپیہ [illegible]

صاحب سے مودبانہ گذارش کی گئی کہ آپ نے ایسے بلوں کے
چیکوں پر دستخط ہی کیوں کئے تھے جن بلوں کی سپلائی ہی
نہیں ہوئی۔ اور اگر آج ہی چیکنگ ہو جائے تو آپ اس
کا کیا جواب دیں گے اس پر ڈائرکٹر صاحب آپے سے
باہر ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم آئندہ آپ سے کتابیں نہیں
لیں گے اور جائیے جہاں آپ نے کتابیں دی تھیں ان
سے جا کر چیک مانگئے۔ ہمارے ہاں آپ کا کوئی چیک
نہیں ہے۔ چنانچہ ڈائرکٹر کی یہ فرعونیت نما بکواس
سن کر ہم واپس آ گئے اور یہ چیک اس وقت ۱۴ اپریل
تک بذریعہ ڈاک بھی موصول نہیں ہوا۔

ہم جناب نرسمہا راؤ صاحب سے ادب کے ساتھ دریافت
کرتے ہیں کہ ہمارے وزیر اعظم ملک کو اکیسویں صدی میں لے جانے
کی ابھی سے تیاریاں کر رہے ہیں اور حالت یہ ہے کہ ان
کی حکومت کے افسران بغیر سپلائی ہوئے مال کے بلوں
کے چیک تیار کر دیتے ہیں۔

کیا آپ اس کی تحقیق کرائیں گے کہ ایسا کیوں ہوا۔
کیونکہ ہم نے اسی وقت سینٹرل لائبریری میں اردو سیکشن
سے فون پر بات کی تو انھوں نے بتایا کہ اردو سیکشن میں
ایسا ہرگز نہیں ہوا اور ہم نے کسی چیک کی ڈلیوری سے
انھیں منع نہیں کیا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی
اور انگریزی کی کتابیں زیادہ تعداد میں خریدی جاتی ہیں
اور پیشگی بل انھیں کتابوں کے لئے جاتے ہیں جو زیادہ
تعداد میں خریدی جائیں اور بک سیلرز کے ہاں ان کتب
کا اسٹاک موجود نہ ہو۔

ہم چاہتے ہیں کہ دلی پبلک لائبریری کے اکاؤنٹنٹ اور
ڈائرکٹر دونوں کی اس فرعونیت کا سخت ترین نوٹس لیا جائے
تاکہ آئندہ اس لائبریری میں کوئی خلاف قاعدہ بات نہ ہو سکے
کیونکہ اگر بغیر مال لئے بل بنوا کر چیک تیار نہ کئے گئے ہوتے
تو یہ چیک اب تک بک سیلرز کو کبھی کے نہیں دیئے گئے۔

سرکاری ہسپتالوں میں غیر ذمہ داری

پہلے جے پور کی یہ خبر ملاحظہ فرمائیے:-

• جے پور ۱۶ اپریل یہاں سوائی مان سنگھ اسپتال میں ایک
۴۰ سالہ شخص رام پرشاد اپنے بائیں کولہے کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کا
علاج کرانے آیا لیکن ڈاکٹروں نے اس کے سیدھے کولہے اور
ران کا آپریشن کر دیا۔

رام پرشاد کے لڑکوں کی جانب سے بار بار بتائے جانے کے بعد
وہ دوسری ٹانگ کا علاج کر رہے ہیں۔ انھوں نے یہ آپریشن کر دیا
رام پرشاد کے لڑکوں نے چارو ناچار مقامی پولیس اور حکام سے
رابطہ قائم کیا۔

ایس ایم ایس میڈیکل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایس آر
مہتا نے بتایا کہ تین سینئر پروفیسروں پر مشتمل ایک انکوائری کمیٹی
قائم کر دی گئی ہے۔

کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر ایف ایس کے برابار اور دوسرے
ممبر ڈاکٹر ڈی ایل چنگانی اور ڈاکٹر او پی کل شریشٹھا ہیں۔
کمیٹی سے تین دن کے اندر اندر رپورٹ پیش کرنے کو کہا گیا ہے
دریں اثنا ڈاکٹر مہتا نے کہا کہ تمام میڈیکل چارٹس اور ایکسرے
کی رپورٹ ضبط کر لی گئی ہے۔ تاہم جب رام پرشاد کے لڑکوں
سے رابطہ قائم کیا گیا تو انھوں نے شکایت کی کہ جیسے ہی
انھوں نے یہ معاملہ اٹھایا تو داخلی سلپ اور ایکسرے کی
رپورٹ ہٹا لی گئی ہیں۔

ڈاکٹر مہتا نے یقین دہانی کرائی کہ چھان بین کی رپورٹ
ملنے کے بعد سخت کارروائی کی جائے گی۔ قومی آواز

جے پور تو خیر ایک صوبائی راجدھانی ہے۔ ہندوستان کی
راجدھانی دلی کے سرکاری ہسپتالوں میں حالت اور بھی ابتر ہے
جیسا کہ آئے دن اخبارات میں یہاں کے سرکاری ہسپتالوں کے
ڈاکٹروں اور دیگر عملہ کی لاپرواہی کے بارے میں شکایات شائع ہوتی رہتی ہیں
کچھ ماہ پہلے روزنامہ تیج کے سابق اور روزنامہ پرتاپ کے ایڈیٹوریل
اسٹاف کے ایک معزز رکن جناب نقش صحرائی کو ایک حادثہ پیش آیا
تو ڈاکٹروں کی لاپرواہی کے باعث ان کی ٹانگ کے زخموں میں
زہر پھیل گیا اور ٹانگ کاٹنا پڑی اور ڈاکٹروں کی لاپرواہی کے
باعث نقش صحرائی ہسپتال میں ہی انتقال کر گئے۔ حال ہی
میں ایک اور مشہور شاعر اور ادیب جناب اے۔ کے فنا کو جو
سابق ایڈیٹر "تراش" کوٹہ ہو کر گذشتہ ۲۵ سالوں سے باقا

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

دیوان آنند کمار بار ایٹ لا

سرور تونسوی

؎ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

انگریزی حکومت میں پہلے ہندوستانی ڈویژنل کمشنر لاہور راجہ
نریندر ناتھ کے ہاں فروری سنہ ۱۸۹۵ء میں بسنت کے دن دیوان
آنند کمار کا جنم ہوا۔ سنٹرل ماڈل سکول لاہور اور گورنمنٹ
کالج لاہور میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۳ء
میں یہ کیمبرج یونیورسٹی کے پمبروک کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے
گئے۔ اُن دنوں ڈاکٹر اقبال اور جسٹس دین محمد بھی کیمبرج یونیورسٹی
میں ہی زیر تعلیم تھے۔ دیوان صاحب فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال
ان سے دو سال سینئر تھے۔

جب دیوان صاحب نے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی تو
تقسیم اسناد میں پمبروک کالج کے پرنسپل نے اپنی افتتاحی
تقریر میں فرمایا کہ میری زیر نگرانی ہزار ہا غیر ملکی طالب علموں نے
ڈگریاں حاصل کیں مگر جس شریفانہ، فرماں بردارانہ اور عقیدتمندانہ
انداز میں مسٹر کمار نے اپنا زمانۂ طالب علمی اس یونیورسٹی میں گزارا
ہے وہ ایسا مثالی تھا کہ جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہندوستان
کے زمانۂ قدیم میں مہاجن بھارت مذہبی، روحانی یا اخلاقی تعلیم حاصل
کرنے والے سٹوڈنٹ اپنے اُستادوں کو گرو کا درجہ دیتے ہوں گے
اور اُن کی تعظیم اپنے ماں باپ کی طرح کرتے ہوں گے۔ مسٹر کمار کا
یہ رویہ ان ہندوستانی راجاؤں، نوابوں اور خان بہادروں کے
فرزندوں کے لئے مشعلِ راہ ہونا چاہئے جو یہاں تعلیم کے حصول کی
خاطر میں ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن پر یہاں کے باشندوں
کو شرم محسوس ہوتی ہے۔ پرنسپل پمبروک کالج کا یہ تعریفی
سرٹیفکیٹ دیوان صاحب کے ارشاد کے مطابق اب بھی موجود ہے۔

جب دیوان صاحب بار ایٹ لا بن کر لاہور ریلوے
اسٹیشن پر پہنچے تو ان کا سامان تو ان کی کوٹھی (جو آج کل
فاطمہ جناح میڈیکل کالج کا ہوسٹل ہے) پر بھجوا دیا گیا اور
ان کی والدہ محترمہ اپنے بیٹے کو کار میں سیدھے ہردوار لے
گئیں اور انھیں گنگا اشنان کرانے اور گنگا جل پلانے
یعنی شدھ کرنے کے بعد گھر لائیں۔ ابھی دیوان صاحب
کیمبرج یونیورسٹی میں ہی زیر تعلیم تھے کہ پنجاب میں جلیانوالہ باغ
کا سانحہ رونما ہو چکا تھا۔ اور اس سانحہ دردناک سے
دیوان صاحب کے دل میں انگریزی حکومت سے متعلق نفرت
پیدا ہو گئی۔ چنانچہ جب گورنر پنجاب نے راجہ نریندر ناتھ سے
کہا کہ وہ اُن کے صاحبزادے کو اعلیٰ عہدے پر متمکن کرنے
والے ہیں اور راجہ صاحب نے یہ خوشخبری اپنے فرزند ارجمند کو دی
تو آنند کمار صاحب نے انگریزی حکومت کی ملازمت سے انکار
کر دیا اور کہا کہ میں تو درس و تدریس میں دلچسپی رکھتا ہوں اور
ایک ماہ بعد ہی انھیں پنجاب یونیورسٹی میں زوالاجی پڑھانے کی
ملازمت مل گئی۔

راجہ نریندر ناتھ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو ہلا
کی ہر دلعزیزی کے باعث عوام نے انھیں اپنا لیڈر بنا لیا۔ اور
راجہ نریندر ناتھ کی حیثیت پنجاب کی سیاسیات میں اس مہرے
کی ہو گئی جس کے بغیر کوئی بھی سیاسی گتھی حل ہونا مشکل تھا۔
یونینسٹ پارٹی کے سرکردہ سر سکندر حیات خاں، چوہدری چھوٹو
رام اور دیگر اکابر راجہ صاحب کو اپنا دست راست سمجھتے تھے۔
پنجاب کے ہندوؤں نے راجہ صاحب کو پہلے پراونشل مہا سبھا
اور پھر آل انڈیا مہا سبھا کا صدر منتخب کیا۔ راجہ جی راؤنڈ ٹیبل

کانفرنس میں مدعو کئے گئے۔ غرضیکہ پنجاب کی حکومت سازی بھی ان کے مشورہ کے بغیر عمل میں نہیں آسکتی تھی۔ سر [illegible] کو وزیر بنانے والے راجہ صاحب ہی تھے۔

اس وقت کا [illegible] خواہ وہ [illegible] کا ہو یا مسلم [illegible] لاہور [illegible] راجہ صاحب کا [illegible] دیوان [illegible] دیوان آنند کمار نے [illegible] رکھا ہوا تھا کہ [illegible] آزاد [illegible] رہ سکے [illegible] جب [illegible] ابوالکلام آزاد [illegible] یہاں مہمان ہوئے تو شام کو آنند کمار صاحب مولانا آزاد کے پرسنل سیکرٹری [illegible] اجمل خان صاحب کو ڈرائنگ ہال میں لے گئے اور ایک الماری کھول کر کہنے لگے اجمل صاحب غیر ملکی شراب کے [illegible] برانڈ آپ کے سامنے ہیں مولانا جو برانڈ پسند کرتے ہوں یہاں سے لے لیجئے گا۔ اس پر اجمل خان صاحب [illegible] اور فرمایا دیوان صاحب آپ کو غلط اطلاع ملی ہے۔ دیوان صاحب فرماتے تھے کہ اس [illegible] اجمل خان صاحب [illegible] واقعہ [illegible] دونوں کے ذہن میں تازہ ہو جاتا اور دونوں [illegible] دیتے۔

۱۹۴۷ء کے تقسیم ملک کے بعد دیوان آنند کمار بھی ۱۹ کروڑ کی جائیداد چھوڑ کر ہندوستان آگئے۔ اور پہلے کچھ دن مولانا [illegible] اپنے عزیزوں کے یہاں رہے اور [illegible] اپنے خسر کی کوٹھی [illegible] صاحب نے مجھے ان سے متعارف کرایا۔

دیوان صاحب نے ہندوستان آکر [illegible] کالج، دیال سنگھ کالج دہلی اور دیال سنگھ کالج کرنال جاری کئے۔ راؤز ایونیو کی بلڈنگ خرید کر اس میں دیال سنگھ پبلک لائبریری کا اجراء کیا۔ یاد رہے کہ سنہ ۱۹۱۰ء سے پہلے دیال سنگھ لائبریری لاہور میں راجہ نریندرا ناتھ نے بنائی تھی اور ایسی لائبریری ایشیا بھر میں اس لحاظ سے نہیں تھی کہ اردو، فارسی اور عربی کی نایاب اور مشہور عالم کتابوں کا جو ذخیرہ اس لائبریری میں تھا کسی اور لائبریری میں نہیں تھا۔ دیال سنگھ کالج کی بلڈنگ لودھی کالونی میں بنائی گئی اور بڑی شان و شوکت سے یہ کالج جاری رہا مگر [illegible] کی آمدنی کی [illegible] اور [illegible] مطالبہ [illegible] دیوان صاحب

کو منتقل کر دیا اور انھوں نے یہ کالج سنہ ۱۹۷۲ء میں دلی یونیورسٹی کی تحویل میں دے دیا۔ کرنال کا دیال سنگھ کالج اب بھی دیوان آنند کمار صاحب کے فرزند ارجمند دیوان گجیندر کمار صاحب کی چیئرمین شپ میں چل رہا ہے اور ہریانہ میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ دیال سنگھ لائبریری راؤز ایونیو کی بلڈنگ کا بہت بڑا حصہ دلی حکومت نے ایکوائر کر لیا اور [illegible] آنے فی مربع فٹ سے کرایہ مقرر کیا گیا جو ماہوار ۶۶۶۶/- روپیہ [illegible] اس کرایہ سے لائبریری کے اسٹاف کی تنخواہیں اور لائبریری کی بلڈنگ کی دیکھ ریکھ مشکل سے ہو رہی ہے اب جب کہ دلی میں فی مربع فٹ چودہ روپیہ کرایہ مقرر ہے مگر اس لائبریری کو وہی چھ آنے مربع فٹ ہی کرایہ دیا جا رہا ہے۔ جو کہ سنہ ۱۹۵۰ء میں مقرر کیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پچھلے چار پانچ سالوں میں اس لائبریری میں ایک بھی کتاب نہیں خریدی جا سکی اس کے باوجود یہ لائبریری اس لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے کہ اردو فارسی اور عربی کی نایاب اور نادر کتابیں ایسی جو اس لائبریری میں موجود ہے وہ دلی کی کسی دوسری لائبریری میں نہیں مل سکتیں۔

دلی کے سابق لیفٹیننٹ گورنر جناب جگموہن نے اس لائبریری کا کرایہ بڑھانے کے لئے [illegible] بھی مگر ان کے [illegible] کاش ہمارے موجودہ لیفٹیننٹ گورنر [illegible] صاحب تک یہ آواز پہنچ سکے اور وہ دیال سنگھ لائبریری کے ساتھ انصاف کر سکیں تاکہ یہ نامور لائبریری زندہ رہ سکے۔

انگریزی کتابوں کا جو بہترین کلیکشن اس لائبریری میں ہے شاید پارلیمنٹ کی لائبریری میں بھی نہ ہو۔ ہندی کتابوں کے بارے میں دیوان صاحب فرماتے تھے کہ ہندی [illegible] کو اس کے مصنفین نے اپنی قابلیت کے مظاہرے کے لالچ میں ایسی عجیب و غریب زبان کو جنم دیا ہے جسے کم سے کم ہندی نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ زبان کسی دوسری دنیا کی زبان معلوم ہوتی ہے چنانچہ ہندی کی کتابیں اس لائبریری میں شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھیں تاہم ہندی ادب کی ہر اچھی کتاب موجود ہے۔

دیوان صاحب بمبئی میں بڑے بڑے اداروں کے
پلاننگ، ڈائرکٹر، ڈائریکٹر اور چیرمین تھے۔ جن میں تھاپر گروپ
جگجیت ملز، دیال سنگھ ٹرسٹ اور دیگر درجنوں تعلیمی ادارے
تھے۔

پنڈت موتی لال نہرو نے اپنی صاحبزادی محترمہ لکشمی پنڈت
کا رشتہ دیوان آنند کمار سے کرنا چاہا مگر دیوان صاحب نے
انکار کر دیا جس سے پنڈت جواہر لال نہرو ہمیشہ اُن سے کھچے
کھچے رہے یہاں تک کہ جب دیوان آنند کمار کے داماد کرنل
اٹل پاکستان کی پہلی لڑائی میں کشمیر کے محاذ پر کام آئے تو
پنڈت جواہر لال نہرو اظہار افسوس کے لئے مسز اٹل کے ہاں
دیوان صاحب کے مکان پر تشریف لائے تو بھی دیوان صاحب
سے محض رسمی اظہار افسوس کرنے کے بعد مسز اٹل یعنی دیوان
صاحب کی صاحبزادی سے ایک گھنٹہ تک اظہار افسوس کرتے رہے

ہندوستان کی مشہور خاتون محترمہ رامیشوری نہرو دیوان
آنند کمار کی بہن تھیں اور گجرات کے سابق گورنر جناب بی۔
کے نہرو دیوان صاحب کے نواسے ہیں۔

پنڈت نہرو کی مخالفت کے باوجود مولانا آزاد نے دیوان
صاحب کو پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا۔ اور جس صحیح
انداز سے پنجاب یونیورسٹی کی خدمت دیوان صاحب نے انجام دی
شاید ہی پنجاب یونیورسٹی کو ایسا وائس چانسلر نصیب ہوا ہو۔

روس میں ہمارے سفیر پروفیسر نورالحسن جب وزیر تعلیم تھے تو
انھوں نے ایک ایسی محترمہ کی سفارشی خط دیوان صاحب کے نام
[illegible] جسے دیوان صاحب جانتے تھے کہ محکمہ تعلیم میں ایسی عورت
کا ہونا بدنصیبی سے کم نہیں۔ دیوان صاحب نے یہ سفارشی
[illegible] پڑھنے کے بعد اپنے سکریٹری جو ایک سردار صاحب تھے کو
[illegible] کہ ابھی دلی نورالحسن صاحب سے ٹیلی فون کی لائن ملائیں
[illegible] دیوان صاحب نے پروفیسر نورالحسن صاحب سے کہا یہ
[illegible] لکھتے وقت اگر آپ نے اپنی پوزیشن کا خیال
[illegible] پوزیشن کا خیال [illegible] لیا ہوتا [illegible]
[illegible] کا ریسیور کریڈل پر پٹک دیا۔
[illegible] صاحب نے پنجاب یونیورسٹی میں پڑھنے ادیب

ادیب عالم، منشی، منشی فاضل کے امتحانات کا سلسلہ
شروع کرنے کے لئے اپنی کوٹھی ۱۹ سندر نگر میں قاضی سجاد
حسین صاحب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، جناب اجمل خاں
صاحب وغیرہ اہم ہستیوں کو کھانے پر مدعو کیا اور مشورہ کیا کہ
کون کون حضرات کو ان امتحانات کا ممتحن مقرر کیا جائے۔

قاضی سجاد حسین صاحب کا فرمان ہے کہ جب انھوں نے مولانا
ابوالکلام آزاد سے کہا کہ آج ہم نے ایک عجیب شخص سے
ملاقات کی۔ اس شخص میں تعصب نام کی بدعت کہیں
نظر نہ آئی۔ انسانیت اور شرافت کا نمونہ، اُردو، فارسی
عربی کا شیدائی اور اب جب کہ اُردو، فارسی وغیرہ کا نام لیوا
پنجاب میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتا یہ شخص پنجاب یونیورسٹی
میں اورینٹل لنگویج کے امتحانات شروع کرنا چاہتا ہے۔

تو مولانا آزاد نے فرمایا قاضی صاحب آپ کو معلوم ہونا چاہیئے
کہ اس شخص کے آباؤ اجداد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر
خزانہ۔ آنریری آف اسٹیٹ اور مہاراجہ کی فوج خاص کے جنرل
رہ چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کے چشم و چراغ ان صفات کے
حامل نہیں ہوں گے تو پھر اور کون ہوگا۔

کالج میں چند اسامیاں خالی تھیں تو امیدواروں سے
مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ آپ میں سے ہندو اور سکھ صاحبان
تشریف لے جائیں آپ کے لئے تو سارا ہندوستان موجود ہے
جہاں آپ کو کام مل سکتا ہے۔ مگر مسلمانوں کے لئے اب
ایسی سہولیت نہیں رہی لہٰذا مسلمان امیدواروں کو ہی میں
ملازم رکھوں گا۔

دیال سنگھ کالج میں مسلمان طالب علموں کے لئے نصف
فیس کی معافی کا تو عام اعلان تھا اور اگر کوئی طالب علم اُردو
پڑھنا بھی اپنے مضامین میں شامل کرتا تو اس کی ساری فیس
معاف کی جاتی تھی اور اکثر حالات میں تو ایسے طالب علموں کو کتابیں
بھی دیوان صاحب خرید کر دیتے تھے۔

جناب نثار [illegible] صاحب ترقی اُردو بورڈ کے ڈائرکٹر
[illegible] تو وہ دو سال کی رخصت لے کر دیال سنگھ کالج کے
شعبۂ اُردو سے ترقی اُردو بورڈ میں گئے۔ [illegible] صاحب

شارب صاحب دیال سنگھ کالج میں واپس نہیں آئیں گے
لہٰذا ان کی جگہ اُردو پڑھانے والے کے لئے آسامی پُر
کرنے کے لئے اشتہار دیا گیا۔ جناب عزیز اندوری کی خواہش
تھی کہ وہ دہلی آجائیں۔ لہٰذا میں نے اُنھیں دلی بُلا لیا اور
اُن کی درخواست بھی بھجوا دی گئی۔ دیوان صاحب کا یہ احسان
تھا کہ وہ مجھ نیاز مند پر اعتماد کرتے تھے۔ کئی سالوں تک
شام کی سیر میں میرا اُن کا ساتھ رہا اور ہر روز صبح سات بجے
سے نو بجے تک بھی میں ان کی خدمت میں حاضر رہتا۔
یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھ ایسے ہیچمدان کو
وہ عزت بخشتے تھے۔ اور اکثر معاملات میں مشورہ بھی طلب کرتے
تھے۔ قدرت کا کرم تھا کہ میں اُن کے بتائے ہوئے مسئلے پر
جو اچھا برا مشورہ دیتا وہ عین ان کے سوچے سمجھے نتیجے کے
مطابق ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے شارب صاحب کی جگہ رکھے
جانے والے امیدواروں کے لئے بھی مشورہ چاہا تو عرض کیا کہ
صاحب صاف بات تو یہ ہے کہ میں اس جگہ عزیز اندوری کو
رکھوانا چاہتا ہوں آپ یقیناً عزیز اندوری میں وہ سب صفات
پائیں گے جو ایک اچھے اور مناسب اُردو لیکچرار میں ہونی چاہیے
میری عرضداشت پر فرمانے لگے۔ اچھا کبھی عزیز اندوری کو یہاں
لانا۔ حافظ محمد یوسف دہلوی مرحوم بھی مجھ نیاز مند پر کرم فرماتے
تھے لہٰذا انھوں نے میری گزارش پر عزیز اندوری کو دفتر
شمع میں معقول تنخواہ پر ملازم رکھ لیا تھا۔ ایک روز میں
عزیز اندوری صاحب کو دیوان صاحب کے ہاں لے گیا۔ قدرت
نے یاوری کی دیوان صاحب نے جو کچھ عزیز اندوری سے
دریافت کیا اس کا جواب عزیز صاحب نے بہت ہی اچھے انداز
میں دیا۔ اور دیوان صاحب نے وعدہ فرمایا کہ عزیز اندوری
کو ہی رکھا جائے گا۔ اب معاملہ انٹرویو کا آیا۔ دلی یونیورسٹی
سے مسٹر پاٹھک آبزرور تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس اور دوسرے کچھ
حضرات انٹرویو بورڈ کے ممبران تھے۔ انٹرویو میں جواہر لال یونیورسٹی
کا ایک امیدوار رحمٰن کا نام غالباً مسٹر اصلاحی تھا۔ ایسا
اُمیدوار تھا کہ جسے کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا
لہٰذا اصلاحی صاحب کو کثرت رائے سے منتخب کر لیا گیا۔

ڈاکٹر قمر رئیس اپنی کار میں عزیز اندوری کو دیال سنگھ کالج
سے دریا گنج تک اپنے ساتھ لائے اور عزیز اندوری منہ
بسورے ہوئے میرے ہاں تشریف لائے اور مُردہ سی آواز
میں کہنے لگے سرور صاحب وہاں تو کسی اور کو رکھ لیا گیا ہے
میرے لئے یقین کرنا مشکل تھا کہ دیوان آنند کمار وعدہ
کریں اور ایفا نہ ہو۔ لہٰذا میں اُسی وقت عزیز اندوری کو
ساتھ لئے دیوان صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ حسب معمول دیوان پر
فرشتوں سی معصوم مسکراہٹ لبوں پر لئے بیٹھے تھے۔ دیکھتے
ہی فرمانے لگے آؤ سرور آؤ۔ اور پھر اپنے دیرینہ ملازم کالو کو آوا
دی کہ مٹھائی لائے۔ کالو آن واحد میں تین پلیٹیں اور ایک
طشتری میں مٹھائی لے آیا۔ دیوان صاحب نے خود پلیٹوں میں
مٹھائی رکھ کر پہلے عزیز اندوری کو اور پھر مجھے دی اور پھر فرمایا کہ
مُنہ میٹھا کرلو عزیز صاحب کا کام ہو گیا۔ عزیز اندوری جو نیم مردہ
حالت میں بیٹھے تھے کچھ سنبھلے اور میں نے عرض کیا دیوان صاحب یہ تو کہ
رہے ہیں کہ اُنھیں نہیں رکھا گیا بلکہ کوئی دوسرا امیدوار مسٹر اصلا
کو رکھا گیا ہے۔ دیوان صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا او
فرمایا بھائی اصلاحی ایسا اُمیدوار تھا کہ میرٹ کے لحاظ سے وہ با
کے سب امیدواروں کو پیچھے چھوڑ سکتا تھا لہٰذا میں یہ ظلم نہیں کر سکتا
کہ اصل حقدار کی جگہ عزیز کو رکھ لیتا میں نے خدا کے حضور بھی
آپ کو ناانصافی کا مرتکب نہیں ہونے دیا لہٰذا اصلاحی کو بھی رکھ
لیا اور عزیز اندوری کو بھی آپ آرڈر دیکھ سکتے ہیں۔ اصلاحی
مارننگ کالج میں اور عزیز کو ایوننگ کالج میں اُردو کا لیکچرار
گیا ہے تاکہ عزیز دن کے وقت دفتر شمع کی ملازمت بھی کر
رہے اور شام کو کالج میں پڑھا دیا کرے۔ اُس کی اجازت
تحریری طور پر دے دوں گا۔ عزیز سے فرمایا کہ جائیے کالج جا
اپنا تقرری نامہ لے لیجئے۔

۲۴ مئی ۱۹۸۱ء کو یہ مکمل ہزار داستاں حرکت قلب
بند ہو جانے کے باعث ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا
دیوان آنند کمار سے متعلق دس پندرہ منٹ میں تو
کا ابتدائی تعارف بھی ناممکن ہے چہ جائیکہ خاکہ لکھا
یہ چند سطور محض رسم پورا کرنے کے طور پر لکھ دی گئی ہیں

نور جہاں ثروت

مشاعرہ بزمِ شنکر و شاد نئی دہلی

ایک زمانے میں جب میری اور آپ کی دلّی کی کُل آبادی موجودہ آبادی کے ایک دو "نگروں" کی آبادی سے زیادہ نہیں تھی - فاصلے کم تھے - اس لئے ذرائع آمد و رفت بھی محدود تھے - اسی لئے دلّی میں گو چھوٹے پیمانے پر ہی سہی نہایت شاندار اور معیاری مشاعرے منعقد ہوتے تھے - ادب نواز حضرات جوق در جوق ان مشاعروں میں شرکت کے لئے آتے اور اچھے اشعار سے خوب لطف اندوز ہوتے ان مشاعروں کے حاصل مشاعرہ اشعار کی بازگشت ہفتوں عوام و خواص میں سنائی دیتی لیکن آج جب کہ لڑکی کے جہیز اور شادی کے اخراجات سے کہیں زیادہ بجٹ والے مشاعرے منعقد ہونے لگے ہیں اور جنھیں دیکھنے کے لئے شعر و شاعری کے ہزاروں شائقین دور دراز کی تکلیف دہ فاصلے طے کرکے پہنچتے ہیں - شعری ذوق کی تسکین کے لئے موسم کی کلفتیں برداشت کرتے ہیں - شعرائے کرام باراتیوں کی طرح ناز و نخرے کرتے ہوئے آتے ہیں لیکن اس سارے اہتمام کے باوجود سامعین کے ذوق کا سامان فراہم نہیں ہوتا مشاعروں کی اس کثیر تعداد میں بس ایک آدھ ہی شاعر، شاعری کی عزت بچانے میں کامیاب ہوتا ہے -

دلی کلاتھ ملز کا سالانہ مشاعرہ بھی دلّی کا دوسرا بڑا مشاعرہ ہوتا ہے جس پر لاکھوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں ہزاروں سامعین تسکین ذوق کی توقع لے کر مشاعرہ گاہ تک پہنچتے ہیں اور رات کے آخر میں بڑبڑاتے ہوئے واپس آتے ہیں - اُردو کی یہ کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ جشن جمہوریت اور ڈی سی ایم کے مشاعرے جو اپنے بھاری بجٹ اور بے پناہ وسائل سے بہترین اور معیاری مشاعرے کہلائے جانے کے مستحق تھے - دن بدن انحطاط کا شکار ہو رہے ہیں - مشاعرہ جشن جمہوریت پر تو اُردو والے بہت پہلے ہی فاتحہ پڑھ چکے کیونکہ بدقسمتی سے یہ مشاعرہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے جو سرکاری خرچ پر اپنی دکانیں چلانے کا ہنر جانتے ہیں اور شاعر و غیر شاعر کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں -

اس کے برعکس ڈی سی ایم کا مشاعرہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جن کی نیت پر تو شک نہیں کیا جا سکتا لیکن بدقسمتی سے اُردو نہیں جانتے اور مشاعرے کے روایتی رجحانات سے ناواقف ہیں اس مشاعرہ کے منتظمین اپنی دانست میں خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں اُردو کے جن قطب نماؤں سے مشورہ کرتے ہیں وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ان مخلص لوگوں کو گمراہ کرکے لال قلعہ کی طرح اس مشاعرے میں بھی اپنے حاشیہ برداروں کو مدعو کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ اس مشاعرہ میں ایک خاص قسم کے گروہ کی چھاپ لگی ہوئی ہے -

دور کیوں جائیے اپنی دلّی میں اچھے شاعروں کی کمی نہیں ایک دو نہیں اَن گنت ایسے موجود ہیں جو شاعری کی آبرو ہیں جنھوں نے اپنے شعری لہجے سے متاثر کیا ہے لیکن ڈی سی ایم کے مشاعرے میں دلّی کی نمائندگی صرف دو شاعروں کی قسمت میں ہے جن میں سے ایک شاعر یقیناً قابلِ احترام ہیں انھوں نے اُردو شاعری کو بہت کچھ دیا ہے دوسری شخصیت نہ زیادہ اہم ہے اور نہ متاثر کن پچھلے دو برسوں سے ایک اور شاعر کو شامل کیا جانے لگا ہے جو اپنی عمر کے لحاظ سے یقیناً قابل احترام ہیں لیکن شاعری کے اعتبار سے بس . . . .

ڈی سی ایم والے یقیناً اس طرح اُردو کی خدمت

[illegible] ہی وہ ڈوبا ہوا ہے تاریکی پھیلانے میں۔

کمار پاشی کے کلام کے بعد ناظمِ مشاعرہ نے بیکل اتساہی کو دعوتِ سخن دی۔ انھوں نے تحت میں چھوٹی بحر میں شعر پڑھے۔

سادگی سنگھار ہو گئی
آئینوں کی ہار ہو گئی
چھاؤں کے قریب جب گئے
دھوپ اعتبار ہو گئی

بیکل اتساہی کے بعد طنز و مزاح کے پاکستانی شاعر انور مسعود مائک پر آئے اور مزاحیہ قطعات سنائے

آپ کرائیں ہم سے بیمہ چھوڑیں سب اندیشوں کو
اس خدمت میں سب سے بڑھ کر روشن نام ہمارا ہے
خاصی دولت مل جائے گی آپ کے بیوی بچوں کو
آپ تسلی سے مر جائیں باقی کام ہمارا ہے

انور مسعود کے بعد پاکستان کے ایک اور مہمان حمایت علی شاعر جو صنف ثلاثی کے ماہر مانے جاتے ہیں زحمتِ سخن دی گئی۔

[illegible] ہم سے ملا ہوں تو یہ کھلا
[illegible] فاصلہ دھوکا نظر کا تھا
چہرے پہ عمر بھر کی مسافت رقم سہی
دل کے لیے تمام سفر لمحہ بھر کا تھا

ثلاثی ——— الہام

کوئی تازہ [illegible] اے ربِ جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
فکر محوِ انتظارِ جبرئیل

حمایت علی شاعر نے ڈاکٹر بشیر بدر کا تعارف نہایت جامع الفاظ میں کرایا ناظمِ مشاعرہ مائک پر آئے

وہ چہرے [illegible] جنھیں پڑھنے والوں نے پڑھ لیا
مرا چہرہ کوئی پڑھے گا کیا مرا چہرہ میری نقاب ہے

ڈاکٹر بشیر بدر نے محترمہ ممتاز مرزا کو دعوتِ سخن دی۔ انھوں نے اپنے مخصوص ترنم سے غم ذات میں ڈوبی ہوئی غزل پڑھی

غموں میں ڈوبی ہوئی ہر اک خوشی میری
[illegible] سے گزری ہے زندگی میری
خیال و فکر نے کیا کیا صنم تراشے تھے
تمام عمر پرستش میں کٹ گئی میری

ممتاز مرزا کے بعد کنور مہندر سنگھ بیدی مائک پر آئے

کچھ نورِ خدا دل میں کچھ جلوہ جاناں
کعبہ کا یہ کعبہ ہے بت خانے کا بت خانہ

اب زحمتِ سخن دی گئی عمر بھر غزل کے گیسو سنوارنے والے بزرگ شاعر محترم غلام ربانی تاباں کو

کس نے کہا کہ جانبِ صحرا نہ جائیے
دیوار و در کا قرض تو پہلے چکائیے

غلام ربانی تاباں کے بعد پاکستان کے مہمان شاعر قتیل شفائی جو اب سے پہلے کئی بار ہندوستان آچکے ہیں اور جن کے مجموعہ ہائے کلام ہندوستان میں چھپ چکے ہیں مائک پر تشریف لائے

رقص کرنے کا ملا حکم جو دریاؤں میں
ہم نے خوش ہو کے بھنور باندھ لئے پاؤں میں

اس کے بعد فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہوا قتیل شفائی کو گلو خلاصی کے بعد مجروح سلطانپوری کو دعوتِ سخن دی گئی۔

مجروح صاحب نے پہلے دو قطعات طنز و مزاح کے سنائے شاید اس سے پہلے طنزیہ کلام سن کر جتنے بد مزہ ہوئے ہوں گے اس کا مزہ بدلنے کے لئے ایسا کیا ہوگا ورنہ [illegible] خود۔ وہ مزاحیہ شعر نہیں کہتے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی مشہورِ زمانہ غزل اسی ترنم میں سنائی جو اس غزل کے [illegible] مقرر ہے

ہم ابھی ہیں شہ [illegible] ہوئے اور تم نے بھی دیکھا دور سے لیکن
یہ نہ سمجھا ہم کو ہوا ہے جان کا نقصان تم سے زیادہ

اخیر میں کیفی اعظمی کو زحمت دی گئی انھوں نے تحت مخصوص انداز میں کلام سنایا

وہ بھی سراہنے لگے اربابِ فن کے بعد
[illegible]

حسن عسکری کاظمی

کل ہند پاک مشاعرہ انبالہ

برصغیر ہندوپاک کے مختلف علاقوں سے بیکرانِ صداقت
صفا فکرونظر کے چراغ روشن کرنے کی خاطر ایک ایسی سرزمین پر
اکٹھے ہوئے جہاں اُردو زبان سے نسبت رکھنے والے ان
کے منتظر تھے۔

شام بہار ٹرسٹ کے روحِ رواں راجندر ملہوترا کے حُسنِ
انتظام اور ان کے جمالیاتی ذوق کو دیکھ کر مہمانوں کے چہرے
کھل رہے تھے۔ ہر طرف سے سیلابِ نور و نکہت سرسراتے
ہوئے نقرئی قہقہے فضا کو اور بھی خوبصورت بنا رہے ہیں جب
کاروانِ رنگ و بو لذتِ کام و دہن کے مرحلے سے منزلِ سماعت
کی جانب رواں دواں تھا تو پاکستانی شعراء اور ہندوستانی
سامعین کے میل جول سے ایک نئی معتبر، محبت بھری اور
جاندار محفل نے اپنے ہونے کا پتہ دیا۔

اس محفلِ شعر و سخن میں جسے کل ہند و پاکستان مشاعرہ
کا اعزاز حاصل تھا۔ سرزمین انبالہ پر پوری آب و تاب
کے ساتھ منعقد ہو رہا تھا جس کی صدارت کے فرائض گورنر
ہریانہ سید مظفر حسین برنی انجام دینے والے تھے اور جس میں
مہمانِ خصوصی ڈاکٹر محمد ہمایوں سفیر پاکستان دہلی سے انبالہ
تشریف لائے۔

راجندر ملہوترا نے مہمانانِ گرامی کی تشریف آوری کی خبر
دیتے ہوئے ... مشاعرے کے انعقاد کا اعلان کیا
دور تک پھیلے ہوئے پنڈال کی رنگین منقش چھت سامعین
کی تالیوں کی گونج سے اور بھی نکھر گئی

ادھر اس علاقے کے ڈپٹی کمشنر نے خیر مقدم کرتے
ہوئے اپنی میزبانی کا اظہار کیا۔ دوسری طرف ملک زادہ
منظور احمد نے شمعِ مشاعرہ روشن کی خاطر صدرِ تقریب سے
درخواست کی۔ ایک بار پھر تالیوں کی گونج فضا میں وہ
روایت روشن ہوگئی جسے مشاعرے کے اِن دنوں میں ہمیشہ اہمیت
حاصل رہی۔

مشاعرے سے قبل کشمیری لال ذاکر کی دو کتابوں "دوسرے
سورج کی کتھا (ناول) اور "میرا آنچل میلا ہے" (افسانے)
کی رسم اجراء ہوئی انھوں نے یہ شعر پڑھا کہ ؎

میرے فسانے پڑھو گے تو جان جاؤ گے
تمہاری گلیوں میں میرے ہی خواب بکھرے ہیں

کشمیری لال ذاکر نے ان دو کتابوں پر ایک ہی بار خوب
خوب داد سمیٹی۔

سفیر پاکستان ڈاکٹر محمد ہمایوں نے مشاعرے سے قبل
کہا کہ سامعین شعرا کا کلام سننے کے لئے بے تاب بیٹھے ہیں
اس لئے اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ
شام بہار ٹرسٹ نے باقاعدگی کے ساتھ ہر سال مشاعرے
کا اہتمام کیا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ میرے وطن عزیز
پاکستان سے اتنی بڑی تعداد میں شعرا تشریف لائے اس
نوعیت کے ثقافتی وفود کے تبادلے ضروری ہیں۔ ہندوستان
کے ادیبوں کی پانچ ہزار کتابیں پاکستان میں مختلف مقامات
پر دکھائی گئیں۔ دو ہمسایہ ملکوں میں باہمی تعاون اور
دوستی کو بڑھانے کی کوشش جاری رہے گی۔ آج یہاں
گورنر ہریانہ کی سرپرستی میں اس مشاعرے کا انعقاد ہوا تو
اسی طرح آئندہ عنقریب کراچی، لاہور میں اسی پیمانے پر
ہندو پاکستان مشاعرہ منعقد کرنے کے انتظام کئے جا رہے
ہیں۔

صدرِ مشاعرہ سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ نے کہا۔
یہاں اُردو گھر اور اُردو اکیڈمی بنانے کی کوششیں جاری
ہیں یہ سب کام راجندر ملہوترا کے ذمہ ہے جو ان کی خوش نیتی

کا نتیجہ ہے انھوں نے کہا کہ اردو غزل اور اس کی گائیکی اس قدر مقبول ہے کہ جس کا حاصل یہ نکلا کہ اردو پڑھنے کا ذوق و شوق بڑھ رہا ہے جو زبان عوام میں اتنی مقبول ہو اور وہ زبان جو اس قدر شگفتہ ہو وہ ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ خطبۂ صدارت میں وہ یہ شعر پڑھ کر گئے ؎

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

ان کا اشارہ انسان دوستی کی لازوال قدروں کی طرف تھا جس کی ایک مثال آج کا یہ ہند و پاکستان مشاعرہ تھا۔

اسی مشاعرے کے آغاز میں مسٹر اشفاق نے وزیر تعلیم پاکستان مسٹر آہیر کا پیغام پڑھ کر سنایا کہ دونوں ملکوں کے درمیان یہ فضا اور مشاعروں کا انعقاد خوش آئند ہے اس سے دونوں ملکوں کے درمیان خیر سگالی کا جذبہ فروغ پا رہا ہے اور جس کے نتائج بہت دور رس مرتب ہوں گے۔ پیغام ختم ہوا تو مشاعرے کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ملک زادہ منظور احمد نے ایک ایسے شاعر کو پکارا جو نگاہوں سے محروم ہیں۔ بصارت سے محروم ہونے کے باوصف وہ بصیرت سے بہرہ مند ہیں۔

اے ڈوبنے والے ہوش میں آ احساس خودی کو زندہ کر
موجوں کو بدل دے ساحل سے امید کنارا رہنے دے

آواز کے ساتھ ترنم کانپوری کا ترنم فضا میں بکھرنے لگا۔

اس مرد مجاہد کے صدقے جس نے یہ سبق دنیا کو دیا
جو تیغ کے سائے میں ہوا سجدہ وہی سجدہ ہوتا ہے

اردو زبان و ادب مشترکہ ترکہ ہے اس لئے ہر عقیدے کا فرد اس زبان کو وسعت دینے کا پرخلوص عزم کئے ہوئے نظر آیا۔ سریندر پنڈت سوز کو سنئے ؎

جس لاش کو چندن میں سجا رکھا ہے میں نے
یہ قتل بھی میرے ہی اشارے پہ ہوا تھا

ماجد دیوبندی مائک پر آئے۔

ہم نے غیروں پہ تو الزام لگا رکھے ہیں
اپنے دامن کے مگر داغ چھپا رکھے ہیں

لیجئے وہ رخصت ہوئے تو ساغر عافیت سے ایک آواز طلوع ہوئی۔ ساغر فریدی نے معاشرے کے تضاد رویوں کو موضوع سخن بنایا۔

لوگ نیلام ارنا سے کبھی نہیں باز آتے
اور تعلیم دیا کرتے ہیں خودداری کی

ہر شاعر کا اپنا انداز اظہار ہوتا ہے اسی بات کو مزا کے رنگ میں ساغر خیامی پیش کرنا چاہتے تھے۔

بغیر سوئی کے کرتا ترپ نہیں سکتا
بغیر آب کے پودا پنپ نہیں سکتا
مرا خیال غزل میں خیال پیدا کر
یہ ٹیلیفون تو کتابوں میں چھپ نہیں سکتا

مزاج نا پھلجھڑی تمام ہوئی تو انسی جگہ تسنیم صدیقی عصمت مریم کی شہادت کا خیال آیا ؎

یہ الگ بات کہ عیسیٰ نہیں بنتا کوئی
ماں کی آغوش تو معصوم ہے مریم کی طرح

ظاہر ہے کہ ایسا انسانیت کے دکھوں کا مداوا کے لئے ہی گا، نا اتنا آسان نہیں لیکن غیر علیل یا اس کی نسل پر بیتی مصیبتوں پر انسان کڑھ سکتا ہے۔ نثری نظم "گدھے" پڑھنے کے لئے کھنڈوا نیپال۔ گلاب کھنیالی آپہنچے وہ طنزیہ نظم پڑھنے کی ایک فقط خواہش میں مبتلا تھے کہ ان کی جگہ انور بشیر بدر کو لیا۔ اللہ اللہ یہ کیسا شائستہ مذاق تھا لیکن کسی کو زحمت دینا تھی۔

"میں نہیں پڑھ سکتا" انھوں نے اپنے خشک پوری قوت سے کام میں لاتے ہوتے ہوئے معذرت یہاں ناظم مشاعرہ نے ان سے اپنی دیرینہ دوستی میں نہایت بے تکلفی سے آرا چلا دیا۔

"جی وہ پانی پی رہے ہیں وہ کسی الجھن سے نہیں پڑھیں گے وہ قدرے وقفہ چاہتے ہیں اب مجھے پڑھنا ہے" ؎

جو بات کہی جا سکے تیور سے کہی جا
جو شعر کہا جا سکے حریفانہ کہا جا

ملک زادہ منظور احمد نے اپنی غزل کے اختتام کے ساتھ ہی شعر پڑھا۔

وہ عکس بن کے مری چشمِ تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

اس لئے ان کے اعلان سے پہلے معلوم ہوا کہ بشریٰ صابری کو کہیں سے گھیر کے لایا جا رہا ہے وہ اس سالانہ ہند و پاکستان کے مشاعرے میں جس تسلسل سے شرکت کر رہی ہیں اس سے وہ وضع داری اور وفاداری بشرطِ استواری کی عملی تصویر دکھائی دیں اور جیسے ناصر کاظمی مرحوم نے فرمایا تھا کہ ؏

پھرا ایک کبوتر کئی عصا بوں میں
مرے لبوں پہ ابھی نام تھا بہاروں کا
ہجومِ شوق میں خاروں نے مجھے گھیر لیا
جب آیا عید کا دن گھر میں بے بسی کی طرح
تو میرے پھول سے بچوں نے مجھ کو گھیر لیا

وہ اپنے شاہین صفت بچوں سے جان چھڑا کر برائے دلی میں شعلہ نوائی سے اپنا غمِ فراق چھپانے کی کوشش کرتی رہیں۔

صہبا اختر کو دعوتِ سخن دی گئی ؎

میں پاکستان کا شاعر ہوں، پاکستان ہے میرا
مگر نوعِ بشر سے پیار بھی ایمان ہے میرا

صہبا اختر نے محبت کے دریا بہائے جو بہت دیر تک بہتے رہے اور نظم مسلسل کا انجام بخیر ہوا۔

اردو شاعری کی خدمت میں تیسری پشت کی نمائندگی کرتے ہوئے افتخار امام الحرسے جناب سیماب اکبر آبادی کے پوتے نئے آہنگ اور جدید لہجے میں غزل سرا ہوئے ؎

میری آواز کے سائے میں سفر طے کر لے
آئینہ مجھ کو بنا اور نظر طے کر لے

اس سفر کے اختتام محترمہ سحاب قزلباش نے فضا میں اذہار سے انکار کا اظہار کیا ؎

بے صدا اشکوں کو اظہار نہ ہونے دیں گے
تجھ کو رسوا سر بازار نہ ہونے دیں گے

ان کے بعد شاہد الوری نے طنز کو شعار بنایا۔

چاند پر جا کے انھوں نے تو علم گاڑ دیئے
اور ہم سوئے چرخِ غبار سے بھی نہ چھوڑے ہم نے
بیٹھے اس مصرعہ اقبال کو دہراتے رہتے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

ساغر اعظمی نے مشورہ دیا کہ :

جسم تو بہت سنور چلے روح کا سنگار کیجئے
پھول شاخ سے نہ توڑیئے خوشبوؤں سے پیار کیجئے

ایک اور آواز حسن عسکری کاظمی کے نام سے یوں سنائی دی

چہرے سے مرا کرب دکھائی نہیں دیتا
آواز تو رکھتا ہوں دہائی نہیں دیتا

ظہیر النساء نگار کو شکایت رہی کہ

تیرے شہر میں کوئی اہلِ دل کسے زندگی کا پیام دے
یہاں آبرو ہے بکی ہوئی یہاں آدمی ہے بکا ہوا

حکمت کی بات جناب حکیم افتخار فخر نے سنائی ؎

کوئی دستک دے اچانک گھر کا دروازہ نہ کھول
پہلے سن آواز پھر آواز کا چہرہ بنا!

بشیر بدر اب غزل پڑھنے کا موڈ بنا چکے تھے اور وہ اسٹیج سکریٹری کی زبان پر دعوتِ سخن سے پہلے ہی گویا ہوئے۔

ملک تقسیم ہوئے دل تو سلامت ہیں ابھی
کھڑکیاں ہم نے کھلی رکھی ہیں دیواروں میں

انور مسعود قطع کلامی کے انداز میں قطعہ پڑھنے لگے۔

لازم ہے احترام بزرگوں کے حکم کا
دل سے خیالِ حکم عدولی نکال دے
انور نہ ڈال کل پہ کبھی کام آج کا
میرے عزیز تو اسے پرسوں پہ ڈال دے

ہند و پاکستان کے اس مثالی مشاعرے میں دکنی لہجے میں محسن احسان نے پتے کی بات کی۔

ہم دامِ حریفاں ہیں آپ بھی ہم بھی
ستم کشِ غمِ دوراں ہیں آپ بھی ہم بھی
چلو کہ پیار سے کشکولِ آرزو بھر لیں
گدائے بے سر و ساماں ہیں آپ بھی ہم بھی

جناب جگن ناتھ آزاد نے گزشتہ دنوں پاکستان کی
پیار بھری سرزمین پر نئے تجربے کئے۔
عمر رفتہ یوں اچانک لوٹ کر آ جائے گی
اس سفر کا مجھ کو پہلے سے یہ اندازہ نہ تھا
جواب میں حمایت علی شاعر نے اپنا تجربہ بیان کیا۔
مدت کے بعد تم سے ملا ہوں تو یہ کھلا
یہ وقت اور یہ فاصلہ دھوکا نظر کا تھا
استاد شاعر بیکل اتساہی نے ہندی زبان کی مٹھاس کو
غزل کے رگ و پے میں رواں دواں کرتے ہوئے سنئے
اشاروں میں گفتگو کی ہے
جس کی ہر شاخ پہ رادھائیں مچلتی ہوں گی
دیکھنا کرشن اسی شاخ کے نیچے ہوں گے
جناب راغب مرادآبادی نے رباعی کو وسیلۂ اظہار
بنایا ہے
رکھتے ہیں زمین ذہن میں سونا چاندی
سوہنی مٹی پہ اس کی ہم نے جان دی
احساس کی فصل لہلہائے گی ضرور
افکار کی ہو رہی ہے بوندا باندی
سنا ہے پنڈال سے باہر کچھ ترشح بھی ہوا
ادھر رات ڈھل چکی تھی صبح کے ساڑھے چار بجا چاہتے
تھے۔ شکیل شفائی نے یہ کہہ کر سب کو اور بھی بیدار کر دیا۔
ذوق لکھتے ہو غزل کا تو سنو بات مری
نیند کا بوجھ نہ رکھنا کبھی سر پہ یارو
رات کے پچھلے پہر شاعری سننے کے لئے
جاگنا بھی ہے عبادت کے برابر یارو
اس عبادت کا سلسلہ صبح عبادت تک جاری رہ کر تمام ہوا۔

بقیہ: بزم سخنگو و نقاد

یہ شہر تو ہے آپ کا آواز کس کی تھی
دیکھا جو مڑ کے ہم نے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اس کے بعد فرمائشوں کا سلسلہ چلا اور انجام کار مشاعرہ ساڑھے بجے
رات کو اختتام پذیر ہوا۔

خوراک اور غذا کا پروگرام

"انیمیا"

خوراک میں قلت فولاد کی وجہ سے عورتوں کو عام طور پر "انیمیا" یا خون کی کمی کا عارضہ ہو جاتا ہے معمولی سا زور لگانے پر بھی دم پھول جانا، انتہائی تھکن، کام کاج میں دل نہ لگنا، پلکوں، ہونٹوں اور زبان کا زرد ہو جانا انیمیا کی علامتیں ہیں انیمیا سے کام کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ زچہ اور اس کے پیٹ میں بچہ کا صحت مند نہ رہنا، اسقاط حمل یا قبل از وقت ولادت، پیدائش کے وقت بچہ کا وزن معمول سے کم ہونا، بار بار چھوت کی بیماریاں لگنے کا احتمال انیمیا کے اثرات ہیں۔

اچھی ملی جلی خوراک کھانے سے انیمیا کو دور کیا جا سکتا ہے۔ خوراک میں گندم، جوار، باجرہ، راگی، دالیں بالخصوص بھنی ہوئی دالیں، سفید اور سیاہ تل، کھجوریں، گڑ، پالک، سیتھی، بتھوا، چولائی، سرسوں کے ساگ کو اپنی روزانہ خوراک میں ضرور شامل کیجئے۔ سفید چاول کا استعمال کم کیجئے۔

ملیریا اور پیٹ میں کیڑوں کی وجہ سے بھی انیمیا ہو جاتا ہے۔ ملیریا کی روک تھام کے لئے اپنے گھر اور ارد گرد میں مچھروں کو نہ پنپنے دیجئے اور پیٹ کے کیڑوں سے بچنے کے لئے حفظانِ صحت کے لوازمات کو بہتر بنائیے۔ سینیٹری پاخانے استعمال کیجئے۔ صاف ستھرا پینے کے لائق پانی پیجئے۔

محکمہ خوراک
بھارت سرکار

DAVP 85/502

عربی ادب سے انتخاب

تحریر۔ فارس تلاش

فاصلے

ترجمہ:۔ ق۔ ا۔ ن

محبت کا ایک المناک فسانہ

صرف ایک بار میں اس سے ملا تھا اور اس حادثہ کو بھی ایک زمانہ گذر گیا۔ اب تو اس پر ماہ و سال کی اتنی دبیز گرد پڑی ہوئی ہے کہ وقت مسلسل پیچھے کی طرف لوٹ کر بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا اس اثنا میں میں نے طویل سفر کئے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر گیا سمندر اور جزیروں میں گیا۔ نہ معلوم کتنے ملکوں کے دارالحکومتوں میں گیا، اور خوبصورت و سربہ فلک عمارتیں دیکھتا رہا۔

معلوم نہیں کیا جی میں آیا کہ میں نے اپنا پاسپورٹ پھاڑ کر پھینک دیا۔ اپنا پرس اٹھا کر پھینک دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نامعلوم سورج ابھری۔

شاید اس طرح تاریخ کے لمحات کچھ ٹھہر جائیں شاید ماضی کا کوئی طوفان، مستقبل کے امکان کا پردہ اٹھا دے اور پانی کی وہ بوندیں جو بادلوں کی تہوں میں چھپی ہوتی ہوں، ٹپک پڑیں ٹپ ٹپ ٹپ!!!

کبھی کبھی اس طرح کے چھوٹے چھوٹے خوابوں سے دل بہلا لیا کرتا تھا۔ اچانک میری نبض کی حرکت تیز ہو گئی اور دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ درمیانی فاصلے ختم ہو جائیں اور ذات و وجود کے سارے جھگڑے ابد تک کے لئے طے ہو جائیں میرے دل کی گہرائیوں سے یہ احساس ابھرا۔

میں بہت جلد اس کے قرب کی آنچ اپنے دامن پر محسوس کروں گا؟ پھر کیا ہو گا؟ میں اس سے بہت پرتپاک انداز سے بغل گیر ہوں گا۔ لیکن لیکن یہ بھی سوچ رہا تھا کہ معلوم نہیں کہ اس کے احساسات کا کیا عالم ہو گا؟ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہو گی؟ میں اس کی دسترس میں ہوں؟ اور میرا ہوں؟ یا وہ مجھے گم کر کے اب تنہا ہو چکی ہے اور اپنی تنہائی سے مفاہمت کر چکی ہے؟

یہ سوچتا ہوا میں چند قدم آگے بڑھا اور اس گوشے کی طرف چلا گیا جہاں کچھ مسافر کھڑے تھے۔

ایک صورت پر نہ معلوم کیوں نگاہیں جم کر رہ گئیں برف کی طرح سفید چہرہ تھا۔ آنکھیں نیلی تھیں۔ بال الجھے ہوئے اور خاک آلود۔ اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے جس طرح کبھی ہمارے خیموں کی رسیاں نیچے لٹکی رہتی تھیں۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ غم کی دیوار منہدم ہوتی نظر آئی۔ ایک نامعلوم خوشی کا احساس ہوا۔

"واب کیا سوچ رہی ہو ظالم" یہ کہتے ہوئے میں کچھ دور تک اس کے ساتھ چلتا رہا۔ یہ اس کے حسن و جمال کا احترام تھا۔ اور آہستہ آہستہ اس کو زمانے کی ستم ظریفی کی داستان سناتا رہا۔ پھر سوچنے لگا۔ فرض کیا کہ وہ بے حد حسین و جمیل ہے۔ ایسی حسین و جمیل کہ سارا عالم اس کے حسن کی آگ میں پگھل سکتا ہے۔ مگر یہ حسن و جمال چند دیناروں میں بک بھی سکتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ شاید میرے اس خیال کی گرمی تھی جو اس تک پہنچ رہی تھی۔

میں نے اپنے حواس درست کئے۔ اس وقت مجھے اس کے محبت بھرے وہ خطوط یاد آ گئے جو اس نے مجھے لکھے تھے وہ سلک جس کی شیشی اس نے بطور تحفہ مجھے دی تھی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے کپڑوں پر ابھی ڈال کر آیا ہوں۔ یا ممکن ہے

ایک کہانی

نسیم سنرکھی

جب میں اس کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا سامنے کی دیوار پر نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ میرے آنے کی اس کو خبر ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ پاس رکھی ہوئی کرسی پر میں بیٹھ گئی۔ اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہیں میں غلط وقت پر آ گئی ہوں۔ اس سے پہلے جب میں آتی تھی تو وہ بڑھ کر میرا خیر مقدم کرتا اور مجھے بیٹھنے کو کہتا۔ آج نہ جانے اس کو کیا ہو گیا ہے۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

"اتنے غور سے دیوار کی طرف کیا دیکھ رہے ہو۔"

"کچھ نہیں۔" اس کا جواب تھا۔ پھر وہ بیٹھے بیٹھے ہنسنے لگا۔ اس کی بے بات کی اس ہنسی پر مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔

"کیا مجھے دیکھ کر ہنس رہے ہو؟"

"دیکھو" اس نے دیوار کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جب میں نے دیوار کی جانب نظریں کیں مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ دیوار صاف تھی۔ بالائی حصے پر جو چھت سے ملتا تھا ایک چھپکلی رینگ رہی تھی۔

"دیوار پر کچھ نہیں ہے سوائے ایک چھپکلی کے۔" میں نے کہا

"ہاں۔ اسے غور سے دیکھو۔" وہ اطمینان سے بولا۔

اس کے اس حکم سے مجھے اکتاہٹ ہو گئی۔ پھر بھی میں نے دیوار پر نظریں جما دیں۔ میں نے دیکھا کہ چھپکلی رینگتی ہوئی آگے بڑھی اور دیوار پر بیٹھی مکھی کو دبوچ لیا۔ میں چپ چاپ بیٹھی اس منظر کو دیکھ رہی تھی کہ یک بیک اس نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔

"کچھ دیکھا تم نے۔" اس نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں" [illegible] آہستہ سے کہا۔

"اچھا، اسے بھی دیکھو" اس نے دیوار پر لٹکا ہوا [illegible]۔ کیلنڈر کے صفحے پر ایک بہت بڑا اشتہار تھا جس کے اندر بیٹھا ہوا نیم برہنہ شخص گوشت کے ٹکڑے کو دانتوں سے نوچ رہا تھا۔ اس کے ارد گرد ہڈیوں کے لمبے اور نکیلے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ تصویر کے ایک کونے میں ایک جانور دم دبائے کھڑا ہوا اس نیم برہنہ انسان کو دیکھ رہا تھا۔ تصویر بڑی رنگ برنگی تھی لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے دیکھنے کے لئے کیوں کہا۔ میں نے اکتا کر اس سے کہا۔

"کسی زمانے کی یہ تصویر ہو گی ہمارے کس مصرف کی۔"

وہ چپ ہو گیا۔ کافی دیر تک بیٹھا وہ کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کو بھی دیکھو۔"

مجھے سخت بوریت محسوس ہو رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ جب میں نے چھت کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ چھت میں چڑیوں کا ایک گھونسلہ تھا۔ دو تین چڑیاں ایک چھوٹی چڑیا کو چھید چھید کر مار رہی تھیں۔ پاس ہی دوسری چڑیا اپنے سوراخ سے آدھا منہ نکالے دیکھ رہی تھی۔ چھوٹی چڑیا مار کھاتے کھاتے زمین پر گر پڑی اور پھر جلد ہی اڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں چپ ہو گئی۔ میں نے اس سے دبے الفاظ میں اس سے پوچھا۔

"تم چھت پکی کیوں نہیں کرا لیتے۔ کچی چھت ہونے کی وجہ سے پرندوں نے جگہ جگہ اپنا گھونسلہ بنا لیا ہے۔"

"کیا پکی چھت پر پرندے نہیں آتے۔" اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

پھر وہ خاموش ہوگئی۔ میری نظریں کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ کمرے میں [illegible] اخبارات اور کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس کے بیچوں بیچ وہ فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر اِدھر اُدھر مکڑیوں کا جالا۔ زمین پر [illegible] کے جلے ہوئے ٹکڑے اور مونگ پھلی کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ ہر چیز پر گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں اُٹھ کر کھڑی ہوگئی میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا —

"لاؤ میں تمہارے کمرے کی صفائی کر دوں۔"

"نہیں، نہیں — بیٹھو، بیٹھو — میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتا۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا اور خود کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں [illegible] اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ آج سے پندرہ سال پہلے [illegible] کا نام جماعت تھا۔ شکل و صورت بھی اچھی تھی اپنے جسم اور لباس کا بڑا خیال کرتا تھا۔ طبیعت میں نفاست تھی لڑکیاں چاروں طرف گھیرا ڈالے رہتی تھیں۔ ان میں میں بھی تھی۔ اب نہ جانے اس کو کیا ہو گیا کہ اس نے اپنے آپ کو برباد کر لیا ہے۔ میں ابھی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ دفعتاً وہ واپس آگیا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ اس نے دو خالی پیالیاں میرے سامنے رکھ دیں۔ ایک پیالی کو اوپر تک بھر دیا دوسری پیالی میں ایک چمچ چائے ڈالی۔ تیسری پیالی بھر کر اپنے منہ سے لگا لی۔ اور مجھ سے چائے پینے کا اشارہ کیا۔ میں بھی چائے پینے لگی۔ جب میری چائے ختم ہوگئی تو اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

"چائے کیسی تھی —؟"

"مزہ آگیا۔ بڑی اچھی تھی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"دوسری پیالی والی کیوں نہیں پی۔" اس نے سوال کیا۔

"یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ چائے کے قطرے تو پیے نہیں جاتے۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ ذرا اس جالے کی طرف دیکھو۔"

"اس کو کیا دیکھوں — یہ مکڑی کا جالا ہے۔ جس میں [illegible]

ایک چھوٹی سی [illegible]

ہوئی [illegible] چھپکلی اسے دیکھ رہی ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا ہے۔ میں تمہارے [illegible] فلم کو دیکھنے نہیں آئی تھی۔ میں تو [illegible] کہ تم [illegible] ہو۔ [illegible] ہو چکے تھے۔ سوچا تمہاری خبر لوں۔ اور تم ہو کہ اپنے کمرے کی فلم دکھا رہے ہو۔ دراصل تمہیں کتابوں نے خراب کر دیا ہے۔"

"چھوڑو، اپنی یہ سب باتیں، کچھ اور باتیں کرو۔ [illegible] نہیں کرتے۔"

"تم نے اوپر تک چائے سے بھری ہوئی پیالی تو پی لی قطروں والی پیالی کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

"تم اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اس موضوع کو ٹالنا چاہتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے بہت کچھ پڑھ لیا ہے۔ لیکن یہ سمجھنے سے قاصر ہو کہ محبت کیا شے ہے۔ کسی لڑکی کے جذبات کو نہیں سمجھ سکتے۔"

"درست کہتی ہو — میں بھی دیکھتا رہتا ہوں۔"

"یقیناً۔ اپنے کمرے کی دیواروں کو دیکھتے رہتے ہو۔ یہ دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔ کہ ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے اوپر مسلط کر کے بیٹھ گئے ہو۔ ذرا اپنے اطراف میں نظریں دوڑا کر دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ تمہارے ساتھی کوئی انجینئر، ڈاکٹر اور بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ گئے ہیں۔ وہ کوٹھیوں اور بنگلوں کے مالک بن گئے ہیں۔ اگر تمہاری جیسی سوچ ہوتی تو کیا وہ اس حقیقت کے مالک ہوتے۔"

میری باتیں سن کر وہ گم سم ہو گیا۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اُٹھ کر اس نے کمرے کا چراغ بجھا دیا۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ اس اندھیرے سے مجھے سخت گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ ایک انجانا ڈر میرے اوپر سوار ہو گیا۔ ایسا لگا کہ کوئی میرا گلا دبا رہا ہے۔ اس خوف سے میرا بدن تھر تھرانے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے پھر چراغ روشن کر دیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا

"کانپ کیوں رہی ہو —؟"

"نہیں تو — میں ٹھیک ہوں۔" میں نے جھوٹ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ جب اس کی ہنسی رک گئی۔ تو اس نے کہا "بقول تمہارے اگر یہ فلم ہے تو اس فلم کے سب ٹکڑوں [illegible] ایک کہانی [illegible]۔"

اور دھرتی کانپ اٹھی

قسط ۱۳

احمد حسین شمس ایڈووکیٹ دکشن گنج

"تو پھر کوئی اشارا ہوگا کیوں نہیں"

"اچھا تو سنو۔ تو کیا اس مچھلی والے کی دوکان پر تم گئے تھے"

"ہاں وہیں سے تو میں آ رہا ہوں۔"

"کیا دیکھا؟"

"ایک مسلمان دو سیر مچھلی خرید کر وہیں چھوڑ گیا ہے۔"

"اچھا تو سرکار میں وہیں جاتا ہوں۔"

"اس رفیوجی کو تو پہچانتے ہو نا۔"

"جی ہاں"

"ہاں بڑی ہوشیاری سے کام انجام ہو اور دارو غہ صاحب کہاں ہیں؟"

"منگلو نے ہاتھی سے اترتے ہوئے کہا وہ دوسری طرف ایک دوکان پر بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"اچھا جاؤ جلدی کرو۔"

مچھلی والے کی دوکان پر ایک شرنارتھی بنگالی آیا اور [illegible] دیکھنے لگا دلاور خاں اور منگلو آس پاس ہی کھڑے تھے دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں آنکھوں ایک دوسرے سے بات کر لیا کرتے تھے۔

بنگالی نے کہا "او مچھلی والا ہام [illegible] ماچھ لینگا [illegible]"

"او ہو بابا، تو اب ختم ہو گئی۔"

"ادھر کو جو را کھا ہے ادھی ناپ دو۔"

"یہ مچھلی میں نہیں دے سکتا۔"

"[illegible] کاہے؟" اور ایک غضبناک [illegible] مچھلی والا پر ڈالی۔

"یہ مچھلی ایک آدمی خرید چکا ہے"

"[illegible] شالا لوگ خالی ابھی ناحق ہم لوگ کو بولتا ہے ہام لوگ پاکستان سے ہندوستان آیا کنتو تم ہندوستان کا مسلمان لوگ، ہام لوگ سے گھرنا کورتا ہے ہام ادھی ماچھ لے گا۔"

"ارے جناب ذرا منہ سنبھال کر بات کیجئے گا رفیوجی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے سینے پر مونگ دلنے جائیے زیادہ بات ......"

اتنی بات سنی تھی کہ اس بنگالی نے مچھلی والے کی گردن پکڑ لی، مچھلی والا اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس کے سر کے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیے اور چاہتا تھا کہ زمین پر دے مارے اتنے میں وہی مسلمان جس نے مچھلی خریدی تھی آ گیا! اور پوچھا کیا بات ہے۔

مچھلی والے نے کہا اس کمبخت بنگالی کو تو دیکھئے آپ کی مچھلی زبردستی اٹھا لینا چاہتا ہے اس مسلمان کو آ گیا طیش اس نے اس بنگالی کی کلائی پکڑ لی اور کہا کیوں بے دو گھونسے کہ مچھلی کا نام بھول جائے بنگالی کہیں کا آیا ہے مچھلی خریدنے

بنگالی نے کہا "شالا مسلمان جٹیا تم فاجلامی کورتا ہے۔ تم لوگ تو پاکستان سے ہام لوگ کو بھگایا اب ہندوستان میں بھی اس ماچھک آنکھ دکھلاتا ہے ہام تمرا آنکھ پھوڑ دے گا۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ اٹھا کر پٹک دوں گا تو سارا [illegible] پسلی چور ہو جائے گی دو چھٹانک گوشت نہیں بدن پر اور زبان تو دیکھو [illegible] کی۔ جیسے ان کے باپ کی جاگیر ہے ہندوستان۔"

"تم ہام کو گالی دیگا تو ہام تم کو مار دے گا!" اور اتنا کہہ کر اس بنگالی نے واقعی ہاتھ چھوڑ دیا پھر کیا تھا دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ان دونوں کا لڑنا تھا کہ منگلو اور دلاور خاں

متحرک نقوش تھے سارے — کچھ تو باقی رہا نہیں پیارے

یہ اسیرانِ زعمِ نصب العین — سب کے سب ہیں نصیب کے مارے

آدمی آپ اپنا دشمن ہے — اپنے ہاتھوں ہی جیت کر ہارے

خود سری کے اُمڈتے ریلوں میں — بہہ گئے ہیں خلوص کے دھارے

جو کسی کے کرم پہ جیتے ہیں — ہیں مجسّم اُدھار بے چارے

منحرف خود سے ہو گئے آخر — گلبدن، ماہرو، مہ پارے

واسطہ ہم سے کوئی کیا رکھے — ہم ہیں خانہ بدوش بنجارے

تشنگی آج بھی دمادم ہے — ہیں سمندر ہیں آج بھی کھارے

چھو لیا کن بلندیوں کو حقیر — دل میں آنے لگے نظر تارے

○

بوالعجب بوالفضول بن کے چلے — لو نمائندۂ اصول بن کے چلے

قوم کے سربراہ بنے جو لوگ — وقت کی آج بھول بن کے چلے

مشعلِ راہ بن کے نکلے تھے — راہ کی حیف دھول بن کے چلے

دور کیا یہ آگیا یارب — جس کو دیکھو رسول بن کے چلے

ہکا بکا حقیر ہے کب سے
خار رہ کر کہ پھول بن کے چلے

یوسف ثانی سلیمانی (پالی)

رات

رات نے اپنی باہنوں میں سارے نظارے باندھ لئے
گاؤں، نگر، جنگل، دریا، سارے کے سارے باندھ لئے
سر پہ گھٹائیں گھنور اندھیرا کچھ بھی کہیں پر نور نہیں
چاروں دشائیں لگتی ہیں ایسے جیسے زمیں پر نور نہیں
یعنی اندھیروں نے مل کر پُر نور نظارے باندھ لئے

رات نے اپنی باہنوں میں سارے نظارے باندھ لئے
ہر پیڑ سسکتا راہوں کا ہے شور مسلسل آہوں کا
لگتا ہے عذاب اترا ہے کوئی یکدم ناکردہ گناہوں کا
پیڑوں نے کراہوں سے اپنی ماحول کے دھارے باندھ لئے

رات نے اپنی باہنوں میں سارے نظارے باندھ لئے
تیرۂ شب میں شہر تمنا ڈوب گیا ہے کس سے کہیں
پیار کا تارا جی کا سہارا ڈوب گیا ہے کس سے کہیں
چوپال، سبھا، مندر کا کلس، مسجد کے منارے باندھ لئے

رات نے اپنی باہنوں میں سارے نظارے باندھ لئے
سیچوالیہ ادر سارگرہ گیان محل کیا گیان بھون
اپچارگرہ، کلیان سمیتی، بال نکیتن، نیائے سدن
کس کس کی کوئی اب بات کرے جب رات نے سارے باندھ لئے

رات نے اپنی باہنوں میں سارے نظارے باندھ لئے
کر گیا ہجرت شام کو سورج پھیلے اندھیرے چاروں طرف
آ کے اندھیرے ڈال چکے ہیں سا تھیو ڈیرے چاروں طرف
کالی اماوس پہنچی گگن تک چاند ستارے باندھ لئے

رات نے اپنی باہنوں میں سارے نظارے باندھ لئے

گگن کی چیخ

شام بارکپوری

سورج آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ نیلے آکاش پر بادل کے ٹکڑے روئی کی طرح تیرتے پھر رہے تھے۔ کھیت کی شادابی اور ہریالی میں فصلوں کی خوشبو رچی بسی تھی۔ ڈولتی ہوئی بالیاں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ گائے کھیت میں آزادانہ پھر رہی تھی۔ صبح سے شام تک سارے کھیت کا چکر لگانا اس کے روز کا معمول تھا۔ گھاس چرتے چرتے وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر سانس لینے لگتی۔ زندگی کے دریچوں سے ابھر کر سرگوشیوں کی دستک سنائی دے رہی تھی۔

اچانک سنہری دھوپ میں ایک بیل کھیت میں گھس آیا۔ اس نے بغیر کسی پس و پیش کے فصلوں کی جگالی شروع کر دی۔ اتنی ادھم مچائی کہ فصلیں تہس نہس ہو گئیں۔ روشنی سے اندھیرا لپٹ گیا۔ دھرتی کی شطرنجی پر زہرناک بیلیں پھیلتی دیکھ کر گائے کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ منہ سے سفید سفید جھاگ نکلنے لگے۔ امن کا راگ دھندلکے میں بکھر گیا تھا۔ وہ بیل کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"تم نے میرے کھیت کو پامال کر ڈالا" گائے کی آنکھوں میں خاموش چبھن تھی۔

"یہاں آ نے سے پہلے [illegible] کی آمد کو روک سکتی ہو۔" بیل نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

جس کے ہاتھ پاؤں سلامت ہوں، وہ اپنی جان کی بقا و سلامتی کی حفاظت خوب جانتا ہے۔ اس کی آنکھوں [illegible] رہی تھی۔

"یہاں چراگاہیں اچھی ہوں [illegible] پابندی نہیں لگا سکتی۔"

"یہاں قدم اٹھانے سے پہلے تمہیں سوچنا چاہئے کہ ہر ایک ریلے کے پیچھے طوفان کا امکان رہتا ہے۔"

اس ماحول میں زہر گھل گیا تھا۔

"میرے وجود سے ٹکر لینے سے پہلے سوچ لو کہ مجاہد کبھی میدان سے پیٹھ پھیر کر نہیں لوٹ جاتے ہیں۔"

حرمت بھری دھرتی کی ناموس کے لئے ہر ریت پر ہوا اتر کر بن کر بگڑ جاتی ہے۔ آنکھوں میں جذبات کا آتش فشاں سلگ رہا تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا بھویں چڑھائیں۔ خونخوار نظروں سے کسی کٹ کھنا کی طرح دیکھنے لگے۔ گائے نے اپنے کھروں سے زمین کی دھول اڑائی۔ اس کے نتھنوں سے گرم گرم سانسیں نکلنے لگے۔ بیل دو قدم پیچھے ہٹ کر اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ اچانک دونوں نے ایک دوسرے پر ہلہ بول دیا۔ دونوں کی سینگیں ٹکرائیں۔ ان کے درمیان زور آزمائی شروع ہو گئی۔ کبھی گائے اسے پیچھے ڈھکیل دیتی تو کبھی بیل اسے پسپا کر دیتا۔ منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ آنکھوں سے کدورت و نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ بدن سے پسینے ٹپک رہے تھے۔ جسم پر جگہ جگہ خراشیں پڑ گئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے لئے میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ کوئی بھی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔

اس بار جیسے ہی بیل اس کی طرف لپکا۔ اس نے چند قدم پیچھے ہٹ کر بیل کے وار سے بچنا چاہا۔ وار خالی گیا۔ گائے نے [illegible] حملہ کیا۔ گائے کی یورش سے بیل بوکھلا گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اب اس کی پشت گائے کی سینگوں کی زد پر تھی۔ گائے کے لئے [illegible] موقع تھا۔ [illegible] اپنی سینگیں [illegible] گھونپ دیں۔ [illegible] ایک [illegible] باقی

نئی نسل کے افسانہ نگار

ڈاکٹر ابو سعید نورالدین

شام بارک پوری

بنگلہ دیش جسے ندیوں اور طوفانوں کی سرزمین کہا جاتا ہے ۔ اس میں رابندر ناتھ ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام جیسے عظیم شاعر نے جنم لیا۔ یہاں کے قدرتی حسن اور گوناگوں انسانی مسائل سے متاثر ہو کر انھوں نے بنگلا ادب کے خزانے کو لعل و گوہر سے مالا مال کیا۔ جسے آج بھی دنیائے ادب حیرت سے دیکھتی ہے۔ یہیں کی نرم و زرخیز مٹی، لہلہاتی فصلوں، رنگ بدلتی ندیوں اور تند و تیز آندھیوں کی فضا میں اردو کے ایک نامور افسانہ نگار شام بارک پوری نے اپنے قلم کی جولانی سے اردو ادب کو شاہکار افسانے دیئے ہیں۔

اپنے ماحول کی ترجمانی، بنگلا دیشی عوامی مسائل کی نمائندگی، زندگی کی اچھائیوں پر ایمان، انسانیت کی عکاسی ساتھ ہی، انسان کو انسان کی نظر سے دیکھنا، امن و آشتی کا پیغام، جبر و تشدد کے خلاف آواز، انسانی کرب کو داخلی اور خارجی حیثیت سے اجاگر کرنا ۔ اور علامتی و استعاراتی اسلوب میں معاشرے، ملک اور ساری دنیا کے آلام و مصائب کو نمایاں کرنا ہی شام بارکپوری کے افسانوں کی خوبیاں ہیں ۔

۱۹۵۷ء میں ان کا سب سے پہلا افسانہ "آنسو" بن کر صفحۂ قرطاس پر ٹپکا تھا۔ جب سے آج تک ان کے افسانے برصغیر کے معیاری ادبی رسالوں میں مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ برصغیر کے قارئین کا ایک وسیع حلقہ ان کے مداحوں میں شامل ہو گیا ہے۔ لندن اور کنیڈا کے اردو رسالوں میں بھی ان کے افسانے شائع ہو رہے ہیں۔ ان ممالک کے محقق اور نقاد نے بھی اُن کو خراج تحسین پیش کیا ہے ۔

ان کا پہلا مجموعہ "پدما کی موجیں" جو کہ ستمبر ۱۹۷۹ شائع ہوا، نہ صرف بنگلہ دیش میں اردو کا پہلا افسا مجموعہ تھا۔ بلکہ سابق مشرقی پاکستان کے چوبیس سا میں بھی اردو کا کوئی افسانوی مجموعہ اس سرزمین سے شائع اس مجموعہ میں افسانہ نگار نے وہ تمام افسانے شامل ک جو ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۶ء تک کے عرصہ میں لکھے گئے ت نے اشاعت کے دوران صرف چیدہ چیدہ افسانے ا شامل نہیں کئے کہ مستقبل کے محقق اور نقاد کو افسانہ ذہنی پرداخت اور قوت تخلیق کا تجربہ کرنے میں آس اسی طرح انھوں نے اپنا دوسرا افسانوی مجموعہ میگھ میں بھی ردو بدل نہیں کیا۔ اور ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ افسانوں کو شریک کر کے اپنی تحریر کی اصلیت برقرار رکھ مجموعہ ستمبر ۱۹۸۰ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عا ۱۹۷۱ء سے اگست ۱۹۷۵ء تک افسانہ نگار کا قلم خاموش رہا۔ طویل خاموشی کے بعد ستمبر ۱۹۷۵ء میں ان ایک افسانہ "آٹھ کروڑ کا زخم" منصۂ شہود پر آیا۔ ی بنگلہ زبان میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ اس کے بعد ا کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو آج بھی جاری ہے

شام بارکپوری کا تیسرا افسانوی مجموعہ رہ جھنا کا جون ۱۹۸۴ء میں نکلا۔ یہ اپنی نوعیت کا بالکل اچھوتا مجموعہ اس سرزمین سے شائع ہوا۔ جس سے افسانوی انگشت بدنداں رہ گئی۔ بیانیہ کہانیوں کے علاوہ ا اور علامتی اسلوب کا یہ مجموعہ گوناگوں خوبیاں اپنے سمیٹے ہوئے ہے۔ بنگلا دیش کے نامساعد حالات

اردو معتوب ہو کر رہ گئی ہے اور اس کی شمع ٹمٹما رہی ہو۔
باد مخالف کے تند جھونکوں میں اتنی دیدہ دلیری، جرأت،
سچائی اور حق کا چراغ روشن کرنا صرف اور صرف شام بارکپوری
ہی کا کارنامہ تھا۔ جنھوں نے ساری دنیا کو دکھا دیا کہ ایک
ذمہ دار قلم کار اپنے قلم کی آبرو کا سودا نہیں کرتا۔ اور اپنی
تخلیق میں صداقت کو پیش کرنے میں مطلق پس و پیش نہیں کرتا
شام بارکپوری کا قیام کھلنا میں سندربن کے قریب ہے۔
جو بنگلہ دیش کا سب سے بڑا اور حسین جنگل ہے۔ انھوں نے
اس ماحول کو تراش خراش کر افسانوی ادب میں اپنے زور بیان
سے بانسری کا ایسا سُر پھونکا کہ افسانے کے قارئین سحر زدہ ہو کر
رہ گئے۔ ان کے افسانے نہ صرف قاری کے دل و دماغ
کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ بلکہ روح کی گہرائیوں میں
اتر کر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ یہ شام
بارکپوری کا کمال ہے کہ اپنے قاری کو ایک لمحہ کے لئے بھی ادھر
ادھر بھٹکنے نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ ان کے فن میں ایک
اور خصوصیت در آئی ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کا آخری
جملہ حذف کر دیا جائے یا کاٹ دیا جائے تو سرے سے
وہ افسانہ ہی معلوم نہ ہوگا۔ یہ اُن کے فن کی معراج ہے۔
چھٹی دہائی کے بعد اردو ادب میں کوئی ایسا افسانہ نگار پیدا
نہیں ہوا۔ جس نے افسانے کی اس تکنیک کی طرف دھیان
دیا ہو۔ کوئی اکا دکا افسانہ لکھ لے تو اور بات ہے۔ مگر اسے
فن کی حیثیت دینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اُن کے افسانوں
کی کن کن خوبیوں اور پہلوؤں کو گنوایا جائے۔ یہ گویا دریا کو
کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ
شام بارکپوری بنگلہ دیش کے دوسرے افسانہ نگاروں
سے ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔

شام بارکپوری کے افسانوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے
سے مندرجہ ذیل باتیں نمایاں طور پر ہمارے سامنے آئی ہیں۔

مقامی رنگ و آہنگ

شام بارکپوری کے افسانوں میں سب سے اوّل جو بات
اپنی طرف مبذول کرتی ہے۔ وہ ہے مقامی رنگ و آہنگ۔
سب جانتے ہیں۔ بنگلہ دیش جغرافیائی اور لسانی طور پر برصغیر
میں ایک علیحدہ اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ یہ حیثیت اسے
ہے۔ اس دیس کے سینے کو چیرتی ہوئی کثرت سے چھوٹی بڑی
ندیاں خلیج بنگال میں جا گرتی ہیں۔ [illegible] پر اُن کی شاخوں
کا جال پورے ملک میں بچھا ہوا ہے۔ یہی سبب نہیں۔ بلکہ جگہ
جگہ بڑی بڑی جھیلیں، اور آبی خطے پھیلے ہوئے ہیں۔ جو برسات
میں انتہائی سمندر کا سماں پیش کرتے ہیں۔ کثرت بارش کی
وجہ سے کبھی کبھی سیلاب آجاتا ہے۔ جو کھڑی فصلوں کو تباہ
و برباد کر کے عام لوگوں کے لئے دکھ درد کا باعث بنتا ہے
مگر دوسری طرف یہی بارش اور پانی لہلہاتے ہوئے سبزہ زار
سینکڑوں قسم کے پیڑ اور درخت، رنگ برنگ پھولوں
باغات، اُگا کر نہایت دلکش اور دلفریب فضا پیش کرتا
ہے۔ یہاں کی عام زبان بنگلہ ہے۔ اس کی وجہ سے یہ
کی ہر چیز پر اس زبان کی چھاپ ہے۔ لوگوں کے ناموں سے
لے کر، اُن کی روایات، رہن سہن کے طریقے، کھانے پینے
کے طرز، بول چال کے ڈھنگ، بود و باش کی ریت اور پہ
کے لباس وغیرہ سب پر اُس مقامی زبان کے نقوش کندہ
یہاں تک کہ پیڑوں، پھلوں، پھولوں، پرندوں، جانور
مچھلیوں، سب کے نام بھی بہت حد تک الگ ہیں۔ لہٰذا
اردو افسانہ نگار یا ناول نویس جب یہیں کی سرزمین سے
اپنی کہانی کا پلاٹ اخذ کرتا ہے تو ان تمام چیزوں کو
قابل برداشت حد تک اُردو میں سمونا پڑتا ہے۔ ہمارے
خیال میں ہر اُس شخص کو جو اُردو میں کچھ لکھنا چاہتا ہے۔ اسے
معاملے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مگر
دینی چاہئے کہ شام بارکپوری اس مقام سے بڑی آسانی
سے گزر گئے ہیں۔ اسی بات کو ہم نے مقامی رنگ و آہنگ
لکھا ہے۔ اُن کی تحریروں میں یہی چیز ان کی امتیازی خو
ہے۔ یہ خصوصیت ہے ان کے ناول، افسانوں اور افس
مجموعوں کے نام میں بھی، بالحسن وجوہ پائی جاتی ہے۔
کی طرح شام بارکپوری نے بھی عام لوگوں کی زندگیوں کو ا

موضوع بنا لیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ ہم جنہوں نے جس
ماحول سے اپنے پلاٹ اور کردار لیے شام بارکپوری کا
گردو نواح اس سے جدا ہے۔ اس لئے پلاٹ بھی مختلف
اور کردار کے قد و قامت، بول چال اور طور طریق الگ۔
اردو میں لکھنے والوں کے لئے برصغیر کے دیگر علاقوں کی
فضا کی بہ نسبت بنگلہ دیشی ماحول قدرتی طور پر قدرے
زیادہ سنگلاخ ہے۔ لہٰذا اس منصب عظمیٰ سے عہدہ
برآ ہونا آسان نہیں۔

شام بارکپوری کے افسانوں میں بنگلہ دیش کی زندگی
کی عکاسی بہت نمایاں ہے۔ دیہاتی زندگی کی ترجمانی ان
کے ہاں بہت زیادہ ہے اور بہت تفصیل سے ہے گاؤں
کے غریب کسان، مزدور یا مچھیرے مختلف حالات میں
کیسے کیسے روحانی کرب و آلام کا شکار رہتے ہیں۔ اور کس
کس طرح طبقاتی کشمکش میں ان کی زندگیاں دکھ درد اور
پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اور کیسے کیسے وہ اہم
ساری مصیبتوں کو انتہائی صبر و شکیبائی سے برداشت
کرتے ہیں۔ ان سب کے حالات و کیفیات کا بیان بڑے
درد انگیز لہجے اور دلکش پیرایہ میں شام بارکپوری کے
افسانوں میں ملتا ہے۔ جو ان کی فنی صلاحیت کا مظہر ہے۔

فطرت انسانی کا مطالعہ اور مشاہدہ

شام بارکپوری کے افسانوں میں دوسری اہم بات،
"فطرت انسانی کا مطالعہ اور مشاہدہ" ہے۔ دنیا میں کوئی
بھی لکھنے والا اچھا اور کامیاب افسانہ نگار نہیں بن
سکتا۔ جب تک کہ وہ انسان کا نفسیاتی طور پر گہرا مشاہدہ
اور مطالعہ نہ کر سکے۔ یہ ایک خداداد استعداد ہے جو ان
میں ودیعت ہوئی ہے۔ اس کی مدد سے وہ انسانی کردار
اور فطرت کا مطالعہ اور مشاہدہ بڑی غائر نظر سے کرتے ہیں
اس عمل میں انسان کا نفسیاتی تجزیہ بھی شامل ہے جو کسی عام
آدمی کے لئے ممکن نہیں۔ ان کو پیش یا افتادہ اشیاء میں
بھی وہ حکمت اور راز ہائے سربستہ دریافت ہوتے ہیں۔
جو ہما شما کے وہم و گمان میں کبھی نہیں آ سکتے۔ شام بارکپوری
میں یہ قابلیت کامل طور پر پائی جاتی ہے۔ اس لئے وہ جس
پلاٹ پر بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ قاری
کو کسی بات میں تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔

جزئیات نگاری

شام بارکپوری کی کہانیوں کی ایک ذیلی خصوصیت ان کی
جزئیات نگاری ہے۔ جو فطرت انسانی کے غائر نظر سے
مطالعہ اور مشاہدے کے نتیجے کے طور پر عمل میں آتی ہے۔
ان کی یہ بات بالخصوص مناظر قدرت کی عکاسی پائی جاتی
ہے۔ سچ پوچھئے تو کوئی بھی افسانہ نگار اس وقت تک کامیاب
افسانہ نہیں لکھ سکتا۔ جب تک اس کی نگاہ عمیق اور مجزہ
رس نہ ہو۔ کسی کردار کا روپ ہو یا کسی منظر کی تصویر کشی، جب
تک کہ اس کا بیان تمام ممکنہ جزئیات پر مشتمل نہ ہو۔ اس
وقت تک وہ بیان صرف سپاٹ سا مضمون رہ جاتا ہے۔
ایسی سادہ تحریر کے پڑھنے میں بھلا کسی کو کیا لطف آ سکتا ہے
اس معاملے میں شام بارکپوری پر کوئی طعنہ زنی نہیں کر سکتا

عشق و محبت کا عنصر

عشق و محبت کا عنصر تخلیق آدم کے ساتھ ہی وجود میں آ
لہٰذا اس کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے مگر ہم یہاں اس کی تا
میں نہیں جانا چاہتے۔ وہ ہمارے موضوع بحث سے خارج
ہے۔ یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ دنیا میں انسانی
کا سلسلہ تا قیامت قائم رکھنے کے لئے قدرت نے انسا
میں ایک تخلیقی قوت عطا کی ہے جو دو متضاد جنس مرد و
میں باہمی کشش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ اور اسی کشش
کو عشق و محبت کا نام دیا گیا ہے عشق و محبت کے او
بہت سے روپ ہیں۔ مگر جسے کہا [illegible] اس کا [illegible]
وہی ہے جو مرد و زن کے [illegible] جبلی کشش میں پنہاں
اور جس کے متنوع بیانات کو اصطلاح رومان کہا جاتا ہے دو
موتوں کی تفصیلات کے لئے مذہبی کتب یا دیگر کتب

رمایہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ لیکن وہ صورتیں افسانوی
ب کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے لئے مولانا روحی
فیظ، علامہ اقبال جیسے صوفی شعراء بس ہیں۔

عشق و محبت کی باتوں میں بڑی رنگینی اور رعنائی ہے
نیا میں ہزاروں لوگوں نے لاکھوں طریقے سے حیات
سان کے اس تصور کو پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں کثرت سے
ر لکھنے والوں سے لے کر بانسل آزاد اور عریاں لکھنے والے
ی وجود میں آئے۔ کوئی زبان و ادب زندگی کے اس لازمی
صر سے مستثنیٰ نہیں۔ بعض ناول نگار اور افسانہ نویس نے
ہت ہی احتیاط برتی اور شائستگی کے حدود میں رہ کر اپنے
خیالات پیش کر کے دنیائے ادب میں اپنا سکہ جمایا اور
بعض نے، جن کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ اپنی تحریروں میں
عریانیت کو روا رکھا۔ انھوں نے اس انداز بیان کا جواز
پیش کیا کہ یہ چیز تو ہماری زندگی اور معاشرے میں موجود ہے
اور اس کو سب سامنے برملا کہنا ہمارے فرض منصبی میں
شامل ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کو انھوں نے ترقی پسندی
سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ترقی پسندی اچھی ہے کہ بری۔ یہاں
اس بحث میں ہم جانا نہیں چاہیئے۔ اس موضوع پر اب
تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا
ہماری بحث یہاں صرف شام بارکپوری سے ہے۔ ان کو
اس معاملے میں ہم نے کافی محتاط پایا ہے۔ اور شاذ و نادر
ہی ان کو شائستگی کی حدود سے تجاوز کرتے دیکھا۔ یہ ان کی
کریم النفسی اور شریف الطبعی ہے۔ ورنہ لکھنے کی گنجائش تو
بہت تھی۔ کہیں کہیں ان کا قلم اگر بے پروا ہو گیا ہے۔ تو ہمارے
خیال میں اسے محض زیب داستان کے لئے سمجھنا چاہئے
افسانوی ادب میں بالعموم جن مضامین پر طبع آزمائی کی جاتی
ہے۔ ان میں اس حد تک روا رکھا جا سکتا ہے۔

زبان و بیان

شام بارکپوری ایسے ماحول میں پلے بڑھے، جہاں اُردو
اور بنگلہ دونوں زبانیں یکساں طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہیں

اگرچہ بنیادی طور پر ان کا تعلق اُردو ہی سے رہا ہے۔ اور
ان کے گھر میں بھی اُردو ہی بولی جاتی ہے۔ لیکن بنگلا زبان
و ادب سے بھی اُن کی واقفیت کم نہیں۔ اعلیٰ تعلیم انھوں
نے لاہور میں حاصل کی، جو اُردو کا ایک اہم مرکز ہے۔ اور
وقت کے بہترین اساتذہ سے اُردو پڑھی۔ اُردو میں لکھنے
کا چسکا تو بچپن ہی میں پڑ گیا تھا۔ اس پران کی خداداد ذہانت
و فطانت الگ۔ اس لئے زبان خوب منجھ گئی اور بیان میں
نکھار پیدا ہوا۔ طالب علمی کے زمانہ سے لے کر اب تک
بیرونی ممالک کا شوقیہ طور پر یا تجارتی اغراض سے سفر بھی
کیا۔ بے شمار لوگوں سے ملے اور تبادلۂ خیال کیا بالخصوص
برصغیر کے اُردو ادیبوں اور شاعروں سے دوستانہ مراسم
پیدا کر کے استفادہ کیا۔ دیسی بدیسی ادب ہمیشہ زیر مطالعہ
رہا۔ لہٰذا قدرتی طور پر معلومات میں اضافہ ہوتا گیا اور
نظر میں وسعت۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ افسانوی ادب
کی زبان اور اس کا طرز بیان کیا ہونا چاہیئے۔ پلاٹ
اور کردار کی مناسبت سے کچھ مقامی الفاظ اصطلاحات
و محاورات اور مکالمے آ جاتے ہیں۔ مگر وہ اُردو زبان و
ادب کے تحمل سے باہر نہیں ہو پاتے۔ یہ سب باتیں فسانے
کے پلاٹ اور کردار کی مقتضیات میں سے ہیں۔ ایک مختلف
ماحول کی باتوں کو، اُردو ادب میں، جس کا ایک مخصوص معیار
بنا ہوا ہے۔ اس قدر سلاست اور روانی سے ڈھالنا
اور انداز بیان میں ندرت پیدا کرنا۔ ہمارے خیال میں شام
بارکپوری کا کمال ہے۔

شام بارکپوری کے طرز بیان میں بڑی شگفتگی ہے۔ وہ ہر
چیز کو نہایت آسان، سادہ، مگر پُر لطف زبان میں بیان
کرتے ہیں۔ قاری جہاں ایک طرف نفس کہانی کا لطف
اٹھاتا ہے۔ وہ اندازِ بیان کی شگفتگی سے بھی محظوظ ہوتا
ہے۔ اُردو اور بنگلا الفاظ کا شیریں امتزاج، تشبیہات
و استعارات کا مناسب استعمال اور انسانی کیفیات کا
فنکارانہ تجزیہ، یہ باتیں ایسی ہیں کہ اُن کے افسانوں کی رنگ
میں اضافہ کرتی ہیں۔

...بت

...یسا کہ پہلے اشارۃً لکھا گیا ہے، شام بارکپوری کا
...نسانی کا مطالعہ اور مشاہدہ بڑا گہرا اور وسیع ہے۔
...جہ سے اُن کے افسانوں میں مقامی رنگ و آہنگ کی
...کاسی کے باوجود آفاقیت پائی جاتی ہے کیونکہ ...
...فطرت تو سارے عالم میں قریب قریب ایک ہی قسم کی
...ور ایک ہی نوع کے واقعات سے ہر ملک میں لوگ
...طور پر حیرت و استعجاب، رنج و غم، نفرت و محبت،
...حسد، بغض، رشک و رقابت جیسے فطری جذبات
...ر کرتے ہیں۔ ہنسنے اور رونے کے انداز میں بھی کوئی
...تفاوت نہیں ہے۔ شام بارکپوری کے افسانے
...ی مطالعہ اور مشاہدہ سے پُر ہیں۔ جو آفاقی رنگ
...رتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کے یہاں حقیقت شعاری
...الیں پیدا ہو گئی ہیں۔ جن میں تمام فطرت انسانی کی
...نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

...داری نگاری

اخیر میں ان کی کردار نگاری پر کچھ روشنی ڈال کر بات
...رتے ہیں۔ شام بارکپوری کے افسانوں کے کردار بعض اوقات
...ہوتے ہیں۔ جن کے اقوال و افعال کو کوئی بھی اپنے لئے
...بنا سکتا ہے اور اُن کی فطرت سے سبق لے کر اپنے آپ
...حسن پیدا کر سکتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کرداروں کا فطری
...نقا دیا جاتا ہے۔ یہ بہت مشکل مرحلہ ہے ہر کوئی اس
...کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لغزش ہو جاتی ہے۔ مگر شام
...بارکپوری اس معاملے میں بہت محتاط ہیں۔ اس زمین پر
ان کے قدم لڑکھڑاتے نہیں۔ بلکہ نہایت پامردی کے ساتھ
آگے بڑھتے ہیں اور کرداروں کو جیتا جاگتا بنا دیتے ہیں۔ وہ
کرداروں کی خصوصیات نمایاں کرنے کے لئے یا انہیں حقیقت
کا لباس پہننے کے لئے خود کردار کی زندگی کے ایسے واقعات
پیش کرتے ہیں۔ جن سے وہ حقیقی معلوم ہوں۔

اختتامیہ

اگر شام بارکپوری کا موازنہ ٹالسٹائی، چیخوف، موپاساں
پریم چند، کرشن چندر، بیدی اور منٹو سے کیا جائے تو غلط ہوگا
ان کے افسانوں کے سفر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی انفرادیت
کے ساتھ ایک نئی راہ پر گامزن ہیں۔ اُن کے افسانے جدید
کہانیوں کا وہ گلدستہ ہیں جن میں رنگ برنگ کے پھول سجے
ہیں۔ جس طرح باغ میں سینکڑوں قسم کے پھول کھلے ہوتے
ہیں۔ مگر گلاب کی حیثیت الگ سی ہوتی ہے۔ بنگلہ دلیش کی
مٹی سے وہ گلاب کھلا ہے۔ جس کی خوشبو سے اُردو افسانوی
ادب مہکا رہا ہے۔

بقیہ: کنگن کی چیخ

خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ نقاہت
سے اُس کا بُرا حال تھا۔ اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا
وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اسے اپنے جان کے
لالے پڑ گئے تھے۔ وہ مشکل سے اپنی کانپتی تھرتھراتی
ٹانگوں پر کھڑا ہو سکا۔ اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔
اسے اپنے سر پر موت رقص کرتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے دائیں
بائیں دیکھا اور اپنی جان بچانے کے لئے کھیت سے سرپٹ
بھاگا۔ سراسیمگی میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی
گائے کی سینگیں خون سے لت پت ہو گئیں۔ اس
نے آسمان کی طرف منہ کر کے فتح کا نعرہ بلند کیا۔ پھر دراز ہو کر
دھرتی پر لیٹ گئی اور دھول میں لوٹنے لگی۔ خون کی بوندیں
شپ شپ کر زمین کی چھاتی میں جذب ہو رہی تھیں۔ دھرتی
کی سوندھی مٹی اس کے زخموں کا مرہم بن گئی تھی۔
دوسرے دن کھیت پر جان نچھاور کرنے والی نیم مردہ
گائے کو کسانوں نے ذبح کر کے کھا لیا۔

Phone: 275602
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644 57

A

خرید کر پڑھئے
مانگ کر پڑھئے
یا پھر
چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمّل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شان دار ادبی دستاویز ہے۔ اس میں شامل ہیں:

قیمت: پندرہ روپے

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
★ نادر و نایاب تصویریں۔
★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔
★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اُردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون نمبر: ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۶۴۴ رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۱۵۳

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

فیاض گوالیاری

ماہنامہ شانِ ہند دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ
۲/۵۰ روپے
زر سالانہ: ۲۴/ روپے

جلد ۲۷	مئی سنہ ۱۹۸۶ء	شمارہ ۵

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی

رابطہ جو بھی زندگی سے ہے — اپنی مرضی سے ہے خوشی سے ہے
بات بنتی ہے آپ سے مل کر — ملنا جلنا تو ہر کسی سے ہے
جھانک لے بھول کر گریباں میں — جس کو امید دوستی سے ہے
روشنی خود سے ہو گئی ہوگی — تیرگی بھی تو روشنی سے ہے
شان ہے آپ کی خداوندی — کام بندوں کا بندگی سے ہے
اس قدر بغض، اس قدر کینہ — آدمی ہی کو آدمی سے ہے
ارغوانی کہ آسمانی ہو — شان کے طرزِ میکشی سے ہے
کھو گیا آدمی کہاں یارو — آدمی ہے تو آدمی سے ہے

جہل تو جہل تھا حقیر ہمیں
شکوہ گر ہے تو آگہی سے ہے

دریا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے اور سرورق کے صفحات دین ٹریڈرز بلیماران دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۵ - انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

دلی اردو اکاڈمی

پچھلے دنوں لفٹننٹ گورنر نے دہلی اردو اکاڈمی کی تشکیل نو کی ہے۔ جن نئے ممبران کو اکاڈمی کی ممبری عطا کی گئی ہے اُن میں سے ایک کا سرسری تعارف شانِ ہند کی سابقہ اشاعت میں کرایا گیا ہے۔ حال ہی میں اردو اکاڈمی کی ضمنی سب کمیٹیوں کی بھی تشکیل کر دی گئی ہے۔ تقریبات سب کمیٹی کے چیرمین ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں۔ ایوارڈ کمیٹی کے چیرمین جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ تعلیمی سب کمیٹی کے چیرمین الور دہلوی صاحب کو مقرر کیا گیا ہے اور اس مرتبہ ایک چوتھی سب کمیٹی پبلیکیشن کے نام سے وجود میں آئی ہے جس کا چیرمین ڈاکٹر خلیق انجم کو بنایا گیا ہے۔ ۱۲ر مئی کو چیمسفورڈ کلب میں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے ان چاروں سب کمیٹیوں کے چیرمین صاحبان اور مشیر اکاڈمی کو اس لئے مدعو فرمایا تاکہ ایک ایسا مشترکہ انداز فکر اختیار کیا جائے کہ چاروں سب کمیٹیوں کے چیرمین اور مشیر اکاڈمی ایک ٹیم کی شکل میں اردو اکاڈمی کو زیادہ سے زیادہ فعال بنا سکیں۔ جناب الور دہلوی صاحب کو پچھلے دنوں ہلکا سا دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ گووند بلبھ پنت ہسپتال میں زیر علاج تھے اس لئے وہ کنور صاحب کی اس دعوت میں شریک نہ ہو سکے مگر سنا ہے کہ انھوں نے مشیر اکاڈمی کی زبانی کنور صاحب کو یہ پیغام بھجوایا کہ وہ کما حقہ طور پر اُن کے ساتھ ہیں اور اس میٹنگ میں جو بھی تجاویز منظور کی جائیں وہ اُن پر عمل پیرا ہوں گے۔ دلی میں ان پانچ محافظین اردو کی اس میٹنگ میں اگر یہ عہد و پیماں کئے گئے ہوں کہ من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو یعنی میں آپ کا خیال رکھوں گا اور آپ میرا خیال رکھیں گے تو یہ میٹنگ یقیناً بڑی کامیاب رہی ہو گی اور آئندہ بھی [illegible] کی امید کی جا سکتی ہے۔ اور اگر واقعی سچے دل سے [illegible] اکاڈمی دہلی کو فعال بنانے۔ حق دار کو اس کا حق دینے۔ [illegible] کسی زور رعایت کے تعلیمی ملازمتوں کے دیئے جانے۔ بہترین [illegible] کی اشاعت۔ اچھی کتابوں پر بغیر کسی دباؤ کے انعامات دینے اور ایوارڈ دیتے وقت صحیح حقداروں کا انتخاب کرنے کا پلان اس میٹنگ میں بنایا گیا ہو۔ تو ہم کنور صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ میٹنگ بلا کر اردو اکاڈمی کو فعال بنانے کے لئے ایک ضروری قدم اٹھایا ہے۔

مگر کنور صاحب کا یہ قابلِ تعریف پلان کیا کامیاب ہو سکے گا؟ اس سلسلے میں ہمیں یہ عرض کرنے میں کوئی عذر نظر نہیں آتی۔ کہ اردو اکاڈمی کے کچھ معزز ممبران نے ایک علیحدہ گروپ بنا لیا ہے۔ اور اس گروپ کے سربراہ ہیں جناب ڈاکٹر صلاح الدین۔ اور انھیں دلی کے کچھ ایسے لوگوں کی بھی مدد حاصل ہے جو اردو اکاڈمی میں اپنا دور دورہ چاہتے ہیں۔ اور اس گروہ کی طرف سے تخریبی کارروائیوں کے سگنل ملنے شروع ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اردو اکاڈمی کے ایک ممبر کی بابت سنا گیا ہے کہ انھیں مشیر اکاڈمی سے یہ شکایت ہے کہ چوتھی سب کمیٹی کا چیرمین انھیں کیوں نہیں بنوایا گیا حالانکہ یہ معزز ممبر جانتے ہیں کہ اردو اکاڈمی کا ممبر منتخب کرنا یا کسی سب کمیٹی کا چیرمین مقرر کرنا لفٹننٹ گورنر کے اختیار میں ہے۔ مشیر اکاڈمی کے اختیار میں نہیں۔ اگر مشیر اکاڈمی کے اختیار میں ایسا ہوتا تو وہ آپ ایسے لالچی اور اکاڈمی کے سار

بجٹ کو خود ہی ہضم کرنے کی خواہش رکھنے والے ممبر کا انتخاب ہی کیوں کرتے ؟ ان ممبر صاحب نے بزبانِ خود یا اپنے کسی چمچے کی معرفت منتظر اکاڈمی کو یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر آپ کے خلاف کوئی پوسٹر شائع ہو تو ناراض نہ ہونا۔ اس سلسلے میں مدیر شانِ ہند صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ یہ صاحب ضرور منتظر اکاڈمی کے خلاف پوسٹر شائع کریں یا کرائیں تاکہ ہمیں بھی یہ موقع میسر آسکے کہ ہم اس ممبر کے اصلی حدود اربعہ کی پیمائش کرسکیں اور عوام کو بتا سکیں کہ دلی اُردو اکاڈمی کو قائم کرنے والے لفٹنٹ گورنر نے انھیں کن صفات کی بنا پر اکاڈمی کا ممبر چُنا تھا۔

دلی والے

روزنامہ "قومی آواز" کی اشاعت میں التوا سے دو ایک روز پہلے "قلم تراش" نے قومی آواز میں اپنے مخصوص کالم میں "دلی والے" سیمنار کی تعریف جس انداز میں کی ہے وہ چغلی کھا رہا ہے کہ "قلم تراش" نے اس سیمنار کے ڈائریکٹر ڈاکٹر صلاح الدین کے ایماء پر ہی یہ سب کچھ لکھا ہے۔ یہ سیمنار کئی وجوہ کی بنا پر قطعی ناکام رہا اس پر تفصیلی طور پر ہم انہی سطور میں ہی عرض کریں گے۔ پہلے "قلم تراش" نے جو کچھ اس مانگے کے اُجالے کی روشنی میں بے سروپا باتیں لکھی ہیں آئیے اُن کا پوسٹ مارٹم کرتے چلیں۔ "قلم تراش" نے پہلی شکایت یہ کی ہے کہ "دلی والے سیمنار" کی پبلسٹی بہتر طور پر نہیں کی گئی اور اس کے پروگرام کی تفصیل کا اشتہار "قومی آواز" میں نہیں دیا گیا۔

شاید قلم تراش کو معلوم نہیں کہ اُردو اکاڈمی نے بتیس سو دعوت نامے اس سیمنار کے بذریعہ ڈاک اُردو سے شغف رکھنے والے حضرات کو بھجوائے۔ اور اس سیمنار کی پبلسٹی بھی ویسے ہی کی گئی جس طرح دوسرے سیمناروں کی کی گئی۔ پروگرام کا اشتہار نہ دینے سے روزنامہ قومی آواز کو خاص مالی نقصان رہا مگر پروگرام کی کامیابی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کیونکہ جب تین ہزار سے زائد ذاتی دعوت ناموں کے اجراء پر سیمنار کے پہلے اجلاس میں صرف نو حضرات تشریف لائے اگر قومی آواز میں پروگرام شائع ہوتا تو بھی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔

دوسری شکایت میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو کوسا گیا ہے حالانکہ انھوں نے جو اُردو افسانہ ورکشاپ / سیمنار کرایا اُسے بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی۔ کئی رسائل نے اس ورکشاپ کی تفصیلی کارروائی اپنے خاص نمبروں میں شائع کی قلم تراش اور ڈاکٹر صلاح الدین صاحب کی نظروں سے لندن، پاکستان، ناروے وغیرہ کے وہ رسائل شاید نہیں گزرے جن میں اس سیمنار کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ مٹی کو بھی ہاتھ لگا دیتے ہیں تو وہ بھی اردو کی نوبا [illegible] اُٹھتی ہے۔ اور اُردو کی جو خدمت ڈاکٹر گوپی چند نے اپنے ملک میں اور خصوصی طور پر دوسرے ممالک میں کی ہے اُس کی گرد کو بھی ہمارے اُردو دانش ور نہیں پہنچ سکتے چہ جائیکہ بیچارے ڈاکٹر صلاح الدین ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ہمسری کے خواب دیکھنے لگے ہیں۔

کنور [illegible] سنگھ بیدی سحر کا نام لئے بغیر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی بابت ہم یہ ہی کہہ سکتے ہیں کہ دلی میں ہر وہ تقریب یا ادارہ جس کا تعلق اُردو سے ہو۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بغیر ادھورا ہے اور دلی سے باہر بلکہ یوں کہئے کہ ہندوستان کے باہر بہ حیثیت ہمدردانِ اُردو یہ دو نام اس حقیقت کا مظہر ہیں کہ ہندوستان میں اُردو صرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ ہر مذہب و ملت کے عوام کی زبان ہے۔ بے شک کنور صاحب نے اُردو اور دلی کی تقریبات میں مشاعروں، قوالیوں، رقص و سرود اور شامِ غزل ایسے فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے پروگرام کو اولیت دی مگر بہت کم لوگوں کو یہ علم ہوگا کہ اُردو اکاڈمی قائم کرنے والے اُس وقت کے لفٹنٹ گورنر جناب جگموہن صاحب کا یہ نظریہ تھا کہ اُردو کو غیر اُردو والوں تک پہنچانے کے لئے ایسے پروگراموں کو ترجیح

جائے تاکہ غیر اُردو داں حضرات ایسے دلچسپ پروگراموں میں زیادہ سے زیادہ شریک ہوں اور ان پروگراموں سے انھیں اُردو زبان کی شیرینی کا پتہ چل سکے اور وہ اُردو پڑھنے کی طرف راغب ہو سکیں۔ لہٰذا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان تقریبات میں عوام جوق در جوق آئے اور انھیں یہ پروگرام پسند بھی آئے اور کئی غیر اُردو داں حضرات نے اُردو پڑھنا شروع بھی کیا جس کا ثبوت یہ ہے کہ کئی نوجوانوں نے اُردو سیکھ کر اکاڈمی سے انعامات حاصل کئے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بارے میں اگر کوئی بکواس کرتا ہے تو وہ اپنی زبان کو گندہ کرتا ہے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، نے اُردو کی خدمت جس انداز میں کی ہے اُس کا عوام کو علم ہی نہیں۔ نارنگ صاحب نے امریکہ میں اُردو سیکھنے والوں کے لئے جو سیلف سٹڈی بکس تیار کیں اُن کتابوں سے ہزاروں غیر اُردو داں خواتین۔ بچوں اور بالغوں نے اُردو سیکھی۔ حال ہی میں بمبئی میں ایڈیٹر شانِ ہند کو جناب ڈاکٹر کیشو چندر سین، حقیر آستانی کی اہلیہ محترمہ نے بتایا کہ انھوں نے اپنے قیام امریکہ کے دوران ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ایسی ہی کتب سے اُردو سیکھنے کے لئے استفادہ کیا۔
دوسرے ملکوں میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اُردو کا مقدمہ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ وہاں کے عوام یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اُردو پاکستان ہی کی نہیں بلکہ ہندوستان کی زبان ہے۔
قومی آواز کے قلم تراش کو یہ شکوہ ہے کہ کمشیر اُردو اکاڈمی نے ڈاکٹر صلاح الدین کی ڈائریکٹرشپ میں ... محسن فاروقی پر خاکہ کیوں نہیں پڑھا۔
اول تو یہ ہی حماقت سے کم نہیں کہ محسن فاروقی پر خاکہ پڑھوایا جائے وہ دیوبند کے رہنے ... ہے کہ وہ دلی میں رہتے تھے ... ہیں کہ ہمیشہ غلافِ کعبہ بیچتے رہے۔ شربت ... ڈیکورین کے نام سے لیکوریا کو دور کرنے کی دوا کے بد بیچتے رہے اور بیچاری بھولی بھالی عورتوں کو ٹھگتے رہے ... شریف الحسن نقوی الیاسمتین، پرہیزگار اور شریف ... محسن فاروقی پر کیا لکھتا۔

قلم تراش نے "دلی والے سیمنار" کی بہت زیادہ تعریف فرمائی ہے اور نئے لکھنے والے نوجوانوں کو بھی خوب سراہا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ نوجوانوں کو آگے لانا چاہیئے اور یہ اُردو کی بہترین خدمت ہے مگر ان نوجوانوں اُن کی فہم و فراست کے مطابق ہی ...... کام لیا جائے تو مفید ہو سکتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سال سیمنار میں تین چار خاکے ہی ایسے تھے جنھیں خاکہ کہا جا سکتا ہے اور ڈاکٹر محمد حسین صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں بالکل بجا اور مناسب طور پر ان خاکوں پر اپنی رائے ظاہر فرمائی تھی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صلاح الدین اور قلم تراش صاحب کی خدمت میں عرض کرنا ضروری ہے کہ جناب محمد طفیل صاحب مدیر "نقوش" نے اپنی تصنیف "مجبی" میں خاکہ نگاری کی تعریف یوں فرمائی ہے۔

میرے نزدیک!
"خاکہ نگاری خدائی حدود میں قدم رکھنے کے مترادف ہے۔ یعنی جو کچھ آپ کو خدا نے بنایا ہو اُس کے عین مین اظہار کا نام خاکہ نگاری ہے"
خاکہ نگاری کی تعریف طفیل صاحب نے جس خلوص سے کی ہے وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے کیا "دلی والے" سیمنار کے ڈائریکٹر ڈاکٹر صلاح الدین اور قومی آواز کے "قلم تراش" ایمان سے کہہ سکتے ہیں کہ اس سیمنار میں پڑھے گئے خاکوں میں سے کتنے خاکے ایسے تھے جو اس تعریف پر پورے اترتے تھے۔
حق تو یہ ہے کہ اس بار "دلی والے" سیمنار قطعی ناکام رہا گنتی کے دو چار خاکے ہی ایسے تھے جنھیں خاکہ کہا جا سکتا ہے جناب ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں ان خاکوں کے بارے میں جو ریمارک کسے تھے وہ حقیقت پر مبنی تھے۔
دلی اُردو اکاڈمی نے عملی طور پر ثبوت دیا ہے کہ اُردو

سب کی زبان ہے اور اکادمی نے غیر مسلم اردو پرستوں کی مالی مدد کرنے میں کسی قسم کے تعصب سے کام نہیں لیا ہے مگر دلی والے "سیمنار" کے سلسلے میں جب ایڈیٹر شان ہند نے درجنوں ایسے مسلم اور غیر مسلم حضرات کے نام گنوائے جو درحقیقت دلی والے تھے اور ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ کسی طور پر بھی انھیں اس سیمنار میں نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے تھا تو ڈائریکٹر صاحب نے جواب دیا کہ ان کے پاس دو صد حضرات کی لسٹ موجود ہے آئندہ چار سالوں میں ان حضرات پر خاکے لکھوائے جائیں گے - حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ڈائریکٹر صاحب کو دلی کے ان ہندو حضرات کے سلسلے میں بہت کم واقفیت ہے جنھوں نے اردو کی خدمت کے سلسلے میں اور دیگر کارناموں سے دلی کا نام روشن کیا - مگر برا ہو تعصب کا کہ ڈائریکٹر صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ دلی اگر باقی ہے تو محض مسلمانوں کے دم سے اس لئے وہ آٹے میں نمک کے برابر غیر مسلموں کو اس سیمنار کے قابل سمجھتے ہیں - اسی پریس کانفرنس میں جناب راج نارائن اور ایڈیٹر "آج کل" نے احتجاجی سوال کیا کہ انھیں ٹیلی فون پر ڈائریکٹر سیمنار نے فرمایا کہ آپ جناب منور دہلوی پر خاکہ لکھئے اور جب سیمنار کا پروگرام شائع ہوا تو منور صاحب اور راز صاحب کا کہیں نام تک نہیں ہے - اس کی کیا وجہ ہے - ڈاکٹر صلاح الدین صاحب نے محض یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی کہ یہ میری کوتاہی ہے حالانکہ یہ ان کے تعصب کا ایک بھدا مظاہرہ تھا - گو اب کچھ لوگوں کی زبانی سننے میں آیا ہے کہ ڈاکٹر صلاح الدین فرماتے ہیں انھیں ایسا کرنے کے لئے سیکریٹری اردو اکادمی نے ہدایت دی تھی - اگر ایسی بات تھی - تو انھیں پریس کانفرنس میں ... چاہئے تھی -

ڈاکٹر صلاح الدین نے نہ صرف تعصب کا ثبوت دیا ہے بلکہ انھوں نے اردو اکادمی کی ایک معزز ممبر ڈاکٹر اسماء سعیدی صاحبہ سے (جو اب اردو اکادمی کی ممبر نہیں رہی ہیں) ناانصافی کی ہے کیونکہ یہ ان سے ناراض ہیں اور یہ ناراضی اس لئے ہے کہ ڈاکٹر اسماء سعیدی صلاح الدین صاحب کو ابھی برسوں پڑھا سکتی ہیں - پریس کانفرنس میں ایڈیٹر شان ہند نے سوال کیا کہ بسمل سعیدی صاحب پر خاکہ لکھنے کے لئے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جب کہ وہ کچھ سال پہلے بسمل سعیدی کا خاکہ لکھ چکے ہیں اور یہ خاکہ تنازعہ کا باعث بن چکا ہے اس لئے کیا یہ بہتر نہ تھا کہ بسمل سعیدی صاحب پر خاکہ ان کی صاحبزادی ڈاکٹر اسماء سعیدی ... سے لکھوایا جاتا تو اس کا جھٹ سے جواب ڈاکٹر صلاح الدین صاحب کی بجائے محترمہ نورجہاں ثروت نے دیا کہ عزیز رشتہ دار اپنے باپ - بھائی وغیرہ پر خاکہ لکھتے وقت رو رعایت برتتے ہیں - مگر اس کا کوئی جواب نہ دیا گیا کہ ڈاکٹر ... صاحب نے اپنے والد قبلہ ... لکھنوی پر - جناب ... دہلوی نے اپنے بھائی ... ناتھ زتشی پر - اور کچھ دیگر حضرات نے بھی اپنے عزیزوں پر خاکے لکھے تو یہ قاعدہ ان حضرات پر کیوں عائد نہیں کیا گیا - محترمہ نورجہاں ثروت اور ڈاکٹر صلاح الدین نے جس انداز میں ڈاکٹر اسماء سعیدی کے نام کی مخالفت کی وہ کسی ذاتی رنجش کا آئینہ دار تھا -

مولانا عبدالباقی صاحب پر جناب پروانہ ردولوی سے خاکہ لکھوایا گیا - اس پر بھی پریس کانفرنس میں ایڈیٹر شان ہند نے اعتراض کیا کہ مولانا عبدالباقی پر پروانہ صاحب کیا لکھ سکیں گے انھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ تقسیم ملک سے پہلے باقی صاحب حکومت پنجاب میں کس عہدے پر تھے اور اس وقت کے ہندوستان کے پہلے سرکاری افسر اعلیٰ مسلمان مولانا عبدالباقی ہی تھے جنھوں نے تقسیم ملک کے بعد ہندوستان جانے کی مانگ کی - اور دوسرے غیر سرکاری ملازم مسلمان تھے خان غازی کابلی جنھوں نے ہندوستان کو پاکستان پر ترجیح دی - تو ڈاکٹر صلاح الدین نے جواباً فرمایا کہ پروانہ ردولوی صاحب مولانا باقی کے ساتھ کئی سال تک کام کرتے رہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ پروانہ ردولوی صاحب اشتہارات فراہم کر

کے لئے باقی صاحب کے ہاں صرف تین ماہ کام کرتے رہے چونکہ پروانہ ردولوی اردو اکاڈمی کے خلاف برابر میں لکھتے رہتے تھے اس لئے اُن کا مُنہ بند کرنے یا قلم روکنے کے لئے اُن کو ریڈیو پروگرام اکاڈمی سے دئیے گئے۔ اسی طرح قومی آواز کی آواز کو بند کرنے کے لئے میڈم نور جہاں ثروت اور قومی آواز کے کارکنان کو پروگرام دئیے گئے دوسرے الفاظ میں ڈاکٹر صلاح الدین نے اپنے سیمینار کے امکانی مخالفوں کو پروگرام دے کر اس ضرب المثل کی صداقت کو تسلیم کرایا کہ مُنہ کھائے آنکھ شرمائے۔

مولانا باقی متحدہ پنجاب میں ڈائریکٹر اطلاعات تھے وہ آئی۔ سی۔ ایس کیڈر کے آدمی تھے سولہ زبانیں جانتے تھے۔ وطن دشمن لوگوں کے بارے میں جو وہ رپورٹ انگریزی میں تیار کرتے تھے۔ اسے حکومتِ ہند سر آنکھوں پر رکھتی تھی۔ باقی صاحب ایسا جرنلسٹ صدیوں میں پیدا ہوتا ہے دہلی کے ایک اور جرنلسٹ باقی صاحب کی مقبولیت سے جلتے تھے اور چاہتے تھے کہ حکومت ہند میں انھیں بھی وہ مقام حاصل ہو سکے جو مولانا باقی کو حاصل تھا۔ مگر چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ یہ اردو کے صحافی باقی صاحب کی گرد کو بھی نہ پا سکے کیونکہ باقی صاحب ایسی انگریزی بولنا اور لکھنا ان کے فرشتوں کے بس کی بھی بات نہ تھی۔ چنانچہ پروانہ ردولوی صاحب نے مولانا باقی کے خاکے میں انہی رقیب صحافی کی بتائی ہوئی باتیں لکھیں اور باقی صاحب کا خاکہ اُڑایا۔

قبلہ یوسف دہلوی پر جو خاکہ فیاض رفعت صاحب نے پڑھا کیا وہ خاکہ تھا؟ اس سے کہیں بہتر مضامین یوسف دہلوی صاحب پر کئی رسائل میں چھپ چکے ہیں۔

ایک بات ماننی پڑے گی کہ ڈاکٹر صلاح الدین نے اس بات کا خاص اہتمام رکھا کہ اُن کے کسی دوست یا رفیق کو یہ شکایت نہ رہے کہ اُنھیں اس سیمینار میں چار سو روپیہ بھی نہ دلوایا۔ بعض کو تو آٹھ آٹھ سو روپے بھی دلوا دیئے۔

اس سیمینار پر ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر کیا کیا جائے کہ شانِ ہند کی محدود ضخامت اس کے لئے ناکافی ہے۔ لہٰذا ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ اُردو اکاڈمی نے اگر "دلی والے" سیمینار کا سلسلہ جاری رکھنا ہے جو کہ جاری رہنا انتہائی ضروری ہے تو پھر اس کی ڈائریکٹر شپ کسی مناسب اور موزوں شخصیت کے حوالے کی جائے۔

پنجابی اکاڈمی دِلی یا پولیس اسٹیشن

حکومتِ دلی نے اُردو۔ پنجابی اور ہندی اکاڈمیاں اس لئے بنائی ہیں کہ ان اکاڈمیوں کے ذریعہ ان تینوں زبانوں کے فروغ کے لئے کوشش کی جائے اور ان زبانوں کے ادیبوں۔ لیکھکوں اور تنقید نگاروں کی مناسب طور پر حوصلہ افزائی کی جائے اور جہاں مالی مدد کی ضرورت ہو وہاں کسی قسم کی کنجوسی نہ کی جائے۔ اور یہ تینوں اکاڈمیاں ایسے پبلک ادارے ہیں جہاں پر عوام کے ساتھ خوشگواری کا سلوک کیا جانا ضروری ہے۔ اُردو اکاڈمی میں جائیے تو اس کا ہر کارندہ آپ کو اخلاق اور تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ نظر آئے گا۔ ہندی اکاڈمی میں اگر جانا ہو تو وہاں آپ کا سواگت خندہ پیشانی سے کیا جائے گا۔ آپ کے تشریف رکھتے ہی گرمی میں ٹھنڈا پانی اور سردی میں چائے اور بسکٹ پیش کئے جاتے ہیں اور ہر آنے والے کو تسلی بخش جواب دیا جاتا ہے اور جو بھی واقفیت آپ کو چاہیئے بہم پہنچائی جاتی ہے۔

اور اگر خدانخواستہ آپ پنجابی اکاڈمی میں چلے گئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ پنجابی اکاڈمی میں نہیں بلکہ کسی پولیس اسٹیشن میں چلے آئے ہیں جہاں آپ کی کوئی سُننے والا نہیں ہے۔ ایک کشمیری صاحب اسسٹنٹ سکریٹری ہیں جن کا بول چال کسی روایتی پولیس کانسٹبل سے بھی زیادہ ہی روکھا اور ہتک آمیز ہوتا ہے۔ اُنھیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ اکاڈمی میں آنے والے کسی بھی شخص سے کس طرح بات کرنا ہے۔ ہاں اکاڈمی کے ملازمین

کہ ایک فوج ظفر موج ہے جو صرف بے کار گپیں ہانک رہی ہوتی ہے اور لڑکیاں تو کسی بھی آنے والے کی کسی بھی بات کا سیدھے منہ سے جواب دینا بھی گناہ سمجھتی ہیں۔ ہاں جن دنوں کسی تقریب کے سلسلے میں دعوت نامے بھجوانے ہوں تو پنجابی اکاڈمی کے دفتر میں واقعی کام ہو رہا ہوتا ہے

اردو۔ ہندی اور پنجابی اکاڈمیوں میں سے ہر ایک کو تئیس تئیس لاکھ روپیہ سالانہ گرانٹ ملتی ہے۔ پنجابی اکاڈمی کے سکریٹری صاحب سرکاری محکمہ اکاونٹس میں افسر اعلیٰ ہیں لہٰذا انھیں اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ اکاڈمی کی طرف دھیان دے سکیں۔

سال میں تئیس لاکھ روپیہ برباد کرنے والی یہ پنجابی اکاڈمی کیا یہ بتا سکتی ہے کہ اس نے سال بھر میں کسی ایک بھی غیر پنجابی یا کسی غیر سکھ کو پنجابی (گورمکھی) لکھنا پڑھنا سکھایا ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیا پنجابی ٹپے۔ بولیاں اور پنجابی ڈرامے وغیرہ پر یہ رقم خطیر برباد کرنا دلی کے عوام پر ظلم نہیں۔

ہم لفٹننٹ گورنر سے التماس کریں گے کہ پنجابی اکاڈمی کے سکریٹری کوئی ایسی عوامی شخصیت ہونی چاہیے جو پورا وقت اکاڈمی کو دے سکے۔ اور اگر کسی وجہ سے موجودہ سکریٹری کو یہ اعزاز بخشنا ہی ہے تو پھر اسسٹنٹ سکریٹری ایسا ہونا چاہیے جو پنجابی اکاڈمی کو ایک لسانی ادارہ سمجھ کر اس کے نظم و نسق کو چلائے موجودہ اسسٹنٹ سکریٹری ہرگز ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے پنجابی اکاڈمی ایسے عوامی ادارے میں رکھا جائے۔ یہاں تو کوئی ایسا شخص ہونا چاہیے جو اپنی افسری کو گھر رکھ کر آیا کرے اور اپنے آپ کو پنجابی اکاڈمی کا خادم تصور کرے۔

میٹروپالیٹن کونسل میں

دلی اردو اکاڈمی کا ذکرِ خیر

میٹروپالیٹن کونسل دہلی کے اجلاس ۳۰ مئی کو وقفۂ صفر میں جنتا پارٹی کے مرزا صدیق علی نے دہلی کی اردو اکاڈمی کے سلسلے میں سخت الزامات عائد کئے اور کہا کہ یہاں رقوم اور فنڈ کا بے جا استعمال ہو رہا ہے اور فیصلے کئے جا رہے ہیں۔ مرزا صاحب نے اکاڈمی میں بھائی بھتیجہ واد کے الزامات لگاتے ہوئے اردو کے ماہرین کی ایک کمیٹی سے اس کی جانچ کرانے کا مطالبہ کیا۔

اس سلسلے میں مرزا صدیق علی صاحب کی خدمت میں گذارش ہے کہ دلی کے ماہرین اردو کم و بیش سب ہی اکاڈمی کی جنرل باڈی کے ممبر ہیں۔ لہٰذا ان سے اکاڈمی پر آپ کے لگائے ہوئے الزامات کی جانچ کیا ہو سکے گی۔ لہٰذا ہم لفٹننٹ گورنر صاحب کی خدمت میں یہ تجویز رکھ رہے ہیں کہ وہ مرزا صدیق علی صاحب کو ہی اس کا اختیار دیں کہ وہ خود ہی اُن الزامات کی جانچ کریں جو کہ انھوں نے میٹروپالیٹن کونسل میں لگائے ہیں۔ تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو سکے۔

سردار جعفری شہریار اور بشیر بدر کی دُرگت

لوک سبھا میں مسلم مطلقہ خواتین بل پیش ہوا تو اس کے خلاف ملک کے جن ۱۲۵ مسلم دانشوروں، ادیبوں شاعروں، صحافیوں اور فن کاروں نے اپنے دستخطوں سے مشترکہ بیان جاری کیا تھا ان میں سردار جعفری اور شہریار بھی تھے۔

حیدرآباد میں اقبال اکیڈمی کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے عالمی اقبال سیمینار کے موقع پر جو مشاعرہ ہوا اس میں سردار جعفری، شہریار اور ڈاکٹر بشیر بدر کا جو حشر ہوا وہ اردو کے اُن تمام ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے جو محض حصولِ زر اور اپنی شہرت کے لئے اپنے مذہب کا مذاق اڑاتے ہیں۔

دراصل حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش خواہ کتنے ہی ترقی پسند کیوں نہ ہو جائیں مگر ان تینوں ممالک کے عوام اپنے اپنے مذاہب سے روگردانی نہیں کر سکتے اور یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں

کمیونزم پھیلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

مسلم مطلقہ خواتین بل کے سلسلے میں اگر مسلمانوں کی اکثریت اپنے پرسنل لاء کی روشنی میں اس کی حمایت کرتی ہے تو پھر نہ حکومت کو اور نہ کسی اور کو اس پر اعتراض ہونا چاہئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ لوک سبھا، راجیہ سبھا اور راشٹرپتی نے یہ بل پاس کر دیا ہے۔ اگر کوئی مسلمان پرسنل لا کو نہیں مانتا یا مسلم مطلقہ خواتین بل پر عمل کرنا نہیں چاہتا تو اُسے کون روک سکتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے مگر اُسے یہ اختیار نہیں کہ مسلم اکثریت کے ایسے مطالبہ کو جو شرعی طور پر صدیوں سے قابلِ قبول رہا ہے، تسلیم کئے جانے میں روڑا اٹکائے۔ وہ اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے اگر اکثریت اُس کا ساتھ نہیں دیتی تو اسے اپنے یقین و اعتقاد کے مطابق عمل کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔ چونکہ سردار جعفری اور شہریار نے اس بل کی مخالفت کی اس لئے حیدرآباد کے عوام کا ردِ عمل ان دونوں ترقی پسند شاعروں کے خلاف سمجھ میں آسکتا ہے مگر بشیر بدر نے تو اس بل کے خلاف کوئی سرگرمی نہیں دکھائی تھی مگر انھیں بھی ادبی ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقدہ اس مشاعرہ میں انتہائی ہراسانی کے عالم میں اس وقت بھاگ جانا پڑا۔ جب سامعین جن میں طلبا اور نوجوانوں کی اکثریت تھی انھیں شریعت دشمن قرار دے کر ان کے خلاف پُرجوش نعرے لگائے اور انھیں مشاعرہ گاہ سے چلے جانے کا مطالبہ کیا۔ اس مرحلے پر مظاہرین نے اُن کے خلاف بینر اور پوسٹر بھی بلند کئے۔ جن پر شریعت کے دشمن واپس جاؤ کے نعرے درج تھے۔ اس موقع پر مشاعرہ گاہ میں افراتفری پھیل گئی اور مشاعرہ گاہ میں موجود ہزاروں سامعین نے مظاہرین کی تائید میں اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نظامتِ مشاعرہ کی بار بار وضاحت کے باوجود مشتعل سامعین نے ڈاکٹر بشیر بدر کے کلام کو سننے سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف نعرے لگائے۔ بشیر بدر نے بائبل پر خدا کی قسم کھاتے ہوئے اس بات کی تردید کی۔ انھوں نے مسلم پرسنل لا بل کی مخالفت میں کسی قسم کا بیان دیا تھا۔ ان کی اس تردید کے باوجود سامعین ان کے خلاف نعرے بلند کرتے رہے اور ایک مرحلہ پر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مشاعرہ اس افراتفری میں ختم ہو جائے گا لیکن بشیر بدر دانشمندانہ فیصلہ کرتے ہوئے اسٹیج کے نیچے چلے گئے۔

"رہنمائے دکن" کے نمائندہ نے ڈاکٹر بشیر بدر سے اس سلسلہ میں استفسار کیا تو انھوں نے بتایا کہ میں نے کبھی بھی مسلم پرسنل لا بل کی مخالفت نہیں کی حیدرآباد میں آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کے عوام یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے بھی اس بل کے خلاف کوئی بیان دیا ہے۔ حالانکہ یہ بہتان ہے اس کے بعد ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنے قلم سے ان حسبِ ذیل تحریر نمائندہ رہنمائے دکن کو لکھ کر دی۔

"میں نے بخدا مسلم پرسنل لا بل کی مخالفت میں کوئی بیان نہیں دیا۔ میں بل کی مکمل تائید میں ہوں اور اس کی حمایت کرتا ہوں"

بشیر بدر

19/4/86 حیدرآباد

دِلّی اُردو اکاڈمی کا کھانا

دلی اُردو اکاڈمی جب کوئی دو روزہ، سہ روزہ یا اس سے بھی زیادہ دنوں کا سمینار کراتی ہے تو دوپہر کا کھانا مہمانوں اور جملہ سامعین کو اس وجہ سے کھلاتی ہے کہ اگر سامعین کھانا کھانے کے لئے اپنے اپنے گھروں کو جائیں گے تو پھر واپس نہیں آئیں گے اور سہ پہر کا اجلاس پھیکا رہے گا مگر یار لوگوں نے اس رعایت کا بھی ناجائز فائدہ اُٹھانا اپنا شعار

بنالیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کھانا انتہائی درجہ کا بہترین ہوتا ہے اور کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل کے کھانے سے بھی لذیذ ہوتا ہے۔ مگر اس کھانے کی وجہ سے سیمنار کا آج کا اجلاس بالکل ناکام رہتا ہے اور اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ سامعین بارہ بجے کے بعد اکا دکا آنے شروع ہوتے ہیں اور ایک بجے کے قریب جوق در جوق آنے لگتے ہیں اور پندرہ منٹ کے اندر اندر غالب اکاڈمی میں تو یہ حالت ہو جاتی تھی کہ ہال کے ساتھ ساتھ گیلری بھی بھر جاتی تھی اور برآمدہ میں بھی سامعین کا جمگھٹا لگ جاتا تھا اور کچھ حضرات غالب اکاڈمی کے سامنے نیچے پڑے جاتے رہتے تھے اور جوں ہی نقوی صاحب نے یہ اعلان کیا کہ نیچے کھانا آپ کا انتظار کر رہا ہے تو بس [illegible] میں یہ حالت ہوتی تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں اور کوئی خالی پلیٹ نہیں مل رہی ہے۔ گوشت، مرغ، مچھلی یا زردہ وغیرہ میزوں تک پہنچتے بھی نہیں پاتا تھا کہ راستہ میں ہی یار لوگ ڈونگے خالی کر دیتے تھے اور کئی حرص کے ماروں کا تو یہ حال ہوتا تھا کہ پلیٹ میں سالن رکھنے کی جگہ نہیں ہے مگر ان کی بھوکی نظریں اور پھر کئی دنوں تک ایسا لذیذ کھانے نہ ملنے [illegible] سے ان کی خاندانی کمینگی چاہتی تھی کہ مرغ کی دو چار ٹانگیں وہ اور بھی پلیٹ میں رکھ لیں۔ ایک اندازہ کے مطابق اگر ہال میں سامعین کی تعداد زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس ہوتی تو کھانے کے وقت یہ تعداد تین سو سے زائد ہو جاتی۔

اب کی بار "دلی والے" سیمنار اُردو اکاڈمی کے نئے دفتر گھٹا مسجد کے پاس بیلا روڈ پر ہوا تو حالت ویسی ہی تھی یعنی عام اجلاسوں میں سامعین کی تعداد نو دس سے لے کر تیس چالیس تک ہوتی تھی مگر کھانے کے وقت یہ تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی تھی۔ پڑھے لکھے اُردو دانشوروں کا کھانے کے سلسلے میں کیا حال ہے۔ اس کی ایک مثال سُن لیجئے۔

"دلی والے سیمنار" کے پہلے روز راقم الحروف اکاڈمی کے دفتر کے باہر بیلا روڈ کی ضمنی سڑک پر کھڑا کسی کا انتظار کر رہا تھا کہ ۲ ½ بجے ایک تھری ویلر سکوٹر سے ایک صاحب دیوان شاعر اپنی اہلیہ محترمہ اور نوجوان بیٹے کے ساتھ اترے اور سلام علیک کئے بغیر فرمانے لگے سرور صاحب کیا کھانا ہو لیا۔ عرض کیا کہ کھانا تیار کرانے کے انچارج جناب عارفین صاحب سیر چشم اور فراخ دل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جانتے ہیں کہ انھیں کیسے لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے لہٰذا اللہ ان کے ہاتھوں میں ایسی برکت ڈال دیتا ہے کہ کھانا چار بجے تک بھی آپ کو مل سکتا ہے اس پر یہ صاحب فرمانے لگے سرور صاحب آپ جانتے ہیں کہ میں آل انڈیا ریڈیو میں ہوں۔ دفتر سے گھر گیا وہاں سے بیوی اور لڑکے کو لیا اور افراتفری میں بھول گیا کہ اکاڈمی کا دفتر بدل گیا ہے اور اب کی کھانا بھی اکاڈمی کے دفتر میں ہی ہوگا اور سیدھا نظام الدین غالب اکاڈمی گیا تو وہاں پتہ چلا کہ بیلا روڈ جانا ہوگا لہٰذا وہاں سے بس پکڑ کر دریا گنج آئے اور تھری ویلر والے سے کہا کہ ہمیں بیلا روڈ پہنچا دو اور اب یہ چار روپے ساٹھ پیسے مانگ رہا ہے۔ راقم الحروف نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ گھبرائیے نہیں آج قورما کے ساتھ اسٹو بھی بنا ہے اور بے حد لذیذ ہے۔ آپ کھائیں گے تو تھری ویلر کا کرایہ بھول جائیں گے۔ آپ یقین مانیے کہ یہ حضرات کھانا کھانے کے فوراً بعد واپس چلے گئے اتنی بھی تکلیف گوارا نہیں کی کہ جس ہال میں سیمنار ہو رہا ہے اس کے اندر جا کر جھانک ہی لیں۔

ان حالات کے پیش نظر اس کھانے کی وجہ سے سیمنار کے عام اجلاس بے رونق رہنے لگے ہیں اور کھانے کے وقت جم غفیر نظر آتا ہے کھانے سے پہلے یا بعد وہ دس بیس لوگ نظر آتے ہیں جنھیں یا تو خا

یا مقالہ پڑھنا ہوتا ہے یا اُن کے کچھ ایسے دوست جو منہ دیکھے کی داد دے کر اپنے تعلقات قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

ہماری رائے میں تو کھانے کی بدعت قطعاً بند کردینی چاہیئے۔ شعراء، مقالہ نگار اور خاکہ نگار جو باہر سے تشریف لاتے ہیں انھیں دہلی میں قیام وطعام اپنے اخراجات پورا کرنے کے لئے دعوت نامہ میں ہی لکھ دیا جاتا ہے اور دوسرے حضرات اپنے اپنے گھر جاکر کھانا کھاسکتے ہیں۔ جن لوگوں کو مقالے اور خاکے سننا ہوں گے وہ ہر حال میں آئیں گے اور جو محض کھانا کھانے کی وجہ سے آتے ہیں ان کا آنا نہ آنا برابر ہے

اکاڈمی کو سال بھر میں کھانے کی بدعت ختم کرنے سے کم وبیش پچاس ساٹھ ہزار روپیہ کی بچت ہوگی جو کسی دوسرے نیک کام میں صرف کی جاسکتی ہے اور اگر بھوکوں کو کھانا کھلانا بھی اکاڈمی کے فرائض میں داخل ہے تو پھر اس بدعت کو جاری رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں مگر ہم چاہیں گے کہ اکاڈمی کے ارباب بست وکشاد ایمانداری سے سوچیں کہ اس طرح کھانے پر ایک رقم خطیر برباد کرنے سے اُردو کا کیا بھلا ہوگا۔

کیا ڈاکٹر صلاح الدین رو دیئے تھے؟

ڈاکٹر صلاح الدین کو اُردو اکاڈمی دہلی کے دوبارہ ممبر منتخب ہونے پر ان کے احباب نے رنجیت ہوٹل میں استقبالیہ دیا۔ جس میں متعدد حضرات نے شرکت فرمائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس استقبالیہ میں اُردو اکاڈمی کے مُشیر اور دیگر متعدد ممبران نے شرکت اس لئے نہیں کی کہ یہ استقبالیہ اس امر کا آئینہ دار تھا کہ اُردو اکاڈمی کی مخالفت میں ایک گروپ اُبھر کر آیا ہے جو ڈاکٹر صلاح الدین کو ایک سپر طاقت تسلیم کرانے کا فرض انجام دے گا اور اس مخالف گروپ کا نصب العین یہ ہے کہ اکاڈمی سے بوڑھوں کو نکال کر ان کی جگہ نوجوانوں کو لایا جائے۔ اور اسی لئے اس استقبالیہ میں کسی بوڑھے کو مدعو بھی نہیں کیا گیا

دُور کی کوڑی لانے والوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ استقبالیہ کے بعد رات کو رنجیت ہوٹل میں ہی ڈاکٹر صلاح الدین صاحب کے خاص احباب میں شراب ناب کے دور بھی چلے۔

اس مخصوص دعوت میں ایک صاحب جو کچھ زیادہ ہی پی گئے تھے نے یہ کہتے ہوئے محفل کا رنگ بگاڑ دیا کہ سالا بڑی بڑی باتیں کر رہا ہے لفٹننٹ گورنر کے ہاں تو آنسو بہا کر اور زار وقطار روتے ہوئے اپنے آباو اجداد کو فریڈم فائٹر کہہ کر اپنی ممبری بچا کر لایا ہے۔ اور ہمارے سامنے پھنے خاں بنا پھرتا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ ایک شرابی کی بڑ ہو۔ مگر اکثر اوقات شرابی نشے میں پتے کی بات بھی کہہ جاتے ہیں تاہم اس کی تصدیق یا تردید تو ڈاکٹر صلاح الدین یا لفٹننٹ گورنر ہی کرسکتے ہیں۔ مگر یہ بات بڑے زوروں سے ادبی حلقوں میں موضوع سخن بنی ہوئی ہے اور اُردو داں حضرات لفٹننٹ گورنر کی رحم دلی کی تعریف کررہے ہیں۔

ڈاکٹر نارائن دت پالیوال کی ادبی کاوش

ہندی اکاڈمی دہلی کے سکریٹری ڈاکٹر نارائن دت پالیوال نے ہندی کی ایک ڈکشنری کمالوتی ہندی شبد کوش ترتیب دے کر ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔

جناب کے آنند بھارتی انگزیکٹو کونسلر (تعلیم) دلی ایڈمنسٹریشن نے ہماچل بھون میں ہندی کی اس ڈکشنری کا اجرا کرتے ہوئے فرمایا کہ مختلف زبانوں کے الفاظ کو ہندی زبان میں سمو کر ہندی کے مزید فروغ کے لئے ڈاکٹر پالیوال نے جو کامیاب کوشش کی ہے وہ مبارکباد کی مستحق ہے موصوف نے مزید فرمایا کہ کمالوتی ہندی کے سلسلے میں یہ پہلی کوشش ہے جس کے لئے ڈاکٹر پالیوال اور بھی تعریف کے قابل ہیں کہ انھوں نے اپنی اس ادبی کاوش سے ریسرچ اسکالروں اور لسانیات پر کام کرنے والوں کے لئے آسانی پیدا کردی ہے۔ شانِ ہند کی آئندہ اشاعت

یں اس ڈکشنری پر مفصل تبصرہ شائع ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر حقیر آستانی

شاعری کے افق پر کچھ دنوں سے ایک نام ڈاکٹر حقیر آستانی ضو بار ستارے کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی سی روشنی کی طرح ذہنوں کو منور کئے ہوئے ہے معیاری رسائل و جرائد میں ان کا کلام اہتمام سے شائع ہو رہا ہے اور ذوق سلیم رکھنے والے حضرات سے داد پا رہا ہے حال ہی میں ان کا مجموعہ کلام "افکار گریزاں" اس انداز سے شائع ہوا ہے کہ دیکھنے والا بے ساختہ کہہ اٹھے کہ واقعی افکار گریزاں اس سال کا بہترین مجموعۂ کلام ہے اگر آپ اچھی شاعری کے دلدادہ ہیں تو افکار گریزاں" کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے جو یقیناً آپ کے باذوق ہونے کی دلیل ہوگا۔

ترقی اردو بورڈ

ترقی اردو بورڈ میں تین چار خود غرض اور ناجائز مفاد حاصل کرنے والے اصحاب موجود ہیں جو ڈائریکٹر صاحبہ کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ حکومت نے یہ ادارہ اردو کی ترقی اور تحفظ کے نیک جذبہ سے قائم کیا ہے اور حقیقت ہے کہ اس ادارہ نے بہت ہی مفید اور کارآمد کتابوں کے علاوہ تعلیمی نصاب کی کتابیں شائع کر کے اردو کے طلبا اور اردو داں عوام کے لئے آسانیاں مہیا کی ہیں۔ ضرورت تو یہ تھی کہ ترقی اردو بورڈ کا ہر رکن اردو کے تحفظ کے لئے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا تاکہ یہ ادارہ زیادہ سے زیادہ بہتر کارکردگی سے اپنے اغراض و مقاصد کو پورا کرتا مگر بدقسمتی سے اس وقت (۳) ادارہ میں تین چار اصحاب ایسے ہیں جو اپنی سرگرمی سے اس مفید ادارے کو بدنام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ یہ حضرات اپنی ذاتی اغراض سے اوپر اٹھیں اور ترقی اردو بورڈ کو زیادہ سے زیادہ فعال ادارہ بنانے میں ڈائریکٹر صاحبہ کو تعاون دیں اگر ان حضرات نے اپنی نامناسب کارروائیوں سے توبہ نہ کی تو ہمیں مجبوراً وزارت کو ان کی کارستانیوں سے آگاہ کرنا ہوگا۔

اردو اکاڈمی دہلی سے دھوکا

یہ خبر بڑے زوروں سے گرم ہے کہ جن مصنفین کو کتابیں شائع کرنے کے لئے اکاڈمی نے مالی امداد دی اس میں سے اکثر نے اکاڈمی کو اس طرح دھوکا دیا ہے کہ کم تعداد میں کتابیں شائع کر کے اکاڈمی سے گیارہ گیارہ صد تعداد کے بل حاصل کئے۔ اس سلسلے میں اکاڈمی کو چاہیئے کہ دھوکا دہی کے جرم میں یہ سب معاملے پولیس کو سونپ دے کیونکہ یہ کتابیں اکاڈمی کی مالی امداد سے شائع ہوئی ہیں سرکاری گرانٹ کا غلط استعمال قابل دست اندازی پولیس ہے۔ میٹروپالیٹن کونسل میں اکاڈمی پر عجیب و غریب الزامات لگائے گئے ہیں ایسی صورت حال میں اکاڈمی کا فرض ہے کہ وہ اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے لئے سر دھوکا دینے والے کو پولیس کے حوالے کرے۔ تاکہ آئندہ کسی مصنف کو ایسی جرأت نہ ہو سکے۔

ادارہ شان ہند کی جملہ مطبوعات ۸۵ء پر انعامات

ادارہ شان ہند نے سال ۱۹۸۵ء میں پانچ کتابیں شائع کیں۔ جن میں سے چار مطبوعات۔ سرباز بہادلی نے مرتبہ ڈاکٹر اردو سے سرلن آر مان ہلاری۔ راز دنیاز مجموعۂ کلام جناب راز لائلپوری۔ الہامات مست مجموعۂ کلام پنڈت دینا ناتھ مست کاشمیری اور اپنا دامن اپنی آگ از ڈاکٹر کیول دھیر۔ اترپردیش اردو اکاڈمی نے ایوارڈ دیئے ہیں۔ اور پانچویں کتاب بعنوان مسئلے کا حل (شیر خورمک) از رے جگت سنگھ پر دہلی اردو اکاڈمی نے دو ہزار روپیہ کا ایوارڈ دیا ہے۔ ادارہ شان ہند ان پانچوں حضرات کی خدمت میں ہدیہ تہنیت پیش کرتا ہے۔

غزل

منظر صدیقی (بالسنواڑہ)

ا جسمِ نور کا پیکر غزل میں ہے
ی جو نہیں ہے وہ منظر غزل میں ہے

پھولوں کی طرح لفظ مہکتے ہیں اس لئے
اُس گل بدن کا ذکر مری ہر غزل میں ہے

ی زمینِ تخیل کا آسماں
ن کا عمیق سمندر غزل میں ہے

تفریقِ رنگ و نسل نہ مذہب کا کچھ سوال
انسانیت کا شہر منور غزل میں ہے

ا شراب، ساغر و مینا ہیں اردگرد
ے لوازمات کا منظر غزل میں ہے

پالکی کی نقوشِ لیلیٰ و ... رو رکھی
موسیقیت کا درد بھی منظر غزل میں ہے

غزل

سوز باندوی

ل اہلِ نظر اہلِ زباں آتے ہیں
ر آپ کی محفل میں کہاں آتے ہیں

دور ہیں جو حرم و دیر کے ہنگاموں سے
نیک لوگوں میں وہی اہلِ جہاں آتے ہیں

ہی آپ کی محفل وہی محفل ہے جہاں
زبانوں کی طرح اہلِ زباں آتے ہیں

آگینہ جیسا چٹانوں کو نہ دیکھے کوئی
پتھروں پر کہیں قدموں کے نشاں آتے ہیں

کے بارے میں ابھی آپ نے پوچھیں ہم سے
ے ہم کہاں جاتے ہیں، کہاں آتے ہیں

باتوں کے لئے تم ہمیں الزام نہ دو
ہم کو کچھ اور بھی اندازِ بیاں آتے ہیں

زمانے میں مرے سامنے اکثر اے سوز
زبانوں کی طرح دشمنِ جاں آتے ہیں

غزل

ڈاکٹر سید المحمود دیوآن (لندن)

بات ایمان کی کہتا ہوں خدا خانے میں
بھیس بدلے ہوئے کل آپ تھے میخانے میں

یہ کچھ اچھا نہیں بن دیکھے کسی کو کہنا
آپ تنقید کریں جا کے صنم خانے میں

چشم میگوں کو جو دیکھا تو یہ محسوس ہوا
سارا میخانہ سمٹ آیا ہو پیمانے میں

بات ساقی کی رہے دل کو بھی آجائے سرور
شیخ کیا حرج ہے اک گھونٹ کے پی جانے میں

کھو نہ دینا کہیں رنگین جواں بخت سماں
رات کٹ جائے نہ اس طرح سے شرمانے میں

کام آتا ہے خرد ہو کہ جنوں موقع سے
عمر اک چاہیئے ناصح تجھے سمجھانے میں

تیرے مکتوب کو دیوآن بھلا کون پڑھے
لکھ دیا تو نے حقیقت بھی افسانے میں

غزل

نیر جہاں (ادیب فاضل)

اگرچہ یاد کا یارا نہیں ہے
یہ دل تجھ کو مگر بھولا نہیں ہے

چلے آؤ مرے گھر جب بھی چاہو
بہاروں کو کبھی روکا نہیں ہے

دھواں سا کیوں لگے ہے اپنے اندر
کہ جب باہر کوئی شعلہ نہیں ہے

اگر سوچوں تو جینا تیری خاطر
جو تو مانگے تو اک لمحہ نہیں ہے

خدایا پھر مجھے اُس سے ملا دے
بڑی مدت سے دل دھڑکا نہیں ہے

وطن میں اجنبی باہر مسافر
پلٹ جانے کا بھی رستہ نہیں ہے

کیا ترکِ تعلق اُس سے نیر
مگر کیا یاد کا رشتہ نہیں ہے

غزل

ڈاکٹر تفتہ (کورو کشیتر)

راہِ الفت میں تمہیں پاؤں جمائے رکھئے
راستے جتنے بھی ہیں سب دُور بھگائے رکھئے

حسنِ گفتار سے اِک اِک کو بنائے رکھئے
ساری دُنیا کو اشاروں پہ نچائے رکھئے

گردِ غم، آئینۂ دِل سے ہٹائے رکھئے
اپنے دامن سے اِک اِک داغ چھڑائے رکھئے

یہ حقیقت ہے کہ فردا میں کشش ہے لیکن
ذہن میں عہدِ گزشتہ کے بھی سائے رکھئے

یہ الگ بات کہ ہو یا نہ ہو تاثیر کوئی
اپنی ہی ذات کو آواز لگائے رکھئے

ہاں زمانہ تو نمک پاش ہُوا کرتا ہے
اپنے زخموں کو زمانے سے بچائے رکھئے

ظلمتیں دائم و قائم نہیں رہتیں ہردم
اپنے احساس کی قندیل جلائے رکھئے

کامیابی تو یقینی ہے رہِ ہستی میں
ہاں اگر شرط ہے ماحول بنائے رکھئے

تفتہ جب زیست کے اسرار سے انکار نہیں
ٹھیک ہو یا غلط، کوئی تو رائے رکھئے

جوشِ جنوں (غزل بقیدِ یک قافیہ)

امر چند قیس جالندھری

اُڑی جب خاک میرے آشیاں کی
وہاں پہنچی - یہ مٹی تھی جہاں کی

اسیرِ اُلفتِ صیّاد ہوں میں
خبر کیا گلستاں کی؟ آشیاں کی

دُھواں سا اُٹھ رہا ہے گلستاں سے
خدایا! خیریت ہو آشیاں کی

زبانِ برق سے ہم نے سُنی ہے
کہانی جلنے والے آشیاں کی

قفس میں جب سے یہ دل لگ گیا ہے
نہیں بجلی سے کم یاد آشیاں کی

چمن میں تنکا تنکا چُن کے ہم نے
بنا رکھی ہے اپنے آشیاں کی

پتہ کس کو ہے اب کس کو خبر ہے
چمن میں آشیاں کا؟ آشیاں کی؟

برستے ہیں ہمیشہ پھول جس پہ
زمیں ہے وہ ہمارے آشیاں کی

یہاں بھی ناک میں اے قیس! دم ہے
قفس کی سی فضا ہے آشیاں کی!

غزل

یوسف ثاقی سیلانی
پالی (راجستھان)

ہم اس خطا پہ نشانے بنے سزاؤں کے
ہر میں آئیں جہاں پر وہیں یہ برسیں گی
ہر ایک نظر کا فریب آسمان ہے گویا
ہر اک پہاڑ کو بُرتا ہے جوگیوں کی طرح
بڑے درخت ہیں مضبوط کتنے چھوڑو بھی
لپٹ رہا تھا اِک اونچے درخت سے جو شخص

یہ آج تک نہ ہوئے مرتکب خطاؤں کے
فضول جائیں گے سب جائزے گھٹاؤں کے
بھٹک رہے ہیں مسافر یوں ہی خلاؤں کے
کبھی بتائیں گے حالات بھی گپھاؤں کے
اُکھاڑ دیتے ہیں جھونکے اُنھیں ہواؤں کے
وہ بھینٹ چڑھ گیا طوفان بھری ہواؤں کے

اُلجھ کے رہ گئے ثاقی خلوص کے بندے
قدم قدم پہ ملے دائرے وفاؤں کے

بُغدم چچا بمقابلہ ولی گجراتی

جوزف انور (احمد آباد)

صبح سویرے پانچ بجے دروازے پر جو کسی نے دستک دی تو ہمارے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔

"کون ہے بے"

استادِ محترم۔ اپنے کرمفرماؤں کا اس ڈھنگ سے خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ کیا تمہیں میرا خط ملا نہیں۔ اس ترکی بہ ترکی جواب پر ہم نے بڑبڑاتے ہوئے پلنگ سے اٹھ کر دروازہ جو کھولا تو پھر بیساختہ منہ سے نکل گیا۔ لاحول ولاقوۃ یہ تو بُغدم چچا ہیں۔

"اوّل تو لاحول تم پر۔ دوئم یہ کہ چھ سال لکھنؤ میں رہ کر بھی تہذیب اور شائستگی سے نابلد رہے۔ گفتگو کا سلیقہ ہے نہ کچھ پاسِ ادب، خیر سے عمر میں دس سال مجھ سے بڑے ہو۔ اگر میں تمہارا چچا ہوں تو تم بھی میرے والدِ مرحوم سے کم نہیں۔

"اماں بُرا نہ مانئے۔ دراصل آپ جگت چچا ہیں اِس لئے منہ پر چڑھا ہوا ہے"

ہم نے اپنی صفائی میں بولتے ہوئے کہا

"اپنی یہ خلعِ جگت اپنے پاس ہی رکھو اور ہاں یہ بھی سن لو کہ ہم نے اب اپنا تخلص قاف۔ میم، نون سمرقندی کی بجائے پاگل پریمی رکھ لیا ہے۔ اب ہمیں پاگل ایسے ہی کہا کرو۔

بیگم اس وقت باورچی خانے میں تھیں اس گفتگو کی صدائے بازگشت اُن کے کانوں تک پہنچی تو باورچی خانے ہی سے بولیں۔

"اجی یہ صبح صبح دودھ والے سے کیا ماتھا پچی کر رہے ہو یہ کمبخت پانی ملانے سے باز نہیں آئے گا۔ الآخر بُغدم چچا کی پیشانی پر دفعتاً سلوٹیں نمودار ہو گئیں جسے کمالِ احتیاط کے ساتھ درست کرتے ہوئے وہ سیدھے باورچی خانہ جا گھسے۔

السلام علیکم بھابھی صاحبہ۔ پہچانا نہیں۔ میں قاف۔ میم۔ نون ہوں۔ دہلی کے مشاعرے میں انور بھائی کے ساتھ ملاقات بھی ہوئی تھی۔ آپ کو آٹوگراف بھی دیا تھا۔

بات یہ ہے کہ شام کو بزمِ خیر البشر کی جانب سے ٹاؤن ہال میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہونا تھا۔ قیام وطعام کا ذمّہ شعراء حضرات ہی کے سر تھا۔ دہلی سے بُغدم میاں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ لہٰذا ازراہِ محبت کہئے یا کفایت، ڈھونڈتے ڈھونڈاتے یہ بلائے ناگہانی کی طرح غریب خانہ تک آ پہنچے تھے۔ اٹیچی کو ایک طرف پٹک کر جب بُغدم میاں ایک صوفہ میں جا دھنسے تو گھر کا جائزہ لیتے ہوئے بولے "اماں یار ان ڈیڑھ کمروں میں کیسے گزر ہوتی ہوگی مشکل تو یہ ہے کہ یہاں کوئی فائیو سٹار ہوٹل بھی تو نہیں۔ خیر دل میں جگہ ہونی چاہیئے۔ کل صبح کی فلائٹ سے تو واپس چلا جاؤں گا۔

اُدھر جہاں بیگم پر سکتے کا عالم طاری ہو چکا تھا اِدھر ہماری حالت بھی قہرِ درویش بر جانِ درویش کے مصداق بن چکی تھی۔

ناشتے میں جب بُغدم چچا چار انڈے آملیٹ کے ساتھ چشم زدن میں صاف کر چکے تو انھوں نے بغور ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔

اماں یہ تمہیں کیا ہو گیا۔ چار سال ہی میں کیسی بھوتوں جیسی صورت بنا ڈالی ہے اُدھر بھابھی صاحبہ

کو دیکھو۔ چشم بد دور۔ ماشاء اللہ وحیدہ رحمان سے کم نہیں بن ٹھن رہی ہیں۔ مجھے بھی ایسا لگتا ہے یہاں کی آب و ہوا مردوں کے لئے سازگار نہیں۔ دہلی میں ناشتہ میں آٹھ پراٹھے کھاتا تھا یہاں بمشکل چار کھا پایا ہوں۔ غالباً عارضہ گیس ہو گیا ہے۔ بس شوق ملاقات یار مقصود تھا جو احمد آباد چلا آیا ورنہ مشاعروں کے دعوت نامے تو ترن تارن اور بٹالہ سے بھی آئے تھے۔

پھر بیگم کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ بھابھی صاحبہ آج تو صحیح خاطر داری ادا ہو جائے۔ ہو جائے مرغ مسلّم۔ کھانے کے بعد گندم چچا نے اپنی توند سہلاتے وہ فلک رسا ڈکار لی کہ ہم تو ہم بیگم تک سہم گئیں۔

بھائی انور مشاعرہ تو رات کے آٹھ بجے شروع ہو گا چلو کچھ سیر و تفریح ہو جائے۔

یہاں کے جھولتے میناروں اور جالی والی مسجد کی کافی تعریف سنی ہے۔ کوئی اے کلاس انگریزی فلم چل رہی ہو تو وہ بھی دیکھ لیں گے اور پھر کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھا کر سیدھے مشاعرہ چلے چلیں گے۔

بس اسٹینڈ پر پہنچے تو گندم میاں لائن کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے سیدھے جا کر سب سے آگے کھڑے ہو گئے۔ دو تین نوجوانوں نے ہانک لگائی "لائین میں آ جاؤ لائین میں" ہم نے کہا بھیا پاگل پن ہی ادھر جنگلے میں آ جاؤ۔ گندم میاں بڑبڑاتے ہوئے جنگلے میں آ گئے۔

اماں کیا بور کر رہے ہو۔ نظام [illegible] ہے۔ ہم دہلی والے اس کے قائل نہیں۔

[illegible] دہلی

آؤ تو معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] [illegible] اترے اور لو اور دہلی اسٹیشن کے قلیوں ہی کو دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ بیچ بکس صندوق سر پر اٹھا کر اس طرح بھاگتے ہیں کہ جناب بس ذرا آپ کی نظر چوکی کہ [illegible] غائب۔ تانگے والوں کی تو بات ہی کیا۔ ایسا لگتا ہے ہندوستان کے سارے فری اسٹائل پہلوان دہلی میں آ کر تانگہ چلانے لگے ہوں۔

لائن میں کھڑے لوگ بڑے انہماک کے ساتھ گندم میاں کی باتیں سن رہے تھے کچھ نوجوانوں کے چہروں پر خفگی کے آثار بھی تھے۔ دفعتاً گندم میاں کی آنکھیں جو گرگٹ کی طرح پھیلنے اور سکڑنے لگیں تو حسب معمول ہم نے بھی ادھر ادھر دیکھا۔ ایک جانب سے آرگنڈی کی پھول دار ساڑھیاں پہنے کچھ حسینائیں آ رہی تھیں۔

"سبحان اللہ۔ کمال ہے انور صاحب جسے دیکھو تو ناقد چار فٹ سے آگے تو کوئی نکلتا ہی نہیں۔ قسم خدا کی بس اٹھائیے اور گملوں میں سجا دیجئے۔ اچانک انھوں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ اماں یہ بس کب آئے گی؟ اماں اتنی کنجوسی بھی کس کام کی آٹھ دس روپوں کا ہی تو سوال تھا ٹیکسی کر لیتے تو کب کے پہنچ جاتے

جیسے ہی بس آئی تو کنڈکٹر نے بس سے اتر کر آواز لگائی چھٹا پیسہ لاؤ چھٹا پیسہ اور لائن میں کھڑے مسافر اپنی اپنی جیبوں کو ٹٹولنے لگے۔

تم انور صاحب میرے پیچھے آ جاؤ۔ میں ان کی عیاری خوب سمجھتا ہوں دیکھتا ہوں کیسے ریزگاری نہیں دیتا۔ کہاں کا ٹکٹ لینا ہے؟

لال دروازہ

جیسے ہی گندم میاں کا نمبر آیا تو انھوں نے جھٹکے سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر کنڈکٹر کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

دو لال دروازہ

چھٹا پیسہ لاؤ چھٹا۔

"ہم نے گھر میں کوئی ٹکسال نہیں لگا رکھی ہے" گندم چچا نے کنڈکٹر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تو ہمارے پاس بھی کوئی ریزرو بینک کا خزانہ نہیں یہ لو ٹکٹیں اور تین روپے۔ باقی کے پیسے گاڑی میں مل جائیں گے۔

کنڈکٹر کوئی مردم شناس شخص تھا جیسے ہی گندم چچا بس میں چڑھے اس نے دوسرے مسافر سے ریزگاری لے کر ہمیں آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے باقی کے چالیس ہمارے ہاتھ میں تھما دیے جو ہم نے کچھ مسکراتے ہوئے جیب میں رکھ لئے۔

ہم جس سیٹ پر بیٹھے تھے عین اس کے سامنے زنانہ سیٹ پر دو اینگلو انڈین لڑکیاں منی سکرٹ پہنے جلوہ فگن تھیں۔ گندم چچا کی آنکھیں پھر پھیلنے سکڑنے لگیں۔ لبرل اسمارٹ ہو چکی تھی مگر گندم چچا کی نظریں ابھی تک اینگلو انڈین لڑکیوں کی ٹانگوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ ہمیں ہنسی آ گئی۔

"کیوں حضرت کھمبے سجا رہے ہو کیا؟"

گندم چچا جھینپ گئے۔ اعتدال پر آتے ہی انھوں نے ہمیں ٹکٹیں دکھائیں۔

"اماں دیکھنا کتنے پیسوں کی ہے؟"

"اسی پیسے کی ایک ٹکٹ ہے"

"اسی اسی ایک سو ساٹھ یعنی چالیس پیسے۔"

دو تین بس اسٹینڈ میں تو بس مسافروں سے کھچا کھچ بھر چکی تھی اس دوران میں کئی مرتبہ انھوں نے کنڈکٹر کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کرتے ہوئے اماں یار۔ اماں یار۔ بھی کہا مگر سانپ اور نیولے کی لڑائی شروع ہو چکی تھی دو تین بس سٹاپ اور آئے کنڈکٹر بس کے دوسرے سرے پر مسافروں کی ٹکٹیں کاٹنے میں مصروف تھا اور گندم چچا گردن کو ٹیڑھی میڑھی کر کے کنڈکٹر کو ٹکٹکی باندھے ہوئے تھے اور اس امید میں تھے کہ نظریں ملیں تو اپنے باقی پیسوں کی یاد دلائیں۔ بار بار اُن کا ہاتھ اماں کہہ کر اُٹھتا اور گر جاتا۔ اینگلو انڈین لڑکیاں بھی دلچسپی سے اب گندم چچا کی حرکات کو دیکھ رہی تھیں جیسے جیسے فاصلہ بڑھتا گیا۔ گندم چچا کی بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا گیا ان کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو چکی تھیں۔ مجھے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر بڑبڑائے

اماں یار پیسے نہیں دے رہا ہے۔

"ابھی ریزگاری آ جائے گی تو دے دیگا۔" ہم نے مسکراتے ہوئے کہا "ادھر دیکھو وہ ہے مشہور زمانہ جالیوں والی مسجد" مگر گندم چچا تو اس وقت کسی اور ہی دنیا میں گم تھے۔ جا۔لی۔یاں ہاں جالیاں انھوں نے بس کی کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

آئیڈیا تو عمدہ ہے لگوالی جائیں تو کھڑکی کے شیشے محفوظ رہیں گے۔ ہم چپ ہو گئے۔ اب گندم چچا کی قمیص پسینے سے تر ہو چکی تھی۔

وہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے

"انور صاحب لال دروازہ کتنی دور ہے؟"

"بس دوسرا اسٹینڈ لال دروازہ ہی ہے۔"

"اوہ" گندم چچا کراہ اٹھے۔ جیسے اُن پر کسی نے تیزاب چھڑک دیا ہو۔ کافی اونچا نیچا ہونے کے بعد دیکھا تو کنڈکٹر بس کے اگلے دروازے کا ہینڈل پکڑے کھڑا تھا۔ گندم چچا غصے کے عالم میں مٹھیاں بھینچے آگے بڑھے۔ میں ابھی اس کی طبیعت درست کیے دیتا ہوں۔ موقعہ کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ہم بھی چلائے اماں پاگل صاحب پیسے اُس نے ہمیں دے دیے ہیں میرے پاس ہیں مگر گندم چچا کی قوت سماعت نہ صرف برداشت کے باہر ہو چکی تھی بلکہ ان پر جنونی کیفیت بھی طاری ہو چکی تھی۔ اُدھر پاگل کے نام پر مسافر بھی سہم کر گندم چچا کو دیکھنے لگے تھے۔ غصے کے عالم میں انھوں نے ایک مسافر کو ایک طرف دھکا دیا تو دوسرے کو دوسری طرف اتنے میں بس سٹاپ پر جیسے ہی بس رکی گندم چچا ہائے ہائے کرتے ہوئے کنڈکٹر کی طرف لپکے۔ کنڈکٹر بھی مستعدی سے بس سے نیچے اتر گیا۔ اماں اماں کہتے ہوئے ہم بھی گندم چچا کے پیچھے لپکے۔ گندم چچا جیسے ہی بس سے کودے ہم بھی اُن کے پیچھے پیچھے کود پڑے۔ اُدھر کنڈکٹر بھاگ کر پچھلے دروازے سے بس کے اندر اور کنڈکٹر کے وسل دیتے ہی بس چل دی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ بس کے پیچھے گندم چچا بے تحاشہ بھاگے جا رہے تھے اور گندم چچا کے پیچھے ہم۔ گندم چچا کے پیچھے ہمیں بھاگتے ہوئے دیکھ کر لوگوں نے سوچا کوئی جیب کترا بٹوہ مار کر بھاگ رہا ہے پھر کیا تھا چشم زدن میں لوگوں نے گندم چچا کو ہمارے پیچھے پہنچتے گندم چچا ہجوم کے بیچ میں

باقی ہے

آم کے آم

انور سدید

ادب کی طرف رام لعل نابھوی کی پیش قدمی کا
سلسلہ بھی عجیب ہے۔ وہ جب نوجوان تھے تو زندگی کا
مشاہدہ اور سرکاری ملازمت کرتے رہے لیکن جب
ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو انھوں نے ادب کو اپنی
زندگی کی سب سے بامعنی سرگرمی بنالیا۔ اس دور میں
انھوں نے زندگی بھر کے مشاہدات پر نظر ڈالی تو کئی
بوالعجبیاں اُن پر آشکار ہوتی چلی گئیں اور وہ اُن پر بے
اختیار قہقہہ زن ہو گئے۔ یہ اُن کا کرم ہے کہ جو قہقہے اپنے
گھر کے ڈرائنگ روم میں لگائے تھے اُن کو خود اپنی
ذات تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ ان تبسم تاروں کو الفاظ
کا جامہ بھی پہنا دیا اور پھر "خفیف تبسم" کے عنوان سے
کتابی صورت بھی دے دی۔

مزاج کی تخلیق، رام لعل نابھوی کی زندگی کا موڑ نہیں
بلکہ یہ وہ لمبی سڑک ہے جس پر نابھوی صاحب عمر بھر سفر
کرتے رہے۔ پہلے وہ حالات واقعات و حادثات کو
دیکھ کر بس خاموش ہو جاتے تھے۔ اب وہ ان واقعات
کو ضبطِ تحریر میں بھی لانے لگے۔ اور ان مزاحیہ تصویروں
کو دیکھنے کا موقع عوام کو بھی دینے لگے۔ ہمارے ہاں
مزاحیہ نگاری بذاتِ خود فن کی ایک منزل ہے اور
بیشتر ادیب اس میں طمانیت محسوس کرنے لگتے ہیں۔
لیکن، رام لعل نابھوی کا مقصد قہقہہ بیدار کرنا اور
عوام کی ہنسی کو برانگیختہ کرنا نہیں تھا۔ وہ تو انسان
کو اپنے مشاہدات کی حسین لطافتوں اور لذت انگیز
حیرتوں میں شریک کرنے کے آرزومند تھے۔ چنانچہ
ان کے داخل میں جو آسودہ فکر انشائیہ نگار سو رہا تھا
وہ ایک روز اچانک بیدار ہو گیا۔ اور ہم نے
دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک "پوسٹ کارڈ" تھا۔ جو
بظاہر دبیز سے مٹیالے رنگ کے کاغذ کا ایک مستطیل
سا ٹکڑا تھا لیکن وہ اس کے داخل سے ایک زندہ
شخصیت کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور
وہ کہہ رہے تھے کہ

"پوسٹ کارڈ بہت مسکین طبیعت کا مالک ہوتا ہے
لیکن کبھی کبھی اسے شرارت سوجھ جاتی ہے۔ پھر وہ
سفر کرنے کی سوچتا ہے اور میز پر سے کھسک کر
دوسرے تھیلے میں چلا جاتا ہے۔ ملکوں ملکوں نہ سہی
شہروں شہروں گھومتا ہے۔ مختلف ڈاکخانوں کی سیر
کرتا ہے۔ اِدھر وہ کھسکا۔ اُدھر انکوائری شروع
ہو جاتی ہے۔ شرارت تو پوسٹ کارڈ کی ہوتی ہے۔
پھنس جاتے ہیں ڈاکخانے کے ملازم۔ پوسٹ کارڈ
سب دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اسے کوئی سزا نہیں ملتی۔
وہ تو چپ چاپ تماشا دیکھتا ہے۔ یہ اُس کی توانائی
ہے"

میں رام لعل نابھوی کے انشائیوں کا شاید سب سے
پرانا قاری ہوں۔ وہ جب ملازمت سے ریٹائر ہو کر اپنے
گھر چلے گئے تو یوں ہی ایک بے نام سی خواہش پیدا ہوئی کہ
اب رام لعل نابھوی کو بھی کی طرح لمحۂ فراغت
حاصل ہے اور وہ اپنے ڈرائنگ روم کے صوفے پر
دھوتی باندھ کر اور حقہ سلگا کر اپنے حاصلِ حیات پر
طائرانہ اور غائرانہ نظر ڈال سکتے ہیں۔ اپنے ساتھ
خود کلامی بھی کر سکتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اپنی اس
ڈھیلی ڈھالی۔ آزاد فکر اور آوارہ خرام خود خیالی کو لکھنے
پر آمادہ ہو جائیں اور ہمیں بھارت سے ایک انشائیہ

نگار مل جائے۔ اب میں یہ نہیں سمجھتا کہ یہ لمحہ دعا کے مستجاب ہونے کا لمحہ تھا یا رام لعل نابھوی کے داخل سے انشائیہ نگار تو بل کے جن کی طرح نکلنے کے لئے بے تاب ہو گیا تھا کہ مجھے ان کا پہلا انشائیہ ملا۔ میں نے پڑھا تو سب سے پہلے سجاد نقوی کو اطلاع دی۔ انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کو بتایا اور پھر آپس میں ہم نے مسرت کا باہمی اظہار کیا کہ نابھا جیسے دور افتادہ مقام پر ایک شخص ڈاکٹر جانسن کی متعین کردہ حدود کو نہ صرف قبول کر رہا ہے بلکہ ایسے انشائیے لکھ رہا ہے۔ جن میں خیال کو کروٹ مل جاتی ہے۔ حقیقت ایک نئے مدار میں سفر کرنے لگتی ہے اور قاری حیرت سے دیکھنے لگتا ہے کہ حقیقت کی تصویر کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

"آم کے آم" رام لعل نابھوی کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں سولہ متنوع انشائیے اور ایک ابتدائیہ شامل ہے۔ میں ان میں سے بیشتر انشائیوں کو مختلف رسائل میں پڑھ چکا ہوں لیکن اب یہ انشائیے کتابی صورت میں سامنے آئے ہیں تو انھیں دوبارہ پڑھ کر پر لطف مکرر کے مزے لیے گذرا ہوں۔ رام لعل نابھوی کی خوبی یہ ہے کہ وہ دوستوں کو اپنی خلوت میں داخل ہونے کا موقع دیتے ہیں تو محض قہقہوں کو ہی نہیں اچھالتے بلکہ ان کے ساتھ برابر کی سطح پر تبادلۂ خیالات بھی کرتے ہیں۔ باہمی گفتگو کے اس مرحلے پر ہی ان کے ہاں انشائیہ تخلیق میں ہے "مسکرانا" "انتظار" "پوسٹ کارڈ" اور "حیرت" وغیرہ انشائیے رام لعل نابھوی کے فن کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ وہ ایک اچھے مزاح نگار کی طرح حقیقت کا معروضی زاویہ پیش نظر رکھتے ہیں تو اپنی تازہ کاری سے پڑھنے والوں کو حقیقت کی موضوعیت سے بھی آشنا کرا دیتے ہیں۔ چنانچہ جمیل آذر نے ان کے "انشائیہ انتظار" کو خیال کا عشائیہ قرار دیا ہے۔ یہ عشائیہ چھوٹے چھوٹے متوازن جملوں سے مرتب ہوا ہے اور کومل لہروں کے متوازن بہاؤ سے ایک فرحت انگیز اور لذت افزا کیفیت پیدا ہو گئی ہے

"انتظار شعلے کی طرح لپک کر ختم ہو جائے تو آپ مسکرا اٹھتے ہیں۔ انتظار گیلی لکڑی کی طرح سلگنے لگے تو آپ کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ آپ اپنی مٹھیاں بھینچ لیتے ہیں۔ رنج اور غم میں ڈوبے ہوئے اور غصہ میں بھرے آپ کے کانوں کی لویں سرخ ہو جاتی ہیں۔ آپ ٹیلی فون کا موڈنگا بار بار اٹھاتے ہیں۔ سگریٹوں کے مرغولے ہوا میں چھوڑتے ہیں۔ کمرے میں بے چینی سے گھومتے ہیں اور بیر [illegible] ہیں۔ کبھی کرسی سے صوفے پر اور کبھی صوفے سے موڑھے پر جا بیٹھتے ہیں۔ انتظار کونے میں کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔ آپ انتظار کرتے جائیں۔ انتظار یہی تو چاہتا ہے۔

(انشائیہ "انتظار")

رام لعل نابھوی کے انشائیوں میں عدم کو حقیقت سے ثابت کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔ وہ ان گوشوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جہاں نان جویں کے کی نظر نہیں جاتی۔ وہ سچ کے پردے سے ایک اور سچ کو اجاگر کرتے ہیں اور پھر اس پر قاری کو انکشاف حیرت سے آشنا بھی کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

"دنیا میں دو حقیقتیں ہیں۔ روشنی اور تاریکی خیر و شر۔ سایہ تاریکی کا ایجنٹ ہے۔ جب تاریکی میں جاتا ہے تو اس میں ضم ہو جاتا ہے اور نظر نہیں آتا۔ روشنی ہو تو نظر آتا ہے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ روشنی میں کوئی چیز بھی ہو۔ دراصل سایہ شے کے بطن میں ہے۔ شے تاریکی میں رہے تو یہ باہر نہیں آتا۔ روشنی میں آئے تو باہر آ جاتا ہے۔"

(سایہ)

"حیرت کا جملہ تین قسم کا ہوتا ہے۔ معمولی۔ سمنت بھرپور۔ پہلی حالت میں آنکھ نصف کھلتی ہے۔ منہ نصف کھلتا ہے۔ ہاتھ اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ کچھ لمحوں کے بعد انسان اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ دوسری حالت میں آنکھیں جب ایک بار کھلتی ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اب بند نہیں ہوں گی۔ دہن مبارک کھلتا ہے تو لگتا ہے کہ کچھ بھی ہو یہ اسی طرح کھلا رہے گا۔ پورا جسم ایک لمحہ کی تو ... پر آ کر ٹھہر جاتا ہے یہ عارفانہ حیرت ہے۔ اگر اسی حیرت کی زد میں آیا ہوا شخص بڑے کے نیچے سے اٹھنے میں کامیاب نہ ہو تو جہالی سطح پر حاصل کر لیتا ہے"

(حیرت)

"گالی جب آنا چاہتی ہے۔ بلا روک ٹوک آجاتی ہے۔ جہاں چاہتی ہے بلا کسی سے پوچھے چلی جاتی ہے جتنی دیر ٹھہرنا چاہے ٹھہر جاتی ہے۔ چاہے معمولی لڑائی کرا دے۔ چاہے سر پھڑوا دے۔۔ گالی محبت اور نفرت دونوں سے پیدا ہوتی ہے۔ محبت کی گالی میں دعا۔ تعریف ہوتی ہے۔ خلوص ہوتا ہے۔ ہلکی سی سرزنش ہوتی ہے۔ نفرت میں بددعا اور ذلت ہوتی ہے"

(گالی)

آپ نے دیکھا کہ یہ سب ٹکڑے حقیقی — زندگی کی قاشیں ہیں۔ لیکن یہ غیر منظم مواد نہیں۔ رام لعل نابھوی نے ہمیں ایک کنارے پر کھڑے ہو کر دوسرے کنارے کا منظر دکھایا ہے اور یوں زندگی کے خواب کو ... نئی تعبیر دی ہے۔ یہی انشائیہ کا فن ہے اور اسی فن کو رام لعل نابھوی نے اپنی فطری حیرت سے کچھ اور بھی لطف انگیز بنا دیا ہے۔ انشائیوں کی یہ کتاب ڈاکٹر وزیر آغا کے ممنون ہے۔ ابتداء میں انشائیہ کے فن پر بحث کی ہے جو فی النفسہ خیال افروز ہے اور انشائیہ کی بحث کو ... خیز انداز میں قاری کے سامنے لاتی ہے۔

بقیہ: بُذدم چچا، مقابلہ ولی گجراتی

لات گھونسے کھا چکے تھے اور مشتے نمونہ از خروارے ہمارے بھی لگ چکے تھے۔ ہجوم چھٹا تو ہم نے دیکھا کہ بُذدم چچا اکڑوں گھٹنوں میں سر چھپائے بیٹھے تھے۔ ان کی اچکن تار تار ہو چکی تھی۔ ہمیں جو دیکھا تو ٹھری مری آواز میں بولے "تو کہاں آ گئے ہم ؟"

بُذدم چچا یہ ہی تو ہے لال دروازہ بے خیالی میں ہماری زبان سے نکل گیا۔ بُذدم چچا نے اکڑوں بیٹھے بیٹھے ہی آس پاس کی تمام بلڈنگوں کے دروازے کنکھیوں سے دیکھ ڈالے اور غصّے کے عالم میں بیٹھے بیٹھے چیخے۔ کہاں ہے لال دروازہ ؟"

"ماں یہ احمد شاہ بادشاہ" ابھی ہم جملہ بھی پورا نہ کر پائے تھے کہ بُذدم چچا غضبناک ہو کر کھڑے ہو گئے۔ احمد شاہ کی تو ایسی کی تیسی۔ تم نے پھر مجھے چچا کیوں کہا۔ قسم خدا کی اگر دوسری مرتبہ پھر تم نے چچا کہا تو اسی لال دروازے میں تمہاری چھٹی قبر بنوا دوں گا۔

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گردوپیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
- ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف و شفاف کیوں نہ رکھیں جنہیں ہم سب استعمال کرتے ہیں۔
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں اور درحقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گردوپیش کو صاف و شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے۔ جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلے میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں آپ صرف اتنا خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف و شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ صرف آپ کی خدمت کے لئے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے ادھر ادھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑے دان میں پھینکا جائے۔ آپکا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیگا۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھئے

ناردرن ریلوے

"چپکلی"

ڈاکٹر اُدے سرن ارمان (بلاری)

رات میں قریب ہی کے ایک مندر سے برابر آرہی
کسی عورت کے چیخنے کی دل ہلا دینے والی آواز نے مجھے
یکایک سوتے سے اُٹھا دیا۔ میں نے گھڑی دیکھی تینوں
سوئیاں رام سیتا اور لچھمن کی طرح کیو میں کھڑی تھیں
میں بیٹھ گیا اور آہ لینے لگا۔ چیخ پکار جاری ختم ہوتے
گراموفون کی طرح مدھم پڑ گئی تھی۔ میری نیند کوسوں دور
جا چکی تھی۔ میں پاس والے مندر کے پجاری پنڈت
بھولا ناتھ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سوچنے
لگا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ میں نے اُن کے بارے میں
آج تک کبھی سوچا برا ہی سوچا جب کہ وہ ایک اچھے بھلے
پجاری تھے مگر میں نے اس کا بھی دھیان نہیں کیا —
[illegible] کے بارہ بجے کا وقت۔ اُن کا
[illegible] اور غیر شادی شدہ ہونا ان تمام باتوں نے ایسا
سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اب میں بے تاب ہو گیا [illegible]
تمام عورت کی درد کو جانے [illegible] سے درد کا میار دار
[illegible] تھا کسی مضطر [illegible] پجاری درد کی طالب ہوتی
[illegible] نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ میں
[illegible] لحاف ہٹایا۔ رائفل اٹھائی۔ ابھی دروازہ
سے باہر قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ دل نے پھر ٹوکا کسی
کی مدد کو گھر سے باہر بے وقت جانا بھی تو خطرناک
ہو سکتا ہے کسی پولیس والے نے دیکھ لیا تو ڈکیتی میں
پھانس لے گا۔ میں ٹھٹھر گیا۔ اور چھپکلی کی کٹی دم کی
طرح تڑپتا رہا۔ رائفل ایک طرف رکھ دی اور چپکے
سے لحاف میں سرک گیا۔ پولیس کے خوف نے مجھے اچھا
کام کرنے سے روک دیا تھا میں ٹھنڈے ہوتے
لحاف کو چاروں طرف سے سمیٹتے ہوئے سوچنے لگا۔

اور پولیس کے تمام اقدام پر سوچنے بچارنے کے بعد پھر
پنڈت جی کے بارے میں سوچنے لگا۔
اب میں پنڈت جی سے نفرت نہیں کر رہا تھا بلکہ
اُن پر ناز [illegible] ہو رہا تھا۔ ابھی چند ہی منٹ ہوئے
ہوں گے کہ میری [illegible] نے کروٹ بدلی مجھے بیٹھے دیکھ کر
اس نے فوراً پوچھا "آدھی رات میں بتی جلائے کیوں
بیٹھے ہو؟"
میں نے بہانا تراشا "میں نے ایک ڈراونا خواب
دیکھا ہے ابھی [illegible] کے بارے میں سوچ رہا تھا ابھی سوتا
ہوں۔" یوں کہتے ہوئے میں لیٹ گیا۔ آنکھیں بند
کر لیں مجھے پورا اطمینان تھا کہ بیوی میری بات سے
مطمئن ہو گئی تھی۔ اسی لئے اس کو جلدی نیند آگئی
ویسے بھی وہ مجھ سے ہمیشہ پہلے ہی سو جاتی تھی اور میں
بہت دیر بعد سوتا تھا۔ میں نے کافی کوشش کی مگر نیند
نہیں آئی۔ میں نے بیوی کے خوف سے ہاتھ پیر بالکل
نہیں ہلائے مگر سر چکرا برابر رہا مجھے ان پاکھنڈی
دھرم کے ٹھیکیداروں سے پہلے ہی رغبت نہیں تھی
اب اور بھی متنفر ہو گیا جو لوگ بھگوان کو دھوکا دے
سکتے ہیں وہ انسان کو دھوکا کیوں نہیں دے سکتے۔
اب تک میرے دل میں پنڈت جی کی طرف سے گندے
اور بھدے بچاروں کی ایک بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ اور
کمی کے بجائے بڑھ ہی رہی تھی تبھی دل کی آڑ سے
ایک خیال نے سر اٹھایا۔ تیس سال کے جوان پنڈت
جی نے جو کہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے سماج کے
اصولوں کو توڑ کر کوئی پاپ بھی کر لیا ہو تو بھی کوئی بات
نہیں ہے آدمی کی کچھ ضرورتیں ایسی بے لگام ہوتی

ہیں کہ اُن پر قابو نہیں پایا جاتا اور آدمی بہک جاتا ہے ڈگمگا جاتا ہے۔

امیر لوگ تو سب طرح سے سکھی ہوتے ہوئے بھی دوسری عورتوں کی آبرو پر منڈلاتے رہتے ہیں پھر بھی اُن کی دیوانی حسرتیں شانت نہیں ہوتیں۔ اتنے پر بھی کوئی اُن کی طرف انگشت نمائی کرنے کی ہمت نہیں کرتا اس طرح سوچتے سوچتے میں پھر اُٹھ بیٹھا میں نے سمجھا تھا کہ اب بیوی سو چکی ہوگی۔ مگر فوراً اُٹھ بیٹھی اور بولی "کیا پھر کوئی بھیانک سپنا دیکھ لیا؟"

اب کی بار میں نے بتی نہیں جلائی تھی مگر پھر بھی پکڑا گیا میں نے فوراً بات بنائی "میں لیٹرین جا رہا ہوں" یہ سنتے ہی بیوی پھر خاموش ہو گئی یہ تو ایسا کام ہے جس کو کوئی بھی نہیں روک سکتا میں کچھ وقت بتا کر لوٹ آیا اور چادر اوڑھ کر مرے ہوئے سانپ کی طرح پڑا رہا سوچتے سوچتے کب نیند آ گئی پتہ نہیں مگر جب آنکھ کھلی تو گھڑی کی دونوں سوئیاں صلیب کی مانند ہاتھ پھیلائے ہوئے تھیں۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ میں اُن کی بولیاں ایسے سن رہا تھا جیسے کہ میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ میری بیوی بھی اُٹھ بیٹھی تھی وہ مجھے اُداس دیکھ کر بولی "کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے کہا "میں اِن چڑیوں کی بابت سوچ رہا ہوں تم سمجھتی ہو یہ کیا کہہ رہی ہیں؟"

وہ بولی "میں تو آدمیوں کی بولی بھی نہیں سمجھتی اِن کی کیا سمجھوں گی تم سمجھتے ہو تو بتاؤ؟"

"ہاں میں تو سمجھتا ہوں سنو دیکھو مرغی سے مرغ کہہ رہا ہے "جیوں کا تیوں۔ جیوں کا تیوں" یعنی روزِ ازل سے یہ انسان کو صبح اُٹھنے اور الغفور کا نام لینے کا اُپدیش دیتا آ رہا ہے مگر اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا جیوں کا تیوں ہے" میری بات سنتے ہی بیوی کا تیور چڑھا کر کہتی ہوئی چلی گئی "یہ تمہاری باتیں وہی سن سکتا ہے جس کے پاس کوئی کام نہ ہو۔ تم بے وقوف بنانے میں خوب ماہر ہو" اُس روز بھی ایسے ہی کہہ رہے تھے کہ گاڑی کیا کہتی ہوئی بھاگتی ہے؟"

میں نے اُس کو روکتے ہوئے کہا "کیا میری بات غلط تھی گاڑی جھک جھک کہتی نہیں دوڑتی ہے دُنیا کا کون سا آدمی ہے جو بھاگتے وقت اور اوپر چڑھتے وقت جھکتا نہ ہو، آگے بڑھنے والے یعنی ترقی کرنے والے کو جھک کے چلنا یعنی انکساری برتنا قطعی ضروری ہے" یہ سنتے ہی وہ مسکراتی ہوئی رسوئی میں چلی گئی میں نے بھی بالٹی اُٹھائی اور نل پر پانی لینے چلا گیا مگر پنڈت جی میرے دماغ میں اب گھوم رہے تھے۔ رات کو سوتے وقت میں نے طے کیا تھا کہ دن نکلتے ہی پنڈت جی سے اُس عورت کے چیخنے کا معاملہ معلوم کروں گا مگر ہوش اور جوش میں کئے گئے فیصلوں میں فرق ہوتا ہے اب میں نے یہ ارادہ ٹال دیا تھا کیونکہ یہ بات پوچھنا تہذیب سے خارج ہے کسی کی غلطی اُس کے سامنے میں ہی کیوں رکھنے جاؤں میری ہی طرح اور لوگوں نے بھی تو چیخ پکار سنی ہوگی سب میری ہی طرح چپ ہو کر تھوڑے ہی بیٹھ جائیں گے کوئی نہ کوئی منہ پھٹ تو اُن سے پوچھ ہی بیٹھے گا اور بھید کھل جائے گا میں نے سر جھٹکا اور دماغ ہلکا کر لیا مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی میرے دل و دماغ میں کوئی نہ کوئی خیال اُبھر ہی آتا تھا جیسے برف سے ستائی ہوئی شاخوں پر جہاں تہاں کونپلیں نکل آتی ہیں۔

ایک پاگل عورت جو کئی ماہ سے ہمارے محلے میں گھوما کرتی تھی ایک دن میں نے اُس کو قریب سے دیکھا اُس کا پیٹ غیر معمولی اُبھرا ہوا تھا میرا ماتھا ٹھنکا مجھے معاً پنڈت جی کی بات یاد آ گئی۔ پورے پانچ ماہ گذر چکے تھے۔ مجھے میرے تمام مشکوک سوالوں کا جواب مل گیا میں نے اُس کو سر کھجاتے ہوئے وہیں چھوڑ کر گھر کی راہ لی اور بیوی کو اُس رات کی ساری روداد کہانی سنا دی جس کو میں نے محبت نامہ کی طرح رکھا تھا وہ سنتے ہی بولی اب پرلے (قیامت) ہونے والی ہے۔"

میں نے کہا "پرلے ایسے ظالموں سے تھوڑے ہی ہو جائے گی" وہ میرا منہ دیکھ رہی تھی "پرلے تو جب ہوگی جب ایسے مظلوموں پر ترس کھانے والے نہیں رہیں گے" میں نے ان الفاظ کا ردِ عمل جاننے کے لئے اُس کے چہرے کا جائزہ لیا وہ کافی گمبھیر تھی۔ اُس نے سنجیدگی سے کہا "کون کرے گا ایسے لوگوں پر دیا؟"

"وہ جو دھارمک ہوگا جس کے دل میں مظلوم اور مجروح کا درد ہوگا" میں نے برجستہ کہا۔ وہ اب بھی چپ تھی اور شاید سوچ رہی تھی اس طرح کے لوگوں کے ساتھ برتی جانے والی ہمدردی کے نتائج کے بارے میں میں نے اس کی زبان کھلے بغیر ہی آگے کہا "ماتا ذرا تم یہ سوچو کہ اگر تمہاری بیٹی پاگل ہو جاتی اور اس کو اُس کے سسرال والے گھر سے نکال دیتے تو تم کیا کرتیں؟" یہ سنتے ہی وہ ایسے چونکی جیسے اُلو نیا سونگھ کر رہ گئی اور بولی "میں تمہارا مطلب سمجھ گئی ہوں مگر بھلائی کا انجام اکثر اُلٹا ہوتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں اور ہر بھلا مانس اس کو سمجھتا ہے مگر کبھی بھلائی سے باز نہیں آتا۔ بدنامی کا خوف کئے بغیر ہی بھلائی کرتا رہتا ہے" وہ مسکرائی اور بغیر کچھ کہے میرے ساتھ چل دی ہم دونوں پگلی کو زبردستی گھر کھینچ لائے اور کمرے میں بند کر دیا۔ اُس کو نہلایا دھلایا کپڑے پہنائے کھلایا پلایا محبت کا برتاؤ کیا ایک ڈاکٹر کا علاج چالو کر دیا اور اُس کی رپورٹ تھانے میں درج کرا دی۔ اس وقت میرا صرف ایک بچہ تھا میں دفتر چلا جاتا اور میری بیوی اپنے بچے اور پگلی پر نظر رکھتی۔ شام کو ہم لوگ پھر اس کو ایک کمرہ میں بند کر دیتے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ پگلی میری بیوی کے ہاتھ سے دودھ پینے لگی جس میں آسانی سے دوا ملا کر دے دی جاتی تھی۔ پاس پڑوس کے لوگوں کو اُس کے ساتھ ہمارا یہ برتاؤ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی۔ کچھ لوگ تو ہماری تعریف کرتے تھے جو افادیت بخش ثابت ہوتی تھی کچھ کہتے تھے کہ ہم اس طرح اپنے کئے ہوئے گناہوں کو چھپا رہے ہیں ورنہ کون اس زمانے میں بلا مطلب کسی کے ساتھ ایسا کرتا ہے کوئی اس پگلی کو ہماری رشتہ دار بتاتا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ بات تمام بستی میں پھیل گئی اور ایک دن پنڈت جی بھی ہمارے گھر آئے اور بولے۔

"منشی جی اس پگلی کو اپنے گھر تو رکھ رہے ہو مگر کسی دن قانون کے شکنجے میں مت پھنس جانا" میں نے کہا۔ "پنڈت جی کوئی بھی قانون شرارت کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور ہم اچھا کام کر رہے ہیں۔ اس لئے کوئی ہمیں مجرم کیوں ٹھہرائے گا" یہ سنتے ہی وہ مسکرائے اور بولے

"منشی جی آپ واقعی شریف آدمی ہیں اور اپنی شرافت کا ثبوت دے رہے ہیں آپ کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ بُرا تو وہ ہے جس نے اس کی عزت لوٹی ہے اُس کو اس کرنی کا پھل بھرنا پڑے گا۔"

"جی ہاں پنڈت جی آپ ٹھیک کہتے ہیں" میں نے کہنا شروع کیا "لیکن پھولوں کے رنگ اور آدمیوں کے ڈھنگ کی طرح گناہوں کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں اگر کسی شادی شدہ نے اس کی عزت لی ہے تو واقعی یہ ایک گناہ ہے جرم ہے اور اگر غیر شادی شدہ کا یہ فعل ہے تو میں اس کو پاپ نہیں مانتا بلکہ حالات کی مجبوری میں بہکا ہوا قدم مانتا ہوں۔ آدمی کی بہت سی ضرورتیں ہوتی ہیں جنسی خواہش بھی ایک خاص ضرورت ہے کوئی اس پر حاوی ہو جاتا ہے کوئی مغلوب ہو جاتا ہے اور توازن کھو بیٹھتا ہے۔ ہمارے سماج میں طرح طرح کے کلب ہیں جن میں جا کر امیر لوگ جنسی خواہشات کی تسکین کرتے ہیں تفریح کرتے ہیں اور دولت کا مزہ لیتے ہیں جبکہ اُن کے گھروں میں بیویاں بھی ہیں لیکن غریبوں کے لئے کسی نے کچھ نہیں سوچا۔ کچھ لوگ تو غیر شادی رہ کر ہی ساری زندگی گزار دیتے ہیں اور اُن کو عورت کا لمس

تک نصیب نہیں ہوتا۔ قانون کی نظر میں ایسے لوگ مجرم ہوں مگر میں تو دوسرا ہی نظریہ رکھتا ہوں۔ یہ مجرم نہیں بلکہ مجبور ہیں۔ یہ سن کر پنڈت جی بولے "آپ کیسی درست صحیح کہہ رہے ہیں اور مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ اس کے بعد وہ مہینے میں ایک دو بار ضرور آنے لگے اور اس پگلی کی خیر و عافیت پوچھ کر چلے جاتے تھے۔

ہم دونوں اس کا علاج بھی کرا رہے تھے اور اس کو خوش بھی رکھتے تھے۔ ہمارے ... کے برتاؤ نے اس پر جادو کر دیا۔ ڈاکٹر کا کہنا صحیح ثابت ہوا کہ یہ نازک مزاج ہونے کی وجہ سے گھریلو نامناسب حالات کی ضرب کاری کو برداشت نہیں کر سکی اور دماغی توازن کھو بیٹھی ہے پاگل نہیں ہے بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ اور وہ ٹھیک ہو گئی۔ ہم نے اس کا نام اور پتہ بھی پوچھ لیا۔ پریا اس کا نام تھا اچھے خاصے گھرانے میں بیاہی گئی تھی سسرال والے لالچی لوگ تھے پریا کے باپ نے جہیز میں ہر مانگ پوری کی مگر پھر بھی وہ لوگ دست دراز ہی رہتے تھے۔ پریا کے باپ نے ناقابل برداشت بوجھ کو بھی لڑکی کی خوشحالی کے لئے اٹھا لیا مگر سب بے سود ثابت ہوا دولت کے بھوکے عورت کی قدر نہیں کرتے۔ پریا کی ساس جب بھی کسی کی شادی سے لوٹ کر آتی اور وہاں جہیز میں اپنے یہاں ملی ہوئی چیزوں سے سوا دیکھتی تو پریا کے سامنے اس کمی کی شکایت کرتی یہ شکوے شکایتیں کبھی کم نہیں ہوئے اور پریا اپنے ماں باپ کی تنگدستی سے جو شادی کے بعد وجود میں آئی تھی پریشان رہتی ہی تھی یہ طعنے اس کو اور دکھی رکھتے تھے اس کے رات دن خار زار میں گزرتے چلے گئے۔ اور ایک دن وہ پاگل سی ہو گئی۔ اس کے کوئی بچہ بھی نہیں تھا جس کی وجہ سے گھر والے دوسری شادی کرنے کی باتیں کرنے لگے تھے ہو سکتے ہو تے وہ پاگل پاگل ہو گئی۔ ان لوگوں کو اس [illegible] موقع ملا انھوں نے اس کے مائکے والوں کو بھی خبر نہیں

کی اور علاج معالجے کے لئے پاگل خانہ میں بھی بھرتی نہیں کیا بلکہ گھر سے نکال دیا۔ یہ بتایا کہ اس نے ہوش میں آنے کے بعد اب ایشور نے اس کو ایک لڑکے کی ماں بھی بنا دیا۔

اس کے بعد ہم نے سوچا کہ پریا کو اس کے ملک کے پہنچا دیا جائے تاکہ وہ لوگ اس کے گزارے کے لئے سسرال والوں سے بذریعہ عدالت کچھ طلب کریں ہو سکتا ہے۔ بچہ دیکھ کر کچھ برتاؤ بدل جائے اور حالات سازگار ہو جائیں۔ ادھر ہمیں یہ بھی شک تھا کہ کہیں سسرال والے اس کا گلا نہ گھونٹ دیں، ابھی ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے۔ پریا اپنے بچہ کو دودھ پلا رہی تھی پیار کر رہی تھی سجی سنوری اوڑھے پہنے بہت خوبصورت دلہن معلوم ہو رہی تھی بھگوان نے اس کو رنگ روپ تو پہلے ہی سے دے رکھا تھا۔ اچانک پنڈت جی معمول کے مطابق آ پدھارے "کیا ہو رہا ہے"؟ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

"کچھ نہیں پنڈت جی" "آئیے بیٹھئے" پنڈت جی چارپائی پر اس طرح بیٹھے کہ پریا کا چہرہ ان کو صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں نے ان کے دیکھنے کا انداز دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا "پنڈت جی یہ وہی پگلی ہے"

ہاں منشی جی وہی ہے آپ نے اس کی زندگی بنا دی شرافت کا ثبوت دے دیا سماج میں ایسے ہی حساس لوگ ہو جائیں تو یہ سماج دنیا کو خوشحال بنا سکتا ہے اب تم کسی مناسب آدمی کے ساتھ اس کا بیاہ کر دو تمہارا بوجھ بھی اتر جائے گا اور ایک گھر بھی بس جائے گا۔ یہ سنتے ہی میری بیوی نے کہا جی آپ ٹھیک کہتے ہیں میں بھی منشی جی سے کہنے والی تھی۔ میں مسکرا دیا اس کے دل کی بات کو گیا عورت سوت کے ڈر سے زیادہ پریشان ہوتی ہے میں نے پنڈت جی کا دل ٹٹولتے ہوئے کہا

جی اس بدنصیب بدنام عورت سے کون شادی کریگا اگر آپ ہی اس کو اپنا لیں تو کیسا رہے کیونکہ آپ کی عمر بھی تو تیس کے پیٹے میں ہے "آپ کی شادی ابھی بھی ہوئی نہیں کیونکہ آپ کے پتا کا اچھوت اُدھار میں ہر کسی کے کھانا کھانے سے برادری نے حقہ پانی بند رکھا ہے ابھی پنڈت جی کچھ بولنے نہیں پائے تھے کہ بیوی نے جھٹ سے کہا وہ پنڈت جی بہت اچھا رہے گا ۔ تم برادری کا دھیان ہی مت کرو ۔ لڑکے کا رنگ ڈھنگ بھی آپ ہی پر گیا ہے بڑا ہونے پر اس کو سب لوگ آپ ہی کا بیٹا سمجھیں گے" یہ سنتے ہی وہ بولے "تمہاری باتیں حقیقت میں ٹھیک ہیں ۔ میں نے ایک پاپ تو کر لیا ہے جو اس پگلی کو اس رات پکڑ لیا تھا مگر" کہتے کہتے پنڈت جی ٹھٹھک گئے جیسے لومڑی کسی کی آہٹ پا کر جھاڑی میں چھپ جاتی ہے ۔ میں نے کہا مگر کیا ۔

"یہی کہ اگر میں اس کو اپنا لیتا ہوں تو لوگ مجھے مندر سے نکال دیں گے یہی ایک گزارے کا سادھن ہے وہ بھی چلا جائے گا"

"تو کیا ہوا میں تمہیں آریہ سماج مندر کا پروہت بنوا دوں گا" یہ سنتے ہی پنڈت جی پریا کی طرف پریم سے دیکھنے لگے پریا نے بھی نظر بھر دیکھا اور مسکرا کر سر جھکا لیا ۔ خدا کا شکر ہے ہم لوگ کامیاب ہو گئے ۔

●

بابِ انتقاد

اوم پرکاش بجاج

"مسندِ صدارت سے"

مسندِ صدارت سے" ۱۵ خطبات کا مجموعہ ہے جو ۲۷ر جنوری ۱۹۵۲ء سے لے کر ۷ر اگست ۱۹۸۲ء تک کے درمیانی وقفہ میں جناب ضیا فتح آبادی صاحب مختلف مقامات پر ہونے والے اُردو مشاعروں اور ادبی نشستوں میں پڑھے یا پڑھنے کے لئے لکھے ۔

یہ دراصل بقائے اُردو کے سلسلہ میں پچھلے تیس برسوں کا ایک منظر نامہ ہے ۔ ان خطبوں میں مصنف کے زورِ قلم کا اظہار ہمیں قدم قدم پر ملتا ہے ۔ ان تحریروں سے یہ ثابت کرنے کی بخوبی کوشش کی گئی ہے کہ اُردو محض مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ ہندوؤں سکھوں اور عیسائیوں کی بھی زبان ہے مختلف صوبوں میں اُردو اکاڈمیاں جہاں اچھا کام کر رہی ہیں کہ اُردو کی ترویج و ترقی ہو ۔ وہاں خویش پروری کی مرتکب بھی ہو رہی ہیں ۔ اس خطبوں میں اُردو مشاعروں کے افادی پہلو پر بھی [illegible] روشنی ڈالی گئی ہے اُردو کی جدید اور قدیم شاعری کے سلسلہ میں [illegible] وضاحت بھی کی گئی اُس کے حسن و قبح پر خاطر خواہ مواد بھی مہیا کیا گیا ۔

ان خطبوں کا ایک ہی قسم کا موضوع ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں خیالات کا اعادہ بھی ہو گیا ہے ۔ لیکن مصنف نے یہ اعادہ اپنے مخصوص انداز سے مختلف ڈھنگ اور رنگ سے کیا ہے اسلئے یہ ذوقِ سلیم پر گراں نہیں گزرتا ۔

زبان کے سلسلہ میں مصنف نے کتنی چابکدستی سے لکھا ہے ۔ زبان کا کوئی مذہب نہیں ۔ اس کا کوئی مالک بھی نہیں ہوتا چاہے کوئی ملک اسے اپنی زبان بنا لے نیز زبان کو کسی قوم ، فرقے یا خطے تک محدود نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ حقیقت بھی صداقت سے عاری ہے کہ اہلِ زبان کہلانے کے مستحق وہی حقدار ہیں جنہیں زبان آغوشِ مادر میں ملی ہو ۔ ایسی کتنی مثالیں آپ کو مل جائیں گی جہاں زبان پر عبور اور [illegible] سے حاصل کئے گئے ہیں بعض اوقات تو اکتسابی زبان مادری زبان کا منہ چڑاتی دکھائی دیتی ہے

فاضل مصنف نے اپنے مرحوم استاد علامہ عاشق حسین سیماب اکبرآبادی کی [illegible] کرتے ہوئے ان خطبوں کو لکھا ہے رواں دواں اُردو میں مضمون نے دلچسپی کے عنصر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔ یہاں اس خشک موضوع کا سب سے بڑا کمال ہے کہ پڑھنے والوں کو کہیں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی ۔

[illegible] ۸-۱ [illegible] اری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے طلب فرمائیے ۔

اور دھرتی کانپ اٹھی

قسط ۱۴

احمد حسین شمس ایڈوکیٹ (کشن گنج)

اور پھر داروغہ صاحب نے ایک بیان لکھا۔ میں بیان آپ داروغہ جی کے پاس تھانے میں دس بجے رات کو دے رہا ہوں اس وقت میرے ساتھ دو ساتھی ہری پرشاد اور سکھدیو بھی ہیں۔ ہم تینوں آج خدا گنج ہاٹ میں تعینات تھے قریب تین بجے دن کو مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت جس میں فلاں فلاں کو میں پہچانتا ہوں لاٹھی بھالا اور تلواریں لے کر اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے مسجد سے نکلی۔ مگر ایک نے بڑھ کر مجھ پر لاٹھی سے حملہ کیا اور میں چکرا کر زمین پر گر گیا وہ لوگ اتنے جوش و خروش میں تھے کہ ہم لوگ ڈر سے کچھ بول نہ سکے۔

اور پھر داروغہ صاحب نے وہ مخصوص زبان لکھی جو اطلاعات اول میں لکھی جاتی ہے سپاہی نے اپنے دستخط بنا دیئے۔

داروغہ صاحب نے چوکیداروں سے آٹھ لاشیں ایک بیل گاڑی پر رکھوائیں اور کل قیدیوں کو اپنی حراست میں لے کر تھانہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ شام ہوتے ہوتے گرفتار شدگان کی ایک بڑی تعداد گوپال گنج پہنچ گئی لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ قیدی تھانے کی حوالات میں رکھ دیئے گئے اور داروغہ صاحب اپنی آج کی ڈائری درست کرنے لگے۔

خدا گنج ہاٹ میں جب ہندو مسلمان فن سپہ گری دکھلا رہے تھے اسی وقت کشن لال اپنے ہاتھی کو لئے ہوئے حسین بخش کی کچہری میں لئے ہوئے آئے اور حسین بخش سے کہا حسین جلدی کرو تمہارے گھوڑے کہاں ہیں۔

"مسجد کے پیچھے دونوں گھوڑے بندھے ہوئے ہیں۔"

کشن لال نے فیلبان سے کہا "تم منگلو اور دلاور کو لے کر جلد مکان چلے جاؤ میں گھوڑے پر چلا جاتا ہوں۔"

کشن لال ہاتھی سے اتر پڑے اور پھر حسین بخش کے ساتھ تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے گھوڑے کی طرف چلے حسین بخش کی چھڑی مسجد ہی میں رکھی ہوئی تھی اس لئے وہ لپک کر مسجد کے اندر گئے وہاں دیکھتے ہیں کہ ایک کونے میں مولانا عنایت اللہ صاحب دبکے بیٹھے خوف سے تھر تھر کانپ رہے ہیں خوف اور دہشت ان پر اس قدر طاری تھی کہ ان کی زبان سے اللہ کا لفظ بھی ٹھیک سے ادا نہیں ہو رہا تھا میاں حسین بخش کو دیکھ کر انھوں نے کہا اللہ میری جان بچائیے۔ اگر بلوائی مسجد کی طرف آگئے تو پھر میری جان کی خیر نہیں۔"

"کیا ہوگا اگر مر گئے تو مذہب کے نام پر مرنے والوں کو جنت ملتی ہے حوریں ملتی ہیں بڑی بڑی آنکھوں والی۔"

"میاں صاحب مگر جان بچانا بھی تو فرض ہے۔"

"تو فرض کی تدبیر آپ کیجئے میں تو گھوڑے پر جا رہا ہوں" اتنا کہہ کر انھوں نے اپنی چھڑی لی اور تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے مسجد سے نکلے اور پھر دونوں دوست گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑوں کو سرپٹ چھوڑ دیا۔

راستے میں کسی قسم کی گفتگو نہ ہوئی دونوں سیدھے حسین بخش کے دروازے پر پہونچے ایک نوکر آیا اور گھوڑوں کی لگام تھام لی یہ دونوں گھوڑے سے اتر کر خاص کمرے میں جا بیٹھے۔ حسین بخش نے ایک نوکر کو آواز دی ایک دوسرا نوکر آیا اور ان دونوں کو پنکھا جھلنے لگا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔

جب کچھ سکون ہوا تو پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے میاں حسین بخش نے کہا "معاملہ تو طول کھینچ گیا۔"

"اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔"

"کچھ آدمی بھی جان سے مارے گئے۔"

"ہاں یہ تو برا ہوا مگر پنڈت جی اور مولوی صاحب تو خوش ہو گئے"

"یہ لوگ تو عقل کے اندھے ہوتے ہیں"

"مگر یہی لوگ تو ہمارے عزت کے محافظ بھی ہیں اگر مولوی اور پنڈت نہ رہیں تو ان غریبوں کو بھگوان اور خدا سے ڈرائے گا کون ان ناداروں کو قسمت کے سہارے جینے کا طریقہ کون سکھائے گا حسین بخش ہمارے بزرگ بھی بڑے عقلمند تھے کہ اس جماعت کی ایجاد کی ورنہ آج ان سیاسی لیڈروں نے تو ناطقہ ہی بند کر دیا ہوتا اور پھر کشن لال نے کہا "بھئی اب کچھ ناشتہ کرنا چاہیئے دن بھر کا بھوکا ہوں" حسین بخش نے اپنے نوکر سے ناشتہ لانے کو کہا۔

نوکر کے چلے جانے کے بعد حسین بخش نے کہا "مگر بھئی یہ مولوی عنایت اللہ بھی خوب آدمی ہے ایسی جوشیلی تقریر کی کہ مسلمانوں کا خون کھول اٹھا جنت کی حوروں کا جب ذکر کیا ہے تو بس خدا کی قسم مجھے تو عشرتی نظر آنے لگے نقشہ وہ پیش کیا گویا یہ مولانا چشم دید گواہ ہیں جنت کے وہ شرابیں وہ حوریں وہ غلمان! اجی واہ کیا پُرکیف جگہ ہوگی وہ بھی"

کشن لال نے کہا "اور ٹھاکر سچا نند نے بھی کچھ کم کرامات نہیں دکھلائی وہ بڑھ کر للکارا ہے ہندوؤں کو کہ سب دیوانے ہو گئے بھئی کمال کرتے ہیں یہ لوگ بھی"

"مگر یہ لوگ تو نفرت کے بیج بوتے ہیں"

"اچھا تو ان لاشوں کا کیا ہوگا"

کشن لال نے کہا "تم گھبراتے کیوں ہو اب مجھ سے [illegible] کی امید رکھو اب تو قتل کا مقدمہ دائر ہوگا پہلے صرف جیل کا خوف تھا اور اب پھانسی کا ڈر ہے جان وہ پیاری چیز ہے کہ روپئے کے ساتھ زمین بھی جائے گی مگر وہی ذرا عقل کو بروئے کار لانا ہوگا داروغہ صاحب کو ہاتھ میں اس وقت تک رکھنا ہے جب تک مقدمہ ختم نہ ہو جائے دلاور خان ہندوؤں کو شناخت کرے گا اور منگو مسلمانوں کو کیوں؟"

"تمہاری عقل کی میں داد دیتا ہوں بڑی اچھی سوجھ رکھتے ہو۔"

"اور پھر وہ مہینے کے بعد عشرتی تمہاری آغوش میں ہوگی۔"

کشن لال مسکرائے۔

حسین بخش کا چہرہ کھل اٹھا عشرتی کی خیالی تصویریں ان کے سامنے ناچ اور وہ جھوم اٹھے۔

کشن لال نے کہا "اس کے لئے ایک نئی عمارت بنوا دینی ہوگی اور اس مکان کا نام ہوگا۔ عشرت کدہ کیوں؟"

"اجی واہ کیا پتے کی بات کہہ دی تم نے بھئی۔ کشن لال جی تو چاہتا ہے تمہارا منہ چوم لوں۔ کیا کیا گل بوٹے کھلاتے ہو مگر اپنی داڑھی کو دیکھ کر ذرا شرمندہ ہو جاتا ہوں۔"

کشن لال نے کہا "ارے بھئی اسے صاف نہیں کرتے تو خضاب سے سیاہ ہی کر ڈالو۔"

"ہاں کوئی دوائی تو منگوائی ہوگی"

"ابھی ٹھہرو شادی کی بات پکی ہو لینے دو عشرتی تمہاری جوانی واپس لا دے گی"

"کیوں کشن لال اسے تم نے آنکھوں سے دیکھا ہے"

"کیوں نہیں پری ہے پری اور اس پر جوانی رام قسم تم جیت گئے حسین بخش"

اور حسین بخش کی بوڑھی آنکھوں نے دیکھا واقعی کوئی حور وش کوئی دوشیزہ ان کے سامنے بیٹھی توبہ شکن انگڑائیاں لے رہی ہے انھوں نے ایک دفعہ کشن لال کی طرف دیکھا اور زیر لب مسکرائے اور کشن لال کی [illegible] آنکھیں روپیوں کا انبار دیکھنے لگیں۔ (باقی)

درخواستیں مطلوب ہیں

دفتر اُردو اکادمی، دہلی میں مندرجہ ذیل عارضی آسامیوں کو پُر کرنا ہے

۱- انسٹرکٹر (شارٹ ہینڈ اُردو)

2 - انسٹرکٹر (ٹائپ اُردو)

قابلیت: ۱- کم از کم بی اے (اُردو بحیثیت مضمون)
2- ٹائپ و شارٹ ہینڈ کی رفتار 25 الفاظ اور ۱۰۰ الفاظ فی منٹ علی الترتیب

تجربہ: کم از کم 5 سال بحیثیت سٹینوگرافر

عمر: 25 سال سے کم

تنخواہ: ۷۰۰-25-425 کے سکیل کے ہمراہ دیگر الاؤنس جو دہلی انتظامیہ کے دفاتر میں رائج ہیں

درخواست: ہمراہ نقول اسناد مصدقہ ۳۱ جون 86 تک دفتر اُردو اکادمی میں دستی یا بذریعہ ڈاک رجسٹرڈ موصول کی جائیں گی -

نوٹ: عمر، تجربہ اور قابلیت میں کسی لائق اُمیدوار کیلئے رعائت دی جاسکتی ہے

دستخط/
سید شریف الحسن نقوی
مشیر، اُردو اکادمی، دہلی

Phone: 275602
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644 57
Regd-No D. (DN) 353
MAY 1986

شان ہند
سرور تونسوی

غلط قسم کے
لوگوں کے
ہاتھے نہ
چڑھئے...
ریل ٹکٹیں
دلالوں سے ہوشیار!
پبلک ریلیشنز
ناردرن ریلوے

فون نمبر ۲۷۵۶۰۲ - رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۱۲۴۲ رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۲۵۳

ہندو پرست ہوں۔ نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرہ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زر سالانہ ۲۴/- روپے

جلد ۴۷ جون ۱۹۸۶ء شمارہ ۶

غزل

ڈاکٹر تحقیر آستانی

پہلے سے اس دیار میں شام و سحر کہاں — وہ ہمنوا، وہ ہم نفس وہ ہم سفر کہاں

وہ دل نہیں رہا وہ نگاہیں نہیں رہیں — وہ قصہ ہائے شورشِ قلب و جگر کہاں

وہ ولولے، وہ جوش وہ بے تابیاں نہیں — وہ راستے، وہ چلمنیں، وہ بام و در کہاں

یہ صحبتیں، یہ قربتیں، یہ ہم کلامیاں — وہ دوریاں، وہ فاصلے، وہ نامہ بر کہاں

بے پردگی کے دور میں پردے کہاں دراز — اُس جھینپتی نگاہ کے تیر و تبر کہاں

پہلی سی آج وصل کی سرشاریاں نہیں — ویسے مریضِ عشق کہاں، چارہ گر کہاں

جیتے ہیں لوگ بے در و دیوار زندگی — جن سے کریں گے بات وہ دیوار و در کہاں

کرنا محال ہو گیا جب خود سے بات چیت — تنہا ہوں میں عمر کریں گے بسر کہاں

رہتے ہیں تو بہ تحقیر خلاؤں میں وقت کی — لے کر وہ جائیں گے دلِ بے بال و پر کہاں

مدیر/ناشر سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے اور سرورق کے صفحات کوہ نور ریلیاران دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

دہلی اردو اکادمی نے بجٹ کی روشنی میں

دلی انتظامیہ نے دلی اردو اکادمی کا بجٹ موجودہ مالی
میں تیس لاکھ روپیہ سے بڑھا کر پچاس لاکھ روپیہ کر دیا ہے
یہ بجٹ ہندوستان بھر کی اردو اکادمیوں کے سالانہ بجٹ
میزان کے لگ بھگ ہے دوسرے لفظوں میں جس کا مطلب یہ
ملک بھر کی جملہ اردو اکادمیوں کو اگر ترازو کے ایک پلڑے میں
جائے اور دوسرے پلڑے میں دلی اردو اکادمی کو تو سالانہ
کے معاملے میں دلی اردو اکادمی کا پلڑا پھر بھی جھکا رہے گا۔
دلی انتظامیہ کی اس فراخدلی پر ملک بھر کے اردو دوستوں کو یقینی
ر پر خوشی ہوگی اور وہ چاہیں گے کہ دلی اردو اکادمی دلی انتظامیہ
اس فراخدلی کا احساس ملک بھر کے اردو دوستوں کو حسب
ل طریقوں سے دلائے۔

۱- یو پی اردو اکادمی کا بجٹ پچیس لاکھ روپیہ ہے اور
لاکھ روپیہ اتر پردیش اکادمی اپنی مطبوعات کی فروختگی سے
ہر سال تقریباً انیس لاکھ روپیہ اپنی کارگزاری پر خرچ کرتی
تقریباً سوا لاکھ روپیہ سے سالانہ [illegible] کے انعامات [illegible]
شائع ہونے والی اچھی اردو کتب پر تقسیم کرتی ہے۔ اور
اردو اکادمی نے اپنے پچھلے سال کے تیس لاکھ روپیہ کے
سے صرف پچیس ہزار روپیہ اردو کی اچھی کتب پر
کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ دلی اردو اکادمی بھی ملک بھر میں
ہونے والی اردو کتب کو انعام کے لئے طلب کرے
سے کم نصف رقم کے انعامات دلی میں شائع ہونے والی
لئے جائیں اور نصف رقم دلی سے باہر شائع ہونے
الی اچھی اردو کتابوں پر انعامات کے طور پر تقسیم کرے اور اس
کے لئے کم از کم ایک لاکھ روپیہ مخصوص رکھا جانا چاہئے۔

جبکہ اردو اکادمی [illegible] آتا ہے تو ایسی صورت
میں ایک لاکھ روپیہ اردو کی اچھی کتابوں پر انعام کی صورت میں
تقسیم کرنا کوئی احسان نہیں ہوگا۔ اس ضمن میں مزید عرض کر دیا
جائے کہ بہار اردو اکادمی کا سالانہ بجٹ بمشکل سے پانچ چھ
لاکھ روپیہ ہے مگر وہ بھی سارے ملک میں شائع ہونے والی اردو
کی اچھی کتب پر انعامات دیتی ہے۔ بہار اردو اکادمی کا
انعامی کتب کا انتخاب یو۔پی اردو اکادمی کے انتخاب سے
کہیں بہتر اور صاف ستھرا ہوتا ہے۔ اسی طرح مغربی بنگال
اردو اکادمی اپنے بہت ہی کم بجٹ میں ملک بھر میں شائع ہونے
والی اردو کی بہترین کتابوں پر انعامات دیتی رہی ہے۔ گزشتہ
سال سے اس اکادمی کی مالی حالت اچھی نہ رہنے سے مجبوراً
ایسا کرنا منسوخ کیا گیا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ دلی اردو اکادمی
جس کا بجٹ ۵۰ لاکھ ہے وہ ایسا نہیں کر سکتی۔

۲- اردو اکادمی دلی کئے چنے آٹھ دس ادیبوں، شاعروں کو
ادبی وظیفہ کے طور پر یا ادیبوں شاعروں کی بیواؤں کو گزشتہ
برس تک تین تین سو روپیہ دیتی رہی ہے اور اب یہ رقم چار
سو روپیہ کر دی گئی ہے اور یہ وظیفے یا بیواؤں کی امداد محض
ایک سال کے لئے [illegible] مخصوص حالات میں یہ رعایت
مزید ایک سال کے لئے بڑھا دی جاتی ہے اب چونکہ اردو اکادمی کو
دس لاکھ روپیہ ہر سال ملے گا تو یہ ادبی وظیفہ اور مالی امداد وغیرہ
مخصوص حالات میں مستقل جاری رکھے جائیں اس
سال اردو اکادمی دلی نے حسب ذیل ادبی وظیفے جاری کئے ہیں۔

۱- جناب فتح لال سرتی ضیا فتح آبادی
۲- جناب بخشی اختر امرتسری

۳- جناب طالب چکوالی صاحب
۴ - جناب دینا ناتھ مست کاشمیری
۵ - مرحوم ماسٹر جگت سنگھ (سردار صاحب) ایڈیٹر ماہنامہ رہنمائے تعلیم کی بیوہ

اس کے علاوہ کچھ مسلمان حضرات اور بیوہ خواتین بھی ہیں جن کو یہ امدادی وظیفہ ملے گا۔ مگر یہ تعداد دس سے زائد نہیں ہے اس لحاظ سے گزشتہ ایوارڈ کمیٹی قابل مبارکباد ہے کہ اس نے بلا تخصیص مذہب و ملت یہ ادبی وظیفے اور مالی امداد دینی منظور کی۔

یہ ادبی وظیفے یا مالی امداد محض ایک سال کے لئے ہے ہم یہ دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا پانچوں ادبی وظیفہ پانے والے حضرات جو طویل علالت کے باعث چلنے پھرنے سے بھی معذور ہیں۔ خدا ان سب کو عمر خضر دے کیا اُردو اکاڈمی کی ایوارڈ کمیٹی یہ بتا سکے گی کہ ایک سال کے بعد یہ اصحاب کیا کریں گے۔ کیا اُردو اکاڈمی کا فرض نہیں کہ یہ ادبی وظیفے تاعمر جاری رکھے۔

۳- ایوارڈ کمیٹی نے نہ معلوم کس طرح سے یہ منظور کر لیا کہ گیارہ ہزار روپیہ ہندوستان کی کسی ایسی ادبی شخصیت کو دیا جائے جس کا اوڑھنا بچھونا اُردو رہا ہو۔ حالانکہ دلی اُردو اکاڈمی تو دلی نواسیوں اور وہ بھی کم از کم دس سال سے دلی میں رہ رہا ہو کو ہی مخاطب ہونے کا حق دیتی ہے۔ مگر دلی اُردو اکاڈمی جناب خوشتر گرامی کو اس حق سے محروم رکھنے کی لگاتار جو دھاندلی کرتی آ رہی ہے وہ اس کے لئے انتہائی طور پر باعث شرم ہے۔ خوشتر گرامی نے بیسویں صدی کے ذریعہ اور بچوں کی نصابی کتابیں لکھ کر اُردو کی جو خدمت کی ہے اُس سے انحراف کرنا دُنیا کا سب سے بڑا ادبی جرم ہے۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جو ایوارڈ کمیٹی کے صدر تھے نے بھی دباؤ میں آکر اس ناانصافی کا ساتھ دیا اور ایسے وقت میں جبکہ خوشتر گرامی صاحب ۸۵ سال کی عمر میں طویل علالت کے باعث بمبئی میں زیر علاج ہیں اور ہمارے راشٹرپتی بھی ان کی مزاج پرسی کے لئے اُن کے مکان پر قدم رنجہ فرما چکے ہیں۔ جس شخص نے دلی میں ۱۹۲۶ء سے لے کر گزشتہ چار پانچ سال تک رہ کر بیسویں صدی کے ذریعہ اُردو کی ناقابلِ فراموش خدمت کی اُسے اب یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ دلی والا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بغرض علاج بمبئی میں گزشتہ چار پانچ سال رہ رہے ہیں۔ حالانکہ خوشتر گرامی صاحب کے بچے دلی میں ہی کاروبار کرتے ہیں۔ اس سال ایوارڈ کمیٹی کے صدر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے ہم اُمید کریں گے کہ وہ کسی دباؤ میں آئے بغیر اس سال اُردو کی خدمات کا ایوارڈ خوشتر گرامی صاحب کو دلانے کی کوشش کریں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ پہلے سے ہی فیصلہ ہو چکا ہے کہ امسال یہ ایوارڈ محترمہ صالحہ عابد حسین کو دیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے انہوں نے اس مرتبہ اُردو اکاڈمی دلی کی ممبرشپ قبول نہیں فرمائی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محترمہ صالحہ عابد حسین اس ایوارڈ کی ہر طرح سے حقدار ہیں۔ بلکہ انھیں یہ ایوارڈ دیا جانا اس ایوارڈ کی عزت افزائی ہے مگر خوشتر گرامی صاحب سے جو ناانصافی کی گئی ہے اس کا ازالہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ یہ خصوصی ایوارڈ دو حضرات کو دیا جائے۔ ایوارڈ کمیٹی کو روپیہ کی کوئی کمی نہیں۔

۴- دلی اُردو اکاڈمی کے فرائض میں یہ بھی ہے کہ وہ دلی سے شائع ہونے والے اُردو کے ایسے رسائل و جرائد کی مالی مدد کرے جو قومی یکجہتی کے لئے کوشاں ہوں اور جو اُردو کی [illegible] اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہوں مگر پچھلی ایوارڈ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے تمام قواعد و ضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خصوصی میٹنگ بُلا کر بمبئی کے ماہنامہ شاعر کے لئے دو ہزار روپیہ کی مالی مدد منظور کرا دی جیسے شاعر کی تاریخ ساز اُردو خدمات کے عوض ایوارڈ دے کر اپنا دل خوش کر لیا۔ اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اس کا جواب آج تک نہ دے سکے کہ اُنھوں نے دلی اُردو اکاڈمی کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کر کے اپنے پسندیدہ ماہنامہ کو اکاڈمی سے ناجائز طور پر دو ہزار روپے دلوا دیے۔

ہم یہ جائز مطالبہ موجودہ ایوارڈ کمیٹی تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ وہ دلی کے اُن اُردو رسائل و جرائد کو مالی امداد دے جو قومی یکجہتی اور خدمتِ اُردو کے لئے اپنے آپ کو مخصوص

ہوئے ہیں۔ اُمید ہے کہ کنور مہندر سنگھ بیدی اور اُن
کے رُفقائے کار ایوارڈ کمیٹی کے ممبران اس کا لازمی خیال
کریں گے۔

دلی اُردو اکاڈمی کی مزید تعلیمی۔ تفریحاتی اور ذیلی
لٹریری سب کمیٹیوں کے بارے میں شان ہند کی آئندہ اشاعتوں
میں محاسبہ کیا جائے گا۔

لفٹیننٹ گورنر کو غلط مشورہ

اُردو اکاڈمی دلی کے ممبران کی نامزدگی لفٹیننٹ گورنر کرتے
ہیں۔ اور یہ نامزدگی اس امر کو پیش نظر رکھکر کی جاتی ہے کہ یہ
[illegible] اُردو کی بقاء و حیات اور اس زبان کے تحفظ اور [illegible]
[illegible] دیں۔ ظاہر ہے کہ لفٹیننٹ گورنر ذاتی طور پر کسی کے
بارے میں مکمل و مفصل واقفیت نہیں رکھتے لہذا وہ اپنے
ذرائع سے مناسب حضرات کے بارے میں دریافت کرتے
ہی ہوں گے۔ لہذا یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ اس مرتبہ
اُردو اکاڈمی کے ممبران کی نامزدگی کے بارے میں لفٹیننٹ
گورنر کو کچھ حضرات کے بارے میں غلط مشورہ دیا گیا ہے۔
سابقہ ممبران میں سے بھی کچھ حضرات چھانٹی کر [illegible]
اور جو نئے ممبران نامزد ہوئے ہیں اُن میں سے کچھ حضرات [illegible]
[illegible] کے لوگ ہیں [illegible] اُردو کے بارے میں کیا معلوم۔
[illegible] کمیٹی میں غیر مسلم [illegible] (غیر [illegible]
[illegible]) کنور مہندر سنگھ بیدی [illegible]
اب [illegible] نے اپنے آپ کو [illegible] کر دیا ہے [illegible]
[illegible] برادری کی نمائندگی کرتے ہیں [illegible]
[illegible] نمائندگی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ جناب [illegible]
[illegible] ([illegible]) کا اُردو اکاڈمی کی ممبر
[illegible] نامزد کیا جانا یقیناً اس بات کا مظہر ہے [illegible]
[illegible] ڈاکٹر [illegible] نئے ممبران کو پسند کرتی ہے۔ [illegible]
[illegible] کا نامزد کیا جانا اس لئے ضروری تھا کہ [illegible]
[illegible] سب سے بڑے اور بہترین ماہنامہ بانو کی مدیرہ ہونے کے
علاوہ مشرقی اور مغربی تہذیب کا ایک [illegible] ہیں [illegible]

کے لئے باعث فخر ہیں۔ جزائر العرب کے دورہ کے درمیان
وزیر اعظم ہند کے ساتھ پریس نمائندگان میں سعدیہ دہلوی
بھی شریک تھیں اور ابھی پچھلے دنوں صدر پاکستان نے سعدیہ دہلوی
کو شرف ملاقات بخشا اور اُن کے ساتھ ہندوستان میں اُردو
زبان کے بارے میں گفتگو فرمائی۔ اس کے برعکس جن نئی خاتون کو
ممبر نامزد کیا گیا ہے وہ اُردو کے بارے میں کیا جانتی ہے اس
پر [illegible] ڈالنا ہمارا کام نہیں بلکہ اُن لوگوں کا ہے جنہوں نے
لفٹیننٹ گورنر کو [illegible] ممبر نامزد کرنے کا مشورہ دیا۔

کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ اُردو سب کی زبان ہے مگر
غیر سرکاری ممبران میں سے ایک غیر مسلم ممبر کو کیوں کم کر دیا گیا
عیسائی حضرات نے یہ معلوم کیا ہے کہ جب سے لال
قلعہ کا مشاعرہ شروع ہوا ہے آج تک کسی عیسائی شاعر
کو اس مشاعرہ میں مدعو نہیں کیا گیا پچھلے سال وعدے
کے باوجود مسٹر جولیس [illegible] کو اس مشاعرہ میں نظر انداز کر دیا
گیا جب کہ مشاعرہ کمیٹی کے ممبران نے ایسے ایسے سفارشی شعراء کو
مدعو کیا جنہیں شاعر کہنا بھی شاعر اور شاعری کی توہین تھی
ایک محترمہ نے تو کمال ہی کر دیا اس باہمت لڑکی نے [illegible]
بھارتی جی [illegible] چندر راو لفٹیننٹ گورنر
کو مجبور کر دیا کہ اُس کا باپ اس مشاعرہ میں ضرور پڑھے گا
اور یہ حقیقت ہے کہ اس لڑکی کے باپ نے پڑھا اور ڈنکے
کی چوٹ [illegible] مگر مشاعرہ کمیٹی نے کبھی یہ
[illegible] محسوس کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ہم اُردو سب کی
زبان کا نعرہ لگاتے ہیں [illegible] عیسائی شاعر کو لال قلعہ کے
مشاعرہ [illegible] کمیٹی کے صدر ڈاکٹر گوپی
چند نارنگ ہیں [illegible] اُردو سب کی
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ضرورت [illegible] ہیں وہ زبان
سے کچھ نہ کچھ [illegible] کہ وہ کیا جاتی ہے

مصداق اپنی روزی روٹی کا مسئلہ بنالیا ہے یہ حضرات
سمجھتے ہیں کہ جس طرح بعض ایم - ایل - اے میونسپل
کمیٹی کے ممبران - ممبر پارلیمنٹ اور ریڈیو پاکستان کے ممبران
سیاسی اتار چڑھاؤ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ممبری کو روزی
روٹی کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور الیکشن پر کیا ہوا خرچ دراصل
خرچ ممبر بن جانے پر وصول کر لیا جاتا ہے - اسی طرح اردو
اکاڈمی کے ان ممبران نے بھی اپنی نامزدگی کو [illegible] سمجھ
لیا ہے کہ خدا دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اردو اکاڈمی
کی ممبری سے پہلے ان حضرات کو کوئی [illegible] -
اور ممبر نامزد ہوتے ہی زمانے بھر کی [illegible]
اور ہمارے ڈاکٹر کامل قریشی صاحب [illegible]
اکیڈمی - سیمینار کے ڈائرکٹر اور [illegible] کیا بن بیٹھے شاعر
تو خیر وہ پہلے بھی جو تھے درجہ کے تھے ہی - مگر کہا یہ جاتا ہے
کہ مختلف انداز سے جس قدر روپیہ ڈاکٹر کامل قریشی نے
اردو اکاڈمی سے وصول کیا ہے شاید ہی کسی دوسرے
ممبر نے وصول کیا ہو - اس سلسلے میں ہم نے پہلے بھی لکھا تھا
کہ لفٹننٹ گورنر کو چاہیے کہ وہ سکریٹری اردو اکاڈمی سے
اس کی تفصیل طلب فرمائیں کہ اکاڈمی کے کس ممبر نے کس
قدر روپیہ کس کس مد میں وصول کیا ہے تاکہ اردو کے غم
میں آنسو بہانے والوں کی اصلیت معلوم ہو جائے۔ یہ عوام
کو علم نہیں کہ ڈاکٹر کامل قریشی نے انڈین کلچرل انسٹی ٹیوٹ
کے لئے اردو اکاڈمی سے سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں پانچ ہزار
روپیہ اور سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں دس ہزار روپیہ اردو اکاڈمی
سے لیا اور اس سب کمیٹی کی معرفت لیا جس کے یہ خود ممبر
تھے - حالانکہ اس قسم کی ادبی تقریبات منعقد کرانے والی
بیسیوں چھوٹی درجنوں انجمنیں شہر میں موجود ہیں جن کی کارگزاریوں
کی رپورٹ گاہے گاہے اخبارات میں بھی نظر سے گزرتی
رہتی ہے مگر انڈین کلچرل انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے آل انڈیا
مشاعرہ کا ایک بار دعوت نامہ کسی کے پاس دیکھا گیا تھا - اگر
کامل قریشی صاحب پندرہ ہزار روپیہ اس انڈین کلچرل انسٹی
ٹیوٹ کے نام پر بٹور سکتے ہیں تو پھر دیگر انجمنوں کی کیا خطا ہے
انھیں بھی اس قسم کے عطیات کیوں نہ دیئے جائیں۔

اور تو اور ڈاکٹر کامل قریشی نے پچھلے دنوں سکریٹری اردو
اکاڈمی کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی اور وہ اس طرح کہ نقوی
صاحب نے انھیں کسی سب کمیٹی کا چیرمین کیوں نہیں بنوایا۔
جب کہ بقول ان کے یہ سینیر ہیں - اس پر نقوی صاحب نے
جواب دیا کہ ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر
نثیر صدیقی - ڈاکٹر [illegible] وغیرہ آپ کو پڑھاتے رہے ہیں
سینیر وہ ہوئے یا کہ آپ اور اگر [illegible] اصول کی وجہ سے
آپ [illegible] سیدی تحریک
سلسلہ [illegible] حقیقت ہے اس پر ڈاکٹر کامل قریشی نے
نقوی صاحب کو دھمکی دی کہ آپ کے خلاف پوسٹر چھپیں گے
انھوں نے فرمایا کہ کتے بھونکتے رہتے ہیں ہاتھی چلتے رہتے ہیں
اردو اکاڈمی کے قیام کے وقت جناب جگموہن صاحب
لفٹننٹ گورنر کو تو ڈاکٹر کامل قریشی میں ایک خاص صفت نظر
آئی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے انھیں ممبر نامزد کر دیا تھا لیکن
ہمارے موجودہ لفٹننٹ گورنر صاحب نہ معلوم انھیں کس بنا
پر دوبارہ ممبر نامزد کر دیا - حالانکہ اردو اکاڈمی میں ایسے ممبران
کو نامزد کرنے کی ضرورت تھی جو اکاڈمی اس ادارے کو اپنی روزی روٹی
کا وسیلہ نہ سمجھے بلکہ اردو کی خدمت کا ایک سنہری موقع۔
نہ معلوم ڈاکٹر کامل قریشی صاحب نے انکم ٹیکس کی ریٹرن
میں اس آمدنی کا ذکر کیا ہے یا نہیں جو انھیں اردو اکاڈمی
سے ہوئی ہے۔ انشاء اللہ آئندہ اس سلسلے میں مزید روشنی
ڈالی جائے گی - ایک صاحب نے جب ڈاکٹر کامل قریشی کی ان
دھمکیوں کی [illegible] تو فرمانے لگے بھئی ایک تو قریشی اور پھر
کامل قریشی ایک تو کریلا اور دوسرے نیم چڑھا -

پنجابی اکاڈمی کی فضول خرچی

کہتے ہیں کہ جب [illegible] آدمی کو شرارت سوجھتی
اور عیاشی کی سوجھتی ہے - اسی طرح پنجابی اکاڈمی [illegible] کی گرانٹ
پچاس لاکھ روپیہ ہو جانے پر اکاڈمی کے ارکان کو روپیہ کی بربادی
کے لئے ایک نیا طریقہ سوجھا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح مشہور

کاروباری ادارے اپنی مصنوعات کی مقبولیت کے لئے ریڈیو پر سپانسرڈ پروگرام دیتے رہتے ہیں اسی طرح دلی پنجابی اکاڈمی کے ذمہ دار حضرات نے اکاڈمی کی غیر مقبولیت سے جھنجھلا کر اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالنے کے لئے آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ ایک سپانسرڈ پروگرام پنجابی درشن [illegible] سے نشر کرنے کا اعلان کیا ہے۔ [illegible] پہلے مسیحی ادارے مسیحیت کے پرچار کے لئے برسہا برس تک ریڈیو کے ذریعے بہتر سے بہتر پروگرام پیش کرتے رہے مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ ان مسیحی اداروں کو روپیہ غیر ممالک کے مسیحی ادارے دیتے تھے مگر مسیحیت کا پرچار ریڈیو کے ذریعہ عوام کے گلے نہ اترا اگر کروڑوں ڈالر صرف کرنے والے مسیحی ادارے کامیاب نہ ہوسکے تو پنجابی اکاڈمی کس طرح ریڈیو کے ذریعہ پنجابی زبان اور کلچر کی ترقی عوام میں کرسکے گی۔ پنجابی اکاڈمی کے دفتر میں اس اکاڈمی کے اسٹیٹ سکریٹری مسٹر [illegible] جو پنجابی کلچر کا پرچار کرتے ہیں اس کے پیش نظر تو یہی نظر آتا ہے کہ پنجابی اکاڈمی ریڈیو کے اس پروگرام پر اکاڈمی بلکہ عوام کا کافی روپیہ برباد کرنے کے بعد مسیحیوں کی طرح پچھتائے گی۔

سردار منجیت سنگھ سکریٹری پنجابی اکاڈمی اگر پنجابی اکاڈمی کے ذریعہ [illegible] زبان اور کلچر کو مقبول عام کرنا چاہتے ہیں تو انھیں پنجابی ہندوؤں کو بھی اپنے ساتھ لینا ہوگا۔ چونکہ وہ خود ایک ایسی سرکاری ملازمت میں ہیں جہاں انھیں قطعاً فرصت نہیں ملتی اور اکاڈمی کے دفتر میں سارا دن ملازم لڑکیوں کا ہجوم گپ بازی اور [illegible] کو ہی پنجابی زبان اور کلچر کا ایک ضروری جزو سمجھتی ہیں۔

شکریہ

پچھلے دنوں راقم تشویشناک [illegible] تک علیل رہا۔ تاہم خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اُس نے دوبارہ زندگی عطا فرمائی، راقم الحروف نے اپنی علالت کی اطلاع کسی کو نہیں دی مگر کچھ احباب اور عزیز رشتہ داروں کو اس کی اطلاع کسی نہ کسی طرح ہوگئی اور متعدد خطوط۔ ٹیلی گرام اور ٹیلی فون اس سلسلے میں موصول ہوئے اور کچھ حضرات تو بہ نفس نفیس مزاج پرسی کے لئے غریب خانہ پر تشریف لائے۔

راقم الحروف اپنے تمام بہی خواہوں اور ہمدردوں کا تہہ دل سے ممنون احسان ہے۔

بہترین رہنما اور معاون کتابیں

ہند کے مسلمان شعراء	رتن پنڈوری	۵۱/-
سرمایۂ بلاغت	"	۲۰/-
فن تاریخ گوئی	"	۱۵/-
آخری کنارا	"	۱۵/-
سر مغفرت	"	۱۲/-
سپنے	چندن بھارتی	۲۰/-
آوازِ دل	جولیس نحیف دہلوی	۱۵/-
جنون	کے۔ کے سنگھ میئنک	۱۰/-
دیوان	ناصر کاظمی	۱۲/۵۰
ہر بار کہا دل نے	ڈاکٹر اودیش رانی	۳۵/-
ناک کا سرور	"	۲۱/-
اپنا دامن اپنی آگ	ڈاکٹر کیول دھیر	۳۰/-
بکھرے پہلو زندگی	"	۳۰/-
غذائی مسئلے کا حل	اے جگت سنگھ	۱۸/-
الہامات مست	دینا ناتھ مست کشمیری	۳۵/-
اعترافات	گوہر عثمانی	۲۵/-

ماہنامہ شان ہند فلیٹ ۸۔ انصاری گیٹ دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ڈرامہ والوں کی کمی ہے۔ البتہ ڈرامہ نگاروں کی قدیم نسل نے ڈرامے کو ایک نمایاں صنفِ ادب کی حیثیت سے ترقی دینے میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہ کیا اور انھیں عوام تک جو پیام پہنچانا تھا اس پر بھی زورِ قلم صرف نہ کیا۔ انھیں اس کے فنی تنوع اور عناصرِ ترکیبی سے خاطر خواہ واقفیت نہ تھی۔ مغربی طرز ڈرامہ نگاری سے پہلے جس نے انحراف کیا۔ وہ جسیم الدین ہیں۔ جنھوں نے اپنا ڈرامہ "حبشی کی لڑکی" پیش کر کے بنگالہ ادب میں ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے اپنی ادبی اہمیت تسلیم کرالی۔ "حبشی کی لڑکی" صحیح معنوں میں ایک لوک ڈرامہ ہے جس میں مشرقی بنگال کی دیہی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں سپیرے کی بیوی چمپا کی داستانِ غم بیان کی گئی ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت اس کا غنائی حسن اور مکالموں میں روزمرہ کا استعمال ہے۔

بنگلہ ڈراما نورالمومن کے احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتا کیونکہ انھوں نے ڈراما نگاری میں جدید موضوعات اور تکنیک کا اضافہ کیا ہے۔ اس کا دوسرا ڈراما "NEMESIS" جب ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تو پڑھے لکھے طبقے میں نہ صرف ہلچل مچ گئی بلکہ نور المومن کے فنی شعور اور بالغ نظری کا بھی اعتراف کیا گیا۔ یہ ایک طویل ایکا کی ڈراما ہے جس میں انسانی نفسیات کا تجزیہ فنی چابکدستی سے کیا گیا ہے۔ اس کا ہیرو اسکول ماسٹر ۱۹۴۳ء کے قحط بنگال میں جب چور بازاری شروع کر دیتا ہے تو ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی روح اس کے پیشے سے بغاوت کرتی ہے۔ اور اس سے انتقام لیتی ہے۔ اس ڈرامے میں صرف ایک ہی کردار ہے۔ جو آغاز سے انجام تک اسٹیج پر رہتا ہے۔ دوسرے کردار پس پردہ رہتے ہیں۔ وہ ہمیں نظر نہیں آتے۔ لیکن ان کا ردعمل اسٹیج کے کردار پر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بقیہ کرداروں کے فرائض خود اس کا ذہن، اس کا تصور اور ٹیلیفون کے ذریعہ اس کا مکالمہ ادا کرتا ہے۔ اسے ڈرامائی خود کلامی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کیونکہ جب اسٹیج پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے تو وہ دوسرے سرے کے کرداروں سے گفتگو کرنے لگتا ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک ڈرامائی کشمکش کو بھی برقرار رکھا گیا ہے اور فنی اہتمام کے طور پر نقطۂ عروج کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ڈرامہ نگار کا دعویٰ ہے کہ اس سے پہلے کسی اور فنکار نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا۔ لیکن بعض ناقد [illegible] کا بیان ہے کہ فرانسیسی ڈراما نگار، ژان کاکتو نے اس موضوع [illegible] اپنا ڈراما "انسانی آواز" بہت پہلے پیش کیا ہے۔ اور جہاں تک آواز کے سہارے کردار کی نمائندگی کا تعلق ہے نور المومن کا ڈراما اس سے مماثلت رکھتا ہے۔ بہرکیف اس سے انکار ممکن نہیں کہ بنگلہ ڈراما لکھنے والوں کی نئی نسل پر نور المومن کی چھاپ بہت گہری ہے اور اس میں اتنا شعور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اور معاشرے کے تقاضے کو اپنی تخلیقات میں سمونے کی کوشش کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ نور المومن قدیم و جدید ڈراما نگاروں کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے بعد جو ڈراما نگاروں نے ڈرامے کی تخلیق میں بڑی گرمجوشی اور فنکاری سے حصہ [illegible]

شوکت عثمان ہمارے معاشرے کے متوسط طبقے کے ایک باشعور نقاد ہیں اور سماج کی برائیوں اور خامیوں پر بڑے تیکھے انداز میں تنقید کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے موضوع میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ ڈرامے کی فنی خوبیوں سے عہدہ برآ نہیں ہو پاتے۔ کردار غیر فطری ہو جاتے ہیں اور ان کا طنز غیر مؤثر۔ شوکت عثمان جہاں تک ہمارے معاشرے کا تعلق ہے، جان گالز ورذی اور بن جانسن کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے ڈراما "عملوا مقدمہ" میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان کی رومان پسندی کو پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ڈرامے میں بڑا لوزی تعلیم یافتہ افسر کا مضحکہ خیز ہو کر رہ گیا ہے اس کا دوسرا ڈراما "کنکر" ایک پاگل قسم کے سوداگر سلیمان کے گرد گھومتا ہے جو درآمد کئے ہوئے کنکروں اور راجپوتانہ کے ریگستان سے بھری ریت کو غلوں میں بھر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ غلوں کو قبر کھودنے والوں کی مدد سے خالی قبروں میں چھپا کر رکھ دیتا ہے۔ ڈرامے کا اختتام انسانی اخلاق کی تباہی و بربادی کی طرف [illegible] کرتا ہے۔ بن جانسن کا ڈراما "کیمیا گر" کی طرح بعض جگہ کے مکالموں میں نشتریت اور لطیف طنز کا پہلو نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ شوکت عثمان نے "ظالم زمیندار"، "بغداد کا شاعر" کے لئے "یتیم خانہ" کے عنوان سے بھی ڈرامے لکھے ہیں اور کامیاب طور سے اسٹیج پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اور نوعیت کے لحاظ سے طربیہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ شوکت عثمان بنیادی طور

کامیاب افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں لیکن ڈرامائی ادب میں
اس کی کارگزاریوں سے خاصہ اضافہ ہوا ہے۔

منیر چودھری کے ڈرامے "قبر" اور "انسان" قابل تعریف
تخلیقات ہیں۔ اس کی زبان نہ صرف شستہ اور شگفتہ ہوتی ہے
بلکہ اس میں طنز کے نشتر بھی ہوتے ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ
اس میں ظرافت کا احساس بھی رچا ہوا ہے۔ منیر چودھری نے
بنگلہ ڈرامے کو جدید مغربی تکنیک سے روشناس کیا۔ اور اپنے مقصد
کی وضاحت کے لئے نئے نئے اسلوب اختیار کئے۔ اس نے جارج
برنارڈ شا کے ڈرامے Can tell you never
کا ترجمہ "کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا" کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ ادب
میں ایک قابل قدر اضافہ ہے جس میں فنی لوازم بھی برتے گئے ہیں
اور اصل کی تمام خوبیوں کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے دوش بدوش امریکن ڈراما نگار کلیفرڈ اوڈیٹ کے
ڈراما Waiting for Lefty کے بنگلہ
ترجمے کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس ڈرامے کی پیش کش کبیر
چودھری کے قلم کی مرہون منت ہے۔ ترجمے سے اس امر کا پتہ چلتا
ہے کہ کبیر چودھری کو نہ صرف زبان و بیان پر قدرت ہے بلکہ
ڈرامے کی تکنیک اور فن پر بھی کافی دستگاہ ہے۔ بعض ناقدوں کے
خیال میں یہ ڈراما اور بھی کامیاب اور مؤثر ہوتا اگر اس کے کردار
کلکتہ کی فضا کے بجائے مشرقی بنگال کی فضا میں پروان چڑھتے۔
اسی ماحول اور سوسائٹی کے افراد معلوم ہوتے۔ ناقدین کا دوسرا طبقہ
اس ڈرامے کے متعلق یہ اظہار خیال کرتا ہے کہ کلکتہ میں جو شسلسٹ
قسم کے خیالات و جذبات ہیں چونکہ مشرقی بنگال کی بہ نسبت زیادہ
بہتر طور پر سمجھے جا سکتے ہیں۔ اسی لئے غالباً کرداروں کی تخلیق
کلکتہ کی فضا میں کی گئی ہے اور تمام واقعات کے ظہور پذیر ہونے کے لئے
اسی جگہ کو مترجم نے مناسب سمجھا۔ اس امریکن ڈراما نگار کے منظوم
ترجمے کا نام کبیر چودھری نے "نکار" رکھا ہے۔

عسکر ابن شیخ مشرقی بنگال کے تمام جواں ڈراما نگاروں میں
سب سے زیادہ مقبول اور مشہور ہیں۔ ان کے ڈراموں کا موضوع عام
طور پر ہماری اپنی سوسائٹی کا متوسط طبقہ ہے۔ ان کا قلم سماج کی
برائیوں کو نمایاں کرتا ہے۔ زمینداروں کے جرائم اور اخلاقی کمزوریوں
کی حقیقت گیری اور عوام کے مسائل سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ عسکر ابن شیخ
کے یہاں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان کے تمام ڈرامے ایک ہی
پس منظر کو پیش کرتے ہیں اور ایک ہی موضوع کے گرد گھومتے ہیں اور
وہ اس ماحول کے گرد اپنے کرداروں کی تخلیق کرتے ہیں۔ ان کے یہاں
فن کا احترام ہے لیکن موضوع میں یکسانیت ہے تنوع نہیں۔ عسکر
ابن شیخ نے مشرقی بنگال کے ڈراما نگاروں میں غالباً سب سے
زیادہ ڈرامے لکھے ہیں۔ جن میں "خانہ جنگی" اور "قدم بڑھاؤ" کا
نام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان دونوں ڈراموں سے بہتر بیت
ناک پیدا ہے۔ اس میں نقطۂ عروج کو فنکارانہ طور پر پیش کیا گیا
ہے۔ اس کے ایکانکی ڈراموں کے مجموعے کا نام "طوفانی موج"
ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے متعلق ایک
تاریخی ڈراما بھی عسکر ابن شیخ نے پیش کیا ہے جس کا نام "کوہ آتش
فشاں" رکھا ہے۔ انھوں نے میمن سنگھ کے لوک گیت پر بھی مشتمل چند
ڈرامے ترتیب دئے ہیں جہاں تک اس قسم کے ڈرامے کا تعلق ہے
عسکر ابن شیخ، جسیم الدین (شاعر) سے بہت قریب ہیں (ملاحظہ ہو
جلشی کی لڑکی) لیکن جسیم الدین نے مکالمے میں بڑی چابکدستی سے
کام لیا ہے۔ یہ بات عسکر ابن شیخ کے یہاں مفقود ہے۔ اگرچہ
غنائی عناصر دونوں کے یہاں مشترک ہیں۔

فرخ احمد بنگلہ زبان کے مشہور و معروف شاعر تھے انھوں نے
ڈرامہ نگاری کی دنیا میں ایک نیا تجربہ کیا تھا یعنی "نوفل اور حاتم" کے
عنوان سے منظوم ڈراما پیش کیا تھا۔ ایک منظوم ڈرامے کی کامیابی کا راز
اس میں پوشیدہ ہے کہ اس کی زبان عام بول چال کی زبان سے قریب
ہو۔ اس میں کردار کے اختلاف کے ساتھ ساتھ زبان کے اختلاف
کا بھی خیال رکھا گیا ہو۔ نوفل بادشاہ کا کردار ہے اس لئے اس کی
زبان [illegible] (حاتم) کی زبان سے مختلف ہے۔ اس میں شاعرانہ
حسن و دلکشی بھی ہے اور ڈرامائی خوبی بھی۔ اگرچہ اس کی تکنیک نئی
نہیں ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اس میں چند خامیاں بھی ہیں۔
مثلاً اس ڈرامے کا آغاز سلیقے سے نہیں ہوتا اور حاتم خلاف توقع
یکایک اسٹیج پر آ جاتا ہے۔ مائیکل مدھو سودن کے تقریباً
ایک سو سال بعد فرخ احمد نے بنگلہ ادب میں نظم معرا استعمال کی ہے
جس سے مستقبل میں ڈرامے کی نئی راہیں کھلنے کی توقع بڑھ جاتی ہے
فرخ احمد کا دوسرا ڈراما "بڑوں کی حکومت" ہے۔ اس میں ڈراما
نگار کی [illegible] جھلک پائی جاتی ہے۔ اس میں تمام تر وہی خوبیاں

خامیاں ہیں جو بن جانسن کے ڈرامے Every man in his Humour میں پائی جاتی ہیں۔ ان دونوں ڈراموں کو اسٹیج کی زینت بنایا جا سکتا ہے۔

ان چند ڈرامہ نگاروں کے علاوہ بعض اہل قلم ایسے بھی ہیں جنھوں نے صرف ایک یا دو ڈرامے لکھے ہیں۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں بھی اس فہرست میں شریک کر لیا جائے اور ان کے سرسری تذکرے سے یہ مضمون بھی مکمل ہو جائے۔ ان میں عظیم الدین اور سید ولی اللہ کی تخلیقات کو زیادہ سراہا گیا ہے وہ اس طرح کہ عظیم الدین کے ڈرامے "ایم اے" اور ولی اللہ کے ڈرامے "کتاب کا پیر" پر پاکستانی اہل قلم کی شاخ (۱۹۶۳) کی طرف سے انعامات مل چکے ہیں۔ عظیم الدین کا دوسرا ڈرامہ "جہاں" ہے جس میں مشرقی بنگال کی دیہی زندگی سے مواد فراہم کیا گیا ہے۔ انیس چودھری کا ڈرامہ "نقشہ" اور "اہم" میں ہماری اپنی زندگی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ عبدالحق کے ڈرامے "بے قسمت مشہور عالم منافع خور" اور "دوست کا بھکاری" ہمارے ماحول کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ علی منصور کا ڈرامہ "آتش زدہ مکان" قاضی محمد الیاس کا "اسمگلر" اکبر الدین کا "بادشاہ" ابراہیم خلیل کا "سفر نگی راج" ابوالفضل کا "قائد اعظم" مفخر الاسلام کا "مرشد" اور غلام رحمان کا "ایرانی لڑکی" ایسی تخلیقات میں ہے جو خامیوں سے پاک نہیں لیکن ان میں سے بعض ڈرامے ایسے ہیں جو اسٹیج پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اور بہر صورت بنگلہ کے ڈرامائی ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بنگلہ زبان میں بچوں کے ڈرامائی ادب پر عثمان کے علاوہ پرنسپل ابراہیم خاں نے بھی قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے بچوں کے لئے چار مختصر ڈراموں کا مجموعہ "بہشتی بادشاہ" کے نام سے شائع کیا ہے اس کے علاوہ اشرف الزماں، عبید الحق اور مشرقی بنگال کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو ڈرامائی سرگرمیوں اور ترقیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ چنانچہ مسٹر رفیق الاسلام (موجودہ صدر شعبہ بنگالی، ڈھاکہ یونیورسٹی) نے اپنے ایک مضمون میں بنگلہ ڈراموں کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ گذشتہ دس سال کے اندر یعنی ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک ڈھاکہ یونیورسٹی اور اس کے ملحقہ کالجوں کے طلبہ نے تقریباً ایک سو ڈرامے اسٹیج کئے۔ اس سلسلے میں یہ بات [illegible] کے ڈرامے "شاعر بھائی" کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا جس کا موضوع قاضی نذر الاسلام کی زندگی ہے اور جس پر پاکستانی مصنفین کی انجمن کی طرف سے انھیں پانچ ہزار روپے بطور "آدم جی انعام" پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان کے ڈرامے کو بنگلہ ادب کی بہترین تخلیق میں شمار کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں اس امر کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن نے بھی ڈرامے کی نشر و اشاعت میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ اگرچہ ریڈیائی ڈرامہ اسٹیج کے لئے نہیں ہوتا اس کا تعلق صرف سماعت سے ہے اور آنکھوں کی بجائے کانوں کی تفریح کا ذریعہ ہوتا ہے۔

مضمون کے اختتام پر اس امر کا اظہار بھی بیجا نہ ہوگا کہ موجودہ بنگلہ ڈراموں میں جو خامیاں ہیں اگر ان کی اصلاح کی طرف توجہ دی جائے اور [illegible] نوجوان لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی گئی تو بنگلہ ڈرامہ بہت جلد ترقی کے منازل طے کر لے گا۔ ان خامیوں کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ ڈرامہ نگار فنی طور پر ڈرامے کی ہیئت کو پیش نظر نہیں رکھتے۔ انھوں نے نفسیاتی مسائل کو ضرورت سے زیادہ سادگی کے ساتھ برتا ہے جس سے فن کے وقار کو ٹھیس لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سامعین کی کثیر تعداد کو پورے طور پر اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتے ہیں۔ ڈرامے کے فن کو ترقی دینے کی ایک مستقل اور منظم صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ حکومت قومی تھیٹر کے قیام کی تجویز پر سنجیدگی سے غور کرے کیونکہ یہاں اداکاروں کی کمی نہیں اور وہ بخوشی "قومی تھیٹر" کی آواز پر لبیک کہہ سکتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ڈھاکہ یونیورسٹی ڈرامے اور اس کے فن کو نصاب تعلیم کے طور پر یونیورسٹی میں داخل کر دے اور مشہور ڈرامہ نگاروں کو اس شعبے سے منسلک کر دے۔ ان کے تعاون سے ملک میں بھی خاص سرگرمی رہے گی اور ڈرامہ بھی ترقی کرتا رہے گا۔

جھوڑی

کلیم احمد

بوڑھا منشی جھکا اور چاہا کہ ایک جھٹکے میں جھوڑی اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لے۔ لیکن سودا سلف سے بھری ہوئی جھوڑی اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔ تب اسے احساس ہوا کہ جھوڑی آج کچھ معمول سے زیادہ بھاری ہو گئی ہے۔ جیسے صاحب نے پورا بازار خرید کر جھوڑی میں ڈال دیا ہو۔ اس کی کمر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا اور جھکنے سے سر بھی تھوڑا سا چکرایا تھا۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے سوچا۔ کیا اسے صاحب سے کہنا چاہیے کہ ذرا ٹوکری پکڑا دیں یا پھر اسے اللہ کا نام لے کر دوسری مرتبہ کوشش کر لینی چاہئے۔ اس نے ذرا لمبا سا سانس بھر کر اللہ کا نام لیا اور پھر ٹوکری اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی تھی۔ "چلئے صاحب!"

"کیا بات ہے بڑے میاں تم بیمار تو نہیں ہو؟" صاحب نے اس پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور آگے بڑھ گئے۔ بوڑھا منشی صاحب کے پیچھے چلتے ہوئے یہ سوچنے لگا کہ واقعی وہ اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ اب پہلے جیسا دم خم اس میں نہیں ہے اب جب شام کو گھر لوٹتا ہے تو اس کے بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹنے لگتا ہے اور اس کا جی کھانا کھانے کو بھی نہیں چاہتا۔ بس اس کا جی یہ چاہتا ہے کہ ایک کونے میں دم سادھے چپ چاپ پڑا رہے۔

حالانکہ یہ وہی تھا جو دن بھر میں پچاسوں پھیرے لگانے کے بعد بھی نہیں تھکتا تھا اور ویسا ہی تازہ دم رہتا تھا۔ وہ اس وقت سے منشی کا کام کر رہا تھا جب کہ اُسے ڈھنگ سے لنگی بھی باندھنا نہیں آتی تھی لوگ اس کے حوالے سودا سلف دیتے ہوئے گھبراتے تھے پتہ نہیں یہ بالشت بھر کا چھوکرا کہاں ٹھوکر کھا کے گر پڑے اور اپنا منہ ہاتھ پھوڑے اور دوسرا سودا سلف خراب ہو۔ کام کرتے اور لوگوں کی جھڑکیاں سنتے وہ جوان ہو گیا تھا۔ پھر اس نے چپکے سے ایک دن گوری سے شادی کر لی تھی۔ اور تب اسے اس حقیقت کا علم ہوا تھا کہ فٹ پاتھ کی زندگی اور ہے گھر سنسار اور۔ اور اس خیال کے تحت اس نے وہیں محلے میں ایک کھولی کرایہ پر لے لی تھی اور پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگا تھا کیونکہ اب اس کا ایک گھر تھا ایک ٹھکانا تھا اور جب آلو پیدا ہوا تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔ اس کے پیدا ہوتے ہی اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ہرگز آلو کو اپنی طرح منشی نہیں بننے دے گا بلکہ وہ اُسے پڑھائے گا لکھائے گا۔ اور ایک بڑا آدمی بنائے گا۔ گوری کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بڑے زور سے ہنسی تھی اور ایک دن ہنستے ہوئے اُس نے اس سے کہا تھا۔ جانتے ہو پڑھانے میں کتنا خرچ ہوتا ہے۔ ارے وہ جو سامنے والی کوٹھی ہے نا اس کا لڑکا اسکول جاتا ہے۔ بی بی جی جب ہم کو کسی کام کو بلاتی ہیں تو معلوم پڑتا ہے۔ ڈھیر ساری کتابیں، کاپی اور پھر آنے جانے کو رکشہ بی بی جی کو ہزار مرتبہ کہتے سنا ہے "ان دو بچوں کی پڑھائی کے خرچ نے ہمیں مار ڈالا۔" میں تو یہ چاہتی ہوں آلو کو رحمٰن مستری کے حوالے کر دو۔ ڈھنگ کا مستری بن جائے گا۔ گھر میں دو چار پیسے آئیں گے۔ لیکن وہ گوری کی بات ان سنی کر کے ایک دن آلو کو اسکول لے جا کر بھرتی کرا آیا تھا۔ اور لڑکے کو بھرتی کرنے کے بعد اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کا سینہ دو چار انچ اور پھیل گیا ہو۔

کہتے ہیں کہ ہونہار بروا کے چکنے پات یہ مثل اس لڑکے پر صادق آتی تھی۔ وہ تھا تو منشی کا لڑکا لیکن بلا کا ذہین تھا نہ تو اسے ماسٹر میسر تھا اور نہ کوئی دوسرا کچھ دکھا دینے والا تھا لیکن وہ محنتی تھا اور اس کی محنت اور لگن کا یہ نتیجہ نکلا تھا کہ وہ میٹرک کے امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوا تھا۔

آلو نے جب میٹرک کر لیا تو گوری نے کہا "آلو کے ابا اب اور آگے پڑھا کر کیا کرنا ہے۔ بہت پڑھ لیا۔ کہیں نوکر رکھوا دو۔" گوری کی بات سن کر اُسے غصہ تو بہت آیا تھا۔ لیکن اپنے غصہ کو

یہ کہہ کر چپ ہوگیا تھا۔ عورت ذات بے عقل ہوتی ہے۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا تھا۔ دیکھو جو بات سمجھ نہ آئے تو بحث نہ کیا کرو۔ ابھی اسے بہت پڑھنا ہے بڑا افسر بننا ہے۔ اس پر تو ایک دھن سوار تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو بہت اونچا دیکھنا چاہتا تھا اتنا اونچا جتنی اونچی وہ کوٹھی تھی جسے دیکھتے وقت اس کے سر سے پگڑی کی پوٹلی گر جاتی تھی۔

اس کا بڑے بڑے گھروں میں جانا ہوتا تھا۔ وہ ان کے ٹھاٹ باٹ کو دیکھتا تھا۔ وہ جب ان کا سودا سلف لے کر ان کے گھر جاتا تو حیرت سے گھر کے در و دیوار کو دیکھتا۔ دیواروں پر خوبصورت پینٹنگ آویزاں ہوتی تھیں۔ وہ اوپر اوپر دیکھتا ہوا آگے بڑھتا تھا کہ صاحب گدیلے صوفے میں دھنستے ہوئے کہتے ارے رے ادھر نہیں قالین خراب ہوگی وہیں ٹھہرو تو وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو جاتا۔ اور پھر اس کی نظریں قالین پر پڑتیں تو وہ دیکھ کر مبہوت ہو جاتا اور بے ساختہ کلمۂ تحسین اس کی زبان پر آتے "ارے میرے خدا کتنی خوبصورت قالین ہے" اس کا جی چاہا کہ وہ بھی صاحب کی طرح قالین پر ذرا سا پاؤں رکھ کر چلتا لیکن اس کے ایسے بھاگ کہاں تھے۔ اس نے اپنے بے قرار جی کو یہ کہتے ہوئے تسلی دی تھی۔ چلو جانے دو، کل جب میرا بیٹا افسر بنے گا تو خوب جی بھر چلوں گا۔ پھر سب کچھ اپنا ہوگا اور کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوگا۔

پھر اچانک اسے گوری پر غصہ آیا۔ کیسے کہہ رہی تھی اسے پڑھا کر کیا کرو گے۔ کہیں نوکر رکھوا دو۔ دو پیسے گھر میں آنے لگے۔ اب تمہاری صحت بھی پہلے جیسی نہیں رہی۔ واہ جیسے میں تو اسے منشی بننے کے لئے پڑھا رہا ہوں۔ وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا تھا ارے بے عقل جب وہ بڑا افسر بنے گا تو تو ہی اترائے گی ——— تیرے پاؤں زمین پر نہیں ٹھہرا کریں گے۔ بڑبڑاہٹ اتنی واضح تھی کہ صاحب نے چونکتے ہوئے بوڑھے کی جانب دیکھا۔ لیکن بوڑھے رحمو کو اپنے خیالوں میں گم ہوتے دیکھتے ہوئے اس سے کہا بڑے میاں جھوڑی یہیں رکھ دو سودا کام والی اندر لے جائے گی۔

بوڑھے رحمو نے سودا کی جھوڑی اتارتے ہوئے پوچھا۔

صاحب آج کتنی تاریخ ہے۔

کیوں بڑے میاں تمہیں تاریخ کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ تم اپنی مزدوری بتاؤ۔

آج بارہ ہے۔ بوڑھے رحمو نے اپنے میلے گمچھے سے پسینہ خشک کرتے ہوئے دریافت کیا۔

ہاں آج بارہ ہے! صاحب نے جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا

بوڑھے نے جھنجھلاہٹ کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے پوچھا صاحب اخبار تو ہوگا کیونکہ اسے یہ علم تھا کہ صاحب لوگوں کے یہاں پابندی سے ہاکر اخبار دے جایا کرتا ہے۔ اس لئے اس نے صاحب کے جواب کا انتظار کئے بغیر اپنی لنگی کی گرہ سے ایک مڑی تڑی سی پرچی نکال کر صاحب کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ صاحب ذرا یہ نمبر تو دیکھو بڑی مہربانی ہوگی

نمبر اور پرچی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے صاحب نے سوچا بوڑھا خبطی کے ساتھ سنکی بھی ہے۔ لاٹری کے ٹکٹ سے اپنی قسمت بدلنا چاہتا ہے۔ اس لئے انھوں نے تمسخرانہ انداز سے بوڑھے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ کیوں بڑے میاں لاٹری نکل آنے کی امید ہے کیا؟

ہاں جناب! ساری زندگی کی پونجی داؤ پر لگائی ہے۔ بوڑھا رحمو ذرا اکڑتا ہوا بولا تو صاحب نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا پھر بوڑھے سے انتظار کرنے کے لئے کہا اور ہاتھ میں اخبار لے کر اس پر نظر دوڑانے لگے۔ پھر تھوڑی دیر بعد انھوں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں ہے"

نہیں ہے! بوڑھے نے تقریباً چیختے ہوئے صاحب کے الفاظ دہرائے۔ پھر بڑے یقین سے کہا ایسے نہیں ہوگا۔ میرا آنو غلطی نہیں کرسکتا۔ پھر عاجزی سے صاحب کی جانب دیکھتے ہوئے کہا صاحب ایک بار اور دیکھیں۔

آنو؟ خیر! بڑے میاں میں کچھ نہیں سمجھا تم کیا کہہ رہے ہو

آنو میرا لڑکا صاحب! اس سال اس نے نوکری کا امتحان دیا ہے بوڑھا رحمو نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا تو بات ان کی سمجھ آئی۔ ٹھہرو ٹھہرو بڑے میاں میں نے تو کچھ اور سمجھا تھا۔ پھر اخبار پر نظر ڈالی تو بوڑھے رحمو کا کندھا خوشی سے دباتے ہوئے کہا۔ تمہارے لڑکے نے سیکنڈ کلاس حاصل کی ہے۔

سے زیادہ نہیں لگایا تا تھا۔ لیکن کل کا سوچ کر خود کو دلاسہ دیتا بس کل کی بات ہے ان کا بیٹا افسر ہوا۔ لیکن یہ کل کب؟

آخر ایک دن آلو نے بڑی خوشی سے یہ مژدہ سنایا "بابا سنو مجھے نوکری مل گئی"

"ہاں"

"ہاں بابا"

۔ لیکن دوسرے دن جب وہ شام کو گھر لوٹا تو آلو کا منہ لٹکا ہوا پایا تھا۔ وہ گھر کے دروازے پر بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا۔

کیا بات ہے "بیٹا کیا پھر کوئی"۔

ہاں بابا آج پھر بڑے صاحب نے رُکا سا جواب دے دیا سوری ہم تمہیں معاف کرنا اور میں چپکا نکل آیا۔ یہ بھی نہیں پوچھا کیوں سر۔ کیونکہ وہ وہی کچھ کہتے جو گزشتہ دنوں سے میں سنتا آرہا تھا اس نے بوڑھے رحمو کی جانب دیکھتے ہوئے بڑی افسردگی سے کہا۔

بوڑھے رحمو نے آلو کی پیٹھ پر تھپکی دی اور سوچنے لگا اس کی تسلی کے واسطے وہ کیا کہے۔ کیونکہ وہ تو جانتا تھا۔ من بھر کا بوجھ اٹھانے والوں کو من بھر کا بوجھ دیا جاتا ہے۔ اڑھائی من کی بوری نہیں لادی جاتی۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا اور جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو چپ رہا۔

بوڑھا ہمیشہ کی طرح صبح اٹھا اور تھوڑی اٹھاتا ہوا گوری کی جانب دیکھا جو سر جھکائے جھاڑو دے رہی تھی۔ آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور کل سے زیادہ کمزوری محسوس ہو رہی سر بھاری تھا اور ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں تھی۔ وہ کھڑا گوری کو دیکھتا رہا شاید جھاڑو دیتے ہوئے اس کی نظر اس کی جانب اٹھے اور یوں لیکتا ہوا دیکھ کر کہے "طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آج نہ جاؤ" لیکن وہ سر جھکائے کریدکرید کر کچا آنگن صاف کر رہی تھی۔ جھاڑو دیتے ہوئے ایک بار بھی اس نے بوڑھے رحمو کی جانب نہیں دیکھا تھا اور دیکھا تو انجان بن رہی تھی۔ جیسے دیکھا نہیں۔ بوڑھے رحمو نے جب دیکھا وہ اس کی طرف دیکھتی نہیں تو اللہ کا نام لے کر جھونپڑی سے سر رکھا اور باہر نکلنا چاہتا تھا کہ آلو نے کہا بابا ٹھہرو۔ "بابا" ٹھہر گیا تھا

پھر آلو نے جھپٹ کر اس کے سر سے جھولی کھینچ لی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بابا۔ تم نہیں جاؤ گے لیکن بابا گھر میں جو ہوں اور پھر کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر وہ سر پر جھولی رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

غزل　حکیم محمد رؤف رؤف کھوپالی

عقدہ یہ کھل گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد
دل تیرا ہو چکا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

تیرے لبِ شگفتہ کی ساری ہیں برکتیں
ہر غنچہ کھل اٹھا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

کیوں حضرتِ کلیم پہ طاری ہوا تھا غش
یہ راز کھل گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

دنیا ہی کا ہے ہوش نہ عقبیٰ کی کچھ خبر
عالم یہ ہو گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

صحنِ چمن میں نرگسِ بیمار کو بھی آج
سکتہ سا ہو گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

تیرا رؤف بے نوا تیرے جمال کے
جلوؤں میں کھو گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

سید قطب شہیدؒ

خالد بلال

جنہیں جرمِ صداقت کی پاداش میں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا

۲۹ اگست کا سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ ۱۹۶۶ء کی [صبح] مصر کے اجلِ عظیم دنیائے اسلام کے نامور مفکر سید قطبؒ [کو] تختہ دار پر لٹکا دیا گیا ان کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے باطل کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا اور یوں بے نظیر شخصیت جو مصر اور عرب کے الحاد پرست اور لادین عناصر کی آنکھ میں کانٹے کی طرح [کھٹک ر]ہی تھی اپنے رب سے جا ملی۔ ۱۵ سالہ مشقت کی [سزا کا]ٹنے کے بعد جب جمال عبد الناصر کا ایک نمائندہ سید قطب کے [پاس] گیا اور پیش کش کی کہ اگر آپ چند سطریں معافی نامہ لکھ دیں جنھیں [اخب]ارات میں شائع کیا جا سکے تو آپ کو رہا کر دیا جائے گا اور جیل [کے مص]ائب سے نجات پا کر آپ گھر کی آرام دہ زندگی سے متمتع [ہو سک]یں گے۔

اس پیش کش کے جواب میں سید قطب نے کہا۔

"مجھے ان لوگوں پر تعجب آتا ہے کہ جو مظلوم کو کہتے ہیں کہ ظالم سے معافی مانگ لے۔ خدا کی قسم اگر معافی کے چند الفاظ مجھے پھانسی سے بھی نجات دے سکتے ہوں تو میں تب بھی کہنے کے لئے تیار نہ ہوں گا اور میں اپنے رب کے حضور اس حال میں پیش ہونا پسند کروں گا کہ میں اس سے خوش ہوں اور وہ مجھ سے خوش ہو۔"

یہ تھا وہ جواب جس کو تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا گیا۔ مصر کی یہ نامور شخصیت ۱۹۰۶ء میں مصر کے موشا نامی گاؤں میں [پیدا ہو]ئی۔ [...] سید تھا قطب خاندانی نام تھا۔ سید قطب [کی والدہ] کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ بڑی دیندار اور خدا پرست [تھیں۔ انھیں] قرآن مجید سے گہرا شغف تھا ان کی خواہش تھی کہ ان کے بیٹے قرآن پاک کے حافظ ہوں۔ سید کے والد بھی بڑے خدا پرست اور درویش انسان تھے ان کا پیشہ زراعت کا تھا۔ سید قطب کے آبا و اجداد اصلاً جزیرۃ العرب کے رہنے والے تھے ان کے خاندان کے ایک بزرگ وہاں سے ہجرت کر کے بالائی مصر کے علاقے میں آ کر آباد ہو گئے ان کی اولاد میں سے سید قطب کے والد بزرگوار حاجی ابراہیم قطب تھے۔ سید قطب دو بھائی تھے ایک وہ اور دوسرے محمد قطب۔ سید قطب کی ایک بہن امینہ قطب بھی پڑھی لکھی اور باصلاحیت خاتون ہیں اور دعوتِ جہاد میں اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ سرگرم کار رہی ہیں ان کے اصلاحی اور معاشرتی مضامین بھی مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں ان کی دوسری بہن حمیدہ قطب بھی میدانِ جہاد میں اپنے بھائیوں سے پیچھے نہیں رہیں۔ تیسری بہن نے سید رفعت نامی اپنا ایک لختِ جگر راہِ حق میں قربان کر دیا اور جلاد کے تازیانوں نے اس کے شیدائے راہِ الفت کے خطاب سے نواز دیا۔

یوں خاندانِ قطب کا ہر فرد گوہرِ یک دانہ نظر آتا ہے اور اس مثل کا صحیح مصداق ہے کہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است"۔ صبر و عزیمت اور آزمائش و ابتلا میں بھی اس خاندان نے بیسویں صدی میں جس اعلیٰ کردار کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس نے آلِ یاسرؓ کی مثال زندہ کر دی ہے۔

سید قطبؒ نے تختہ دار کو چوم لیا۔ محمد قطب جیل میں ڈال دیئے گئے۔ حمیدہ قطب کو بھی سات سال قید با مشقت ہوئی۔ امینہ قطب بھی ایسے ہی انجام سے دوچار ہوئی۔

سید قطب نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے سادہ ماحول میں حاصل کی۔ والدہ محترمہ کی دلی آرزو کے مطابق بچپن ہی میں قرآن

منتقل کیا۔ پھر سید کے والدین قاہرہ کی ایک نواحی بستی حلوان
میں رہائش پذیر ہوئے اور یوں سید کو قاہرہ کے ثانوی مدرسے
مدرسہ تجہیزیہ دارالعلوم میں داخل مل گیا یہاں سے فراغت
حاصل کرکے ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم قاہرہ مصر میں داخلہ لیا اور یوں
۱۹۳۳ء میں یہاں سے بی اے ایجوکیشن کی ڈگری حاصل کی اور
اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت پروفیسر لگا دیئے گئے کچھ عرصہ
بعد ان کی بے پناہ صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر ان کو وزارت
تعلیم میں انسپکٹر آف سکولز مقرر لگا دیا گیا۔ اسی دوران ان کو
وزارت تعلیم کی طرف سے جدید طریقہ تعلیم و تربیت کے مطالعہ کے
لئے امریکہ بھیج دیا گیا امریکہ میں ان کا قیام تھوڑے تھوڑے
عرصہ پہلے مختلف کالجوں میں ہوا جن میں واشنگٹن کے ولسن ٹیچرس
کالج، گریلی کولوراڈو کے ٹیچرس کالج کیلفورنیا میں اسٹانفورڈ
یونیورسٹی میں رہا اس کے علاوہ نیویارک، شکاگو، سان فرانسسکو
لاس اینجلز اور دوسرے بڑے شہروں میں بھی جانے کا موقع ملا۔
امریکہ سے واپسی پر انھوں نے انگلستان اٹلی اور
سوئٹزرلینڈ میں چند ہفتے گزارے اور دو سال کے بعد واپس
مصر لوٹے، امریکہ میں ان کے قیام نے ان کے سامنے مادی
تہذیب کی تباہ کاریوں کو کھول کر رکھ دیا اور ان کو اسلام کی
حقانیت و صداقت پر مزید اطمینان ہوا۔ پھر انھوں نے
"اخوان المسلمون" کی طرف توجہ دی، ان کی دعوت کا مطالعہ کیا اور پھر
۱۹۵۲ء میں اخوان سے اپنا رشتہ جوڑ لیا اس دور میں انگریزوں کے
خلاف اخوان جدوجہد کی وجہ سے اخوانیوں پر تکالیف و مصائب
کے دروازے بھی کھل گئے تھے لیکن اخوان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ
دو سالوں کے اندر اندر ان کے صرف کارکنوں کی تعداد ۲۵ لاکھ
تک پہنچ گئی تھی اور عام ارکان ہمدردوں اور حامیوں کی تعداد اس
سے کہیں دگنی ہو گئی ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو اخوان کے مرشد عام الاستاذ
حسن البنا کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا اور جماعت کو خلاف قانون
قرار دے دیا گیا یہ آزمائش کا دور [illegible] میں فوجی انقلاب
کے قیام تک [illegible] جاری رہا۔

جولائی ۱۹۵۲ء میں فوجی انقلاب بپا ہوا جس نے بے شک
اخوان المسلمون کی آزمائش کے ایک دور کو ختم کر دیا مگر ساتھ ہی
آلام و مصائب کا ایسا دور شروع ہوا کہ ؎

درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

اس دور میں سید قطب نے فکری میدان میں جماعت کی عظیم
الشان خدمات سرانجام دیں اور یوں وہ اخوان کے صف اول کے
رہنماؤں میں شامل ہونے لگے ۱۹۵۲ء کے وسط میں اخوان المسلمون
کی تحریک دوبارہ بحال ہوئی فاروق کا دور جبر ختم ہوا۔ اور حسن الہضیبی
کی قیادت میں سرفروشوں کا یہ قافلہ حق ایک طرف پھر اپنی منزل
کی طرف رواں دواں ہو گیا۔ اس دور میں سید قطب مکتب الارشاد
(مجلس عاملہ) کے رکن منتخب ہوئے۔ پھر جماعت کے مرکزی
دفتر میں انھیں شعبہ توسیع دعوت کا انچارج مقرر کر دیا گیا اور
انھوں نے اپنی زندگی ہمہ تن جہاد کے لئے وقف کر دی اور مختلف
پہلوؤں اور مختلف طریقوں سے اس تحریک کی خدمت کی۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں مصر کے معاشرتی بہبود کے سرکل نے
سید قطب کو معاشرتی بہبود کی کانفرنس میں شرکت کے لئے دمشق
بھیجا وہاں سے سید قطب اردن گئے لیکن گلوب پاشا کی مخالفت
کے باعث اردنی حکام نے ان کو داخلہ کی اجازت نہ دی۔

دسمبر ۱۹۵۳ء میں ان کو مجلس عاملہ کی طرف سے بیت المقدس
میں ہونے والی اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے بھیجا گیا۔
اس مرتبہ عالم اسلامی کے وفود کے ہمراہ اردن داخل ہوئے تھے
اس لئے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔

جولائی ۱۹۵۴ء میں اخوان کی مجلس دعوت اسلامی نے
سید قطب کو جریدہ "الاخوان المسلمون" کے ایڈیٹر مقرر کیا۔
ابھی ۲ ماہ ہی ادارت کی تھی کہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۴ء کو یہ اخبار
کرنل جمال عبدالناصر کی حکومت نے بند کر دیا کیونکہ اس اخبار نے
اخوان المسلمون کی پالیسی کے تحت اینگلو مصری کی مخالفت
کی تھی جو ۲۷ جولائی ۱۹۵۴ء کو جمال عبدالناصر اور انگریزوں کے
مابین ہوا تھا اس کے بعد اخوان اور ناصر میں کشمکش کا آغاز ہو گیا
اور اخوان شدید ترین دور ابتلا میں گھر گئے۔

ایک جعلی سازش کے الزام میں حکومت مصر نے اخوان
المسلمون کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ اخوان رہنماؤں کو
گرفتار کر لیا گیا۔ عبدالستار عودہ، محمد فرغلی، یوسف طلعت

ابراہیم الطیب ہنداوی دویر، محمود عبداللطیف کو موت کی سزائیں دی گئیں۔ چند ہفتوں کے اندر اندر ۵۰ ہزار کارکنان کو گرفتار کر لیا گیا اور ایسا محشر خیز ہنگامہ بپا ہوا کہ ہر اس شخص کی عزت وآبرو اور جان ومال پر دست درازی کی گئی جو اخوان سے کسی نہ کسی نوعیت کا تعلق رکھتا تھا۔

سید قطب کو گرفتار کر کے مصر کی مختلف جیلوں میں رکھا گیا کبھی قلعہ کی جیل میں، کبھی فوجی جیل میں اور گاہ ابوزعبل کی فوجی جیل میں (شام کے ہفت روزہ الشہاب) نے (جو ان دنوں شام کی اخوان المسلمون کی شاخ کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا اور لوگوں کو مصری جیل خانوں کی تعزیت کی داستانوں سے آگاہ کرتا رہتا ہے) سید قطب کی گرفتاری کا حال یوں بیان کیا ہے۔

"فوجی افسر جب سید قطب کو گرفتار کرنے کے لئے ان کے گھر میں داخل ہوئے تو سید اس وقت شدید بخار میں مبتلا تھے انھیں اسی حالت میں پابند سلاسل کر لیا گیا اور پیدل جیل تک لے جایا گیا راستے میں شدت کرب کی وجہ سے بے ہوش ہو کر گر جاتے اور جب ہوش میں آتے تو ان کی زبان پر اللہ اکبر، الحمد للہ (اخوان کے نعرے) کے الفاظ جاری ہو جاتے انھیں جب سجن حربی (فوجی جیل) میں داخل کیا گیا تو جیل کے دروازے پر ان کی ملاقات جیل کے کمانڈر حمزہ بسیونی (۵ جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد یہ شخص غداری کے الزام میں خود گرفتار ہو گیا) اور خفیہ پولیس کے افسروں سے ہوئی جوں ہی سید قطب نے جیل کے اندر قدم رکھا جیل کے کارندے ان پر ٹوٹ پڑے اور لوٹے دو گھنٹے تک ان کو زدوکوب کرتے رہے جیل کے اندر ان پر ایک سدھایا ہوا اگر گٹ نما فوجی کتا بھی چھوڑا گیا جو ان کی ران منہ میں لے کر انھیں اِدھر اُدھر منہ میں گھسیٹتا رہا۔ اس تمہیدی کارروائی کے بعد انھیں ایک کوٹھری میں لے جایا گیا اور ان سے سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا اور مسلسل سات گھنٹے تک جاری رہا سید قطب کی جسمانی طاقت اگرچہ جواب دے چکی تھی لیکن ایمانی حرارت اور اطمینان صبر کی طاقت نے انھیں تھیر کی چٹانوں میں تبدیل کر دیا تھا ان پر گوناگوں اذیتوں کی بارش ہوتی رہی مگر وہ اللہ اکبر وللہ الحمد کے سرور جاودانی میں مستغرق رہے۔ رات کو جیل کی تنگ وتاریک کوٹھری میں ڈال دئیے جاتے اور صبح کے وقت بلاناغہ انھیں پریڈ کروائی جاتی ان بے پناہ مشقتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو گئے ۱۷ مئی ۱۹۵۵ء کو انھیں فوجی اسپتال میں منتقل کر دیا گیا اس وقت سید امراض سینہ قلبی ضعف جوڑوں کی درد اور اسی نوعیت کی دوسری بیماریوں میں مبتلا تھے۔

سید قطب کے ایک شاگرد جناب یوسف العظم لکھتے ہیں کہ "ظلم کے گوناگوں پہاڑ سید قطب پر توڑے گئے انھیں آگ سے داغا گیا پولیس کے کتوں نے انھیں کچلیوں میں لے کر گھسیٹا ان کے سر پر مسلسل کبھی گرم اور کبھی ٹھنڈا پانی انڈیلا گیا اور انھیں لاتوں اور گھونسوں سے مارا گیا۔ آزاد الفاظ اور اشاروں سے ان کی توہین کی گئی مگر ان سب چیزوں نے سید کے ایمان ویقین میں اور اضافہ کیا ان کے قدم حق پر مزید جم گئے۔

۱۳ جولائی ۱۹۵۵ء کو مصر کی "عوامی عدالت" (محکمۃ الشعب) کی طرف سے سید قطب کو ان کی غیر حاضری میں ۱۵ سال قید بامشقت کی سزا سنادی گئی کیونکہ سید اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ عدالت میں حاضر نہ ہو سکتے تھے۔

جیل میں ان کو بار بار معافی کی پیش کش کی گئی لیکن ان کا جواب یہ تھا کہ

> "اگر میرا قید کیا جانا برحق ہے تو میں حق کے فیصلہ پر راضی ہوں اور اگر باطل نے مجھے گرفتار کر رکھا تھا تو میں باطل سے رحم کی بھیک مانگنے کے لئے تیار نہیں ہوں ایک مرتبہ وزارت تعلیم کی پیش کش کی گئی لیکن انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ وزارت کا قبول کرنا اس وقت تک حاصل ہے جب تک مصر کے پورے نظام تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا اختیار نہ ہو!

۱۹۶۴ء کے وسط تک سید قطب مصر کے مختلف جیل خانوں میں رہے ابتدا کے ۴ سال تو انھوں نے انتہائی اذیت اور ابتلا میں گزارے مگر بعد میں جبر وتشدد کا سلسلہ ہلکا کر دیا گیا اور ان کے عزیز اقارب کو بھی ملاقات کی اجازت مل گئی اور خود انھیں بھی جیل کے اندر اپنے علمی مشاغل جاری رکھنے کی سہولت کسی حد تک میسر ہو گئی

اس جزوی سہولت سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن" کی تکمیل پر متوجہ ہو گئے۔

۱۹۶۴ء کے وسط میں جب ان کی قید کو دس برس ہو گئے تھے اور بالعموم ۱۵ سال قید پانے والا عملاً دس یا گیارہ سال قید گزار کر رہا ہو جاتا تھا۔ عراق کے مرحوم صدر عبدالسلام عارف نے قاہرہ کا دورہ کیا اور صدر ناصر سے سید قطب کی رہائی کی درخواست کی۔ چنانچہ صدر ناصر نے جو عبدالسلام عارف مرحوم کے ساتھ خوشگوار تعلقات کے متمنی تھے اس درخواست کے جواب میں سید قطب کو رہا کر دیا گیا مگر اس رہائی سے عملاً کوئی فرق پیدا نہ ہوا کیونکہ وہ برابر پولیس کی نگرانی میں رہتے تھے اور انھیں آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت نہ تھی۔

اس مختصر آزادی کو ایک سال بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ سید قطب کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا ان پر الزام یہ تھا کہ وہ طاقت کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں چنانچہ نہ صرف انھیں بلکہ ان کے بھائی محمد قطب اور بہنوں حمیدہ قطب اور امینہ قطب کو گرفتار کر لیا گیا۔ بیس ہزار کے قریب افراد کو گرفتار کیا گیا جن میں سات سو کے قریب عورتیں تھیں۔

اس پکڑ دھکڑ کا آغاز اگست ۱۹۶۵ء میں صدر ناصر کے دورہ ماسکو پر ہوا جب   پر ایک بیان میں اس نے کہا کہ "اخوان المسلمون" نے میرے قتل کی جو سازش تیار کی ہے وہ طشت از بام ہو چکی ہے ماضی میں میں نے انھیں معاف کر دیا تھا لیکن اب انھیں معاف نہیں کروں گا اس سے ایک سال پہلے مصری قانون میں صدر کو لامحدود اختیار دے دیئے گئے اس اعلان کے بعد گرفتاریوں کا وسیع پیمانے پر سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور جیلوں کے اندر تعذیب و تشدد کی بھٹیاں گرم ہو گئیں کچھ عرصہ کے بعد خاص فوجی عدالتوں میں ان کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا۔ پہلے اعلان ہوا کہ مقدمہ کی کارروائی ٹیلی ویژن پر دکھائی جائے گی۔ لیکن جب ملزموں نے اقبال جرم سے انکار کیا اور تشدد اور مظالم کی داستانیں بیان کیں تو فوراً ہی کارروائی ٹیلی ویژن سے روک دی گئی اور بند کمرے میں مقدمہ چلنے لگا۔ مزید یہ کہ ملزم کی طرف سے کوئی وکیل پیروی کرنے والا نہ تھا۔ ملک کے باہر کے وکلاء نے مقدمہ کی پیروی کرنا چاہی۔ مگر انھیں اجازت نہ ملی سوڈان کی بار ایسوسی ایشن کے سابق صدر وسیم محمد احمد اور بیگ کے مشہور اے۔ جے۔ ایم ونیڈال اور مراکش کے دو وکلاء نے باقاعدہ اجازت طلب کی جسے رد کر دیا گیا۔ سوڈان کے دو وکیل از خود قاہرہ پہنچ گئے اور وہاں کی بار ایسوسی ایشن میں اپنے آپ کو رجسٹرڈ کروا کر پیروی کے لئے عدالت پہنچے تو پولیس نے انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیا اور فی الفور مصر چھوڑنے پر ان کو مجبور کیا گیا۔ جنوری اور فروری میں ٹریبونل کے سامنے جو کارروائی ہوئی اس میں ملزموں نے بتایا کہ زبردستی اقبال نامے حاصل کرنے کے لئے ان کو جبر و تشدد اور اعضاء شکنی کا نشانہ بنایا گیا۔ خود سید قطب نے جو مقدمہ کی مرکزی شخصیت تھے، یہی الزام لگایا۔ ٹریبونل کے صدر نے ملزم کا منہ بند کر دیا اور ان کی شہادت سے انکار کر دیا اور اس طرح جانبداری کی بدترین مثال پیش کی۔ وکلاء کے غیر جانبدار عالمی ادارے ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بھی اس بات پر سخت احتجاج کیا۔ اگست ۱۹۶۶ء کو سید قطب اور ان کے دو ساتھیوں کو فوجی ٹریبونل نے موت کی سزا سنائی۔

ان سزاؤں پہ پوری دنیا کے اندر شدید ردعمل ہوا دینی رہنماؤں وسیاسی شخصیتوں، مذہبی اور اصلاحی تنظیموں اور اخبارات و رسائل کی طرف سے سزاؤں میں تبدیلی کی درخواست کی گئی۔ مگران کی شنوائی نہ ہو سکی اور بالآخر سید قطب اور ان کے دو ساتھی ۲۵ اگست کی صبح کو تختہ دار کو چھوتے ہوئے مالک حقیقی سے جا ملے۔

ان کے یہ شعر صحیح ثابت ہوئے "میرے دوست معرکہ عشق میں میں ہرگز نہیں اکتایا اور میں نے ہرگز ہتھیار نہیں ڈالے۔ اگر تاریکی کے لشکر مجھے چاروں طرف سے گھیر بھی لیں تو بھی مجھے صبح کے طلوع ہونے کا پختہ یقین ہے۔

"اگر میں مر جاؤں تو مجھے شہادت کا درجہ نصیب ہوگا اور ان شاء اللہ نہیں کامرانی کے جلو جانب منزل رواں دواں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی دعوت کے لئے ہمارے نام قرعہ فال ڈالا ہے۔ اگر ہم کچھ لوگ تو اپنے فرض انجام دے گئے۔ اور کچھ اپنے عہد و پیمان لئے ہوئے ہیں میں بھی اپنے آپ کو نچھاور کروں گا۔ لیکن صرف پروردگار اور دین حق پر اور یقین راسخ میں سرشار اپنے راستے پر چلتا رہوں گا یہاں تک کہ یا تو اس دنیا میں نصرت سے بہرہ یاب ہو جاؤں اور یا اللہ کی طرف چلا جاؤں اور زندگی جاوداں پانے والوں میں شامل

غزل

ڈاکٹر تفتہ

جگ جگ کے تجربات سے یہ بھید وا ہوا
اب تک میں اپنے آپ ہی کو ڈھونڈتا رہا

گاہے تعینات کی حد سے نکل گیا
گاہے میں اپنی ذات ہی میں گھومتا رہا

مقصد مری حیات کا یُوں تو خدا رہا
دراصل اپنے آپ کو میں کھوجتا رہا

تصویر چاہتا تھا میں جس کی اُتارنا
صدیوں سے اُس کے روپ ہی کو سوچتا رہا

حالانکہ اُس کے لطف سے میں آشنا نہیں
پھر بھی قدم قدم پہ اُسے پوجتا رہا

اُس کا سراغ خانۂ دل میں ملا مجھے
جس شخص کو ازل ہی سے کھوجتا رہا

افلاک بے شمار مری زد میں آ گئے
[illegible] بھید سا رہا

دُنیا کے بھید پیاز کے چھلکوں سے کم نہ تھے
کھلتے گئے میں جیسے انھیں کھولتا رہا

روتا ہوں پھوٹ پھوٹ کے صحرائے عشق میں
میں بھی کسی کے پاؤں کا چھالا بنا رہا

سچا ہوں میں - یہ سب کو جتانے کے واسطے
کیا کیا نہ جھوٹ زندگی میں بولتا رہا

اُس نے تو کر دیا ہے مری حسرتوں کا خون
جس کے لئے میں آہ! لہو تھوکتا رہا

بنگلے میں ساہوکار کے طبلے کی تھاپ تھی
مزدور کوئی جھونپڑے میں کھانستا رہا

جیسے کسی بھنور میں ہوں موجوں کے دائرے
یہ سلسلہ خیال کا یوں پھیلتا رہا

گل کے قریب کس لئے کانٹے کا ہے وجود
میں تو تمام عمر یہی تولتا رہا

میں کون ہوں کہاں سے ہے مری نمودِ ذات
برسوں مرے دماغ میں یہ سلسلا رہا

رمِ آشنا حیات میں یہ طے نہ ہو سکا
دوڑے ہیں سنگِ میل کہ میں دوڑتا رہا

اے دوست! شرحِ زیست کی میں اور کیا کروں
سایہ سا ایک ساتھ میرے بھاگتا رہا

اکثر ملا نہ مجھ کو بھی میرا کوئی سراغ
اکثر میں اپنے آپ سے بھی لاپتا رہا

لمحات زندگی کے مری یُوں گزر گئے
جیسے سہانا خواب کوئی دیکھتا رہا

روزِ ازل سے پایا ہے آتشیں مزاج
لاوا مرے وجود میں بھی کھولتا رہا

پچھلے جنم میں تو نے جو بخشا تھا زخمِ دل
اس جنم میں بھی زخم وہ یکسر ہرا رہا

جسم و اَنا کی شکل میں یکجا ہوا ہوں اب
برسوں میں کائنات میں بکھرا پڑا رہا

اک عمر میں رہا ہوں حقیقت سے منحرف
اک عمر کذب و مکر ہی میں مبتلا رہا

خواہش کا بھوت عالمِ وحشت میں بار بار
دروازہ دِل کا مدتوں ہی توڑتا رہا

تلاشی آپ ہے وہ ربّ العالمین
مولا ہی اپنی ذات کو خود ڈھونڈتا رہا

تحریریں تو آگ میں جلتی گئی مگر
کاغذ کے تن پہ رنگ سا اک دوڑتا رہا

ہونے کو سب حقیقتیں اے تفتہ مجھ میں تھیں
لیکن میں اپنی ذات کا پردا بنا رہا

غزل

اثر اندوری

ماتم کئے ہیں ہم نے گلِ اشکبار کے
برسوں رہیں گے یاد زمانے بہار کے

اک صبح خوشنما ہے تمہاری تلاش میں
مایوس کس لئے ہو شبِ غم سے ہار کے

حسنِ بہار لوٹ کے یوں مطمئن نہ ہو
پت جھڑ میں یاد آئیں گے موسم بہار کے

منسوب کر دیا انھیں شبنم کے نام سے
پھولوں کی آنکھ میں تھے جو آنسو بہار کے

اُن کی نظر سے عظمتیں رنگِ چمن کی پوچھ
جو آ رہے ہیں عمر قفس میں گزار کے

کلیوں کی زندگی سے گلوں کی حیات تک
دیکھے ہیں خوب ہم نے تماشے بہار کے

پابندیاں تو آج بھی میری زباں پہ ہیں
حق دے دیئے ہیں صرف مجھے اختیار کے

اک دل دیا ہے وہ بھی غموں سے بھرا ہوا
قربان کیوں نہ جاؤں میں پروردگار کے

ظلمت شبِ فراق کی ناکام ہی رہی
جلتے رہے چراغ ترے انتظار کے

ہر شخص دے رہا ہے فریبِ وفا ہمیں
قابل رہا نہ کوئی بھی اب اعتبار کے

دنیا جھلس رہی ہے مظالم کی آگ میں
سائے بھی تپ رہے ہیں گلِ مشکبار کے

انسان آ گیا ہے تباہی کے موڑ پر
مانگو دعائیں امن کی دامن پسار کے

تفریقِ باہمی سے پریشاں ہے کائنات
طوفان اٹھ رہے ہیں اثر انتشار کے

دار و رسن

گیان چند منصور نسیمی - لدھیانہ

محبت کا مسکن تھی جو خانقاہیں
بنی ہیں وہی اب ہوس کی پناہیں

نگاہوں سے ملنا وہ چاہیں، نہ چاہیں
نگاہوں سے لیکن ملیں گی نگاہیں

ہمیں سر کے بل ان میں چلنا پڑے گا
بہت سہل سمجھے تھے الفت کی راہیں

رہے ہیں ہمیشہ ہی فرقت کے ساتھی
مرے گرم آنسو - مری سرد آہیں

انھیں سے مرے دل کی دنیا ہے روشن
سراپا تجلی ہیں اُن کی نگاہیں

دعا بن گئی لب تک آ کر شکایت
اشاروں میں کچھ کہہ گئیں وہ نگاہیں

نکالے گئے مے کدے سے جو تائب
حرم میں بھی کیا لے سکیں گے پناہیں

محبت کے وعدے جو تو نے بھلائے
عداوت کے وعدے کہاں تک نبھاہیں

کہاں تک نظارے یہ بزمِ طرب کے
بلاتی ہیں منصور! اب رزم گاہیں

دعوتِ فکر

توصیف [illegible] آہ کیرانوی

فکر کی شمع جلاؤ تو کوئی بات بنے
من کی گر جوت جگاؤ تو کوئی بات بنے

فائدہ کیا ہے مسلنے سے چمن میں غنچے
خار بھی پھول بناؤ تو کوئی بات بنے

آگ گلشن میں لگانا تو ہے آسان بہت
اٹھتے شعلوں کو بجھاؤ تو کوئی بات بنے

ریت پر کھینچو گے آخر یہ لکیریں کب تک
نقش پتھر پہ بناؤ تو کوئی بات بنے

دھجیاں اپنے ہی دامن کی اڑانا چھوڑو
چاک اب سی کے دکھاؤ تو کوئی بات بنے

جو بجھا ڈالے ہیں اپنے ہی ہاتھوں تم نے
ان چراغوں کو جلاؤ تو کوئی بات بنے

بچ کے گرداب سے ساحل کی تمنا کیسی
راہ طوفاں میں بناؤ تو کوئی بات بنے

زخم تازہ ہیں جو انسان کے سینہ میں ابھی
ان پہ گر پھایا چڑھاؤ تو کوئی بات بنے

ماہ و انجم کی ضیاؤں سے نہ چمکے گی حیات
داغ سینہ کے جگاؤ تو کوئی بات بنے

رہنماؤں کے سہارے نہ ملے گی منزل
خود ہی گر راہ دکھاؤ تو کوئی بات بنے

خوف جن برق و شرر کا ہے لگا ہو نہ تمہیں
آشیاں ان سے سجاؤ تو کوئی بات بنے

فصل گلزار سے کھیلو گے کہاں تک آخر
خونِ گلشن پہ بہاؤ تو کوئی بات بنے

جنگ کے نعروں سے تو انساں بہت اوب گئے
امن کی راہ دکھاؤ تو کوئی بات بنے

بزم گیتی کو جو سرشار محبت کر دیں
پھر وہ جام پلاؤ تو کوئی بات بنے

ہیں جو دنیا کے لئے بہتر اخوت کا پیام
ان ہی نغموں کو گر بجاؤ تو کوئی بات بنے

غزل

سوز باندوی

ہر خطا میں نے ہی کی ہو یہ ضروری تو نہیں
بھول تم سے نہ ہوئی ہو یہ ضروری تو نہیں

ہر نظر تیری چبھی ہو یہ ضروری تو نہیں
چوٹ دل پر ہی لگی ہو یہ ضروری تو نہیں

انتظار آپ کا ہوتا ہے قیامت کی طرح
رات کٹ ہی نہ سکی ہو یہ ضروری تو نہیں

سرخ پھولوں پہ بھی شعلوں کا گماں ہوتا ہے
آگ گلشن میں لگی ہو یہ ضروری تو نہیں

پھر نہ چونکا ہے یہ اک لاش پڑی ہو کوئی
بے سبب بھیڑ لگی ہو یہ ضروری تو نہیں

اس طرح دھوپ میں دیکھو کبھی پھولوں کی طرف
چھاؤں سب کی ہی گھنی ہو یہ ضروری تو نہیں

زندگی نے بھی کئی لوگوں کو مارا اے سوز
جان بس موت نے لی ہو یہ ضروری تو نہیں

غزل

مظفر وارثی (لاہور)

دل ہے روشن، مرا بجھتی ہوئی آنکھوں پہ نہ جا
گھر یہ آباد ہے ویران دریچوں پہ نہ جا

پیٹ خالی ہے تو اُگلے ہوئے لقموں سے نہ بھر
چل چکا جن پہ زمانہ انھیں رستوں پہ نہ جا ۲

کھول کر آنکھ جھلستی ہوئی تعبیر بھی دیکھ
ساحلِ خواب سے اُٹھتی ہوئی لہروں پہ نہ جا

سر پہ یوں بوجھ اُٹھا لوں نہ بکھر جائے مٹی
اپنا رُخ دیکھ کے چل تیز ہواؤں پہ نہ جا

شق ہوئے دل تو ہنسی چھوٹ گئی پھولوں سے
بات کی تہ میں اُتر ظاہری لہجوں پہ نہ جا

اپنے جذبے ہی مظفر ترے کام آئیں گے
لوٹ لیں گے تجھے دُنیا کے ارادوں پہ نہ جا

۲ - بہت، نفیس شعر ہے - مدیر

غزل

اختر بھنگالوی

کیا خبر تھی زاغ ہی اک دن ہُما کہلائے گا
اب یہ انساں پا کے مال و زر خدا کہلائے گا

کس کو یہ معلوم تھا - ذرہ ذرہ جرم کا معتقد
بندۂ جرم و ہوا کا ہم نوا کہلائے گا

اور یہ بھی جانتا تھا کون کہ اس [illegible]
لغزشِ حق ریگزار [illegible] کی صدا کہلائے گا

آدمی خود ہی خدا بنتا رہا - ابلیس بھی
جانتا ہے کون اب یہ - اور کیا کہلائے گا

پرسشِ حالات سے غافل رہا منصف اگر
جرم کا اقدام بھی اک مشغلہ کہلائے گا

شیشۂ دل آدمی بن جائیں گے - ممکن نہیں
ہاں یہ ہو سکتا ہے بدخو باوفا کہلائے گا

قطرۂ اشکِ ندامت [illegible] شیشہ ہے ندیم
قتلِ ارماں کا یہی اب خوں بہا کہلائے گا

[illegible] اختر [illegible] سیاست کو نہ ہم سمجھے کبھی
کیا [illegible]

اُردو اکاڈمی۔ دہلی کی تعلیمی سرگرمیاں

۱۔ دہلی کے پرائمری، سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری سکولوں میں اُردو کی تعلیم کا جائزہ لیتے رہنا کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر بھی اردو تعلیم کے مسائل پر نظر رکھنا اور اُن کا حل تلاش کرنا۔

۲۔ دہلی انتظامیہ کے محکمہ تعلیم، دہلی میونسپل کارپوریشن، اور نئی دہلی میونسپل کمیٹی کو اُردو میڈیم اسکول، یا درجات کھولنے کے لئے متوجہ کرنا۔

۳۔ سرکاری اسکولوں میں اُردو اساتذہ کی ضرورت اور ان کے بروقت تقرر پر زور دینا۔

۴۔ اُردو میڈیم اسکولوں میں اُردو داں پرنسپل، لائبریرین اور اساتذہ کے تقرر پر اصرار کرنا۔

۵۔ اُردو میڈیم سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری اسکولوں میں اپنے طور پر ریاضی اور سائنس کے اُردو داں اساتذہ کا تقرر کرنا۔

۶۔ بورڈ کے امتحانات میں کمپارٹمنٹ لینے والے اُردو طلبا اور طالبات کے لئے گرمیوں کی تعطیلات میں کوچنگ کا بندوبست کرنا۔

۷۔ اُردو اسکولوں کو اُردو کی معیاری درسی اور غیر درسی کتابوں کی مُفت فراہمی

۸۔ درسی کتابیں تیار کرنے والے اداروں کو مختلف مضامین کی اُردو کتابیں بروقت مہیا کرنے پر متوجہ کرنا۔

۹۔ اُردو اسکولوں یا جماعتوں کے طلبا اور طالبات کے تقریر، مضمون نگاری، خوش نویسی، غزل اور نظم خوانی، قوالی وغیرہ کے مقابلوں کا انعقاد اور مقابلوں میں پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے طلبا اور طالبات کو نقد انعامات

دینا۔ سال ۸۷-۱۹۸۶ء میں اس مد پر کل ۹۸-۵۳۵۱۴ روپیہ خرچ کئے گئے۔

۱۰۔ اُردو تعلیم کو بڑھاوا دینے کے لئے چھٹی، آٹھویں اور دسویں جماعتوں میں اول حیثیت سے کامیاب ہونے والے طلبا اور طالبات کو وظیفے دیئے۔ اس بار ۵۰۷ طلبا کو کل ۹۵/۱۲۴۹۸۹ روپئے رقم کے وظائف ادا کئے گئے۔

۱۱۔ مجوزہ مرکزی اُردو لائبریری کے لئے اُردو کی معیاری جدید اور قدیم کتابوں کی خریداری۔

۱۲۔ خوش نویسی کے فن کو فروغ دینے کے لئے اُردو اکادمی، دہلی اُردو پرموشن بیورو کو ساتھ قائم کیا ہے جس میں ایک ساتھ ۲۵ طلبا کو اس فن کی تعلیم دی جاتی ہے اور انھیں فی کس سو روپیے ماہوار وظیفہ دیا جاتا ہے۔

۱۳ تعلیمی کمیٹی سرکاری ملازمین کو اُردو پڑھانے کے لئے شام کی کلاسوں کا اہتمام کرتی ہے اور انھیں سفر خرچ کے علاوہ انعامات بھی دیتی ہے اس مالی سال میں سفر خرچ کی رقم بڑھا کر ۰۰ اروپیہ ماہوار کردی گئی ہے۔

۱۴۔ غیر اُردو داں تعلیم یافتہ مردوں اور عورتوں کے لئے ایک سالہ اُردو سرٹیفکیٹ کورس کی تدریس کے لئے شبینہ کلاسوں کا اہتمام کرتی ہے۔ ایسے طالب علموں کو بیس روپئے ماہانہ دیا جاتا ہے

۱۵۔ اُردو اساتذہ کو نئے طریقۂ تعلیم کی بابت معلومات فراہم کرنے کے لئے آٹھ روزہ ریفریشر کورس کا اہتمام کیا گیا۔ تقریباً سو اساتذہ اس سے مستفید ہوئے۔

۱۶۔ مولانا آزاد۔ حیات اور کارنامے کے موضوع پر اکتوبر ۸۵ء میں سہ روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا۔

۱۷۔ دہلی میں اب تک سات زونل لائبریریاں قائم کی جاچکی ہیں جن میں اُردو، ہندی اور پنجابی زبانوں کی کتابیں، اخبارات اور رسائل فراہم کئے جاتے ہیں۔

۱۸۔ شہر کے مختلف علاقوں میں اخبارات و رسائل کے گوشے کھولے جاچکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے

۱۹۔ اکادمی شہر کے ضرورتمند اُردو میڈیم اسکولوں میں اُردو، سائنس و ریاضی کے اساتذہ کا تقرر اپنے خرچ پر کرتی ہے۔ کل ۲۴ اسکولوں میں ۳۴ اساتذہ کا تقرر گذشتہ مالی سال میں کیا گیا۔

المشتہر
اُردو اکادمی، دہلی
گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون نمبر: 276211

بابِ انتقاد

رازونیاز :—

رازونیاز جناب راز لائلپوری کے کلام کا تیسرا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ قیمت پچیس روپے ہے اور ناشر ماہنامہ شانِ ہند

جب کوئی اردو شاعر زیادہ مشہور ہو جاتا ہے تو بیشتر لوگوں کو اس کا تخلص ہی یاد رہ جاتا ہے۔ نام نہیں مثلاً فانی بدایونی، جگر مرادآبادی، صفی لکھنوی، محشر لکھنوی وغیرہ جناب راز لائلپوری کو بحیثیت شاعر شہرت حاصل ہے۔ اسی لئے کم لوگ جانتے ہوں گے کہ ان کا اسم گرامی دھنپت رائے سکھا ہے۔

تاریخ ولادت کا جہاں تک تعلق ہے کوئی شخص خود اپنی تاریخ ولادت کیسے بتا سکتا ہے جو ماں باپ یا دوسروں سے سنتا ہے وہی تاریخ ولادت قرار پاتی ہے۔ اسی لئے کبھی کبھی سکول میں کچھ اور تاریخ درج ہوتی ہے اور جنم پتری میں کچھ اور۔ بہرصورت جو تاریخ ماں باپ بتلاتے ہیں وہی مستند مانی جاتی ہے۔ چنانچہ جناب راز کی تاریخ ولادت ۴ر جولائی ۱۹۲۲ء ہے جناب راز پنجاب (پاکستان) کے شہر لائلپور کے ایک متمول اور ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے۔

ایک انگریزی کہاوت ہے "آوٹ آف ایول کمتھ گڈ" ترجمہ برائی سے بھلائی پیدا ہوتی۔ ہندوستان جب ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ہوا تو اس بات کا اندازہ مشکل ہے کہ کس قدر جان اور مال کا نقصان ہوا مگر اس کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ بہت سے اہلِ قلم اور شعرا مغربی پنجاب سے ہندوستان آ گئے۔ محروم، آزاد، رعنا، [illegible]۔ طالب چکوالی اور کتنے ہی اور صاحبِ کمال دہلی کی بزمِ سخن کو گرمانے لگے۔ اسی طرح ملک کے حصوں میں بھی شعرا اور ادبا تشریف لائے۔ جن

راز بھی اسی شمار میں ہیں۔

جناب راز بہت خوش اخلاق، ملنسار، خوش مزاج شخصیت رکھتے ہیں۔ ان کے احباب کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بزرگوں کا ادب۔ برابر والوں سے مخلصانہ دوستداری ان کا شعار ہے۔ ان کا دل صورتِ آئینہ صاف ہے۔ بیماری کی حالت میں بھی چہرے پر شکن نہیں لاتے۔

عرصہ دراز سے شعرا کا یہ دستور سا بن گیا ہے کہ جہاں کچھ شہرت حاصل ہوئی اپنے استاد سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ فارسی کے مشہور شاعر صائب کا ایک شعر شایانِ پیش ہے۔

"از ادب صائب خموشم ورنہ در ہر وادی
رتبہ شاگردی من نیست استاد مرا"

ترجمہ۔ صائب میں ادب کی وجہ سے خاموش ہوں ورنہ کسی بھی صنفِ شعر میں میرے استاد کو میری شاگردی کا رتبہ بھی حاصل نہیں ہے۔ برعکس اس کے جناب راز اپنے ابتدائی دور سے لے کر آج تک کے ہر استاد کا احترام کرتے ہیں۔ خود ہی تحریر فرمایا ہے۔

"شعر گوئی کا شوق فطری ہے۔ لائلپور، منٹگمری اور [illegible] میں حضرت سرشار سیالوی کی سرپرستی حاصل رہی۔ ان کے انتقال کے بعد قبلہ ساحر ہوشیارپوری کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا اور یہ سلسلۂ تلمذ آج تک جاری ہے۔ آپ نہ صرف میرے استاد مکرم ہیں بلکہ دیرینہ مشفق اور مربی بھی ہیں۔ شہریارِ سخن پروفیسر بخشی اختر امرتسری کے مشوروں اور ان کی رہنمائی کا فخر بھی مجھے حاصل ہے۔"

اسی سلسلہ میں ایک رباعی بھی تحریر فرمائی ہے۔

سرشار ہے جن کی فضیلت معلوم
ساحر کہ بہت جن کے [illegible] کی ہے دھوم
اور اختر [illegible] کہ ہیں اک ماہر فن
ہر راز ان کا ہوں، خادم یہ ہیں میرے مخدوم

جناب راز ایک شاعر کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں ان کا کلام داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ مجموعہ نور صداقت ان کی نظموں کا مجموعہ اور راز بعد عزلوں کا مجموعہ آئینہ راز شائع ہو کر مقبولِ خاص و عام ہو چکے ہیں۔ اب راز و نیاز دوسرا غزلوں کا مجموعہ اہلِ ادب کے سامنے ہے آئینۂ راز اور راز و نیاز دونوں پر اُردو اکاڈمی اتر پردیش سے انعامات ملے ہیں۔ تعجب ہے کہ اتر پردیش اکاڈمی سے تو جناب راز کی کتابیں قابلِ انعام سمجھی گئیں مگر دہلی اکاڈمی نے جہاں جناب راز عرصہ دراز سے مقیم ہیں ان کی تصانیف کو مستحقِ انعام نہیں تصور فرمایا۔

راز و نیاز جناب راز کی غزلوں۔ قطعات اور رباعیات کا مجموعہ ہے آخر میں چند قطعاتِ تاریخی بھی درج ہیں۔ کتاب کی طباعت دیدہ زیب ہے جلد دلکش۔ مضامین میں ایسا جوشِ شباب ہے کہ شاعر کو ۶۵ سال کا بزرگ نہیں خیال کیا جا سکتا۔ قطعاتِ تاریخی خوب ہیں۔ نہ تجزیہ نہ تاثر۔ غزلیات اور قطعات کی زبان شستہ اور بامحاورہ ہے۔ خاندانِ داغ کا اثر نمایاں ہے۔ بقول حضرت ساحر ہوشیارپوری "وہ (یعنی راز) اپنے جذبات و تصورات کو سلیس انداز میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ جناب بشر جھنجھانوی نے بجا ارشاد فرمایا کہ

"راز صاحب کا ایک شعر بھی مخربِ اخلاق نہیں"

راز کے یہاں آہ و زاری، رقصِ بسمل کے مضامین کی کثرت نہیں وہ بیشتر سرخوشی اور مستی کا پیغام دیتے ہیں۔ فنی اعتبار سے بھی کلام نقائص سے پاک ہے کیوں نہ ہو جناب ساحر و اختر کی رہنمائی انہیں حاصل ہے۔ صرف چند شعر راز و نیاز سے پیش کرتا ہوں۔ اہلِ مذاق راز و نیاز پڑھ کر دیکھیں

رہتے تھے کبھی ہم تم موجوں کی طرح مل کر
اب تو ہیں جدا جیسے دریا کے کنارے ہیں

قدم قدم پہ دیئے دوستوں نے لاکھ فریب
مرے خلوص میں لیکن نہ کچھ کمی آئی

شراب نوش، جنوں کار، وحشی، آوارہ
ہمیں یہ حسن کے دربار سے خطاب ملے

کچھ وہ بھی سفینے ہیں جو بحرِ حوادث میں
موجوں نے ڈبوئے ہیں طوفاں نے اچھالے ہیں

جو گا کے سناتا ہے غزل بزمِ سخن میں
ہوتا ہے گلے باز سخن ور نہیں ہوتا

اک انقلاب ہی کو ہے حاصل قرار راز
دنیا ہے جس کا نام بڑی بے ثبات ہے

ہوش میں لانا اگر ہے عاشقِ بے ہوش کو
اپنے دامانِ محبت کی ہوا دیتے رہو

آخر میں اس دعا پر مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ پروردگارِ عالم جناب راز کو اطمینان اور مسرت کے ساتھ عمر دراز کرے تاکہ وہ یوں ہی خدمتِ ادب کرتے رہیں۔ اس وقت جب اُردو پر ہندوستان میں بُرا وقت پڑا ہے ضرورت ہے ایسے حضرات کی جو جناب راز کی طرح بے لوث خدمت کریں۔

ایں کتاب خوش نما راز و نیاز
ہست دیوانے ز راز نکتہ سنج
سالِ تصنیفش لو تسلیم اے ادیب
یک ہزار و نہ صد و ہشتاد و پنج

کرشن لال ادیب لکھنوی

من کہ مکتوب الیہ

جنابِ سرور صاحب۔ براہ کرم حسب ذیل خط اپنے موقر جریدہ شانِ ہند میں شائع کر کے ممنون فرمائیں۔

فقط نیاز مند۔ صلاح الدین

محترم نقوی صاحب!

ماہنامہ شانِ ہند جون ۱۹۸۶ء کا شمارہ یقیناً آپ کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ جس میں اردو اکاڈمی کے "دلی والے" سیمینار کے تعلق سے فاضل مدیر نے کافی لمبا چوڑا مضمون سپردِ قلم کیا ہے اس مضمون میں کچھ ایسی باتیں بھی قلم بند کی گئی ہیں جن سے سنجیدہ قارئین سیمینار کے ڈائرکٹر سے بدگمانی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ سیمینار کا ڈائرکٹر ہونے کے ناطے میں اسے اپنا ادبی اور اخلاقی فریضہ سمجھتا ہوں کہ ان امور کی وضاحت ہو جائے تاکہ ادبی ریکارڈ درست رہے۔

(۱) اس سال "دلی والے سیمینار" کے لئے شخصیتوں کا انتخاب کرتے ہوئے میں نے حضرت منور لکھنوی کی شخصیت کا بھی انتخاب کیا تھا۔ چونکہ جناب [illegible] راز صاحب حضرت منور لکھنوی کے شاگرد رشید ہیں اور خود بھی ایک اچھے شاعر اور نثر نگار ہیں اس لئے میں نے منور صاحب کی شخصیت پر خاکہ لکھنے کے لئے راز صاحب کو سب سے زیادہ مناسب اور موزوں سمجھا اور اس سلسلے میں آپ سے ٹیلیفون پر درخواست بھی کی۔ راز صاحب نے [illegible] صلاح الدین نوازی میری درخواست قبول بھی فرمالی۔ لیکن جب سیمینار کی تیاریاں آخری مرحلے پر پہنچیں اور آپ [illegible] شخصیتوں اور خاکہ نگاروں کے ناموں پر تبادلہ خیال ہوا تو آپ نے نہ جانے کیوں راز صاحب کے نام پر [illegible] میں نے یہ بتایا کہ میں راز صاحب سے درخواست کر چکا ہوں اور وہ حامی بھر چکے ہیں تو آپ نے [illegible] آپ ان کو معذرت کا خط لکھ دیں گے۔ سیمینار کے سلسلے میں منعقدہ پریس کانفرنس میں جب مدیر شانِ ہند نے سوال کیا کہ راز صاحب کو اب تک سیمینار کا دعوت نامہ کیوں نہیں ملا [illegible] داری اپنے سر لیتے ہوئے بھری کانفرنس میں معذرت قبول کرلی تھی جس کے لئے آپ نے کانفرنس [illegible] ادا کیا تھا۔

(۲) گذشتہ سال یعنی ۱۹۸۵ء کے "دلی والے" سیمینار کے لئے شخصیتوں کا تعین کرتے ہوئے جو فہرست [illegible] گئی تھی اس میں حضرت مستحسن فاروقی صاحب کا نام نہیں تھا۔ آپ نے فہرست پر نظر ثانی کرتے ہوئے نہ صرف میری توجہ اس طرف مبذول کرائی بلکہ مرحوم پر خاکہ لکھنے کا اظہار بھی کیا۔ لیکن شاید آپ دفتری مصروفیات کے باعث وہ خاکہ نہ لکھ سکے۔ اس سال پھر آپ نے فاروقی صاحب پر خاکہ لکھنے کی خواہش کا اعادہ کیا جس کا پروگرام میں باقاعدہ اعلان کیا گیا لیکن اس بار بھی اکاڈمی کی مصروفیات کے باعث آپ خاکہ تحریر نہ کر سکے۔ علاوہ ازیں چند اور لوگوں کے متعلق بھی آپ نے تاکید فرمائی کہ ان لوگوں سے نہ لکھوایا جائے اور میں نے باوجود اس کے کہ ان حضرات سے راز صاحب کی طرح خاکہ لکھوانے کا وعدہ لے لیا تھا پر آپ کی خواہش کے احترام میں وعدہ خلافی کا ارتکاب کرتے ہوئے ساری ذمہ داری میں نے اپنے اوپر لے لی چونکہ ان لوگوں کے نام لکھنے سے اکاڈمی کی بدنامی اور آپ کے بارے میں بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے میں ان کے ذکر سے اجتناب کرنا ہی مناسب سمجھتا ہوں لیکن چونکہ چند باتوں کی وضاحت ہونا اب ضروری ہو گئی ہے اس لئے آپ سے گذارش ہے کہ اکاڈمی کا ذمہ دار سربراہ ہونے کے ناطے آپ مدیر شانِ ہند کے نام وضاحت فرمائیں تاکہ ادبی ریکارڈ ذاتی تعلقات اور سماجی معاملات درست رہیں۔ اور اکاڈمی کے ایک ممبر کے بارے میں سیمینار کے تعلق سے مدیر شانِ ہند کو جو بدگمانی ہوئی ہے وہ دور ہو سکے۔

خیر اندیش

صلاح الدین (ممبر اردو اکاڈمی)

Phone: 273602
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57
JUNE 1986

خرید کر پڑھئے
مانگ کر پڑھئے
یا پھر
چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمّل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شان دار ادبی دستاویز ہے۔ اِس میں شامل ہیں :

قیمت : پندرہ روپے

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
★ نادر و نایاب تصویریں۔
★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔
★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اُردو ڈائجسٹ آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

**SPECIAL
FAKHIR TONKI
NUMBER**

رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی) این 353 رجسٹریشن نمبر 644/57 رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر 275602

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

ایڈیٹر
سرورؔ تونسوی

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی

فی پرچہ تین روپے
زرِ سالانہ -/24 روپے

فاخر نمبر

جلد نمبر ۴۷ جولائی سنہ ۱۹۸۶ء شمارہ نمبر ۷

فاخرؔ ٹونکی (مرحوم)

فاخرؔ ٹونکی (مرحوم) خوش نصیب تھے کہ اُن کے انتقال کے بعد ٹونک کے شعرائے کرام ادیبوں اور اُردو دانش وروں نے ان کی یاد میں ایک جلسہ کیا۔ ورنہ آج اُردو کے نام لیواؤں کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا ہی اپنا نصب العین سمجھتے ہیں۔

فاخرؔ مرحوم واقعی شاعر تھے۔ اب سے چوتھائی صدی سے بھی زائد عرصہ ہوا کہ راقم ٹونک کو اپنا گھر سمجھتا تھا اور قبلہ صولتؔ ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ہفتوں ٹونک میں مقیم رہتا تھا، تو فاخرؔ صاحب سے اکثر و بیشتر ملاقات رہتی تھی۔ فاخرؔ، قبلہ صولتؔ رح کی عزت و توقیر کرنے میں کسی سے کم نہ تھے اور قبلہ صولتؔ رح بھی کلامِ فاخرؔ سن کر خوب خوب داد دیتے تھے۔ اور فاخرؔ صاحب کو درازیٔ عمر۔ شہرت اور اقبال مندی کی دعائیں دیا کرتے تھے۔

یہ مشہور ہے کہ قبلہ صولتؔ رح ایسے زود گو پیدائشی شاعروں کی وجہ سے ٹونک کے اکثر شاعر محض نام کے شاعر ہیں۔ ورنہ ان کا جملہ کلام کسی نہ کسی اُستاد کا عطا کردہ ہے۔ مگر یہ ڈنکے کی چوٹ کہا جا سکتا ہے کہ فاخرؔ مرحوم واقعی شاعر تھے۔ اور ٹونک میں جس قدر بھی خود کہنے والے شاعر ہیں اُن کی صفِ اول میں مقام رکھتے تھے۔ خدا فاخرؔ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)

دیا پرکاش سرورؔ تونسوی۔
ایڈیٹر

دیا پرکاش سرورؔ تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی ... کے صفحات ... دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

شعرائے کرام اور ادیب حضرات توجّہ فرمائیں

آپ میں سے کتنے ہی حضرات ایسے ہوں گے جو اپنی تخلیقات کو کتابی شکل میں دیکھنا چاہتے ہوں گے۔ مگر یاد رکھیے کہ شاعری اور ادبی تخلیقات شاعر یا ادیب کی اپنی دماغی کاوش کا نتیجہ ہوتی ہیں مگر ان تخلیقات کو موزوں اور دلکش انداز میں کتابی شکل میں پیش کرنا ہر شاعر یا ادیب کے بس کا روگ نہیں ہے۔

ادارہ شانِ ہند

یہ خدمات بطریق احسن سر انجام دے رہا ہے یعنی اچھی کتابوں کی بہترین انداز میں اشاعت اور جدید طریقوں سے کتابوں کی نکاسی وفروختگی۔ اگر آپ بھی اپنی تخلیقات کو بہترین اور دلکش انداز میں شائع کرانا چاہتے ہیں تو پھر ادارہ ماہنامہ شانِ ہند کی خدمات حاصل کیجئے۔

دفتر ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

اُردو اکاڈمی راجستھان

راجستھان اُردو اکاڈمی کا جنم جناب بھیروں سنگھ شیخاوٹ کے عہدِ حکومت میں ہوا تھا جب کہ آپ جنتا پارٹی کے دورِ اقتدار میں راجستھان کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ جناب بھیروں سنگھ شیخاوٹ جن سنگھ کے ایک مستند اور کٹر لیڈر رہیں اور کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی جن سنگھی گرم توے پر بیٹھ کر بھی حلف اٹھائے کہ وہ اُردو اور مسلمانوں کا خیر خواہ ہے تو اُس پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ لہٰذا راجستھان کی اُردو اکاڈمی جن سنگھ کے اس مسلمہ لیڈر کی قیادت میں جب وجود میں آئی تو وہ محض نام کی اُردو اکاڈمی تھی۔ اور اُسے اس قدر محدود اور معمولی بجٹ بخشا گیا تھا کہ نہ تو یہ اُردو اکاڈمی اپنے لیے دفتر ہی لے سکتی تھی اور تو اور دفتر کے لیے محض فرنیچر اور نام کا سائن بورڈ بھی بنوانے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔

جنتا پارٹی کی حکومت ختم ہوئی تو کانگریس کی حکومت آئی اور توقع تھی کہ یہ حکومت کم از کم اپنے نام کی لاج ضرور رکھے گی اور راجستھان اُردو اکاڈمی کی طرف خاص توجہ دے گی۔ کانگریس راج میں اتنا ضرور ہوا کہ اکاڈمی کو دفتر مل گیا۔ فرنیچر مل گیا۔ اور کچھ اسٹاف بھی، اردو اکاڈمی کے ذمہ دار حضرات نے اپنی بساط کے مطابق کام بھی کیا مگر راجستھان کی اُردو اکاڈمی پنپ نہ سکی۔ مقامی طور پر اُردو کے کچھ دانشور شرپسند مسلمان اکاڈمی کو تارپیڈو کرتے رہے اور اکاڈمی دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں صفر کے برابر رہی ہے۔

اس وقت اکاڈمی کا سالانہ بجٹ دو لاکھ دس ہزار روپیہ ہے۔ بقول ننگی کیا نہائے گی اور کیا نچوڑے گی۔ اس معمولی بجٹ کو بھی اگر عقل مندی۔ کتابت [illegible] اور ضروری اخراجات کے لیے ہی استعمال کیا جائے [illegible] کی اُردو اکاڈمی بہت مفید کام انجام دے سکتی ہے۔

جناب بھیروں سنگھ شیخاوٹ کے مقابلہ میں کانگریسی وزیرِ اعلیٰ بھی کچھ مفید ثابت نہ ہو سکے۔ کیونکہ راجستھان کے خواہ کانگریسی ہوں یا جن سنگھی۔ سب ہی اُردو کو ایک نظر سے ہی دیکھتے ہیں۔ کانگریسی بے شک دکھاوے کے طور پر اپنی پارٹی کے لائحہ عمل کے باعث مجبوراً اردو کے خلاف آواز بلند نہ کریں۔ مگر دل سے اُردو کے معاملہ میں یہ جن سنگھیوں سے کم نہیں ہیں۔ لہٰذا کسی بھی کانگریسی وزیرِ اعلیٰ نے راجستھان میں اُردو اکاڈمی کی طرف توجہ نہ دی ہاں روٹین کے مطابق اس کا وجود ضرور ہے۔ مگر یہ کس مپرسی کی حالت میں ہے، اس کا جائزہ کسی بھی کانگریسی وزیرِ اعلیٰ نے نہیں لیا۔ اُردو کی یہ بھی بدقسمتی ہے کہ اس کے مسلمان دانشور محض لقمہ ہائے تر کی خاطر بساط بھر اُردو اکاڈمیوں کی مخالفت میں لگے ہوئے ہیں، انھیں یہ احساس ہے کہ [illegible] نامور اور جوڑ توڑ میں ماہر اُردو دانشور اکاڈمیوں سے ناجائز فائدے اُٹھا رہے ہیں اور انھیں اس بہتی گنگا میں ڈبکی لگانے کا موقع میسر آنے نہیں دیتے۔ اس لیے اُردو کی ٹانگ اُردو والے ہی کھینچ رہے ہیں۔ یہی حال راجستھان کی اُردو اکاڈمی کا بھی ہے۔ جناب فضل امام اپنی تمام تر شاطرانہ چالوں کے باوجود اُردو اکاڈمی کا نظم و نسق اپنے قبضہ میں نہ لے سکے۔ راجستھان کا ہر کانگریسی وزیرِ اعلیٰ خواہ اُردو کی ترقی کا خواہاں نہ ہو مگر وہ اُردو کے مسلمان دانشوروں کے ہتھکنڈوں سے ضرور واقفیت رکھتا ہے۔ لہٰذا کانگریسی وزیرِ اعلیٰ نے اس مرتبہ راجستھان اُردو اکاڈمی کا چیرمین ایک ایسے شخص کو بنا دیا جسے دُنیائے

اردو میں شاید دو چار حضرات بھی نہ جانتے تھے اور جے پور سے سینکڑوں کلومیٹر کی دوری پر قیام پذیر ہے۔ کانگریسی وزیر اعلیٰ نے ایسا کر کے دوہری چال چلی۔ اولین یہ کہ جے پور کی فضل امام اینڈ کمپنی منہ تاکتی رہ گئی اور دوسرے اردو اکاڈمی ایک ایسے شخص کی تحویل میں دے دی گئی جو اکاڈمی کی ترقی کے لیے حکومت کے لیے دردِ سر نہ بن سکے۔

موجودہ چیرمین اردو اکاڈمی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ راجستھان میں ٹونک ایک ایسا مقام ہے جہاں اردو نے پناہ لی ہے۔ راجستھان کی اردو سرگرمیوں کی تاریخ تب تک مکمل ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ ٹونک کا اس میں ذکرِ طویل نہ ہو۔

پچھلے دنوں راجستھان اردو اکاڈمی جشن جستھان کے موقع پر ایک مشاعرہ کرایا، اور کیا غضب ہے کہ اس خالص راجستھانی اردو کے مشاعرہ میں راجستھان کے مستند اور قدیم شعراء کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اور خصوصی طور پر ٹونک کے شعرائے کرام سے ناانصافی کی گئی۔ جناب اثر آدو سعیدی جو پندرہ سالوں سے انڈو پاک مشاعروں میں شرکت کرتے رہے ہیں انھیں بھی یاد نہ رکھا گیا۔ چیرمن اردو اکاڈمی راجستھان کو چاہیے کہ وہ اپنی کم ہمتی کو چھپائے بغیر اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں۔ کیوں کہ ان کے لیے ایسا کرنا بہتر رہے گا۔ بجائے اس کے کہ وہ غرض مندوں کے ہاتھوں میں کھیلتے ہوئے اپنے آپ کو مذاق کا مضمون بننے پر مجبور ہوں۔

راجستھان کے وزیر اعلیٰ کو بھی چاہیے کہ وہ راجستھان اردو اکاڈمی کو محض رسم پورا کرنے کے لیے بنائے نہ رکھیں بلکہ اسے ایک فعال ادارہ بنانے کی کوشش کریں اور اس کا بجٹ بھی بڑھائیں اور اس کا چیرمین کسی ایسے معتبر اور اردو پرست کو بنائیں جو واقعی اس ادارہ کو فعال بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

> اردو پڑھیے، اردو لکھیے، اردو بولیے:

انجمن تعمیر اردو ٹونک

سرپرست: عالی جناب مرزا رفیع اللہ بیگ
مشیر اعلیٰ: حضرت صائب
مشیر قانونی: جناب مظہر عالم ایڈوکیٹ
معاون اعزازی: جناب تخلیق حسن فاضلی
صدر: جناب شمیم ٹونکی
نائب صدر: جناب بابو رفیق عالم فریدی
جناب گلزار صابی
جنرل سکریٹری: جناب انور اعجازی
جوائنٹ سکریٹری: جناب ترنم اعجازی
جناب شاد کیفی
خازن: جناب برق اعجازی

انچارج شعبۂ نقد و نظر:

جناب مولوی سعید احمد
جناب عمر سیفی
انچارج شعبۂ نشر۔ جناب مہدی ٹونکی
انچارج شعبۂ شاعرات: محترمہ ہما صاحبہ

انچارج طباعت و اشاعت:

جناب رفیق سورتی
جناب محمد شفیق صبائی
انچارج پبلسٹی۔ جناب قیصر آفریدی
آرگنائزنگ سکریٹری۔ جناب سعید الدین

معاون انجمن

بزمِ احبابِ ادب ٹونک
انجمن تعمیر ادب کا ہیڈ آفس: ادبستانِ صائب ٹونک
برانچ آفس: دبستانِ کیف ٹونک
مرکز ادب انجمن تعمیر اردو: دفتر انجمن تعمیر اردو ٹونک
نزد ہاشمی پیلس۔ نزد قصرِ رفیع ٹونک (راجستھان)

تاج اکیڈمی

نذر باغ پیلیس ٹونک

آج یکم مئی ۱۹۸۶ء بروز جمعرات بوقت ۷½ بجے شب تاج اکیڈمی کے ممبران کی ایک عام میٹنگ منعقد ہوئی جس میں اکیڈمی کی از سر نو تنظیم و تشکیل کی گئی۔ عہدیداران اور اراکین کا انتخاب عمل میں آیا جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں :-

عہدیداران

نام	عہدہ
جنابہ عالیہ ملکہ عزیز الزمانی بیگم صاحبہ	سرپرست
جناب مرزا رفیع اللہ بیگ صاحب	صدر
جناب مولانا سید قاضی الاسلام صاحب	نائب صدر
جناب صاحبزادہ عزیز الحق صاحب	" "
جناب مولانا سید عبدالقادر صاحب خنداں	مشیر خصوصی
جناب مولانا سید منظور الحسن صاحب برکاتی	ناظم نشر و اشاعت
جناب صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب	سکریٹری
جناب مولانا صلاح الدین صاحب قمر	جائنٹ سکریٹری
جناب عماد الدین خاں صاحب مراد	خازن

اراکینِ مجلسِ منتظمہ

جناب ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب ———— (ممبر)
جناب مخمور سعیدی صاحب ———— ״
جناب این۔ اے۔ راہی صاحب ———— ״
جناب شیخ حامد صاحب بمبئی والے ———— ״
جناب فضل الرحمٰن خان صاحب رحمانی ———— ״
جناب صادق صاحب صدیقی ———— ״
جناب محمد عمر خان صاحب ندوی ———— ״
جناب صاحبزادہ عابد عاقل صاحب ———— ״
جناب سید احمد صاحب پی۔ آر۔ او۔ ———— ״
جناب صاحبزادہ عبدالقوی صاحب قوی ———— ״
جناب اے۔ ایف عثمانی صاحب ———— ״
جناب مولانا محمد عامر خان صاحب ندوی ———— ״
جناب ایس۔ ایم۔ نسیم صاحب ———— ״
جناب قاری عبدالغفار صاحب ———— ״
جناب صاحبزادہ امداد علی خان صاحب شمیم ———— ״
جناب صاحبزادہ امجد علی خاں صاحب ———— ״
جناب مولانا جمیل احمد صاحب ———— ״

دستخط

(صاحبزادہ شوکت علی خاں)
سکریٹری

بے مثال ــــ کم قیمت ــــ روشن کتب

کتاب	صنف	مصنف	قیمت
ہر بار کہا دل نے	افسانے	ڈاکٹر اودے سرن ارمان	35/-
اپنا دامن اپنی آگ	"	ڈاکٹر کیول دھیر	30/-
گہری پرچھائیاں	ناول	بی۔ ایس۔ بادل	26/-
دیوان	شاعری	ناصر کاظمی	12/50
جنون	"	کے۔ کے سنگھ میئنک	10/-
سپنے	"	چندن بھارتی	20/-
ساحر لدھیانوی نمبر	خاص نمبر	فن و شخصیت بمبئی۔	80/-
اردو ہندی ڈکشنری	ڈکشنری	انجمن ترقی اردو ہند	50/-
اسٹینڈرڈ انگلش اردو	"	" " "	95/-
صد چاک	شاعری	دواکر راہی	40/-
کراچی کا تاریخی مقدمہ	رپورتاژ	مرزا عبدالقادر بیگ	20/50
آزادی کی نظمیں	نظمیں	مرتب سبطِ حسن	10/-
متاعِ صبا	شاعری	صبا افغانی	35/-
غذائی مسئلے کا حل	غذائی مسئلہ	اے جگت سنگھ	18/-
اردو کلاسیکی ہندی اور انگریزی	ڈکشنری	جان ٹی پلیٹس	72/-
راز و نیاز	شاعری	راز لائلپوری	25/-
جاناں جاناں	"	احمد فراز	[illegible]/-
بیس نئی کہانیاں	افسانے	علی احمد فاطمی	20/-
بے جڑ کے پودے	"	سہیل عظیم آبادی	14/-
تنکے کا سہارا	"	شکیلہ اختر	16/-
مجبور	ناول	اظہار صہبائی	20/-
معصوم آنکھوں کا بھرم	افسانے	رام لعل	10/-

زرد پتوں کی بہار : سفر نامہ پاکستان : رام لعل -/13 نیا ساز نیا انداز : شاعری : نازش پرتاپ گڈھی 15/35

اس کے علاوہ ہر موضوع پر اپنی پسندیدہ کسی بھی کتاب کے لیے ہمیں لکھئے۔ یاد رکھئے۔ ہندوستان بھر میں چھپنے والی کسی بھی اردو کتاب کے لیے آپ کو کہیں بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری خدمات آپ ہی کے لیے ہیں۔

ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

زاہد علی خاں شمیم
صدر انجمن تعمیر اردو ٹونک

فاخر اعجازی ـــ "ایک اسپورٹ مین" کی حیثیت سے

حضرت فاخر اعجازی، شعر و ادب کے میدان میں جس مقام و مرتبہ کے حامل تھے ان کی یہ مسلمہ حیثیت تمام اہل علم و اصحاب فن سے مخفی نہیں ہے۔ فاخر صاحب کی وفات نے ان کی شخصیت کے ان مختلف پہلوؤں کو نمایاں کر دیا ہے۔ جن سے اکثر حضرات واقف نہ تھے۔ شعر و شاعری اور درس و تدریس کے ساتھ ان کے دیگر مشاغل کیا تھے اور وہ کن چیزوں سے بطور خاص شغف رکھتے تھے۔ یہ بات ان کے مخلص ملنے احباب کے علاوہ کسی کے علم میں نہیں ہے۔

فاخر صاحب شعر و شاعری کے وافر ذوق کے ساتھ کھیلوں سے دلچسپی رکھتے تھے وہ خود بھی ایک اچھے اسپورٹس مین تھے اور کرکٹ اور شوٹنگ بال کے کھیلوں سے انھیں بے حد شغف تھا۔ کھیلوں کی کمنٹری سننے کے بھی وہ بہت شائق تھے۔ ہند و پاک کی ٹیموں میں جب مقابلہ کے میچ ہوا کرتے تھے تو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ ان کھیلوں کے میچ دیکھتے اور اُن کی کمنٹری سنتے اور نہ صرف خود سنتے اور دیکھتے بلکہ احباب کو اپنے دولت کدہ پر مدعو کرتے اور "میچوں کا آنکھوں دیکھا حال" انھیں سناتے اور دکھاتے بھی تھے اور پھر احباب کی تواضع بھی چائے پان۔ شربت وغیرہ سے کیا کرتے۔ وہ اس معاملہ میں اس شدت کے ساتھ محب وطن تھے کہ ہندوستان کی ٹیم جب کوئی اہم میچ جیت لیتی تو اس کی خوشی میں پارٹیاں اور دعوتیں کرتے اور بڑے فخر کے ساتھ اس کامیابی کا اظہار فرماتے اور اسم باسمّیٰ "فاخر" بن کر ہندوستان کی عظمت کے ترانے گاتے ـــ فاخر صاحب کی کھیلوں سے اس دلچسپی کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ اسکول سے ریٹائرمنٹ کے بعد اور اپنی رحلت سے چند ماہ قبل شوٹنگ بال کا ایک کلب بھی انھوں نے قائم کیا تھا جس کے وہ خود روح رواں تھے۔ اس کلب کے ذریعہ انھوں نے ایک عالی شان ٹورنامنٹ بھی منعقد کرایا تھا۔ جس میں شہر کے علاوہ ضلع کے دوسرے شہروں سے بھی ٹیموں نے شرکت کی تھی۔

فاخر صاحب کی وفات کے بعد انجمن تعمیر اردو کے اراکین نے اپنے بانی اور سرپرست حضرت فاخر اعجاز کا کے اس ذوق کو جِلا دینے اور ان کی یادگار قائم رکھنے کے لیے ۱۱ر ۱۲ر اپریل [illegible] کو "فاخر میموریل ٹورنامنٹ" کا انعقاد کیا۔ یہ یادگاری ٹورنامنٹ۔ فاخر صاحب کے نام اور اُن کے ذوق کو روشن کرنے کا سبب بنا اور ضلع ٹونک کی ۱۳ ٹیموں نے اس میں حصّہ لیا۔ کھیلوں کے اس مقابلہ میں جو کلب سب سے نمایاں رہا اور جس کی کارکردگی درجہ اول رہی وہ صدیقی کلب ہے۔ یہ کلب عزیزیہ گرلس اسکول محلہ اجین کے میدان میں عرصہ ۱۳ سال سے قایم ہے۔ اور پابندئ وقت کے ساتھ اس کلب کے کھلاڑی روزانہ شام کو یہاں حاضر ہوتے اور اس میدان میں تگ تاز کرتے ہیں۔ ان کی یہ مشق مسلسل جاری رہتی ہے۔ صدیقی کلب کے بانی و سرپرست جناب سیٹھ حامد صدیقی صاحب ہیں۔ جو ہمارے ہی شہر کے معزز شہری ہیں لیکن عرصہ دراز سے بسلسلۂ کاروبار تجارت بمبئی میں مقیم ہیں۔ جب اپنے والد بزرگوار شیخ الحاج محمد صدیقی سے ملنے ٹونک آتے ہیں تو وہ اس کلب کی کارکردگی کو ملاحظہ فرما کر مسرور ہوتے ہیں اور اس مسرت کے نتیجہ میں کلب کے ساتھ ہر قسم کا تعاون فرماتے ہیں۔

صدیقی کلب نے اب تک کئی مقامی اور صوبائی مقابلوں

میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے کھیلوں کی دنیا میں نام پیدا کیا ہے اور اس کے مندرجہ ذیل کھلاڑی انڈیا لیول کے کھیلوں میں حصہ لے کر اپنے بہترین کھیل کا مظاہرہ کر چکے ہیں، اور انڈیا لیول کے مقابلوں میں اپنا سکہ جما چکے ہیں۔

۱۔ خلیل الرحمٰن خاں ۲۔ الطاف حسین ۳۔ محمد صدیق پٹھان ۴۔ حسن رضا ۵۔ سعید الدین عرف سیفو بھائی۔

یہ کلب اور اس کے پلیر ضلع ٹونک کے میچوں میں بھی ہمیشہ "ورزہ" رہے ہیں۔ فاخر صاحب مرحوم کو اس کلب سے بطور خاص دلچسپی تھی وہ اکثر اس کے نشستوں میں شریک ہوا کرتے تھے اور اس کلب کے کھلاڑیوں سے انہیں دلی انس اور محبت تھی۔

آہ ایسا دلدادہ اور کھیل کا شایق فاخر اعجازی ہم سے ہمیشہ ہمیش کے لیے جدا ہو گیا۔ اُن کی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں میں باقی رہے گی۔

ہماری دعا ہے کہ خدا انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اُن کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

سرگروہ صاحبزادہ امداد علی خاں نعیم صدر انجمن تعمیر اردو ٹونک۔

ازجناب مرزا رفیع اللہ بیگ صاحب
سرپرست انجمن تعمیر اردو ٹونک۔

حضرت فاخر اعجازی کی یاد

سرزمین ٹونک کو اپنی جن علمی، فنی اور ادبی خصوصیات کی بنا پر بابائے علم میں ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ ان میں صنف سخن شعر و سخن کو نمایاں مقام حاصل ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر اسے دہلی، لکھنؤ اسکول کی طرح شاعری کا ایک منفرد اسکول تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ دہلی و لکھنؤ کے اساتذہ قدیم [illegible] مظفر خیرآبادی، بسمل خیرآبادی جیسے مایۂ ناز شعراء نوابین صاحبان کے دربار سے منسلک رہے اور اُن کے تلامذہ کی ایک کثیر تعداد نے ٹونک کے ادب و شعر پر اپنی چھاپ لگا دی۔

شعر و ادب کا یہ قافلہ تیز گامی سے رواں دواں رہا۔ یہاں تک کہ امام الشعراء حضرت کیف مرحوم اور اُن کے خلف الصدق حضرت سحیف نے ان شعری روایات کو پروان چڑھانے میں نمایاں خدمات انجام دیں اور اپنے جانشین شعر و شاعری کی دنیا میں چھوڑے جن کے دم سے آج بھی ٹونک کی شعری عظمتیں مثلِ چراغ روشن ہیں۔ میری مراد [illegible] استاد [illegible] سے ہے جو حضرت سحیف کے نہ صرف [illegible] کے شعری کارواں کے سالار کل ہیں [illegible] جن شعراء کی تربیت کی اُن میں چند سے

شہر کے ایک باصلاحیت اور نہایت ہی ذہین شاعر حضرت فاخر اعجازی کا نام سرِفہرست ہے۔ فاخر صاحب اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت صاحب صاحب سے پورا پورا فیض اُٹھا یا اور ٹونک کی نئی نسل کے شعراء میں جو مقام و مرتبہ حاصل کیا وہ اُن کے ہمعصر شعراء میں خاص انھیں کا حصہ تھا۔

شاعری کے آغاز ہی سے وہ رومان و محبت کے مضامین کو شعری جامہ پہنانے میں ایک خاص سلیقہ برتنے لگے اور مشق و مہارت کی بدولت ترقی کرتے کرتے ایک مشاق رومانی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ وہ چونکہ تعلیم یافتہ انسان تھے اور سرکاری اسکول میں ہیڈ ٹیچر کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اس لیے ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ اپنے استاد سے فن شاعری کے رموز و نکات سیکھنے کے بعد وہ جن شعراء صاحبان سے زیادہ متاثر ہوئے اُن میں ادیب الملک حضرت اختر شیرانی اور جناب قبلہ استاد حضرت علامہ بسمل سعیدی صاحب رحمہ تھے۔ اختر شیرانی کی رومانی شاعری سے انھیں خاص لگاؤ تھا اور اُن کا یہی لگاؤ رومانی شاعری کی صف میں لانے کا سبب بنا۔

حضرت اختر شیرانی کی شاعری میں رومانی محبت کے جو عناصر بدرجہ حسن و کمال پیوست تھے فاخر اعجازی نے اُن سب کو اپنی شعری تخلیقات میں اس طرح جذب کر لیا تھا کہ وہ اُن کی شاعری کی فطرت ثانیہ بن گئے تھے۔ ماحول کے زیر اثر اُن کی محبت بیز فطرت نے حسن و عشق کے رمز و کنایہ کا جس خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے وہ اُن کے شاعرانہ ذوق کا غماز ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اگرچہ اُن کی طبع رسا ہر صنفِ سخن میں جولانی دکھانے سے قاصر نہ تھی۔ نظم گوئی میں بھی انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ سہرے۔ قصیدے۔ مرثیے۔ قطعے۔ رباعیاں سب ہی اُن سے یادگار ہیں۔ مستقل شعر گوئی کے ساتھ نقد و نظر کا ملکہ بھی قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نو مشق و نو عمر تلامذہ کا ایک معقول حلقہ اُن کے گرد ہر وقت جمع رہتا تھا اور خود بھی مشاعروں کی غزلوں پر اُن کی اصلاح سے بزم مشاعرہ سرگرم ہو جاتی۔ انجمن تعمیر اردو کی سرپرستی قبول کرنے کے بعد وہ نوخیز شعراء کی تربیت میں ہر وقت مصروف نظر آتے تھے۔ افسوس یکم جنوری ۱۹۹۵ء کی صبح نو جیسے طلوع ہوئی تو شاعری کا یہ بلبل ہزار داستان اور عندلیب شیوا بیان اچانک خاموش ہو گیا۔ اس کی شمع حیات دم کے دم میں گل ہو گئی۔

سبھی کی خوشیاں اس وحشت ناک خبر سے مبدل بہ غم سرد ہو گئیں۔ ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل آہ و فغاں سے بھر گیا۔ ہر انسان نے فاخر کی اس جدائی کو اپنا ذاتی غم سمجھا۔ ٹونک میں شعر و ادب کے درخشاں مستقبل پر تاریکیوں کے سائے منڈلانے لگے۔ دل پر پتھر کی سل رکھ کر سب نے فاخر صاحب کی میت کو اُن کی آخری آرام گاہ پہنچا کر ان کی یاد میں تعزیتی جلسے کیے۔ شعراء نے نظمیں لکھیں اور ہر شخص نے اپنے تعلق اور رشتہ کی حد تک اس کا ماتم کیا۔ سب سے پہلے تعزیتی جلسہ [illegible] میں منعقد ہوا۔ جو انجمن تعمیر اردو کی جانب سے بلایا گیا تھا۔ اس جلسے میں شہر کی تمام ادبی انجمنوں کے نمائندے موجود تھے۔ اس جلسہ میں شعراء کرام نے جو تعزیتی نظمیں، قطعے اور مرثیے بطور اظہار عقیدت پیش کیے اور جن ادبائے اپنے تاثرات و خیالات تحریری و تقریری انداز میں اظہار کیا۔ اُن سب کو جمع کر کے شائع کرنے کی تجویز طے پائی۔ اس تجویز کے محرک خصوصی صاحب زادہ امداد علی خاں شمیم صدر انجمن تعمیر اردو، صاحب زادہ انور علی خاں انور جنرل سکریٹری و جملہ اراکین انجمن تعمیر اردو اور فاخر صاحب کے مخلص دوست ٹونک میں شعر و ادب کی جان۔ ملک کے مشہور و معروف شاعر جناب مراد سعیدی تھے۔ مراد صاحب اور فاخر مرحوم کے درمیان جو رشتۂ اخلاص و مودت قائم تھا۔ مراد صاحب اس نیک محبت کو اخلاص کے گوہر آبدار سے تابناک بنائے رکھنے میں اہم رول ادا کیا۔ فاخر صاحب کی اچانک وفات نے اس رشتۂ اخلاص میں اور بھی شدت و التہاب پیدا کر دیا۔ یہ اس خلاء کو پُر کرنے کا واحد راستہ اب یہی ہے کہ ہم اُن کی یاد میں کوئی یادگاری کام انجام دیں اور اُن کے افکار شعری کو طبع کرائیں تاکہ اُن کی ادبی شخصیت اُن کے کلام کے آئینہ میں جلوہ گر رہ کر ادب کا حصہ بن سکے۔ احباب و مخلصین کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے مراد صاحب نے امداد علی خاں شمیم صدر انجمن اور صاحبزادہ انور علی خاں انور جنرل سکریٹری انجمن تعمیر اردو کے تعاون سے اس کام کا آغاز اس فاخر نمبر سے کیا ہے جو فاخر نمبر کی حیثیت سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے توقع ہے کہ فاخر صاحب کے تلامذہ، احباب اور مخلصین فاخر صاحب کے مجموعۂ کلام کی مکمل اشاعت کے انتظام سے غافل نہ رہیں گے۔ یہ یادگاری نمبر تو اس مہم کی ایک کڑی ہے۔

آخر میں اپنے رفقاء کار کے شکریہ کے ساتھ رسالہ شانِ ہند کے ایڈیٹر جناب سرور صاحب تونسوی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے فاخر صاحب سے قرب تعلق کی بنا پر اپنے رسالہ کا فاخر نمبر نکالنے کی ہماری تجویز منظور کی اور فاخر صاحب کی وفات پر مختلف شعراء اور اُدبا کے تاثرات شائع کرنے کا التزام فرمایا۔

3

ان اشعار پر ختم کر رہا ہوں۔

ایسے اشعار کہ موجوں کا تلاطم جیسے
ایسی آواز کہ جھرنوں کا ترنم جیسے
مسکراہٹ تھی کہ غنچوں کا تبسم جیسے
وہ تخاطب کہ شگوفوں کا تکلم جیسے

پیار میں ڈوبا ہوا ہائے وہ اندازِ کلام
روحِ فاخر تری خدمت میں محبت کا سلام

حکیم فضل الرحمٰن رحمانی
ٹونک (راج)

یادوں کی پرچھائیاں

مراد سعیدی صاحب کا شانِ ہند کے فاخر نمبر کے لیے کچھ لکھنے کا حکم ملا تو سطحِ دماغ کے رنگین پردے پر پرچھائیاں ابھرنے لگیں۔ یہ یادیں چند دنوں کی نہیں سالوں کی ہیں۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۸۵ء تک کی یادیں۔

یعنی مرحوم فاخر اور اپنی عمر کا بچپن لڑکپن، شباب اور بڑھاپا تو ہر عمر کو ضرور ملتا ہے۔ لیکن فاخر تو اس منزل کو چھونا ہی چاہتا تھا۔ مگر زندگیِ نو کی جھلک دیکھ کر وہ مرغِ چمن بلبلِ شعر و نغمہ پیامِ عمرِ جاوداں کو لبیک کہتا ہوا اپنے محبوب یارانِ شعلہ نو شبنم کو آخری سلام کر کے وداع ہو گیا یعنی وطنِ عزیز کی بزم ہائے شعر و سخن نغمہ و چنگ کی محفلوں کو سونا کر گیا۔

زندگی کی دوسری کروٹ تھی موت
زندگی کروٹ بدل کر رہ گئی

فاخر اعجازی جس کے اعداد لسان الغیب کے قوانین کے مطابق نو سو نہتر جس کا صغیر عدد انیس بنتا ہے اور جس کا اصغر دسنل یعنی (۱) ایک ہی واحد رہتا ہے۔

یہ عدد ان کی زندگی پر حاوی رہا پیدائش سے لے کر وفات تک ملاحظہ ہو۔

تاریخ پیدائش: ۱۹۲۹+۱۵=۲۸=۱۰= (۱)

تاریخ ریٹائرمنٹ: ۱۹۸۴+۱+۱۴=۲۸=۱۰=(۱)

ان کے ہمعصر شعراء پارسا کوثری کے اعداد (۱۰۰۰) یعنی (۱)

راقم السطور فضل الرحمٰن رحمانی کے اعداد جمل کبیر۔

۱۵۴۹ صغیر ۱۹ اصغر (۱)

یہ علم ہندسہ کا اعجاز ہے کہ اعداد ۱-۱۰-۱۹-۲۸۔ ان کی زندگی پر اثر انداز رہے ہیں اور مشہور علم ہندسہ کیرو (Count Louis Hamon Cheiro) کے تجربات کی روشنی میں اعداد ۶-۱۵-۲۴ کا مالک بھی فاخر کے دردمند دل اور خلوص و محبت کا حامل رہا ہے۔ دیکھیے۔

(۱) عماد الدین مراد سعیدی = ۶۰۹=۱۵= ۶

۲۱۰ + ۳۹۹

(۲) سرور تونسوی = ۷۹۸=۲۴= ۶

یہاں بھی ہندسہ چھ ۶ کی شان نمایاں ہے۔

غرض یہ ایک خشک اور روکھی بحث رَو میں نوکِ قلم پر آ گئی ہے جس کو قلم بند کر دیا گیا ہے۔ ورنہ یہ واحد موضوع علمی موشگافیوں اور اہلِ فن کی دلچسپیوں کے خزانے سمیٹے ہوئے ہے لیکن اربابِ ذوق سے معذرت کے ساتھ اپنے اصل موضوع پر آ رہا ہوں۔

فاخر مرحوم میرے بچپن کے اُن ساتھیوں میں سے رہے ہیں۔ جو عمر کی کچھ منزلوں سے آگے رہے ہیں وہ اپنے دورِ طالب علمی سے ہی اپنے والدین کے سایۂ عاطفت سے متمتع رہے۔ ان کے والد حضرت اعجاز محمود خاں مرحوم کی نسبت سے ہی وہ اپنے تخلص کے ساتھ اعجازی لکھنا فخر محسوس کرتے تھے۔ وہ ایک شریف النسل اور نجیب الطرفین خاندان سے متعلق تھے اس لیے اُن کے خیالات میں پاکیزگی، سنجیدگی اور لطافت کی معجزہ نما صفات موجود تھیں۔

فاخر کو جاننے والوں میں سے سب ہی جانتے ہیں کہ وہ سراپا محبت تھے۔

جس سے ملے جب ملے دپیکرِ خلوص و محبت بن کر ارباب ذوق نے ان کی تخلیقات کو بے جا طور پر ہدفِ تنقید بنایا

کر میں ان کا احاطہ اختصار سے کرنا بھی ضروری سمجھ رہا ہوں
یہ بات ہیں ٹونک کے ادبی ورثہ کی پرچھائیاں ہی تو ہیں۔ سیماب
اسکول کے ترویجِ روایات ساحل، قصائی، واثق،
آرزو، بسمل سعیدی کے تلامذہ کی ایک طاقتور جماعت
میں حضرت درد سعیدی مرحوم، جوہر سعیدی ثم کراچی پاکستان
ناظم سعیدی، سوز سعیدی، رزمی سعیدی، حفیظ اللہ بیگ
رزمی ٹونکی ثم کراچی، مخمور سعیدی، منشی عتیق اللہ خاں
صاحب، رضا، اللہ خاں رضا، ابد، پیر فاخر، دل ایوبی۔
جوہر سعیدی مرحوم، تا سخ بعد میں تخلص یاور کر لیا تھا
بضاعت احمد تمیز، زاغ ایوبی مرحوم، غرض کس کس کو یاد
کیجیے، بہر حال یاد کرنے کے لائق ہیں یاد کیے جائیں گے۔ آج جو
ہم میں ہیں ان کو خدا سلامتی صحت کے ساتھ عمر طویل عطا
فرمائے اور جو نہیں رہے ہیں خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

فاخر اعجازی اپنے وقت کی تاریخ تھے، نشانی تھے۔
جن کے لیے کہنا پڑ رہا ہے کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں۔

محترم مراد صاحب سعیدی، حضرت مولوی سراج الدین
خاں صاحب مرحوم (ناظم شرعی شریف ٹونک) کے صاحبزادہ
اور حضرت بسمل سعیدی کے خاص تلامذہ میں ہیں اور ہند و پاک
کے مشہور و مقبول شاعر ہیں، وہ ان دنوں مرکز فکر و ادب
بنے ہوئے ہیں، شعر و سخن کی دنیا کو بیدار کیے ہوئے ہمہ وقت
مصروف، دوستوں میں محبوب اور سب کے رفیق بنے ہیں۔

فاخر اعجازی کا غم ان کو وہ زخم دے گیا جس کو وہ
مندمل کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں، شانِ ہند کی
خدمات حاصل کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور فاخر نمبر کی تیاریاں
شروع کر دیں۔

ٹونک سرزمین کا بقول حضرت ماہر القادری، وہ زرخیز
خطہ ہے جہاں شعور و حکمت کے چشمے پھوٹتے ہیں، اپنے ہمعصر شعراء
میں فاخر اعجازی نے بھی اپنے فنکارانہ عظمتوں کی بدولت انفرادیت
حاصل کر لی تھی۔ ان کی نظم یا نیکو شاعر رومان ابوالمعانی،
اختر شیرانی مرحوم کی سلمیٰ اور ریحانہ کی بازگشت کو یاد دلاتی
تھی، افسوس فاخر کے دورِ شباب کا رنگین شعروں کا خزانہ ان کی
زندگی میں ہی کھو گیا۔ اُن کے یارانِ تیز گام میں جے پور کے مشہور
و ممتاز غزل گو شاعر حضرت پارسا کوثری سے فاخر کو بہت
قریبی تعلق تھا۔ حضرت پارسا کوثری کا بھی آج استاد الشعراء
میں شمار ہے۔ وہ جے پور شہر کو زینت بنائے ہوئے ہیں۔ فاخر
کی رحلت کی خبر سن کر فاخر کا یہ شعر ان کی زبان پر ہے۔

نہ بجلیاں تھیں نہ شعلے دھواں اٹھا کیسے؟
کوئی بتاؤ مرا آشیاں جلا کیسے؟

ادھر ہند و پاک کے مشہور نوجوان شاعر و ادیب حضرت
راہی شہابی فاخر کی جدائی کو ناقابلِ تلافی حادثہ کہہ رہے
ہیں اور برجستہ یہ شعر پڑھ رہے ہیں:

دنیا نے تجھے چھین لیا مجھ سے تو کیا ہے
دل سے تری الفت کو جدا کون کرے گا

یہ ہی سفر ہم سے اگر [illegible]
جام ذرا ہوں سے عطا کو [illegible]

اے دوست یہ تیرا ہے برا ہے کہ بھلا ہے
فاخر پہ کرم تیرے سوا کون کرے گا

فاخر اعجازی ان صاحبِ ایثار ہستیوں میں سے ایک
ہیں جن کی زندگی کا قیمتی حصہ اردو ادب کی خدمت کے لیے
وقف رہا۔ ان کی غزلیات میں ان کے جوہر نمایاں ہوئے ہیں
آپ کی خدمت میں کچھ اشعار پیش کر کے میں آپ سے رخصت
ہو رہا ہوں۔

چند آنسو حاصلِ فیضِ بہاراں ہو گئے
اے خوشا قسمت کہ ہم بھی گل بداماں ہو گئے
اس نے اس انداز سے کی پرسشِ احوالِ غم
ہم پیئے بیٹھے تھے جو آنسو وہ طوفاں ہو گئے

عمر ہیں لطفِ بے کراں کے لیے
اور ہم جورِ ناگہاں کے لیے
کتنے تاروں کا خون ہوتا ہے
ایک خورشیدِ ضوفشاں کے لیے
کچھ نہیں تو غزل سہی فاخر
اے اک خاص مہرباں کے لیے

درسِ عظمت لیا ہے دنیا نے
دیکھ کر تیرے خاکساروں کو
غنچہ پژمردہ پھول افسردہ
جانے کیا ہو گیا بہاروں کو
اب تو روداد ختم کر فاخر
نیند سی آ رہی ہے تاروں کو

سمٹ کر دستِ تصرف میں آ گئیں کرنیں
ہمارے ہاتھ میں جب ساغرِ شراب ہوا

ستم کسی پہ کیا اور بے پناہ کیا
کرم کسی پہ ہوا اور بے حساب ہوا

پھر ان نگاہوں میں تجدیدِ شوق ہے رقصاں
سنبھال اے دلِ خوددار پھر سنبھال مجھے

فضل الرحمٰن رحمانی

"فاخر ! — ایک یاد"

۱۹۵۱ء کے ایک مشاعرہ میں میری ملاقات فاخر اعجازی، یاور صاحب اور بزمی صاحب سے ہوئی۔ مجھے اُس وقت اِس بے تکلف سرسری ملاقات میں کچھ اپنائیت سی محسوس ہوئی، مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ ہر سہ حضرات بھی میرے استادِ محترم حضرت محمد صدیق صاحب "صائب" ہی کے شاگرد ہیں، بعدۂ علم ہونے پر مجھے از حد خوشی ہوئی۔

اصلاحِ سخن کے سلسلہ میں اکثر محترم صائب صاحب کی نشست گاہ پر ان صاحبان سے ملاقات ہوتی رہی اسی طرح رفتہ رفتہ تکلف نے خلوص و یگانگت کا روپ دھار لیا۔ بزمی صاحب قریب قریب گوشہ نشین سے ہو گئے ہیں اور یاور صاحب اپنے وطنِ مالوف بلیا (یو۔پی) جا بسے ہیں اس وقت یہ دونوں صاحبان میرا موضوع بھی نہیں ہیں۔

فاخر صاحب جس خلوص، محبت اور یگانگت سے مجھ سے ملے وہی خلوص اور محبت آخر وقت تک قائم رہی۔

وہ ایک مخلص دوست وسیع الاخلاق با مروت قابلِ قدر ساتھی ہمیشہ ثابت ہوئے۔ اللہ اُن پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے۔ آمین۔

اُس زمانے میں ہمارے بزرگ محترم عبدالبصیر صاحب بصر مشاعروں کو کنڈکٹ کرتے تھے، میں، فاخر، اور یاور زیادہ تر مشاعرہ میں ایک ہی جگہ بیٹھتے تھے، کبھی کبھار ہم لوگ کسی شاعر کے شعر پر دبی آواز سے تنقید و تبصرہ کرتے ہماری اس حرکت پر آدابِ محفل کا خاطر رکھتے ہوئے قبلہ مولانا بصر صاحب منع فرماتے اور تاکیداً شعر سننے کی طرف متوجہ فرماتے۔ اس وقت ہم لوگ خاموش ہو جاتے پھر کچھ وقفہ کے بعد ہماری تنقید و تبصرہ کی حرکت شروع ہو جاتی تب قبلہ بصر صاحب بہ نگاہِ تادیب ہم تینوں کو الگ الگ بٹھاتے یا اپنے قریب بلا کر بٹھا لیا کرتے۔

فاخر صاحب اختر شیرانی کی رومانی شاعری سے متاثر رہے۔ بقول علی سردار جعفری (اختر شیرانی کا عشق افلاطونی اور جنسی محبت دونوں کے ضمیر سے تیار ہوا ہے اس کی ابتدا تو جنسی اور جسمانی محبت سے ہوئی ہے لیکن اس کی معراج تخیلی محبت ہے۔)

فاخر صاحب کی شاعری تخیلی محبت کے ساتھ ساتھ عقل کی شرکت بھی چاہتی ہے اور فاخر صاحب اپنی شاعرانہ ملکوتی محبت میں ہمیشہ عقل کا دامن تھامے رہے وہ سادگی و والہانہ پن میں کبھی کبھی عشق و محبت کی نازک کیفیت کا مظاہرہ تو کر گئے لیکن فلسفۂ عشق بیان کرنے سے قاصر رہے۔ ان کی شاعری کا تار و پود رومانی شاعری کے خمیر سے تیار ہوا وہ اپنی خوبصورت نظموں اور غزلوں کے ذریعہ چونکا دینے والی بات ضرور کرتے رہے ان کی صلاحیتِ فنکارانہ نکھار اور رچے ہوئے کلاسکی مزاج سے شاعری میں چٹکیلا پن پیدا ہوا [illegible] اثر سے محویت و حیرت کی ملی جلی فضا

تیار کی۔

اختر شیرانی کے بعد وہ ٹونک میں اُردو کے ایک ممتاز خوش فکر و انفرادی لہجہ کے رومانی شاعر رہے، ان کی غزلوں اور نظموں میں ایک رچاؤ اور تیکھا پن ہے جو صاحب اسکول کے کسی بھی شاعر میں نہیں پایا جاتا۔ انھوں نے جذباتی کشمکش میں بھی شعریت و نغگی کو مجروح نہیں کیا۔

مجھے اس وقت فاخر صاحب کے فن اور شخصیت پر نقد و تبصرہ کرنا یا ان کی برتری ظاہر کرنا ہرگز نہیں، میں نے تو اپنے ذاتی تاثرات کا خاکہ پیش کیا ہے، تاہم فاخر صاحب کی شاعری ایسی نہیں ہے جو نظر انداز کی جا سکے۔

ٹونک میں اختر شیرانی کے بعد حقیقتاً فاخر ہی رومانی شاعری کے علم بردار رہے ہیں اپنی بات کا توازن قائم رکھنے کے لیے فاخر کے اشعار کو بطور ثبوت پیش کرتا مگر میری عدیم الفرصتی مجھے یہ موقع فراہم نہیں کر سکی۔

میں نے یہ خاکہ جو پیش کیا ہے اس میں رنگ بھرنے کا کام اردو دوں کے سپرد کرتے ہوئے پُر زور الفاظ میں اہلِ علم حضرات کو دعوتِ فکر و نظر دے رہا ہوں اور گزارش کرتا ہوں کہ فاخر اعجازی کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے اُن پر مقالات قلمبند کریں۔ آل انڈیا فاخر سیمینار کا اہتمام کریں۔

اگر ان کی شاعرانہ صلاحیت کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر رکھا جائے گا تو وہ یقیناً اُردو کے مخلص با حوصلہ اچھے فنکار ثابت ہوں گے اور اُردو کی معروف شخصیتوں میں ان کا شمار ہوگا۔ جو ٹونک اور اہلِ ٹونک کے لیے باعثِ فخر ہوگا۔

آخر میں میں دل سے دست بدعا ہوں کہ خداوندِ عالم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

صفدر علی خاں صفدر ٹونکی۔

از صاحب زادہ انور علی خاں
جنرل سکریٹری انجمن تعمیر اردو ٹونک

فاخر اعجازی

سالِ نو کے آغاز یعنی یکم جنوری ۱۹۸۷ء کو صبح ۱۰ بجے میرے استاد اُردو کے مشہور و معروف شاعر، شاعرِ رومان حضرت فاخر اعجازی کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال اس سال کا نہایت افسوس ناک حادثہ ہے۔ وہ ۲۹ جنوری ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے اور یکم جنوری ۱۹۸۷ء کو ۵۷ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ ڈھائی تین سو کے قریب غزلیات و نظمیں آپ نے کہیں۔ فاخر صاحب مرحوم کی کئی تخلیقات مختلف اُردو رسائل میں شائع ہوئیں اور نا صرف راجستھان بلکہ ہندوستان و پاکستان میں جس نے پڑھا عش عش کر اٹھا۔ فاخر اعجازی مرحوم اختر شیرانی مرحوم سے بہت زیادہ متاثر تھے اور نوجوانی کے چار پانچ سال اختر شیرانی مرحوم کے ساتھ ہی گذارے یہی وجہ ہے کہ فاخر صاحب مرحوم کی تخلیقات میں اختر شیرانی مرحوم کی تصویر نظر آتی ہے۔ اگر اختر شیرانی مرحوم نے اپنی شاعری میں سلمیٰ کو حسین وادیوں کی سیر کرائی ہے تو فاخر مرحوم نے بھی اپنی نیلم کو انہی جیسی حسین وادیوں کی [illegible] بنا دیا ہے۔ لیکن ہم ہندوستانی اپنے اہلِ قلم حضرات کی جیسی کچھ قدر کرتے ہیں۔ اس کا حال سب کو معلوم ہے۔ میرے پاس اُن کی یاد کے طور پر کچھ باتیں ہیں۔ زندگی کے متعلق اُن کے نظریے ہیں۔ ان کی شخصی سادہ منشی ہے۔ اُن کا درس ہے۔ ان کی محبت و شفقت ہے۔ میرے علاوہ بھی چند خوش قسمت لوگ اور بھی ہیں جن کے پاس بھی انفرادی طور پر ان ہی سے کچھ نا کچھ نشانیاں موجود ہیں۔ مجھے معلوم ہے اردو ادب کی تعمیر و ترقی کے متعلق اُن کے کیا منصوبے تھے اور اُردو زبان کی توسیع کے لیے وہ کیا کیا کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ۱۹۷۶ء میں عالی جناب مرزا رفیع اللہ بیگ صاحب کی سرپرستی میں اور حضرت صاحب دام استاد فاخر مرحوم (حضرت

مراد حبیب سعیدی، جناب عمر سیفی صاحب۔ جناب قوسی صاحب جناب مظہر عالم صاحب ایڈوکیٹ کے تعاون سے انجمن تعمیر اردو کو ٹونک میں قائم کیا اور مجھ جیسے ناچیز کو جنرل سکریٹری کے فرائض سونپے۔ بڑی مشکل سے اور احباب کے بہت زیادہ اصرار پر خود نے صدر بننا قبول فرمایا۔ جناب قوسی صاحب کو نائب صدر، جناب برق اعجازی کو خازن اور جناب ترنم اعجازی و سعید الدین صاحب کو جوائنٹ سکریٹری نامزد کیا گیا۔ ورکنگ کمیٹی میں جناب شاد کیفی۔ جناب عابد کیفی مرحوم۔ جناب برق اعجازی مرحوم اور جناب مظفر صاحب کو رکھا گیا اور اس طرح " انجمن تعمیر اردو ٹونک " کئی حضرات کی بھرپور مخالفت کے بعد وجود میں آئی۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی نامناسب نہیں ہوگا کہ اردو ادب اور شاعری کی یہ تاریخی بدنصیبی ہے کہ ہندوستان میں کہیں بھی انجمن، سوسائٹی، یا بزم کے اغراض و مقاصد بظاہر ایک ہوتے ہوئے بھی باہمی اختلافات اور تضاد ہر ضلعے، ہر گاؤں ہر تحصیل، اور ہر شہر میں موجود انجمن کی جانب سے کئی علمی و ادبی محافل منعقد کی گئیں۔ آل انڈیا' و آل راجستھان' ہفتہ وار طرحی مشاعروں کا انعقاد کیا جانے گا۔ تنقید نگاری کا سلسلہ بزم نقد و نظر کے نام سے شروع کیا تاکہ جو خامیاں ٹونک کے شعرا حضرات کی تخلیقات میں ہیں وہ دور کی جائیں۔ پرائمری درجہ سے بچوں کو اردو کی تعلیم دی جائے اس کے لیے انجمن کی جانب سے بھرپور کوشش کی گئی۔ تعلیم بالغان کے لیے ایک کمرہ کرایہ پر لے کر رات میں کلاسیز کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ لیکن افسوس ٹونک کے ہی اہلِ علم حضرات انجمن تعمیر اردو کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے۔ پھر چند احباب بھی ہم سے جدا ہوگئے اس وجہ سے ۱۹۸۳ء میں صرف انجمن کا نام ہی رہ گیا ہم لوگ بھی بددل ہوگئے۔ لیکن فاخر اعجازی مرحوم کی ذاتِ گرامی ہی ایسی تھی جو کبھی بددل نہیں ہوئے اور ہمارا حوصلہ دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش میں کوشاں رہے۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۸ء تک شعر و شاعری و ادبی محفلوں سے فاخر صاحب و فاخر صاحب کے تلامذہ نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ فاخر صاحب مرحوم کے

تلامذہ کا دائرہ بہت مختصر رہا۔ فاخر مرحوم کے باقاعدہ تلامذہ میں یہ خاکسار۔ جناب برق اعجازی۔ جناب ترنم اعجازی اور جناب برق اعجازی مرحوم رہے۔ ویسے فیضِ تلمذ کئی حضرات نے فاخر مرحوم سے پایا، جن کے نام بھی مجھے یاد ہیں اور ثبوت بھی میرے پاس موجود ہیں۔ اس وقت صرف اتنا ہی آئندہ کبھی مفصل حالات لکھوں گا اگر ضرورت سمجھی تو۔ الغرض اس ایک سال کے عرصہ میں ادبی محفلوں کا ماحول اس قدر خراب ہو گیا کہ العمان والحفیظ۔ ایک بار کسی مشاعرہ میں فاخر صاحب تشریف لے گئے، جب وہاں سے آئے تو بہت برہم تھے مجھے حکم دیا کہ انور علی خاں انجمن تعمیر اردو کی تشکیلِ نو کرو۔ اور کل میٹنگ رکھ لو۔ میں نے فاخر صاحب مرحوم کو اتنا برہم کبھی نہیں دیکھا تھا، نہیں معلوم کیا بات ناگوارِ خاطر ہوئی تھی۔ خیر دوسرے دن مرزا رفیع اللہ بیگ صاحب کی صدارت میں میٹنگ رکھی گئی اور دوری ۱۹۸۸ء میں انجمن کی تشکیل نو اس طرح کی گئی .....

.... اور اس طرح تشکیلِ نو کے بعد قصر رفیع نقد باغ پیلس میں کئی مجالس اور محافل منعقد ہوئیں جن میں " شامِ غزل' کے پروگرام اس حیثیت سے خصوصی اور امتیازی درجہ رکھتے ہیں کہ ان میں انجمن تعمیر اردو ٹونک یا جناب شاد کیفی کی مخلصانہ دعوت پر جے پور سے کئی بار جناب ایوب صاحب (نائب صدر یوتھ کانگریس راجستھان) جناب شمشاد صاحب، جناب اسلام صاحب۔ جناب بیتاب صاحب اور محترمہ حنا صاحبہ نے بھی شرکت فرمائی اور انجمن کو دامے، درمے، قدمے، سخنے گراں قدر تعاون سے نوازا اور آئندہ کے لیے ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار ہیں۔ لیکن افسوس دس ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ انجمن تعمیر اردو کے بانی اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے، میں حضرت فاخر مرحوم کی کیا خوبیاں بیان کروں ان کے اعجاز نے مضمون کو بہت بلندیاں عطا کر دی تھیں۔ یہ معنی آفرینیاں، نکتہ سنجیاں، اور خیال آرائیاں فاخر مرحوم کے کلام میں جابجا نظر آتی ہیں۔ لفظی رعایتیں، نکتہ آرائیاں اور سخن آفرینیاں' اُن کے یہاں عام ہیں۔ وہ بات میں سے بات پیدا کرتے تھے۔ اظہارِ مدعا میں لفظی و معنوی خوبیاں پیشِ نظر رکھتے تھے۔

فاخر مرحوم کے کلام میں یہ شراب دوآتشہ ہو کر پائی جاتی ہے۔ رباعی ہو کہ قطعہ، مرثیہ ہو کہ قصیدہ، غزل ہو کہ نظم، ہر نقش اپنی چمک دمک سے تابدار ہے۔ اپنی طرز نو سے منور ہے۔ جس سے مضمون شگفتہ و تازہ رہتا ہے۔ زبان کی برجستگی، بندش کی چستی، اور محاورات کی درستی مزید برآں ہے اشعار تیر و نشتر و پیار و محبت کا کام کرتے ہیں۔ فاخر مرحوم کے جذبات میں خلوص، احساسات میں صداقت، اندازِ بیان شگفتہ استدلال میں رنگینی، لہجے میں نرمی و پختگی موجود تھی بشعور و ادراک فہم و فراست اور فنی قدرت و مہارت کی ترجمانی کرتے تھے۔ لفظی رعایتوں کا سلسلہ، لفظوں کے رکھ رکھاؤ کا سلیقہ، محبت و دلیل کا قرینہ آتا تھا۔ تلخی کو شیرینی میں اور خشکی کو شگفتگی میں برقرار رکھتے تھے۔ اُن کے دم سے جمالِ ادب پر آب و تاب تھی۔ وہ ٹونک ہی کے نہیں ہندوستان کے عوام کے دل کی دھڑکنوں کی آواز تھے۔ جنون و عزم و عمل کا چنگ و رباب تھے۔ محبت و پیار کی مہکتی کتاب تھے۔ جہان ادب میں ایک نیا انقلاب تھے۔ وہ رومانی وادیوں کے رنگین پیامبر تھے۔ وہ اس دور کے شاعرِ رومان تھے۔ میں تصور ہی تصور میں اس شیر دل ادیب کی حقیقی زندگی کے کئی نقشے کھینچ چکا ہوں الغرض وہ مکمل انسان تو تھے ہی مکمل شاعر فخرِ راجستھان تھے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے ہمیں اُن کے نظریات پر قائم رکھے اور اُن کی خواہشات پوری کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فاخر اعجازی مرحوم کی زندگی کے آخری دو سال سخت پیچ و تاب، کشمکش، اور ذہنی و روحانی، کرب و اذیت کے گذرے ہیں اس کے اسباب یوں تو اور بھی بہت سے ہیں لیکن خاص طور پر ٹونک کے ادبی ماحول میں اخلاقی گراوٹ اور ہمعصروں کی ناقابلِ بیان اور بے جا معرکہ آرائیاں بھی اس کا بہت بڑا سبب رہی ہیں۔ ٹونک میں علمی و ادبی زوال فاخر صاحب جیسے حساس اور مفکر شاعر کے لیے سوہانِ روح بن چکا تھا۔ اور وہ اپنی آخری سانس تک اس تکلیف دہ عذاب میں اسیر

آپ کو سمجھو نکتے رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک بے مثال نظم کہی تھی جس کا عنوان "ماتم شہرِ دانشوراں" ہے مندرجہ ذیل ہے:

شہرِ دانشوراں

یہ کیا رنگِ شام و سحر ہو گیا
ہر اک بے ہنر با ہنر ہو گیا
جسے کچھ بھی ادراکِ منزل نہیں
بفضلِ خدا راہبر ہو گیا

وہی جس کا پیشہ تھا آہن گری
وہی آج سے شیشہ گر ہو گیا
فلاں جو ابھی طفلِ مکتب ہی تھا
وہ اُستادِ بالغ نظر ہو گیا

جہاں محورِ دازِ شاہین تھے
وہاں کرگسوں کا گذر ہو گیا
کہاں سے کہاں تک ہیں زاغ و زغن
نشیمن ہر اک شاخ پر ہو گیا

یہی ہیں مسیحائے دوراں تو پھر
مداوائے دردِ جگر ہو گیا
کوئی قاعدہ ہے نہ قانون ہے
ادب جیسے خالہ کا گھر ہو گیا

یہی شہر تھا مرکزِ علم و فن
جو اب مرکزِ جہل و شر ہو گیا
یہی شہر ہے قتل گاہِ ادب
جہاں خونِ علم و ہنر ہو گیا

لقب جس کا تھا شہرِ دانشوراں
وہ بہرِ دبیراں نگر ہو گیا
عروسِ ادب بے طوائف یہاں
کہ جو آ گیا بہرہ ور ہو گیا

میسر نہیں چشمِ صائب نما
ہر اک راہرو بے بصر ہو گیا
سنبھل کر چلیں راہ نوردانِ نو
بہت راستہ پُر خطر ہو گیا

یہ احساس کس کو ہے فاخرؔ یہاں
ہوا کیا جو میں نوحہ گر ہو گیا
مجھے دعوتِ نظمِ گلشن ہے اب
کہ جب ہر شجر بے ثمر ہو گیا

فاخرؔ اعجازی ٹونکی مرحوم

تعزیت نامے

بنواری لال بیروا
ایم پی

نئے سال کا پہلا دن۔ ٹونک کے مطلعِ شعر و ادب پر اک الم ناک اور غم انگیز دن بن کر نمودار ہوا
اس دن شعر و ادب کے حلقوں پر غم کے بادل چھا گئے اور غزل کی ایک مسلّمہ شخصیت ہمارے درمیان سے اچانک رخصت ہو گئی، اور ہماری محفلِ شعر و سخن کو بے جان کر گئی۔
حضرت فاخرؔ اعجازی کی وفات اُردو دنیا کے لیے ۱۹۸۶ء کا وہ الم ناک سانحہ ہے جس پر اُن کے متوسلین، اعزا اور تلامذہ یہ کہنے پر حق بجانب ہیں۔
" آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں "

فاخرؔ صاحب ہمارے شہر کے ان دیدہ ور شعرا میں سے ایک تھے جن کی شاعرانہ صلاحیتوں سے تشنگانِ شعر و ادب سیراب ہوتے رہے تھے۔ وہ اپنی ذات سے شعر و سخن کی ایک انجمن تھے۔

تلامذہ کا ایک معقول حلقہ ان سے استفادہ کر رہا تھا انجمن تعمیرِ اُردو کے وہ مؤسس اور بانی تھے، اس انجمن کے ذریعہ انھوں نے اُردو زبان کی ترویج و تعمیر کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ فنِ غزل گوئی میں ان کا ایک خاص مقام تھا وہ فطری طور پر رومان و محبت کے مبلغ تھے۔ صلح و آشتی ان کا مسلک تھا اور اس مسلک کی ترجمانی ان کی شاعری میں ہوتی تھی۔

حسن و عشق کی واردات کا بیان وہ ایسے دل کش انداز میں کیا کرتے تھے کہ زبان کی لطافت اور شیرینی کے سننے والے چٹخارے لیا کرتے تھے۔ زود گوئی و پُر گوئی کا ملکہ فطرت کی جانب سے وافر طور پر ودیعت ہوا تھا۔
ان کا کلام غیر مطبوعہ ہے، ضرورت ہے کہ ان کی یادگار قائم کرنے کے لیے ان کے دیوان کو زیورِ طبع سے آراستہ کرانے کی جانب توجہ دی جائے تاکہ ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کو اس طرح پُر کیا جا سکے۔
میری دعا ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ ان کے محترم استاد حضرت صائبؔ اور اُن کے پسماندگان کو صبر عطا فرمائے۔

بنواری لال بیروا
(ممبر پارلیمنٹ)

باب حامد بہ غمِ فاخرؔ
سنہ ۱۹۸۶ء

جناب محترم قبلہ استاد صائبؔ صاحب قبلہ ٹونکی
مجھے حضرت مراد صاحب سعیدی کے خط سے، جناب فاخرؔ اعجازی کے سانحۂ ارتحال کا علم ہوا۔ یقین کیجیے کچھ دیر تک میں یہ باور نہ کر سکا کہ جو کچھ پڑھ رہا ہوں وہ سچ ہے، ابھی

ان کے مرنے کے دن کہاں تھے۔

گر بمیرد عیال گیرد عجب نیست
ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

مجھے مرحوم سے جو تعلق خاطر تھا، اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ میں جب ٹونک آتا تھا تو ان کا تصور بھی ذہن میں رہتا تھا کہ ان سے ملاقات ہوگی۔ شعر و شاعری کی محفلیں سجیں اور وہ اپنے دل کش کلام اور مسحور کن ترنم سے فیضیابی کا موقع دیں گے۔

فاخر صاحب جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اچھے انسان بھی تھے اور یہ دو خوبیاں کسی ایک ذات میں مشکل ہی سے جمع ہوتی ہیں، ان کے انتقال سے صرف ٹونک کے شاعرانہ ماحول ہی میں خلا پیدا نہیں ہوا بلکہ وہاں کی تہذیبی اور تعلیمی زندگی میں بھی ان کی ہمیشہ کمی محسوس کی جائے گی اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

آپ کا شریک غم
شیخ حامد صدیقی پرو پرائٹر اسکرپ ٹریڈرس بمبئی ۳

اور جناب مراد سعیدی صاحب کے توسط سے ایک آل انڈیا مشاعرہ کا اہتمام کرایا تھا، اس مشاعرہ میں ہندوستان کے بہت سے ہی نامور شعراء نے بڑی تعداد میں شرکت فرمائی تھی۔ اس میں جناب فاخر اعجازی صاحب نے جو اشعار پڑھے تھے وہ بڑے قابلِ فخر تھے۔

ان کے اشعار کا میں تنہا ہی مدّاح نہیں تھا بلکہ اس مشاعرہ میں جتنے شعراء و معزز حاضرین شامل تھے، سبھی نے مرحوم کو دل کھول کر داد دی تھی۔

آہ ایسا قابلِ فخر شاعر ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا اب بجز صبر اور دعاء کے کوئی چارہ نہیں ہے، میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فاخر صاحب مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور مرحوم کے جملہ متعلقین اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

فقط والسلام
سوگوار
نثار اللہ خاں
پروپرائٹر ضیاء فاؤنڈیشن کوچہ پنڈت۔ دہلی ۶

از دہلی:
۱۲ جنوری ۱۹۸۶ء

جناب محترم قبلہ صائب صاحب زاد عنایتہ،
صبح کو طائرانِ خوش الحان
پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

جناب فاخر اعجازی کی رحلت کی جب خبر ملی کہ یکم جنوری ۱۹۸۶ء کو وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے، بڑا قلق ہوا۔ مرحوم کی شاعری اور شخصیت سے میں بے حد متاثر تھا۔ دہلی سے جب بھی میں آبائی وطن ٹونک آتا تھا تو مجھے ان کے اشعار سننے اور ان سے ملاقات کرنے کا شرف ضرور حاصل ہوتا تھا۔ مرحوم نہ صرف اعلیٰ پایہ کے رومانی شاعر تھے بلکہ اخلاص و محبت کی ایک یادگار بھی تھے۔ میں نے جب والد مرحوم منشی عتیق اللہ خاں صاحب کا "یوم عتیق" منایا تھا

عرب مسجد۔ مدن پورہ بمبئی
۱۵ جنوری ۱۹۸۶ء

حضرت فاخر اعجازی کی رحلت کی خبر وحشت اثر جب بمبئی میں مجھے ملی تو دل و دماغ پر ایک بجلی سی گر گئی۔ بہت دیر تک سکتہ کی سی کیفیت طاری رہی۔ یقین نہ آیا کہ ہمارے وطن کا یہ عندلیب نوا سنج ایک دم کس طرح خاموش ہو گیا ابھی تو گلستانِ شعر و سخن میں اس کے چہکنے کے دن تھے۔ افسوس موت نے ہم سے ایسے گوہر نایاب کو چھین لیا اور ہم بے بسی کے عالم میں اس سانحہ عظیم پر آہ بھی نہ کر سکے۔ بمبئی میں قیام کی وجہ سے اُن کے آخری دیدار سے بھی محرومی رہی۔ بہر حال دل پر صبر کی سل رکھ کر انا للہ و انا الیہ راجعون کہا اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی۔ بمبئی کے اخبارات کے ذریعہ ان کی وفات حسرت آیات پر تعزیتی پیغام اہلِ وطن کو دیا۔ فاخر اعجازی

ہمارے عہد کے اُن نغز گو شعراء میں سے ایک منفرد شاعر تھے جن کی شاعرانہ صلاحیت کا لوہا مانا جاتا تھا۔ وہ رومان و محبت کے پیامبر تھے اور اُن کا پیغام محبت ہی محبت تھا۔ صلح و آشتی اُن کا مسلک تھا اور زندگی بھر وہ اسی مسلک پر گامزن رہے۔ اپنی شاعری کو انھوں نے اسی کا نقیب بنائے رکھا۔ شعر و شاعری کی دنیا میں ان کی ذات سے محبت کی جو شمع روشن تھی وہ گل ہو گئی —

ان کی وفات شعر و ادب کا ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی بظاہر ممکن نظر نہیں آتی۔ فقط۔ خادمِ ادب

(حافظ قاری) عبدالغفار خاں ٹونکی

خطیب و پیش امام مسجد عرب بمبئی۔

مولانا نسیم حیدری

نائب صدر

ضلع کانگریس کمیٹی ٹونک

(حیدری ہاؤس ٹونک)

جناب صاحب السلام علیکم

جناب مراد سعیدی صاحب کی زبانی مجھے یہ معلوم ہوا کہ رسالہ شانِ ہند دہلی کا فاخر نمبر نکل رہا ہے، مراد سعیدی صاحب میرے کرم فرما ہیں انھوں نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں فاخر صاحب کے لیے کچھ لکھوں تو اتنا ہی کافی ہے کہ فاخر صاحب مرحوم کو مرحوم لکھتے وقت آج بھی نہ میری زبان اجازت دیتی ہے نہ قلم کہ انھیں مرحوم کہا جائے۔ صائب صاحب سے ان کا تعلق نہ صرف شاگردی کا تھا بلکہ فاخر صاحب کو فخر تھا کہ صاحب جیسے استادِ سخن اور ماہرِ علم و فن انھیں ملے ہیں۔

میں بد قسمتی سے جس روز ان کا انتقال ہوا پارٹی کی میٹنگ میں شرکت کرنے جے پور گیا ہوا تھا۔ وہیں جب یہ خبر سنی تو دل پر اک دھکا سا لگا۔ اور زبان پر بے ساختہ آیا۔

"زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے"

اور اسی کے ساتھ آج تک بھی طبیعت نڈھال ہے

"کس سے بیاں کر دوں جو میرے دل کا حال ہے"

اک سانحہ عظیم ہے فاخر کا وصال

جس کا ایک شخص کو بے حد ملال ہے

فاخر صاحب پر نہ صرف ٹونک فخر کرتا تھا بلکہ پورا راجستھان انھیں اختر شیرانی کے بعد دیکھتا تھا۔ مجاز لکھنوی کے فاخر صاحب دلدادہ تھے اور مجاز مرحوم جو پایہ کے شاعر تھے فاخر صاحب ہی کو دوست سمجھتے تھے اور رومانی شاعر کہتے تھے۔

مراد سعیدی صاحب کا وہ مشاعرہ جس کی صدارت فاخر صاحب نے کی یاد آرہا ہے جیسے ہی استاد صائب وہاں تشریف لائے تو فاخر صاحب یہ کہتے ہوئے کہ "لو وہ آگئے میرا بوجھ سر سے اترا" کھڑے ہو کر آپ کو مسند پر بٹھا اور خود سامنے بیٹھ گئے۔

فاخر صاحب کی خدا مغفرت فرمائے۔ میں بہت لکھتا مگر ابھی میٹنگ میں جا رہا ہوں انشاء اللہ کسی وقت تفصیل سے لکھوں گا۔

خداوند عز و جل مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

نسیم حیدری

۱۸ مارچ ۱۹۸۶ء (ٹونک)

تعزیتی پیغام

رحیم ادیب، نمائندہ ہندی دینک اخبارات راجستھان پتریکا و راشٹر دوت

گرامی قدر عالی جناب قبلہ محمد صدیق صاحب صائب زاد عنا

حضرت فاخر اعجازی مرحوم کی اچانک موت پر سب سے پہلے میں نے یہ خبر راجستھان کے خاص اخبارات "راجستھان پتریکا۔ دینک نوجیونی۔ اور راشٹر دوت میں شائع کرائی

فخر راجستھان جناب فاخر اعجازی مرحوم جو آپ کے خاص تلمیذ تھے اور جانشین بھی، اور جن کو آپ آئندہ مشاعرہ میں فخر الشعراء کے خطاب سے سرفراز فرمانے والے تھے۔ ان

...اچانک موت سے جس قدر صدمہ ہوا ہے وہ ناقابلِ برداشت ہے۔

...مرحوم کی رومانی پیرو شاعری میں، حضرت اختر شیرانی مرحوم کی جھلک نظر آتی تھی۔ حالانکہ جناب مخمور سعیدی اور ...ن کے ہم پایہ شاعر مراد سعیدی کے تغزل کا رنگ راجستھان ...کی سرحدوں کو پار کر کے انڈو پاک میں چھایا ہوا ہے۔

لیکن فخرِ راجستھان فاخر اعجازی مرحوم کی رومانی ...ورشاعری سلمیٰ۔ عذرا۔ ریحانہ کے ناموں کی تصدیق کرتی ہے کہ اختر شیرانی ہندوستان کے واحد رومان پرور شاعر تھے۔ جناب اختر شیرانی مرحوم۔ جناب بسمل صاحب سعیدی مرحوم ...ور فاخر اعجازی صاحب، مرحومین سے جو خلا سرزمین ٹونک ...میں پیدا ہو گیا ہے اس کو پورا کرنے میں سرزمین ٹونک قاصر ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ مرحوم کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس ...میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آپ کو اور مرحومین کے جملہ متعلقین ...کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

سوگوار

رحیم ادیب۔ (ٹونک)

باطن تو رہ گئے ہیں وہ ظاہر نہیں رہے

یہ کیا ہوا کہ حضرتِ فاخر نہیں رہے

فاخر صاحب میرے ہی بزرگ نہ تھے بلکہ میرے بزرگوار والدِ محترم شیخ احمد صاحب صدیقی اور میرے محترم چچا دلدادۂ شعر و ادب حامد صاحب صدیقی کے بھی بڑے مخلص اور گہرے دوست تھے۔ ہمارے بمبئی ہاؤس ٹونک میں کوئی مشاعرہ یا ادبی محفل منعقد ہوتی تھی تو میں گھر کا ایک چھوٹا سا فرد ہونے کی حیثیت سے سبھی مہمان شاعروں کی خاطر و مدارات میں مصروف کر دیا جاتا۔ اس طرح مجھے حضرت اعجازی صاحب سے شرفِ نیاز حاصل کرنے اور ان کی شاعرانہ برتری کو سمجھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ وہ یقیناً ایک رومانی شاعر تھے یا اخلاق با وضع اور شرافت کا مجسمہ۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ٹونک کی ادبی و شاعرانہ فضاؤں پر جو اداسی ان کی وفات سے طاری ہوئی ہے اس کو دور فرمائے۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر یہی دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور مرحوم کے جملہ متعلقین کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

شریکِ غم

نسیم احمد صدیقی

بمبئی ہاؤس ٹونک راجستھان

ایس نسیم احمد صدیقی

از بمبئی

۸ر جنوری ۸۶ء

عالی جناب استادِ سخن محمد صدیق صاحب صائب ٹونکی۔

خاکسار کو جناب محترم قبلہ مراد صاحب سعیدی کے خط سے معلوم ہوا کہ جناب فاخر صاحب اعجازی ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

حضرت فاخر اعجازی کا نام شاعرانہ حیثیت سے ہمارے شہر۔ صوبہ بلکہ ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں جس احترام و محبت سے لیا جاتا رہا ہے اس سے مجھے بمبئی میں رہتے ہوئے بھی بڑا فخر محسوس ہوتا تھا۔

میں اگرچہ ٹونک ہی کا باشندہ ہوں۔ بقول حضرت مراد سعیدی کے۔

از طرف

حافظ عبدالبصیر جوہری

محلہ لبا طیان چوکڑی

گھاٹ گیٹ "جے پور"

عزت مآب عالی جناب قبلہ استاد صائب صاحب زاد عنایتہٗ

آغازِ سال ہی میں یہ منحوس خبر موصول ہوئی، کہ آپ کے تلامذہ میں سے ایک خاص فرد جن کا نامِ نامی فاخر اعجازی تھا اچانک رحلت فرما گئے۔ "انا للہ ......" یہ تو آپ کے علم میں ہے کہ ہمارا بالاخانہ جو رام گنج بازار میں واقع ہے قبلہ والد مرحوم الحاج عبدالرزاق صاحب جوہری کے عہد سے بھی

باہر سے آنے والے انڈو پاک شعراء کا مرکز رہا ہے۔ ہمارے والد مرحوم بڑے دلدادۂ شعر و ادب تھے۔ دورانِ قیام شعرا صاحبان اکثر مخصوص محفلیں شب و روز اسی بالاخانہ پر منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعرا صاحبان کے کلام سننے اور اُن سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوتا رہتا تھا۔

قبلہ والد مرحوم کے زمانہ میں ہمارے بالاخانہ پر علامہ حضرت بسمل صاحب سعیدی و جناب مراد صاحب سعیدی و جناب فاخر اعجازی صاحب قیام فرماتے، ان شعراء صاحبان کے قیام کے دوران ایک مخصوص نشست کا بھی انصرام کیا گیا تھا۔ جب مجھے پہلی مرتبہ جناب فاخر اعجازی صاحب کے کلام کے سننے کا موقعہ ملا تھا۔ واقعی فاخر صاحب کا کلام دل کش اور بڑا اردومان پرور تھا، اس کے بعد قبلہ والد مرحوم میرے بھائی عبدالرشید صہبا اور "میں" ہر سال قبلہ مراد صاحب سعیدی کے در دولت پر جاتے رہتے تھے۔ قبلہ والد صاحب کے اعزاز میں مراد سعیدی مخصوص محفلِ مشاعرہ منعقد فرماتے تھے۔ اس میں حضرتِ فاخر صاحب مرحوم ضرور شرکت فرماتے۔ ان کا مسحور کن ترنم اور رومانی اشعار سن کر ہم سب ہی لوگ بہت محظوظ ہوتے تھے اور ان کے اشعار سن کر حضرت اختر شیرانی مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ فاخر صاحب واقعی شاعرِ رومان تھے۔

آہ "ایسا منفرد شاعر ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا، رہے نام اللہ کا۔"

میری اور میرے متعلقین کی یہی دعا ہے کہ اے ربّ العزت مالکِ دو جہاں مرحوم کو خلدِ بریں عطا فرمائے، آمین۔

"اللہ" آپ کو اور ان کے جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ آمین۔

فاخر ٹونکی مرحوم کی ایک مرصّع غزل

انتہائے جہد کا حاصل پشیمانی بھی ہے
آپ ہی کو زحمتِ الطاف فرمانی بھی ہے

صبحِ عشرت آئی ہے تو شامِ غم آئی بھی ہے
جو کلی کھلتی تھی کل وہ آج مرجھائی بھی ہے

کون سی شے ہے جو اب میرے مقدر میں نہیں
آنکھ میں آنسو بھی ہیں اس در پہ پیشانی بھی ہے

وائے قسمت جب ملی اک زخم تازہ دے گئی
وہ نظر جو خود علاجِ دہر بہانی بھی ہے

مجھ سے بربادی کے شکوے ہیں دلِ خانہ خراب
تو نے کوئی بات میری آج تک مانی بھی ہے

پھر مرے نقشِ قدم ڈھونڈیں گے اہلِ کارواں
آگے چل کر ایک منزل ایسی پیش آنی بھی ہے

یہ غزل فاخر صاحب نے ۸ر اگست ۱۹۵۶ء کو انجمن ترقی اردو ٹونک کے مشاعرے میں پڑھی تھی۔

ادارہ

ماسٹر عبدالحفیظ صاحب شوق

کیا بیاں روداد ہجر جان کی
ہے جدائی شاعرِ رومان کی
مرگِ فاخر سے یہ ثابت ہو گیا
خواب سی ہے زندگی انسان کی

"ف" لیا تم نے فراست، فخر از فیضان سے
پھر "الف" کو لے لیا ایقان اور ایمان سے
"خ" لیا خلدِ بریں سے "ر" لیا رومان سے
فخر کرنے کے لیے فاخر بنا کس شان سے

از صائب
(برائے کتبہ)

دائمی قیام گاہ الیاس محمود فاخر اعجازی

۱۴۰۶ھ

شمیم[1] خلد حاضر ہو برابر
ضیا باری کرے خورشیدِ انور[2]
ترنم[3] ریز ہو بلبل سحر دم
سحابِ شام میں ہو برق[4] رہبر
سکونت تجھکو جنّت کی عطا ہو
تری بخشش کے طالب ہیں سخنور
خدایا تجھ سے رحمت کی ہے اُمید
تو قادر ہے تو مالک ہے تو داور
دعا ہے روزِ سالِ نو کی یارب
ہمیشہ اپنے فاخر پر کرم کر

۱۹۸۶ء

از نتیجۂ فکرِ عمیق محمد صدیق صائب ٹونکی۔
۱۴۰۶ھ

شمیم صائبی
انور اعجازی
ترنم اعجازی
برق اعجازی

قطعات

لو فردوس میں گھر بناتے ہیں فاخر
نئی ایک دُنیا بساتے ہیں فاخر
یہی شور ہے حُور و غلماں میں دیکھو
وہ آتے ہیں فاخر، وہ آتے ہیں فاخر

پارسا کوثر
جے پور

رحلتِ فاخر سے ہے سینہ میں داغ
مضمحل سے ہو گئے ہر عقل و دماغ
کہہ رہے ہیں آج سب اہلِ سخن
ہو گیا گُل ٹونک کا روشن چراغ

رُباعیات

سرمایۂ وجدان ہے فاخر کی غزل
جذبہ کی نگہبان ہے فاخر کی غزل
رومان پسند تھی طبیعت اُس کی
رومان ہی، رومان ہے فاخر کی غزل

مخمور سعیدی

مسحور کن آہنگِ غزل خوانی تھا
اندازِ کلام اُس کا رومانی تھا
فاخر کی بڑائی کو یہی کافی ہے
وہ معتقدِ اخترِ شیرانی تھا

جناب قومی ٹونکی

شاعر بھی جس کی موت سے بے تاب ہوگئے
ہم عصر ہم مذاق، وہ شاعر نہیں رہا
کرنے تھے جس کو طے ابھی کچھ اور مرحلے
راہِ حیات کا وہ مسافر نہیں رہا
رگ رگ میں جس کی عشقِ مجازی تھا موجزن
وہ محفلِ نشاط میں حاضر نہیں رہا
جس کو حسین چاند ستاروں سے تھا لگاؤ
وہ منظرِ حسین کا ناظر نہیں رہا
آباد جس سے انجمنِ شعر و نغمہ تھی
صد حیف آج ہم میں وہ ناظر نہیں رہا
ماتم کناں ہیں جس کی جدائی سے اہلِ ذوق
صنفِ غزل کا آج وہ ماہر نہیں رہا
پروازِ فکر جس کی بہت ہی بلند تھی
باغِ سخنوری کا وہ طائر نہیں رہا
اہلِ وطن کو فخر تھا جس کے کلام پر
افسوس اس جہاں میں وہ فاخر نہیں رہا
جادو بیانی جس کی اثر کر گئی تو تی
دنیا نے شاعری کا وہ ساحر نہیں رہا

زین الساجدین یزمی آسی

قطعۂ کشور

۱۴۰۶ھ

اک نہ ہونے سے ترے بزم میں اے جانِ غزل
کیسا کم مایہ نظر آتا ہے دامانِ غزل
خیمۂ لالہ و گل میں ہے تحیر طاری
تیری خاموشی سے اے بلبلِ بستانِ غزل
ایسی عجلت تھی کہ سب رختِ سفر چھوڑ گیا
لے گیا ساتھ مگر تو سر و سامانِ غزل
اپنے احباب میں ممتاز رہی یوں تیری ذات
تجھ سے وابستہ رہی منفرد اک شانِ غزل
اب کہاں انجمنِ شعر و ادب میں بزمی
ایسا اسلوب کہ جس کو کہیں شایانِ غزل

فخرِ مجلس فاخر اعجازی
۱۹۸۶ء

ڈاکٹر عابد عاقل ٹونکی

سانیٹ

ادا شناسِ جمال، نقیبِ حسنِ گُل
کلی کلی کا پرستارِ فاخر اعجازی
رفیقِ نرگسِ بیمار فاخر اعجازی
ندیمِ حسنِ گلستاں، حبیبِ حسنِ گُل
غزل سرائے چمن، عندلیبِ حسنِ گُل
نگاہِ سحر کا دلدار فاخر اعجازی
سرور و رنگ کا فنکار فاخر اعجازی
وہ ایک شاعرِ رومان، ادیبِ حسنِ گُل
رہینِ صدمہ و آلام کر دیا جس نے
سکوت میں ہے جو سنبل، تو گنگ ہے سوسن
ہوا ہے منظرِ افسردگی، چمن کا چمن
غمِ فنا سے پھر اک شے کو بھر دیا جس نے
وہ کیا ہے، بلبلِ رنگیں بیاں کی خاموشی
وہ کیا ہے؟ فاخرِ شیریں بیاں کی خاموشی

بابا رفیق العالم رفیق ٹونکی

وہ دل ہے کب جو ترے غم میں سوگوار نہیں
وہ آنکھ، آنکھ نہیں ہے جو اشکبار نہیں
سوائے صبر کے اب ہم کریں بھی کیا فاخر
کہ موت پر تو کسی کا بھی اختیار نہیں

فضائے ابرِ کرم سازگار ہوتی رہے
نثار لطف کی تجھ پر بہار ہوتی رہے
یہ آرزو ہے کہ تیرے مزار پر فاخر
ہمیشہ رحمتِ پروردگار ہوتی رہے

اسی پہ عفوِ خطاکار کا مدار ہے اب
دعائے مغفرت اُن کی پڑھنے کا ہے اب
سکونِ دل کے لیے چل کے فاتحہ پڑھ لیں
رفیقؔ مرقدِ فاخرؔ کی یادگار ہے اب

قطعات

بہ عزائے [illegible] فاخر اعجازی

۱۹۸۶ء

اک تری موت سے فاخر ہے ہر اک دل میں کسک
نہ وہ پھولوں میں ہے رونق نہ وہ شاخوں میں لچک
تیرے ہر شعر سے رنگیں تھا گلستانِ ادب
اب کہاں پائی سرِ بزم وہ تیری سی چہک

پہنچا نہ اس مقام پہ اب تک کوئی ادیب
جو مرتبہ کہ شعر میں فاخر کو تھا نصیب
حسنِ بیاں سے اپنے ادب میں وہ منفرد
اللہ بخشے شاعرِ رومان تھا عجیب

فاخر ترا رومان ہی معیارِ غزل تھا
تنہا غزلِ حسن میں سرمایۂ غزل تھا
اللہ رے یہ حضرتِ صائب کا تصرف
ہر شعر غزل میں ترا شہ کارِ غزل تھا

اسرارِ حسن باطن و ظاہر نہ پائے گا
شعر و ادب میں منصبِ فاخر نہ پائے گا
فاخر کو مل گیا ہے جو صہبا جہان میں
ایسا عروج اب کوئی شاعر نہ پائے گا

عبدالرشید [illegible]

قطعات

خالد سحر تونکی

مغموم دل ہے، اور نظر محوِ یاس ہے
شوخی ہے نظم، اور غزل بھی اداس ہے
وہ شکل جو کہ خواب کے پیکر میں ڈھل گئی
محسوس کر رہا ہوں ابھی میرے پاس ہے

ابن حسن بزمی (دعائے کتبہ)

آرام گاہِ عیش دوام فاخر اعجازی مرحوم
۱۹۸۶ء

آرام گاہِ اعجاز بیاں فاخر اعجازی
۱۴۰۶ھ

راشد فائزی

بخشی تھی جس نے رنگِ تغزل کو زندگی
افسوس وہ حسین سخن ور نہیں رہا
پھر ختم ہو گیا وہ فسانہ حیات کا
پھر آج اپنے دور کا اختر نہیں رہا

صلاح الدین نفیس

ہوئی شورش بساطِ شعر، شاطر چل بسا آخر
جو علم و فن میں یکتا تھا وہ شاعر چل بسا آخر
محبت [illegible] میں جو انسان تھا
[illegible] فاخر چل بسا آخر

فخرالدین رضا بے پر

شعر کا اعتبار تھے فاخر
بزم کا [illegible] تھے فاخر
ماہتابِ سخن کہو بے پر
علم کا شاہکار تھے فاخر

عبدالوحید ناظر، ٹونکی:

ق۔ جس کی فنِ شعر و ادب کا تھی اِک شان
جس کے الفت، رنگِ تغزل کو دی امان
تخ۔ جس کی تھی خلوص تو ۔ رہ رمزِ حسن و عشق
فاخر وہ اپنا دوستو جانے گیا کہاں

برکت ٹونکی

شاعرِ نوجوان تھے فاخر
خود تغزل کی جان تھے فاخر
اس زمینِ ادب کی دُنیا میں
معنوی آسمان تھے فاخر
شعر کہتے تھے عشق کی رو میں
حسن کے پاسبان تھے فاخر
جو گزرتی تھی دل پہ کہتے تھے
حال کے ترجمان تھے فاخر
یہ حقیقت ہے شعر گوئی میں
آپ خود اک جہان تھے فاخر
دم سے تھی اُن کے بزمِ شعر و ادب
شاعری میں مہان تھے فاخر
خبرِ انتقال اُڑتے ہی
برکت اک داستان تھے فاخر

محمد صالح خاں شاعر

وہ فاخر کہ تھا شعر میں جس کے جادو
اُسی کی جدائی میں جاری ہیں آنسو
اُسی کے غم و رنج میں آج شاعر
ہے ماتم کدہ بزمِ تعمیرِ اُردو

وہ فاخر جو اک دم ہوا ہم سے رخصت
نہ آئے گا اب لوٹ کر تا قیامت
وہ کچھ بھی تھا شاعر مگر اُمتی تھا
خداوندِ عالم کی ہو اُس پہ رحمت

غزل کا تھا وہ اس سے شانِ غزل تھی
دہن میں بس اُس کے زبانِ غزل تھی
خدا بخشے اُس کو عجب آدمی تھا
وہ فاخر وفا جس کی جانِ غزل تھی

محکم چند آتھے

فاخر کا وصف مجھ سے بھلا کیسے ہو بیاں
تھا تاجدارِ شہرِ ادب نازشِ جہاں
تھا وہ میاں ہمارے وہ اک رہبرِ غزل
آباد اس نے کر لیا اب ملکِ جاوداں
رعنائی بخشی اس نے رُخِ ماہتاب کو
نازاں ہیں جس پہ انجم و خورشید کہکشاں
ہر شعر سے عیاں تھی محبت خدا گواہ
ہر بات اس کی پھول تھی ہر لفظ گلستاں
گلزارِ شاعری کا وہ گُل جیسے معنوی
جس کے ہر ایک شعر سے سو خوبیاں عیاں
اربابِ حسن و عشق میں ہے اس کا تذکرہ
ہو تو تمام ہو کے رہی اس کی داستاں
غمگین ہے آتھے یہ تیرے غم کی شاعری
آنسو بہا رہا ہے ترے ساتھ کل جہاں

انور علی خاں انور اعجازی

کتنے شیریں زبان تھے فاخر
اہلِ محفل کی جان تھے فاخر
نہیں کوئی مبالغہ انور
شاعرِ خوش بیان تھے فاخر

شعر کی داد بجا دیتے تھے
شعر گوئی کا صلہ دیتے تھے
یوں ہر اک بزم میں آکر فاخر
رونقِ بزم بڑھا دیتے تھے

یوں دھڑکتا ہے قلب سینے میں
جس طرح آب آبگینے میں
آئے گی یاد یوں ہی فاخر کی
شاعری کے رواں سفینے میں

صاحبِ فکر و فن ہوئے رخصت
رونقِ انجمن ہوئے رخصت
شور ہے ماتم کا شہر میں انور
فاخرِ خوش سخن ہوئے رخصت

از اسلم نقوی (رام پورہ)

قطعہ

طبع ہو جائیں تری کاش وہ ساری غزلیں جس سے افزوں ہو تری شانِ غزل تیرے بعد
کاش اسلم کو تو اتنا تو بتا تا فاخر کون چھپوائے گا دیوانِ غزل تیرے بعد

خزینۂ اشعار

ہے خوشی اب کہاں ایک پل ٹونک میں دل ہیں رنجیدہ سب آج کل ٹونک میں
بزم میں جس کی غزلوں سے تھی روشنی وہ کہاں آفتاب غزل ٹونک میں
اک نہ ہونے سے فاخر کے [illegible] تو یہ ہے [illegible] سونی ہے بزم غزل ٹونک میں
ہے کہاں آہ فاخر وہ نغمہ سرا دل کے کیسے کھلیں گے کنول ٹونک میں
جیسا رومان فاخر کی غزلوں میں ہے ویسا ہوگا نہ حسنِ عمل ٹونک میں
ہر طرف قصۂ موت فاخر کا ہے رنج و غم سب کو ہے آج کل ٹونک میں

تجھ کو فاخر سے نسبت تھی اسلم بہت
تعزیت کے لیے تو بھی چل ٹونک میں

صفی اللہ بیگ برق اعجازی

وہ فاخر آج زمانے میں جس کا ماتم ہے
اسی کی یاد میں اب سب کی آنکھ پُرنم ہے
یہ واقعہ ہے کہ بے وقت اس کی رحلت کا
ملال جتنا کریں ہم اسی قدر کم ہے
سیاہ پوش ہیں شاعر بحالِ نوحہ وہ ہے
ہر ایک چہرہ [illegible] غم [illegible] ہے
اسی کے رنج میں ساقی نے ہوش کھوئے ہیں
اسی کی یاد میں شکستہ ساغرِ جم ہے
ہر ایک دل میں اب اس مرگِ ناگہانی کا
قلق ہے یاس ہے حرماں ہے رنج ہے غم ہے
کہاں ہے فاخرِ رنگیں بیاں کہ اب جس کا
بساطِ محفلِ شعر و ادب میں ماتم ہے
دعا ہے برق کی فاخر کا ہو قصور معاف
قصور وار ازل ہی سے ابنِ آدم ہے

قاری محمد علی بیگ عارف ایوبی

فاکو ہم نے جنت الفردوس سے حاصل کیا
اور الف اللہ کے انوار کا شامل کیا
خا کسی خوش خلق نے اعزاز میں بخشی اُسے
را کو رمزِ دو جہاں سے نام میں داخل کیا
پھر ملائے حرف ہم نے اہتمام سے تو فاخر بنا
جس کی تازہ اور اچانک موت نے گھائل کیا
ایسا فاخر جس پہ دنیائے ادب نازاں رہی
جس نے اپنے رنگ سے ہر شخص کو مائل کیا
جو سراپا خود غزل تھا آہ وہ ہی چل بسا
زندگی کا خواب بھی اِس موت نے باطل کیا
کیسی کیسی ہستیاں اِس موت نے ناپید کیں
جیسے عارف حادثہ یہ حادثہ نازل کیا

آہ فاخر

سید صدیق حسن راغب کوثری

ہر بشر با چشمِ تر ہے ماتمِ فاخر میں آج
مضمحل ہے انجمن تعمیرِ اردو کی یہاں
ہے اُفق سے تا اُفق بس تیرگی ہی تیرگی
ہو گئی تاریک جیسے رہ گزارِ کہکشاں

"صلح جوئی" "خوش کلامی" "وضعداری" "دوستی"
فطرتِ فاخر میں تھی کتنی بلا کی سادگی
اِس ملنساری سے گذری اُس کی ساری زندگی
اُس کے دامن پر نہ آیا داغِ بد خُلقی کبھی
مصلحت کی کاوشوں کے جال سے آزاد تھا
پیکرِ اخلاص تھا وہ بامروّت باوفا
بزمِ احبابِ ادب نے اک سخن ور کھو دیا
ہر روش، ہر شاخ پر، ہر پھول ہے با چشمِ تر
غرقِ ماتم ہیں چمن میں بلبل و برگ و ثمر
اک قیامت موسمِ گل میں اچانک آ گئی
گلشنِ شعر و ادب پہ اک خزاں سی چھا گئی
اک صدا گونجی کہ فاخر اس جہاں سے چل بسا
ماتمِ فاخر میں راغب آسماں تک رو دیا
چشمِ تر سے کر رہا ہوں پیش تعزیت کے پھول
یاالٰہی بارگاہِ مغفرت میں ہوں قبول

گلہائے عقیدت

شفیق سخنور
سنہ ۱۴۰۶ ہجری

وہ نکتہ رس وہ فخرِ سخنداں نہیں رہا
افسوس، اب وہ شاعرِ ذیشاں نہیں رہا

وہ فرد کون؟ یعنی وہ فاخرؔ اداشناس
وہ نازشِ جہانِ نگاراں نہیں رہا

جس کا مشاعرہ میں تھا ہر شعر انتخاب
بزمِ ادب میں اب ادب داں نہیں رہا

مضموں سے جس کی گل کی تھی رونق بہار میں
اب وہ اداشناسِ گلستاں نہیں رہا

ہر خار اُس کے پاؤں کے خوں سے گلاب تھا
وہ کیا گیا کہ رنگِ بیاباں نہیں رہا

کب اس کے زورِ شعر سے گلشن میں چاک چاک
داماں نہیں رہا کہ گریباں نہیں رہا

تخلیق جس کی پھول کھلاتی تھی باغ میں
اب وہ نہیں تو جشنِ بہاراں نہیں رہا

ہم بھی اداس ہیں کہ یاد ہے پیہم خدا گواہ
جو دل میں ہے نظر میں نمایاں نہیں رہا

تھا رازدانِ حسنِ مجسّم جو فطرتاً
وہ قدردانِ چہرۂ تاباں نہیں رہا

گھبرا رہا ہوں دیکھ کے سُونے جہان کو
میرے دلی سکون کا عنواں نہیں رہا

بخشش کی اُس کے واسطے دن رات ہے دعا
جو برخلافِ مرضیِ یزداں نہیں رہا

بزمِ سخن ہے آج اُسی کے ملال میں
بزمِ سخن میں اب وہ غزل خواں نہیں رہا

فاخرؔ کی خوبیوں کا ہو کیا ذکر اے نسیمؔ
اک پیکرِ خلوص تھا انساں نہیں رہا

محبِ فکرِ مخلص نسیمؔ ٹونکی
۱۹۸۶ء

وارث حسنی

وہ آفتابِ شعر و ادب ہو گیا غروب
تاروں کو دے گیا ہے جو راہِ مستقیم
اتنا پتہ چلا ہے فرشتوں کے ذکر سے
فاخر جوارِ رحمتِ یزداں میں ہے مقیم
فخر جس فاخر پہ کرتے تھے سبھی اہلِ وطن
اُس کا ماتم کر رہے ہیں آج خطیبانِ فن
چھوڑ کر تنہا وہ سب کو جا بسا ملکِ عدم
ناشرِ علم و ادب وہ منشی محمود حسن
اُس کے اوصافِ حمیدہ ہوں گے کیا ہم سے بیاں
جس کو بخشا تھا خدا نے گوہرِ معنی کا تاج
چار مصرعہ تیرے وارث اس کے شایاں ہوں گے کیا؟
پیش کرتے تھے اُسے اہلِ نظر دل کا خراج

ماسٹر اقبال حسن حسن ٹونکی

اک طرف شہرِ نگاراں ہے اُداس
اک طرف بلبلِ بستاں ہے اُداس
مرگِ فاخر کا یہ انجام نہ پوچھ
اے حسن آج غزل خواں ہے اُداس
اُس طرف اوجِ ثریا ہے اُداس
اِس طرف شہر بھی سارا ہے اُداس
چھوڑ دی جب سے غزل فاخر نے
عشق اور حسن کی دُنیا ہے اداس
زُلفِ شب رنگ کا شانہ ہے اُداس
صبحِ روشن کا ترانہ ہے اُداس
مرگِ فاخر پہ کسے رنج نہیں
اے حسن سارا زمانہ ہے اداس

منشی عبدالوحید ناظر ٹونکی

تیری رحلت کی خبر ہے خاموش
یہ ترا عزمِ سفر ہے خاموش
بزمِ احباب پہ موقوف نہیں
آج ہر ایک بشر ہے خاموش
بے ترے گھر کا یہ عالم افسوس
یعنی دیوار ہے در ہے خاموش
بزمِ تعمیر میں ماتم ہے بپا
حلقۂ اہلِ ہنر ہے خاموش
جمع ہیں لوگ ترے مدفن پر
بات باہم ہے مگر ہے خاموش
تو نے چپ سادھی یہ کیسی فاخر
ہو گئے سارے سخنور خاموش
ہائے اس صدمۂ جاں کاہ سے اب
چپ ہے ناظر تو نظر ہے خاموش

حکیم ظہور احمد نظر صدر بزمِ احباب۔

قاری محمد سلیم خاں اثر برتوری

ہے ماتمی لباس میں عالم ترے بغیر ارباب فن کی آنکھ ہے پُرنم ترے بغیر
دنیائے شاعری میں ماتم ترے بغیر جھنڈے کے آج ہیں سرنگوں ترے بغیر

محسوس ہو رہی ہے فضا میں تری کمی سازِ غزل ہے سوگ میں مدھم ترے بغیر

تیرے قدم نہ پاکے سحر دم ملال میں اشکوں کی طرح بکھری ہے شبنم ترے بغیر

تجھ کو عزیز تر تھی، جو بزم سماع میں سوہانِ روح اب ہے وہ سرگم ترے بغیر

میں کیا بتاؤں اب ترے غم میں جو حال ہے اک بے کلی سی دل کو ہے ہر دم ترے بغیر

ذکرِ نشست ہے نہ حدیثِ مشاعرہ عنواں کوئی نہیں ہے بجز غم ترے بغیر

اے جانشینِ حضرتِ صائب کہاں ہے تو قصرِ ادب ہے درہم و برہم ترے بغیر

اب اے اثر ہے کام دعا ترے لیے
بخشش کی آرزو ہے خدا سے ترے لیے

ترنم اعجازی

شعر گو باکمال تھا فاخر شاعرِ بے مثال تھا فاخر

فطرتاً تھا وہ شاعرِ رومان ترجمانِ جمال تھا فاخر

پسِ منظر تھا اپنے منظر میں صاحبِ حال و قال تھا فاخر

گیا دنیا سے مسکراتا ہوا کتنا نازک خیال تھا فاخر

ہمہ تن پیکرِ خلوص و وفا خوش بیاں، خوش خصال تھا فاخر

مثلِ تصویرِ حسن کے آگے اِک سراپا سوال تھا فاخر

اے ترنم اُسے خدا بخشے
بندۂ ذوالجلال تھا فاخر

ترنم اعجازی

نتیجۂ فکر قریبی عابد عاقل
۱۴۰۶ ہجری

الٰہی رحم کن بر حالِ فاخر
ہمیں از لطف کن اعمالِ فاخر
زہاتف یافت ایں تاریخ عاقل
بشد ایں سالِ روشن سالِ فاخر
۱۹۸۶ء

بجرمِ خویش فاخر ہست نادم
الٰہی رحم کن با وصفِ منعم
طفیلِ حسن ایں تاریخ ہجری
سرورِ حکیم لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ
۱۴۰۶ ہجری

قطعات

از حافظ عبدالرحیم حافظ (جھنجھنوں)

غزل کی روح تھا عنواں تھا فاخر
سراپا شاعرِ رومان تھا فاخر
محبت اس کی یاد آتی ہے حافظ
خدا بخشے عجب انساں تھا فاخر

گنہ فاخر کے سارے دور فرما
عنایات و کرم بھرپور فرما
الٰہی اب یہ حافظ کی دُعا ہے
لحد کو نور سے معمور فرما

فقط رومان تھا سوز و سازِ فاخر
جدا گانہ تھا اک اندازِ فاخر
عجب تھی شان، فاخر سے غزل کی
غزل سے تھا عیاں اعجازِ فاخر

حکیم ظہور احمد صدیقی نظر

آسمانِ ادب کا تارا تھا
بحرِ اخلاص کا کنارا تھا
خونِ ارمان جس نے دیکھے نظر
چہرۂ شاعری نکھارا تھا

آہ وہ آج شاعرِ رومان
چھوڑ کر چل دیا ہمیں ایسے
آسمانوں کی وسعتوں سے پرے
لوٹ کر اب نہ آئے گا جیسے

دم بخود فن ہے شاعری چپ ہے
شانِ اعجازِ فاخری چپ ہے
حادثہ وہ ہوا کہ جس سے نظر
صحنِ فاخر میں زندگی چپ ہے

خراجِ عقیدت

ہوش سرحدی

جے پور

گلشنِ شعر کی پھر سونی کوئی ڈالی ہے — جس کو سب ڈھونڈتے ہیں اُس کی جگہ خالی ہے
ہر طرف چھایا ہوا منظرِ پامالی ہے — جس طرف دیکھئے بے حالی ہی بے حالی ہے

ابرِ غم دل کی مضافات پہ گھر آئے ہیں
گوہرِ اشک ہر اک آنکھ نے برسائے ہیں

حال کچھ درد کا شبنم ہی بتا سکتی ہے — کتنی دل سوز جُدائی کی گھڑی ہوتی ہے
اِس نے مٹتے ہوئے کتنے ہی چمن دیکھے ہیں — یہ ہمیشہ کسی گل کے لیے خون روتی ہے

لبِ خاموش سے افسانہ بیاں کرتی ہے
خون روتی ہے مگر شکوہ کہاں کرتی ہے

وہ گھڑی علم کو فطرت نہ دکھائے گی کبھی — موت قبضہ میں نہ آئی ہے نہ آئے گی کبھی
مسئلہ موت کا سلجھائیں گے کیا اہلِ خرد — یہ خلش زیست کے سینے سے نہ جائے گی کبھی

زیست اور موت کا رشتہ ہے اسی طرح اٹل
جس طرح گردشِ اوقات میں ہے آج سے کل

روح آزاد ہے، آزاد رہے گی ہر — کیا ہوا پیکرِ خاکی جو فنا ہوتا ہے
ہے ازل ہی سے بنایا ہوا فطرت کا اصول — ہم سے ملتا ہے جو اِک روز جُدا ہوتا ہے

رُوح کی موت کہاں جسم فنا ہوتے ہیں
ایسے ہی پاس ہیں جو ہم سے جُدا ہوتے ہیں

تو کہ ہر شعر میں، ہر مصرعہ میں، ہر لفظ میں ہے — تیری ہستی ہے عیاں اب بھی تو مستور نہیں
نام ہی کی ہے جُدائی، یہ سمجھتے ہیں سبھی — تو کسی دیدۂ باطن سے کبھی دُور نہیں

غیر ممکن ہے کبھی دل سے بُھلائیں گے تجھے
ہم ہمیشہ ہی تصور میں بسائیں گے تجھے

دیکھتے ہی تیری عظمت تری خدمات کا رنگ — چہرۂ مرگ کا بھی رنگ اُتر جائے گا
کاتبِ وقت کی رُوداد کا عنوان ہے تو — نام سے تیرے یہ افسانہ نکھر جائے گا

تیری ہستی، تری عظمت ہی میں ڈھل جائے گی
موت دیکھے گی مگر بچ کے نکل جائے گی

سرزمینِ ٹونک

ہوش سرحدی
جے پور

گلشنِ شعر و ادب ہے، سرزمینِ ٹونک تو
ذرّے ذرّے سے ترے آتی ہے شعریت کی بُو
تو ادب کی آبرو، تو شعر و فن کی آبرو
دیدۂ ارباب کو رہتی ہے تیری جستجو
پریم کی بستی ہے تو انسانیت کا آستاں
تو وفا کا شہر ہے، تو ہے دیارِ دوستاں

لوٹتی ہے تیرے قدموں پر وہی رودِ بناس
خوب ہے جو رتبۂ عظمت سے تیرے روشناس
خوشنما نظارگی بکھری ہے جس کے آس پاس
زندگی دیتی ہے سب کو جس کے پانی کی مٹھاس
جو بجائے خود بھی اک دلکش غزل ہے گیت ہے
ہر طرف جس کی فضاؤں میں مدھر سنگیت ہے

تیری دُنیا میں جنابِ کیف تھے یکتائے فن
تھی کبھی تیری زمیں پر سیفؔ کی بھی انجمن
تو ہی اخترؔ کی ہے بستی تو ہی بسملؔ کا وطن
کیوں نہ ہوں قربان تجھ پر شہریارانِ سخن
نامِ نامی پر ترے علم و ہنر کو ناز ہے
سارے راجستھان میں تو آج بھی ممتاز ہے

حضرتِ فاخرؔ کی جب جلوہ نمائی تھی یہاں
خوبیٔ قسمت مجھے بھی کھینچ لائی تھی یہاں
کیا کہوں پھولوں میں کتنی دلکشائی تھی یہاں
مجھ کو کانٹوں سے بھی بوئے اُنس آئی تھی یہاں
محفلیں شعر و ادب کی اب بھی مجھ کو یاد ہیں

میرے دل کے گلستاں میں آج تک آباد ہیں

ہم نے یہ مانا کہ کل کی بات، کل کی بات تھی
ٹونک کی بستی پہ نازاں اہلِ فن کی ذات تھی
ہر فضا روحِ طلسم و پیکرِ نغمات تھی
کیا کشش تھی کیا خبر اس شہر میں کیا بات تھی

اب بھی شوخیٔ بلبلِ نغمات کی ڈالی نہیں
اب بھی یہ بستی مذاقِ شعر سے خالی نہیں

اب بھی صائب کی زبانِ خلق پر روداد ہے
نازشِ شعر و ادب چند سخن یہیں آباد ہے
ارشد و شوکت بھی رنگیں ہے اسی میں شاد ہے
ٹونک راجستھان میں اب تک جہاں کی یاد ہے

ہے اسی کے نام سے وابستہ صولت نیک خو
عاشق و عاجز ہنر کی ہے یہ بزمِ رنگ و بو

راسخ و ناظر سحر قوتی نظر بھی ہیں یہیں
حضرتِ مخمور بزمی دل مرادِ دل نشیں
فخرِ شعر و فن رہے گی تا ابد یہ سر زمیں
اس کا ثانی اب بھی راجستھان میں کوئی نہیں

عشق و رومان کے فسانے جنم لیتے ہیں یہاں
پیار کی راہوں میں راہی جان دیتے ہیں یہاں

اب بھی شعر و شاعری، علم و ادب کا ہے یہ گھر
شام اس کی اب بھی رنگیں، اب بھی دلکش ہے سحر
حضرتِ سیفی ہیں نقادِ سخن اہلِ ہنر
اب بھی ساحل ماہرِ فن، صاحبِ عظمت بشر

جب کبھی اپنے آپ کو افسردہ گیں پاتا ہوں،
اس کی یادوں سے دلِ مضطر کو بہلاتا ہوں

نظم در غزل

"در غمِ" حضرتِ پیامِ فاخر

۱۹۸۶ء

اک نہ ہونے سے ترے جانِ گلستانِ غزل
صحنِ گلشن نظر آتا ہے، بیابانِ غزل

بزم میں تیرے ہی دم سے تھی فضا شانِ غزل
بعد تیرے نہ رہا کوئی ثنا خوانِ غزل

یہ حقیقت ہے "گئی" ہے تیری اے جانِ غزل
خالی خالی سا نظر آتا ہے ایوانِ غزل

تیرا ہر شعر ہی دراصل تماشایانِ غزل
تجھ سے تھی نزہتِ گلہائے گلستانِ غزل

تیرے ہر شعر میں تھی روشنی فکرِ حسیں
تیرا ہر شعر تھا خود شمعِ شبستانِ غزل

تیرے ہر شعر پہ اربابِ بصیرت کی قسم
سارے فن کار کی نظروں میں تھا تو جانِ غزل

تیرے ہر شعر کے مضموں سے ترشح تھی بہار
تھا "نوا" سے تری شاداب، گلستانِ غزل

تیرا ہر شعر "مریضانِ محبت" کا علاج
تیرا ہر شعر "شفا بخش" مریضانِ غزل

تیرا ہر شعر تھا خود کیف و سرور اپنی جگہ
اب کہاں بزم میں وہ بادۂ عرفانِ غزل

صحنِ گلشن میں تو ہیں "لالہ و گل" اب بھی مگر
نغمہ پیرا ہے کہاں بلبلِ بستانِ غزل

فکرِ فاخر نے ضیا بخشی غزل کو ایسی
لوگ کہنے لگے سب شمعِ فروزانِ غزل

تو نہیں شانہ کشِ زلفِ غزل جب فاخر
کون سلجھائے گا اب زلفِ پریشانِ غزل

چاک اس صدمے سے ہوا ایسا کہ رفو ہو نہ سکا
تھا تری ذات سے وابستہ جو دامانِ غزل

بزمِ تعمیرِ ادب، ہو گئی اک دم ویراں
اب وہ فاخر نہ رہا سلسلہ جنبانِ غزل

مجھ کو بے پردے یہ سابق شہابی نے لکھا
فلکِ ٹونک کا تھا وہ مہِ تابانِ غزل

مرگِ فاخر کی خبر سُن کے یہ بے بہ نے کہا
اے لو خاموش ہوا بلبلِ بستانِ غزل

پارسا کا بھی یہ کہنا ہے بصد رنج و ملال
ٹونک میں حضرتِ فاخر ہی سے تھی شانِ غزل

مرگِ فاخر پہ یہ بے ساختہ صہبا نے کہا
ہوا محروم غزل ہی سے دبستانِ غزل

متفق ہیں شعرائے ٹونک کے اس مصرعہ پر
بزمِ تعمیرِ ادب کا تھا وہ ذیشانِ غزل

رفیعہ اشرف بیگ
(…انجمن تعمیر اردو ٹونک راج)

یادِ فاخر

سن ۱۹۸۶ء کے نئے سال کے سورج کو طلوع ہوئے
تین گھنٹے گزرے ہوں گے، میں اپنے معمولات سے
ت پاکر گھر سے باہر جانے کی تیاری میں تھا کہ ایک بچے
ر کہا! فاخر کا انتقال ہوگیا، جیسے کوئی بجلی کا کوندہ
ہو، کچھ سمجھ میں نہیں آیا، کہ اس مختصر سے جملہ کی حقیقت
ہے؟ چند ثانیوں کے لیے حواس ہی مختل ہوگئے۔ اپنے
پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے، میں نے غیر یقینی
ت کے ساتھ استفسار کیا، کون فاخر صاحب؟ کیا تم
ے ہو فاخر صاحب کو؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ چونکہ
نے اس کو قبول نہیں کیا تھا، چاہتا تھا کہ خود کو دھوکا
دوں، اس لیے ایک امید موہوم کے سہارے متوقع
کہ میرے ان پے بہ پے مسلسل سوالات کے جواب میں
حسب منشا باتیں نکل آئے، مگر وا حسرتا! میری خواہش
بے خبر بچے نے دوبارہ پورے وثوق کے ساتھ اپنی بات کو
ل سے دہرایا، اور کوشش کی کہ میرے ذہن میں کسی شک
ہ کی گنجائش نہ رہے، اب کوئی حیلہ نہیں تھا کہ اس
جانکاہ کو واقعی تسلیم نہ کروں، اعصاب نے اپنی قوت
ائی کھو دی، جسم سے جان تو نہیں نکلی، پھر بے جان سا
لڑکھڑاتی زبان سے، "انا للہ و انا الیہ راجعون" پڑھا
زتے کانپتے قدموں کے سہارے چل پڑا۔

الیاس محمود خان فاخر ابھی ابھی کی رہائش گاہ پر ہجوم
ہر ایک گردن جھکائے، خاموش، گم سم، جدا جانے
چوں میں محو تھا، مکان کے ایک کمرے میں جہاں فاخر
کی باغ و بہار شخصیت بے انتہا خلوص و محبت
خیر مقدم کیا کرتی تھی، اس وقت ایک چادر سے
منہ ڈھانپے پلنگ پر بے حس و حرکت پڑی تھی، پھر ایک جھٹکا
لگا، حسب عادت نہ تو فاخر صاحب میرے استقبال کے لیے
کھڑے ہوئے نہ یہ کہا کہ تشریف رکھیے، ہائے کہاں گیا
وہ والہانہ جذبۂ پذیرائی اور وہ احساسِ ملاقات کی بےچینی
کا بے اختیارانہ اظہار، وہ شائستہ اور ہلکے پھلکے انداز میں
داستانِ فراق، شکوہ و شکایت کا وہ منفرد اسلوب، میں
سمجھا تھا کہ پندرہ بیس روز کی جدائی میں اپنے اضطراب و
اذیت کا وہ مخصوص لب و لہجہ سننے کو ملے گا۔ جو میری روح
کی گہرائیوں میں اتر جاتا تھا، اور میری مسکراہٹ بے اختیار
قہقہہ میں تبدیل ہوجاتی تھی، پچھلے بیس دنوں میں حسب معمول
کئی بار بلاوا آچکا تھا۔ اور کئی رقعے بھی، ایک پرچے میں لکھا
تھا، "آج صبح سے بے حد بے چین اور پریشان، نیز سخت
متفکر ہوں، اللہ تعالیٰ سے ہر وقت لو لگی ہوئی ہے۔ دیکھیے
وہ کب کرم فرماتے ہیں، اور فرماتے بھی ہیں یا نہیں، اب تو یہ
بھی نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ رحیم و کریم ہونے کے ساتھ ان کی
شانِ بے نیازی بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔"

سچ تو یہ ہے کہ میں اور سب ہی، حتیٰ کہ معالج بھی یہ
سمجھتے تھے کہ فاخر صاحب کو جسمانی بیماری کچھ بھی نہیں، البتہ
ذہنی صحت میں ضرور فرق پیدا ہوگیا ہے۔ اسی لیے کبھی ان کی
بیماری کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا بھی نہیں — اب بھی
نہیں سمجھ کر علاج اور دیکھ بھال میں کمی ہوئی ہو، مگر یہ اطمینان
تھا کہ نفسیاتی کیفیت ہے، جو کچھ عرصہ میں ٹھیک ہوجائے گی۔

ایک اور پرچہ میں ایک بار لکھا تھا۔
"ہر ہر لمحہ آپ کے مفید اور تسلی بخش مشورہ کی ضرورت
محسوس ہو رہی ہے۔" اس سے آگے تھا، "اب تو بس بار بار

اپنا یہ شعر زبان پر آتا ہے:

چارہ گر میرے، بس اب، اتنا بتا دے مجھ کو
کتنے انفاسِ شرر بار ابھی باقی ہیں

خدا جانے، کیوں وہ زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، یا تو اُن کو یقین ہو چکا تھا کہ زندگی کے ایام بہت مختصر رہ گئے ہیں بہر حال کچھ بھی ہو وہ رختِ سفر باندھ چکے تھے۔
آخری بار صرف اتنا لکھا۔

محترم بھیا، السلام علیکم
بڑی دیر سے در پہ آنکھیں لگی ہیں
"حضور" آتے آتے بہت دیر کر دی

یہ چند یادگار پرچے' مرصع اور قیمتی قرطاس' میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں۔ جواب میرے لیے سرمایۂ حیات ہیں۔

میری اس بیس دن کی غیر حاضری کے زمانہ میں رقعات بھی آتے، آدمی کے ذریعہ بھی بلایا اور خود بھی ایک دو بار غریب خانہ پر کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے تشریف لائے۔ مگر میری بدنصیبی کہ نہ تو میں ان کے پاس جا سکا، اور نہ گھر پر ہی اُن سے ملا۔ بات چونکہ نئی نہیں تھی، اکثر ایسا ہوتا ہی رہتا تھا، اس لیے میں نے اپنی شانِ محبوبیت کا اس دفعہ کچھ زیادہ ہی دکھاوا کیا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ مجھے اس عرصہ میں بہت زیادہ مصروفیت رہی اور میں چاہتا تھا کہ فاخر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے، کم از کم تین چار گھنٹے کی فرصت ہو، ایک گھنٹہ اپنی طرف سے اور کم از کم دو گھنٹے اُن کے دو یا تین بار روانیِ گفتار پر بیٹھنے کے لیے۔ اس لیے کہ میرے معاملہ میں فاخر صاحب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر عمل فرماتے تھے۔ آپ بیتی اور جگ بیتی، سب ہی کچھ سنا دیا کرتے تھے، اور باتوں کا خزانہ پھر بھی معمور رہتا تھا، اور اس سب کا ماحصل یہ ہوتا تھا کہ جب میں اُن سے رخصت ہونے کو ہوتا، ایک جملہ پیش فرماتے تھے۔ بھیا! خدا پاک کی قسم مجھے اب اور اس وقت کسی طرح کی کوئی بیماری اور تکلیف نہیں ہے۔ آپ کے آنے سے نہ جانے کیوں بالکل تندرست ہو جاتا ہوں، اللہ ہی نے فاخر صاحب نے میرے فراق میں جان دے دی، یا جان آفرین نے ملاقات کے لیے اس قدر ... نہ جانے کیا کچھ اور کہتے؟ کتنی باتیں آنا کہی رہ گئیں اور کیا کیا خواہشات وہ اپنے دل میں لے کر رخصت ہو گئے۔

میرا ذہن کمپیوٹر کی سی تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا، ذرا کچھ ہوش آیا تو، انتہائی احساسِ جرم اور شرمندگی کے ساتھ فاخر صاحب کے چہرے سے چادر ہٹائی، ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر تھی، مگر آنکھیں نہیں کھولیں، بات بھی نہیں کی، کیا یہ خاموشی اور مسکراہٹ ایک طنز تھا، میری بے اعتنائی کے انتقام پر' میں نے کہا فاخر صاحب! اس قدر ناراض ہو جائیں گے یہ تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا، اس سے پہلے تو آپ نے کبھی ایسی ناراضگی اور بے رُخی نہیں دکھائی، ہاں قصور وار تو ضرور ہوں۔ خطا تو صرف میری ہے۔ آپ تو سب ہی سے روٹھ گئے۔ مجھے سزا دی ہوتی، مگر یہ دوسرے لوگ بھی تو ہیں' احباب سوگوار ہیں، بچے بلک رہے ہیں۔ وہ دیکھیے کمرے کے ایک گوشہ میں فرش پر آپا بی صاحبہ' آپ کی شفیق ترین بہن بظاہر صبر و استقلال کا پیکر' عالمِ سکوت میں مجسمۂ حیرت بنی بیٹھی ہیں — دل پر کیا بیت رہی ہوگی، خدا ہی جانے، میرے صبر کا باندھ بھی ٹوٹ گیا۔ آنسوؤں کی جھڑی نے نظر کو دھندلا دیا بے اختیار جھکا اور فاخر صاحب کی پیشانی کو چوم لیا، خراجِ عقیدت کا پہلا اور آخری بوسہ، دل نے چاہا کہ لپٹ جاؤں، گلے لگ جاؤں۔ سینہ سے سینہ ملا کر اپنی روح کو فاخر صاحب کے قالب میں منتقل کر دوں، نہ جانے کیوں ایسا نہ کر سکا، بس آنکھیں محبت کے موتی نچھاور کرتی رہیں اور میں سوچتا رہا نہ جانے کیا کیا، اور جو کچھ جانتا ہوں اس کو بیان کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی پڑھنے والوں کے پاس اتنا وقت ہوگا، یہ اشکہائے بے توقیر فاخر صاحب کے لیے نذرانۂ حقیر اور بارگاہِ رب ذوالجلال میں رحم و کرم اور مغفرت کی درخواست ہیں، مُردے، اور زندہ انسان کی یہ حقیقت اور بساط ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَار۔

میرے محب صادق اور رفیقِ دیرینہ جناب عماد الدین خاں صاحب مراد سعیدی بھی فاخر صاحب کی رحلت سے بے حد متاثر ہیں اور اپنے ذوق کے اقتضا کے مطابق فاخر صاحب کو

سے متعلق نظم و نثر میں قریبی احباب کے تاثرات کو شائع کرنا چاہتے ہیں، مجھے بھی حکم ملا تھا کہ کچھ لکھوں، لکھنا پڑھنا میرا مشغلہ نہیں ہے۔ اس لیے بڑی مشکل کا سامنا ہے۔ ایک تجویز تھی کہ میری طرف سے محترم مولوی سید فاتح الاسلام صاحب یا محترم مولوی سید منظور الحسن برکاتی صاحب کچھ لکھ دیں لیکن ایک مرحوم دوست کے ساتھ مستعار تعزیت، ضمیر نے قبول نہیں کیا۔ چنانچہ فاخر صاحب کے جلسۂ تعزیت کے موقعہ پر عزیزم صاحبزادہ امداد علی خاں صاحب غنیم نے اصرار کے ساتھ میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ ٹیپ میں مقید کر لیے تھے، اُن کی مدد سے اپنے یہ تاثرات، مراد صاحب کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

یہ سچ ہے کہ میرے پاس الفاظ کا اتنا ذخیرہ نہیں ہے اور نہ ہی اس قدر استعداد ہے کہ اپنی قلبی کیفیات کو قلم بند کر سکوں، پھر کوئی ترتیب بھی ذہن میں نہیں ہے۔ اس لیے قارئین کرام سے معذرت کے ساتھ، امکانی کوشش سے تعمیل حکم کر رہا ہوں۔ اس میں میرے قلب کی تسکین کا بھی کچھ سامان ہے کیونکہ بہ تقاضائے بشریت اپنے کسی قریبی عزیز، دوست یا شناسا کی موت پر قلب و ذہن کی جو کیفیت ہوتی ہے۔ اس کے اظہار سے کچھ طمانیت سی محسوس ہوتی ہے۔ شاید اس لیے کہ سننے یا پڑھنے والوں کی ہمدردیاں انسان اپنے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔ یہ سب انسانی ذہن کی عجیب و غریب حرکات ہیں، جن کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی ہے۔ پیدائش اور موت کے فلسفے کو ہی سمجھنے کی کوشش کیجیے، کیا یہ درست ہے کہ کسی کی پیدائش پر خوشیاں منائی جائیں، جب کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ موت کا وقت مقرر ہے۔ "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت" فرمانِ ربّی ہے۔ پھر کسی کی موت پر آہ و زاری کی جائے، جب کہ ہمیں یقین ہوتا ہے ہر زندگی کے لیے یہ انجام مقدر ہے۔ مرثیہ پڑھاں یہ کہ نوحہ و فریاد کرنے والا یہ بھول جاتا ہے کہ خود اس کو بھی اسی منزل سے گزرنا ہے۔ اور یہی انجام اس کا بھی ہوتا ہے۔

فاخر صاحب کی موت نے دل و دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں، مرحوم نے بڑی متنوع طبیعت پائی تھی۔ شاعر ہوتے ہوئے بھی شاعرانہ نخوت و تعلّی سے کوسوں دور، مزاج میں بلا کی سادگی، مروت، محبت، خلوص، ہمدردی، انسانیت، شرافت، تہذیب، رواداری، ظرافت و سنجیدگی، بذلہ سنجی و معنی آفرینی، اُن کی ذات کی خصوصیات تھیں، حلقۂ احباب وسیع، ہردلعزیزی کا یہ عالم تھا، کہ جو بھی اُن سے ملتا تھا، سمجھتا تھا کہ فاخر صاحب سب سے زیادہ اُسی سے محبت کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عجیب وصف ہے جو بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ مزاج کی نفاست، اور نزاکت کا یہ عالم تھا کہ اگر پانی پینا ہے تو پہلے ایک گلاس پانی سے کلیاں ہوں گی، اس کے بعد ایک گلاس پانی پیا جائے گا بیڑی سگریٹ پینا ہے تو خود جلانا طبع نازک پر بار ہوتا تھا "نزول شعر کے وقت" جو بقول حضرت خنداں دردِ زہ سے کم قیامت خیز نہیں ہوتا" فاخر صاحب پر کیا گزرتی ہوگی، یہ حال اللہ ہی کو معلوم، ہاں تخلیق جب سامنے آتی تھی جمالیات کا مرقع ہوتی تھی۔

فاخر صاحب نے نظم میں بہت کچھ کہا ہے۔ غزلیں، نظمیں، قطعات، رباعیات، قصیدے، مرثیے، تہنیت، رخصتی، ان کے مجموعہ میں کیا کچھ نہیں۔ ان کے کلام کا ایک بہترین حصہ ان کی زندگی میں ہی ضائع ہو گیا تھا، اور جو کچھ باقی ہے دیکھیے اس کا کیا ہوتا ہے۔

فاخر صاحب حسن و جمال کے شیدائی تھے، اور "اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَّ یُحِبُّ الْجَمَال" کی مجسم تفسیر اُن کو وہ حسن تو عزیز تھا ہی جو چشمِ ظاہر میں سب کو نظر آجاتا ہے۔ جہاں تک فنی خوبیوں کا تعلق ہے۔ ان کا فیصلہ اہلِ نظر کر سکتے ہیں لیکن کلام میں جمالیاتی جھلکیاں اور تاثیر، معاملات، واردات کا اظہار اور اسلوب بیان کی ندرت، مجھ ایسے عامی کو بھی متاثر کر دیتی تھی۔ اُن کا ترنم بھی منفرد تھا، مردانہ وجاہت اور میٹھائی لہجے کی غنائیت سامعین کو دم بخود اور مبہوت کر دیتی تھی۔

اس مختصر خاکے میں اتنی گنجائش کہاں ہے۔ کہ میں اپنے پورے تاثرات بیان کرسکوں۔
فاخر صاحب اپنے گرد و پیش سے کبھی مفاہمت نہیں کرسکے، اُن کی طبع نازک نے حالات سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی سب سے بڑی بیماری، یا آزار، یہی تضاد تھا۔

اے روشن طبع تو برمن بلا شدی

ان کی طبیعت کی درستی ان کے لیے وبال بن گئی تھی۔
آخر میں بس، اتنا اور کہوں گا کہ جس انسان کی عظمت کا آج ہم اعتراف کر رہے ہیں۔ اس کے لیے سب سے بہتر خراج عقیدت یہ ہے کہ اس کے اچھے کردار کی پیروی کریں، ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

رب العزت سے بصمیم قلب دعا ہے کہ وہ فاخر صاحب کی لغزشوں اور فروگزاشتوں سے درگزر فرمائے ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

اے دوست یہ تیرا ہے بُرا ہے یا بھلا ہے
فاخر پہ کرم تیرے سوا کون کرے گا

Phone : 275802 Regd. No. D. (DN) 353
SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 JULY 1986
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57

کلاسیکی رچاؤ رکھ رکھاؤ اور ٹھہراؤ کے شاعر ڈاکٹر کیتسو حیدر حسین حقیر آستانی قصبہ میانی تحصیل
بھلوال ضلع سرگودھا (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔

ممتاز دانشور ڈاکٹر حسین کا نام ایک معزز و معتبر شناخت ایک قدآور اور دل آویز شخصیت اور مختلف
علوم و فنون میں کامل دسترس اور قدریت کی حامل عدیم المثال حیثیت کی بہترین مثال — پرچم اور مینارۂ نور کی
حیثیت کا حامل ہے۔ سات برس بمبئی یونیورسٹی میں پروفیسر رہے اور دو برس UNIVERSITY OF ILLINOIS
CHICAGO, USA میں وزیٹنگ پروفیسر۔ پانچ برس UNIVERSITY OF WISCONSIN, USA. میں ریسرچ
اسکالر بھی رہے۔ - گیارہ برس ASIAN DEVELOPMENT BANK, MANILA, PHILIPPINES
میں سینئر ایکزیکیٹو کے عہدے پر افسر اعلیٰ کی حیثیت سے کام کیا۔ فی الوقت WORLD BANK اور
UNDP میں کنسلٹنٹ ہیں۔ دیگر اداروں مثلاً USAID کے بھی کنسلٹنٹ رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر حسین میراث آدم کی شناوری، جستجوِ رسا کی یاوری، ان گنت انجان اور طویل راستوں پر انجانی
منزلوں کی نشاں دہی میں اپنے عہد کی کہانی ہیں۔ جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کی زندہ تفسیر ہیں۔ بمبئی یونیورسٹی سے
گولڈ میڈلسٹ ہیں اس کے علاوہ ST. XAVIER'S COLLEGE کے دورانِ تعلیم ڈاکٹر سر محمد اقبال اردو
اسکالرشپ سے بھی انہیں نوازا گیا۔ دورانِ تعلیم ہی متعدد وظائف اور انعامات حاصل کیے۔ آل انڈیا مقابلوں
کی بنا پر FULBRIGHT-SMITH-MUNDT اسکالرشپ حاصل کیے اور برائے اعلیٰ تعلیم امریکہ بھی جانا ہوا۔
کتنے ہی ڈپلومہ ہیں جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔ معاشیات پر متعدد کتب کے مصنف ہیں۔ اخباروں اور
رسالوں کے وسیلے سے اپنی انفرادی آن بان اور شان سے اردو شاعری کے میدان میں قدم رنجہ ہوئے۔ کلاسیکی
نظم غزل قطعہ رباعی میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن شاید ان کی طباعی کے لیے آزاد نظم کا کینوس وسیع تر ثابت ہو
روایتی شاعری سے زیادہ مزاجی طور پر وہ آزاد نظم کے شاعر ہیں۔ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی نظمیں کہتے ہیں۔
برسہا برس کی بین الاقوامی سیاحت کی بدولت مختلف ممالک اور ان کے تہذیب و تمدن کو
بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا اتفاق بھی ہوا

شانِ سند
ایڈیٹر
سرور تونسوی

رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی ایل) ۵۲ — رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۶۴۴۶ — فون نمبر ۲۷۵۶۰۲

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ
۲/۵۰ روپے
زر سالانہ: -/۲۴ روپے

جلد ۴۷ — ستمبر ۱۹۸۶ء — شمارہ ۹

اُردو اکیڈمی
رضا اللہ

یہاں پر غالب و اقبال کی عظمت نہیں بٹتی
یہاں پر قیس و فرہاد کی وحشت نہیں بٹتی
یہاں پر خسرو و جمشید کی سطوت نہیں بٹتی
یہاں مانگو بھی تو خیرات کی دولت نہیں بٹتی
اگر دولت بھی بٹتی ہے تو کچھ شرط گدائی ہے
سنا ہے کہ یہاں ایسے ہی لوگوں کی رسائی ہے
خوشامد فطرتاً جو کرتے ہیں جن کے ہاتھ آئی ہے
کبھی اک شاعر خود دار کی عزت نہیں بٹتی

کچل ڈالیں مرے فن کے بھی تابندہ گلابوں کو
کریں گے قتل کب تک یہ ابھرتے آفتابوں کو
رکھیں گے کب تلک طویل شب میں میرے خوابوں کو
جہاں خونِ دلِ فنکار کی قیمت نہیں ملتی
چڑھا آئے ہیں کل چادر یہ اک شاعر کی تربت پر
منائیں اب یہ جشنِ مرگ زندوں کی شہادت پر
ابھی ہنستے ہیں، کل روئیں گے یہ اردو کی میت پر
یزیدِ وقت ہیں، حبِ حسینیت نہیں ملتی

سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ کیا اردو کی خدمت ہے
کہ ہر گہوارۂ دانشوراں بچوں کا مکتب ہے
سیاست کی طرح اس دور میں فن بھی تجارت ہے
لیاقت کی سند اس جا بجز صورت نہیں بٹتی

ودیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے اور سرورق کے صفحات ین یو پرنٹرز بلیماران دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ - انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

اکادمی چیست؟ (Akademia)

ظ انصاری اپنی مخصوص طرزِ نگارش کے باعث اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ آج کل روزنامہ "انقلاب" بمبئی کی ادارت ان کے سپرد ہے۔

ظ انصاری نے اپنے اداریوں سے "انقلاب" کو حیاتِ ثانیہ بخشی ہے۔ قومی یکجہتی کسے کہتے ہیں اسے جاننے اور سمجھنے کے لئے ظ انصاری کے اداریوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے اور اسی باعث روزنامہ "انقلاب" مہاراشٹر ہی نہیں پورے ملک میں اردو کا ایک بہترین اخبار تسلیم کیا جانے لگا ہے۔

ظ انصاری ڈنکے کی چوٹ کمیونسٹ ہیں اور فی الوقت حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا جو عملی ثبوت ہندوستانی کمیونسٹ دے رہے ہیں وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

"اکادمی چیست" روزنامہ "انقلاب" کا اداریہ ہے اور اکادمی سے متعلق یہ تلاش ظ انصاری کی مرہونِ منت ہے۔ یہ اداریہ ہر اکادمی کے ارکانِ بست و کشاد اور کسی بھی اکادمی کے ممبران کا انتخاب کرنے والوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ مختلف ریاستوں کے متعلقہ وزرأ اور دلی کے لفٹیننٹ گورنر جو کہ اکادمیوں کے ممبران کو منتخب کرتے ہیں انھیں اس اداریہ کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے تاکہ ان پر روشن ہو سکے کہ انھوں نے جن ممبرانِ اکادمی کا انتخاب کیا ہے ان میں سے کتنے ممبران ایسے تھے جنھیں یہ عزت دی جا سکتی تھی۔؟

(مدیر)

یہ اصل نسل سے یونانی لفظ ہے جس کا تلفظ خود اس کے بانی افلاطون اور مکتبِ افلاطون نے "پلاس" ہے

"آک ادوم یا"

قبلِ مسیح کے جس زمانے میں یونانیوں کے علوم و فنون کے ڈنکے بج رہے تھے ایرانی و عرب ان سے استفادہ کر رہے تھے۔ ہمارے یہاں تین درجوں کے علمی ادارے "دھار" میں پروان چڑھے۔ علوم (دینی و دنیاوی) اور فنون (آرٹس) کے مدرسی شعبے اور ان کے اوپر مذاکرہ و مباحثہ کا ادارہ۔ یہی ادارہ یہاں کی اکادمی تھی۔ انگریزا میں تینوں کے باقیات محفوظ ہیں۔

یونان کے افلاطونی مکتبِ فکر نے یورپ اور ایشیا کو علوم و فنون کا خزانہ ہی نہیں دیا بلکہ اس خزانہ کی نگہداشت اور اسے مزید مالا مال کرنے کا ایک سانچہ بھی دے دیا۔ یہ سانچہ "اکادمی" تھا۔ علوم کے سب سے بلند مرتبے کی پاسبانی، ذی مرتبہ اہلِ علم کی قدردانی اور اس میں برابر اضافے کی سبیل۔

کوئی چھ صدیاں اکادمی کی سرگرمی سے محرومی کی گذریں۔ چین میں کنفیوشس اور اس کے ماننے والوں نے جو کچھ دستاویز تھا وہ علوم سے زیادہ فنون کی طرف متوجہ رہے۔ ہندوستان بحیثیت کے زوال

ساتھ ہی اندرونی خلفشار میں مبتلا رہا۔
• اکادمی کو ایک طاقتور، مرکزی، منظم حکومت یا سرپرست بھی چاہیئے اور سکون کا سرو سامان اور زمانہ بھی
• اکادمی کا ایک مرکز ہوتا ہے اور اس کی شاخیں ہوتی ہیں جدا جدا موضوع کے لحاظ سے۔ مرکز معیار برقرار رکھتا ہے۔ مرکز کو ممبری تک پہنچنے میں اہلِ علم و فضل کی عمریں بھی بسر ہو چکی ہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ علم کی کسی ایک شاخ میں کوئی شخص سارے ملک میں مقبول ہو گیا لیکن اکادمی کے معیار کو نہیں پہنچا۔ یعنی نام تو کما لیا۔ مرتبہ نہیں ملا۔ قومی اعتبار کی سند نصیب نہیں ہوئی
اکادمی کی شاخوں میں نیچرل سائنس، تصویر کشی موسیقی، مطالعہ فطرت، پیکر تراشی، ادبیات و لسانیات معدنیات، سماجی سائنس کے دوسرے شعبے آتے ہیں۔
ادبیات میں جو اکادمی ہوگی وہ اس قوم کے نسلی گروہ کے علاقے کے ادب اور زبان کی نگہداشت کرے گی۔
بہترین علما کو اس کام پر مامور کرے گی کہ وہ قدیم الفاظ اصطلاحات و تراکیب کے ساتھ نووارد لفظوں کو جانچتے ہوئے قبول یا رد کر دیتے ہیں۔ بحث و مباحث اور مذاکرے کا اہتمام کرے گی اکادمی کی چھلنی سے گزرا ہوا لفظ یا استعارہ قبولِ عام پائے نہ پائے مستند ضرور ہوتا ہے
فرانس نے موجودہ اور گذشتہ صدی کے دوران علمی سرگرمی کو آزاد رکھ کر اکادمی کا وقار نہ صرف بلند کیا بلکہ اکادمیائی سرگرمیوں کے ذریعہ قومی ذہن کو آزادی پسند اور روشن خیال بنانے میں بھی ہاتھ بٹایا۔ شاہی اور جمہوریت کی کشمکش میں آزادیٔ اظہار کی رسہ کشی میں اکادمی بھی دو طرف کھنچی جاتی تھی۔ والتیر و وکٹو ہیوگو ایک طرف اور لوئی اور نپولین والے شہزادے دوسری طرف
والتیر اور وکٹر ہیوگو کے نام ہم نے بطور مثال لکھے لیکن دونوں وہ ہیں جو سماجی سیاسی اور اخلاقی بدچلنی کے اور فرانسیسی کے الزام لگے۔ ہیوگو برسوں جلاوطن رہا۔ نام اکادمی سے خارج کئے گئے اور پھر علمی حلقوں کے دباؤ

نے شاہی کو مجبور کر کے انھیں احترام کے ساتھ واپس لیا۔
اکادمی کے لوگ عمو تا یونیورسٹیوں کے مرحلے سے گزر کر آتے ہیں۔ اکادمی کا درجہ یونیورسٹی سے بلند ہے جس طرح یہ ممکن ہے کہ کسی شخص نے یونیورسٹی میں نہ باقاعدہ تعلیم پائی ہو، نہ تعلیم دی ہو۔ مگر خداداد قابلیت اور اپنی محنت کے بل پر اس مرتبے کو پہنچ گیا ہو کہ سارے اختلافات کے باوجود اکادمی کا ممبر چنا جائے۔ اسی طرح یہ بھی ہوتا ہے کہ عمر بھر یونیورسٹی میں پڑھنے پڑھانے کے باوجود کوئی شخص تحقیق، تلاش یا دریافت میں، چاہے وہ کسی اسٹائل (طرز ادا) کی دریافت ہو اس مرتبے کو نہ پہنچ سکے کہ اکادمی کی ممبری کا اعزاز اسے دیا جائے۔
ترقی یافتہ ملکوں میں بھی یونیورسٹیوں اور اعلیٰ انسٹیٹیوٹوں میں کام کرنے والوں کی تعداد ہزاروں لاکھوں میں ہوتی ہیں لیکن اکادمی کے مستقل ممبر سیکڑوں تک نہیں پہنچتے ان میں بھی بدل کے ممبر اور امیدوار ممبر (جو مستقل رکن شمار نہیں ہوتے تو ووٹ دینے کا حق نہیں رکھتے) شامل ہوتے ہیں (بدلی کا ممبر یعنی
حکومتیں بدلتی رہتی ہیں تاج و تخت الٹتے رہتے ہیں فنکاروں کو عروج و زوال کا، شہرت و گمنامی کا اور حاکموں کو نیک نامی و بدنامی کا سامنا رہتا ہے عالموں کو اپنے نظریے کی عام قبولیت اور اس کی تردید سے واسطہ پڑتا ہے لیکن اکادمی وہ مسندِ بلند ہے۔ وہ اعزاز ہے کہ برسوں کی چھان پھٹک کے بعد جسے ایک بار مل جائے وہ مرتے دم تک رکن اکادمی کی حیثیت سے مستند اور باوقار شمار ہوتا ہے۔

الیکسانڈر دوما (فرانس)

فرانس میں اپنے وقت کا ایک بانکا ناول نگار تھا عوام میں اس کے حامی اور خواص میں اس کے مخالف بہت تھے۔ فرانس کی اکادمی آف لیٹرز میں جتنے فاضل قلم نے اسے شامل نہیں کیا جب بھی نام تجویز ہوا تو ممبر

اہلِ اختیار کو اور اہلِ اعتبار کو دکھاتی رہتی ہے یہ بھی بسا غنیمت ہے۔

اور مہاراشٹر اکادمی

مولانا ابوالکلام آزاد نے جو خود غیر معمولی ذہن و نظر کے مالک تھے۔ آزاد ہندوستان میں اکادمیوں کی داغ بیل ڈالی۔ مرکزی حکومت نے انہی کے زمانے میں تین اکادمیوں کی منظوری دے دی تھی جو آج کل نئی دہلی میں کامیابی سے چل رہی ہیں۔

علمی ادبی شعبے کی	ساہتیہ اکادمی
رقص و موسیقی کی	سنگیت ناٹک اکادمی
مصوری و پیکر تراشی کی	للت کلا اکادمی

البتہ اردو اکادمی کی نوعیت ان سے بلکہ دنیا بھر کی سرکاری، نیم سرکاری اکادمیوں سے مختلف ہے کیونکہ اس کے حالات و ضروریات اوروں سے ذرا ہٹ کر ہیں۔ یہاں اکادمی کے تین پہلو ہوں گے۔

(۱) زبان و ادب کا پرچار۔

(۲) درسی تدریسی ہمت افزائی۔

(۳) علمی اور اعلیٰ ادبی سرگرمی کی پشت پناہی (جو دوسری اکادمیاں کرتی ہیں۔)

اسی نسبت سے اردو اکادمی کے بجٹ کو تین خانوں میں تقسیم کرنا ہوگا اور اس کے کام کے دو پرت رہیں گے۔

ایک اوپر کا پرت جسے اہلِ علم اہلِ قلم سے سو کار رہے اور اکادمی کا معیار سربلند رکھا جائے۔

ایک دوسرا پرت جسے ٹیچروں سے، صحافیوں سے، سوشل ورکروں سے مل کر ان کے حلقوں میں کام کرنے کا موقع ملے اور ان کو بھی اس میں برابر کا شریک کیا جائے۔

ہماری زبان کا کام ان دو لائنوں پر ایک ساتھ بڑھے تبھی اکادمی اپنے بلا کے بھشاشے الضاف

کر سکے گی۔

لطیفۂ غیبی

ایک تازہ ولایت آگرے آئے۔ دوکان پر "پٹھی" (جسے یہاں مرٹی کہتے ہیں) تلی جا رہی تھی۔ نتھنوں میں خوشبو اور منہ میں پانی بھر آیا۔ بنیے سے پوچھا۔

ایں چیست ؟	جواب ملا	"پٹھی پلیت"
"چہ می گوئی ؟"	جواب	"تیل میں پوئی"
"صاف بگو"	جواب	"پیسے کی دو"

ہماری اردو اکادمیوں کے بعض ناگہانی ممبر بھی اکادمیوں سے کبھی کبھی اسی قسم کا سوال جواب کرتے پائے جاتے ہیں اس ڈائیلاگ میں نہ "اکادمی" ان کی زبان سمجھتی ہے نہ وہ اس کی۔ مگر لطف اندوز دونوں ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال کا حصّہ اور حالی کا مظہر

ایک تھا بادشاہ! محل سے نکل کر شکار کے لئے روانہ ہوا۔ ایک دریا پار کرنا چاہا تو پانی کے زور کا تھا نہ کر سکا۔ ڈوبنے لگا کہ فوراً ہی ملاح کے دو نوجوان بیٹوں نے بادشاہ کی جان بچائی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر کہا کہ "انعام میں جو مانگو گے ہم دیں گے۔" بڑے بھائی کو دودھ کا شوق تھا اس نے بادشاہ سے دودھ پینے کے لئے ایک بھینس انعام میں مانگ لی۔ مگر چھوٹے بھائی نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ بادشاہ سلامت مجھے علم کا شوق ہے میری تعلیم اگر آپ انتظام کروا دیں تو میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری ہو جائے۔

بھینس نے تھوڑے دن دودھ دیا اور پھر کسی بنا پر مر گئی۔ بڑے بھائی کی حالت جیسی پہلے تھی ویسی پھر ہو گئی۔ مگر چھوٹا بھائی تعلیم حاصل کرتا رہا اور اپنے علم ہی کی بنا پر شاہزادہ کا بھی دوست بن گیا۔ بادشاہ کی موت کے بعد جب شاہزادہ بادشاہ بنا تو اس نے اسی کو اپنا

ر بنالیا۔

سرکار ہر برس چند کروڑ روپے انجمن ترقی اردو، اردو
بورڈ، اردو اکاڈیمیوں ریڈیو بزم اردو۔ اور ٹی۔ وی
دو پروگراموں کے بہانے سے خدمتِ اردو کی آڑ میں
لمانوں کی خوشنودی کے لئے مخصوص کرتی ہے۔ اب یہ
لمانوں کی سوجھ بوجھ پر منحصر ہے کہ وہ سرکار کی اس بخشش
لاح کے پہلوان بیٹے کی طرح محض بھینس کا دودھ پینے
ر وقتی کام میں لائیں یا پھر موقع سے جائز فائدہ اٹھاتے
ئے اپنے معاشرے کو سدھارنے کی کوشش کریں

مندرجہ بالا سطور مدیر گلکن بمبئی نے عرصہ ہوا بمبئی
ر درشن کے اردو پروگراموں اور مسلمانوں کے لئے
ہ ہائے تر پھینکے جانے کے بارے میں حکومت کے درشنی
اداروں انجمن ترقی اردو، اردو اکاڈمیوں اور ترقی
اردو بورڈ سے متعلق لکھی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کملیشور نے "سیری کریا" عنوان
سے بمبئی اور پھر دہلی دور درشن سے ہندوستانی عوام کے بارے
یں ہونا پروگرام پیش کرنے شروع کئے تھے اور عوام کہتے تھے
ٹی۔ وی پر ایک شخص ایسا آیا ہے جسے اپنے ملک اور قوم کے
سماجی مسائل بتا کر منظرِ عام پر لاکر انھیں حل کرنے کی کوشش
کرنا آتا ہے مگر برا ہو سیاست کا کہ کملیشور ایسے ہندوستانی
معاشرے اور معاشرتی مسائل سے کما حقہٗ واقفیت
رکھنے والے کو دور درشن میں رہنا مشکل کر دیا گیا اور وہ اس
فکر پر تھوکتے ہوئے الگ ہو گئے۔

جن مسلم دانشوروں کو ریڈیو اور دور درشن تک
پہنچنے کا بار بار موقع ملتا ہے اُن میں کوئی بھی ایسا نہیں کہ جو
لک یا کم سے کم اپنے فرقے کے مسائل سے دلچسپی رکھتا ہے
یہ سب کے سب اقبال کے خطے اور حالی کے مغلر کی
باتیں کرتے ہیں۔ غزلیں اور قوالیاں گانے والیوں کے طبلے
اور سارنگی کو سراہتے ہیں یا پھر حقائق کی اس دنیا میں افسانوں
لا قدیم و جدید کے پیمانے سے ناپ کر دور درشن جیسے
معتبر میڈیم کو مستقل ضائع کر رہے ہیں۔

ہندوستان کو چھوڑیئے مسلم اقلیت کے سامنے اس
کے اپنے مسائل ہندوستان کے کسی بھی دوسرے فرقے کے
معاملات سے کہیں زیادہ ہیں۔ مسلم پرسنل لا، جیسے متنازعہ
مسائل سے قطع نظر مسلمانوں میں جوڑے اور تلک کی بڑھتی
مسلمان لڑکیوں کا عرب یا امریکہ پلٹ لڑکوں پر نسبتاً زیادہ
ریجھنا۔ چائے کے مسلم ہوٹلوں میں گندگی کی زیادتی اور گھروں
میں حفظانِ صحت کا فقدان۔ عرب ممالک میں ملازمت
کے تجربے، حج کے سفر میں مشکلیں اور سہولتیں، مسلمانوں
کی تعلیمی حالت۔ مسلم گھروں میں اخبار بینی کا فقدان۔

ہندوستان کی مسلم عورتوں کا عرب سیاحوں سے شادی
کر کے بیوی، بیوی سے داشتہ اور داشتہ سے زر خرید
لونڈی بن جانا اور مسلمان عورتوں کا بار روزگار ہونا جیسے
درجنوں سماجی مسائل ہیں کہ جن کو ٹی وی کے پردے پر لاکر
حل کرنے کی کوشش کی جا سکتی اور فیملی پلاننگ کے لئے
بھی راہ ہموار کی جا سکتی ہے۔ مسلمانوں میں جو انجمنیں اور
سوسائٹیاں قائم ہوتی ہیں وہ روزہ نماز کی تلقین کرتی
ہیں یا پھر شعر و شاعری اور افسانہ نگاری کے فروغ کے لئے
ہوتی ہیں۔ یعنی جنت دوزخ کا ذکر یا چاند ستاروں کا
جس دنیا میں رہتے ہیں اس کی کوئی فکر نہیں اس لئے
ریڈیو اور ٹی وی کی صورت میں جو سہولتیں مسلمانوں کو ملی
ہیں ضرورت ہے کہ روشن خیال، بے دار مغز اور ترقی
پسند دانشور ان کو ملک و قوم اور اپنے فرقے کی اصلاح کا
ذریعہ بنائیں۔ شاعرانہ فلسفے پر مباحثے منعقد کرنا اور ڈراموں
مراثیوں کے گن گانا ترقی پسندی نہیں رجعت پرستی ہے۔

دلی دور درشن پر اردو پروگراموں کی باگ ڈور اب مسز
انجم عثمانی کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ یہ حضرت بھی شمیم عصمت
صاحبہ کی طرح اردو کے مصنفین، شعرا، ادیبوں، نقادوں
جنھیں صحیح معنوں میں اردو دانشور کہا جا سکتا ہے اُن سے
قطعاً ناواقف ہیں شمیم عصمت اور انجم عثمانی میں فرق صرف
انیس بیس کا ہی ہے وہ بھی دو چار پرسنٹ اردو دانشوروں
کے زیر اثر تھیں اور ان کی ہدایات پر ہی اردو پروگرام ترتیب

دیتی تھیں اور انجم عثمانی بھی کچھ اصلی یا نقلی اُردو دانشوروں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور اپنی ڈیوٹی کو بخیر و عافیت انجام دینے کے لئے اُنہی لوگوں کے رہین منت ہیں۔

فہیم عصمت صاحب جس قدر سادہ لوح تھیں انجم عثمانی اتنے ہی شاطر ہیں۔ انھوں نے اپنی دھاک بٹھانے کے لئے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ یہ حضرت مفتی عتیق الرحمان صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں ہمیں کئی حضرات نے یہی بتایا جس پر حیرانی ہوئی کہ عمر کے پچاس سال کے قریب مفتی صاحب کے نیاز مند کے طور پر گذار دی مگر آج تک ہمیں یہ بھی علم نہ ہو سکا کہ مفتی صاحب کے کوئی صاحبزادے انجم عثمانی بھی ہیں اور پھر مفتی صاحب جو ریڈیو اور دُوردرشن کو اسلامی نکتہ نظر سے کفر کی حد تک گردانتے ہیں انھوں نے اپنے صاحبزادے کو اس محکمے میں ملازمت کیسے کرنے دی۔

کلکتہ کے ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑا دہلی تشریف لائے تو ہریانہ بھون میں جناب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ نے انھیں اپنی موٹر بھیج کر اپنے ہاں مدعو کیا۔ اسی اثنا میں خواجہ نثار احمد فاروقی (جو گورنر ہریانہ کے خصوصی مصاحب ہیں) بھی موجود تھے انھوں نے جب ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ کی پُر معلومات گفتگو سنی تو دوسرے ہی دن دُوردرشن والوں سے کہا کہ ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ کا انٹرویو لینا دُوردرشن کے لئے باعثِ فخر ہوگا لہٰذا دو چار دنوں میں ہی ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ کا یہ انٹرویو دُوردرشن پر دکھایا گیا۔ یہ انٹرویو سننے والوں کا کہنا ہے کہ ایک عرصے کے بعد دُوردرشن کے اُردو پروگرام میں ایسا پروگرام دیکھنے کو ملا جس پر واقعی دُوردرشن کو فخر ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ نے بھی ہمیں یہی بتایا کہ انجم عثمانی نے انھیں بھی یہی کہا کہ وہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ چونکہ مفتی صاحب مرحوم اور ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ کے تعلقات بھی نصف صدی سے زائد عرصے کے تھے لہٰذا ڈاکٹر چوپڑہ نے بھی انجم عثمانی صاحب کو دُعائیں دیں۔

اس سے پہلے تو سُنی سُنائی اطلاعات پر ہمیں یقین نہیں آتا تھا مگر جب ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ نے اس کی تصدیق کی کہ انجم عثمانی نے خود ان سے کہا تھا کہ وہ مفتی صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں تو ہم دفتر "برہان" گئے اور مفتی صاحب کے فرزند ارجمند جو کہ ندوۃ المصنفین کے انچارج ہیں سے دریافت کیا کہ کیا انجم عثمانی صاحب واقعی آپ کے بھائی اور مفتی صاحب کے صاحبزادے ہیں تو انھوں نے حیرت کے ساتھ اس سفید جھوٹ پر احتجاج کیا اور کہا کہ آپ شان ہند میں یہ اعلان کر دیجئے کہ انجم عثمانی جناب مفتی عتیق الرحمٰن کے فرزند نہیں ہیں۔

اُردو اکاڈمی کی ایک تقریب منعقدہ غالب اکیڈمی نظام الدین میں جناب انجم عثمانی سے ڈاکٹر ... ملاقات ہوئی اور چائے کے دوران اُن سے دُوردرشن کے اُردو پروگراموں سے متعلق کچھ گفتگو بھی ہوئی تو محسوس ہوا کہ دُوردرشن والوں نے انھیں محض ایک مسلمان کی حیثیت سے ہی اُردو پروگرام کا انچارج بنا دیا ہے ورنہ ان میں ایسی صلاحیتوں کا فقدان ہے جو از خود اس پروگرام کو بخوبی چلا سکیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ انجم عثمانی اس خول سے نکل کر جو انھوں نے اپنے اوپر ہر طرف سے مضبوط طنابوں سے بندھوا رکھا ہے از خود اُردو پروگراموں کو تشکیل دیں تاکہ حکومت جو روپیہ اُردو کی اوٹ میں مسلمانوں پر لٹا رہی ہے اس کا بہتر انداز میں استعمال ہو سکے۔ ویسے حکومت نے تو اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر ایک مسلمان کو دُوردرشن کے اُردو کے پروگراموں کا انچارج بنا رکھا ہے اس لئے حکومت سے تو کوئی شکایت نہیں کی جا سکتی ہاں اُردو پروگرام کرنے والوں سے ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اقبال کے خُطبات حالی کے مظلوم پر مزید ریسرچ نہ کریں اور اس پروگرام کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

ضروری اعلان

"چنگاری" کے بشیر احمد کا معافی نامہ جو انھوں نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سلسلے میں غلط بیانی کے بارے میں پریس کونسل آف انڈیا میں دیا ... مصدقہ نقل جو پریس کونسل آف انڈیا کے دفتر سے حاصل کی گئی ہے دفتر شان ہند میں موجود ہے جو صاحب اس معافی نامہ کو دیکھنا چاہیں وہ دفتر کے اوقات میں تشریف لا کر دیکھ سکتے ہیں۔

ہندو تخیل کہیں نہ کہیں اپنا پن محسوس نہ کرے۔

ہر دور میں، ہر عہد میں، ہر علاقے میں، رجواڑے میں غیر مسلم، خصوصاً برہمن اور کھتری اہلِ اقتدار نے محرم کا اور اہلِ محرم کا غیر معمولی احترام کیا ہے۔ دہلی، لکھنؤ، مرشد آباد اور حیدرآباد میں کتنے ہی برہمن، کایستھ اور کھتری نسل کے سخنوروں نے پورے خلوص کے ساتھ مرثیے اور سلام لکھے اور سرِ منبر پڑھ کر سنائے (بعضے تو اب تک سناتے ہیں) اونچی اور نیچی ذات کے ہندو گھرانے اپنے بچوں کو محرم کا تبرک (پرساد کی طرح) لیتے دیکھے اور اسے بابرکت سمجھتے رہتے ہیں۔ امام کے (فرضی) گھوڑے کے نیچے سے گزرنے کو شبھ سمجھا جاتا رہا ہے۔

یہی نہیں۔ پٹیالہ، گوالیار، جے پور اور دوسرے ریاستوں میں عشرۂ محرم اس شان سے اور اتنی ذہنی اور مالی فیاضی کے ساتھ منایا جاتا کہ دور دور سے ماتمی دستے اور عزادار اس میں شریک ہونے پہنچتے تھے ان ریاستوں کے مہاراجہ سیاہ پوش اور ننگے پاؤں عزاداروں کے جلوس کی سربراہی کرتے اور گلاب پاشی کیا کرتے تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ کے خاندان میں دُلدُل کی لگام تھام کر چلنا ایک اعزاز تھا جو صرف ولی عہد کو سونپا جاتا تھا (آخری وزیرِ اعظم خلیفہ محمد حسین اثنا عشری شیعہ ان سے دو قدم پیچھے چلتے تھے) سندھیا مہاراجہ گوالیار نسل در نسل محرم کا عاشورہ مناتے اور اس روز خود بھی عزاداری کا سارا اہتمام کیا کرتے تھے۔ یہ مذہبی لوگ تھے۔ اپنے دھرم کا پالن کرنے میں (پوری آگاہی کے سبب) باہر دیس کے ایک بڑے دھرم کا بھی آدر کرتے تھے۔ آنکھیں بچھاتے۔ اس عمل کو اپنا دھرم سمجھتے تھے۔

ہندو ہندستان کی نظر میں خالص اور نخالص مذہب کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ شمالی ہند کے ان شہروں میں جہاں شیعہ سنی فساد کا اندیشہ ہوتا۔ تعزیوں اور عزاداروں اور ماتمیوں کے بھاری جلوس اونچی ذات کے ہندو محلوں سے نہ صرف پوری سلامتی کے ساتھ، بلکہ خاطر مدارات کے ساتھ گزرا کرتے تھے۔

ہم نے پڑھا ہے اور سنا بھی کہ امرتسر میں محرم (ذوالجناح) کا جلوس خاص فرمان کے مطابق گوردوارہ ہرمندر دربار صاحب کے سامنے سے گزرنے لگتا تو پابرہنہ گرنتھی آگے بڑھ کر، تعظیم دے کر گھوڑے کی لگام تھام لیتے اور اُسے خود بڑے احترام سے دربار صاحب کے جلو میں گزار چکنے کے بعد عزاداروں کے سپرد کیا کرتے تھے۔

یہ تھا ہندو ہندستان، جس کے سینے میں صدیوں سے ہر ایک مذہب، ہر ایک عقیدے، فرقے کی سمائی تھی۔ جس کی بیٹیوں نے غیروں کو ممتا دی۔ اپنایا، چھاتی سے لگایا۔ اپنے سنسکاروں سے ہم آہنگ کرنا سکھانا۔ آج کوئی کہے اُن سے جو ہندو ہندستان کے جیکاروں کے ساتھ ترشول یا بھگوے جھنڈے اٹھائے، سینہ پھلائے اور بڑبڑاتے پھرتے ہیں کہ اُس ہندو ہندستان کے وارث تلاش کرو جس کے پریم رس نے عاشورۂ محرم کو، اور اس کی کوکھ سے جنمے ہوئے مرثیوں، نوحوں، سلاموں کو دنیا کی بہترین کلچرل اور ادبی وراثت کا نمونہ بنا دیا۔

عاشورۂ محرم صرف عزاداری کا نہیں۔ رواداری کا بھی اعلیٰ ترین مظاہرہ تھا۔ اور آج بھی ہے۔

رشکِ مالوہ دانش علی گڑھی

محمد نقی خاں آشر اندوری ... ایم پی

رتلام مالوہ کے پھیلے ہوئے شفاف دامن پر واقع ایک قدیم شہر ہے۔ یہاں کے باشندے ہندی زبان بولتے ہیں اور ہندی زبان کے ساتھ ہی یہاں پر ایک زبان اور بولی جاتی ہے۔ جو مالوی زبان کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن اس زبان کی مقبولیت صرف مالوہ ہی کی حدوں تک محدود ہے۔ یہاں کے کچھ باشندے راجستھانی اور گجراتی زبان بھی بولتے ہیں۔ کیونکہ راجستھان اور گجرات کی حدیں رتلام سے جڑی ہوئی ہیں۔ کسی زمانے میں یہ علاقہ اردو زبان اور شعر و ادب کے نام پر ایک بنجر اور سنگلاخ علاقہ تھا۔ لیکن آج خدا کے فضل و کرم سے گہوارۂ ادب مانا جاتا ہے۔ وقت بدلا حالات بدلے اور بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ رتلام کا ادبی ماحول بھی بدلا۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں سے کچھ ایسے شعراء بسلسلۂ ملازمت رتلام میں آکر سکونت پذیر ہوئے جن کے ذہنوں پر حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، شاد عظیم آبادی، فانی بدایونی، امیر مینائی اور جگر مرادآبادی کے رنگِ تغزل کا گہرا اثر تھا۔ رتلام کے مقامی اساتذۂ فن کے ساتھ ساتھ ان بزرگ شعراء کی جدوجہد اور قربانیوں نے رتلام کے ادبی ماحول کو نکھارا۔ تقسیمِ وطن کے بعد رتلام میں کبھی ختم نہ ہونے والا ایک ایسا مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا جو الحمد للہ آج تک جاری ہے۔ آج بھی رتلام کی سرزمین پر فقید المثال مشاعرے ہوتے ہیں۔ جن میں ہندوستان کے نامور شعرائے کرام غزل سرا نظر آتے ہیں۔ جوش، جگر اور فراق جیسے الشعرا کے مشہور و ممتاز شعراء رتلام میں بیک وقت ایک اسٹیج پر سامعین کو اپنے [illegible] حاصل ہو سکا۔ یہاں کے سامعین بھی سنجیدہ طبیعت ہیں۔ شعر کو سمجھنے کی خداداد صلاحیت رکھتے ہیں۔ اچھے شعر پر شاعر کو دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ ہر اچھے شاعر کی قدر کرتے ہیں۔ چاہے وہ مقامی ہو یا بیرونی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے آج سے قریب پچیس تیس سال قبل جس وقت محمد عثمان خاں دانش علی گڑھی اپنے آبائی وطن کو ہمیشہ کے لئے خیرآباد کہہ کر رتلام تشریف لائے۔ رتلام کا ادبی ماحول پورے شباب پر تھا۔ ہر زبان پر شعر و ادب کے چرچے تھے۔ اور گھر گھر مشاعروں کے تذکرے ہوا کرتے تھے۔ رتلام میں نوجوان شعراء کی کثیر تعداد کے علاوہ ابو شفیق احمد شفیق کاکوروی سلیمان خاں ناز اکبرآبادی منشی محمد رمضان علی شوکت استادِ مالوہ، فہمید رتلامی احسان الحق احسان رتلامی علامہ غنی بزمی، منظر بزمی حامد نواز صاحب حامد گلشن آبادی وغیرہ مالوہ کی قابلِ ذکر ہستیاں رتلام میں موجود تھیں۔ مالوہ کے مشہور استاد فخرِ مالوہ احسان الحق احسان رتلامی مرحوم، کی شفقت اور مالوہ کے ان ممتاز شعراء کی صحبت نے حضرت دانش علی گڑھی کو [illegible]ا کا ایک پختہ شاعر بنا دیا۔ ویسے تو دانش صاحب نے ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن صنفِ غزل انھیں محبوب رہی۔ اپنی غزلیات میں انھوں نے کھل کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ بقول فہمید [illegible] اچھا شعر تخلیق کرنے کے لئے شاعر کو ہزاروں بار جگر کا خون کرنا پڑتا ہے۔ غزل ایک پردۂ سیمیں ہے جس پر شاعر اپنے جذبات کی لفظی تصویر پیش کرتا ہے۔ اصنافِ شاعری میں غزل ہی ایک ایسی مشکل اور نازک صنف ہے جس پر قدرت حاصل کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ [illegible] ہیں جنھیں دانش صاحب کا

طرح صنفِ غزل پر عبور حاصل ہے۔ دانش صاحب ایک کھلا ہوا ذہن رکھتے ہیں۔ غزل کے مخصوص تیور اور اس کا مزاج سے واقف ہیں۔ آج کے دور میں جب کہ غزل کا زیور حسن اس کے جسم سے اتارا جا رہا ہے غزل اپنی نزاکت اور رنگینیاں کھو رہی ہے۔ ان کے یہاں غزل نازک لہجے سے مرصع اور لطیفات کے زیور سے آراستہ نظر آ رہی ہے۔ اور شاید یہی ان کی مقبولیت کا راز بھی ہے۔ ہندوستان کے عظیم گلوکار اپنی موسیقی کے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے دانش صاحب کی خوبصورت اور رنگین غزلوں کو سہارا لینے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں دانش صاحب کے یہاں انفرادیت سے سینکڑوں بار کہی ہوئی بات بھی اسی انداز سے کہتے ہیں کہ وہ نئی معلوم ہوتی ہے۔ آپ کے اشعار میں منفرد طرز گفتگو پائی جاتی ہے دانش صاحب کی یہ تمام خوبیاں انھیں غزل کا ایک بڑا شاعر ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ دانش صاحب ایک ایسے شاعر ہیں جو برسوں سے ترنم کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ادب کو ان سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اگر انھیں آسمانِ ادب کا ایک رخشندہ ستارا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا آج وہ مقبولیت کے اس مقام پر ہیں جہاں شاعر کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ دانش صاحب ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نیک دل اور ہمدرد انسان بھی ہیں انسانیت و شرافت شائستگی حسنِ اخلاق اور خوش مذاق انھیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی ہے ایک اچھے سچے اور عہد آفریں شاعر میں جو خوبیاں ہونا چاہئیں وہ آپ میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ آپ کا شعری مجموعہ "قلم کا سفر" منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے مندرجہ ذیل اشعار آپ کی فنکارانہ شخصیت کا آئینہ ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ساحل سے خدا حافظ جب تم نے کہا ہوگا
پھر ڈوبنے والے کا کیا حشر ہوا ہوگا

جب میری تباہی کا افسانہ سنا ہوگا
ظالم وہ سہی لیکن دل کانپ گیا ہوگا

بے وجہ نہیں کہتی دنیا مجھے دیوانہ
تم نے بھی کبھی شاید دیوانہ کہا ہوگا

خاموشی پہ اس کی تو مایوس نہ ہو اے دل
وہ عرضِ تمنا پر کچھ سوچ رہا ہوگا

اب ترے نام سے منسوب ہے ہستی میری
انگلیاں تجھ پہ اٹھیں گی میں جدھر جاؤں گا

مجھے بتائیں گی کیا گردشیں زمانے کی
میں کل تمہارے بارے میں اے دوست سوچتا ہی نہیں

یاد آؤں گا میں تمہیں اس دم
تم جب اپنوں کو آزما لوگے

ہر ایک چیز کی بہتات قدر کھوتی ہے
کبھی کبھی جو ملے غم تو احترام کریں

گردشِ وقت مٹا مجھ کو مگر دھیان رہے
پھر نہیں کوئی ترے ناز اٹھانے والا

اتنی خوشی نہ بخش کہ آنسو نکل پڑیں
غم بھی نہ اس قدر ہو کہ ہنسنے نہ پائیں ہم

ان کی زلفوں کو چھوئے ایک زمانہ گذرا
آج تک ہے مرے ہاتھوں میں خوشبو باقی

کیا تری یاد کی اب ہم سے تو اضح ہو گی
اب نہ باقی ہے لہو دل میں نہ آنسو باقی

دانش کی آرزوں کا نقشہ بدل گیا
دنیا سمجھ میں آئی کسی کے کرم کے

یادِ ماضی کی گھٹن سوزِ غمِ مستقبل
یہ سلگتے ہوئے دن رات نہ جینے دیا

تم بھی اک واقعہ ہو کے رہ جاؤ گے
ہم بھی بھولی ہوئی داستاں ہو گئے

جسم اک تنگیٔ زندان بلا ہو جیسے
زیست ناکردہ گناہوں کی سزا ہو

باقی صد ۱۴۲ پر

افکارِ گریزاں

یوسف ناظم

یہ افکارِ گریزاں، تو بڑی ہی شاندار کتاب نکلی کیوں نہ ہو ماہنامہ شانِ ہند دہلی کی طرف سے شائع ہوئی ہے آن، بان، شان۔ تینوں عناصر اس میں موجود ہیں۔ کتاب ہاتھ میں آئی تو ایسا محسوس ہوا قوسِ قزح ہاتھ دھو کر سامنے آ گئی ہے۔ سرورق میں ویسے دو رنگ کم ہیں لیکن پانچ رنگوں کی بہار بھی سات رنگوں کی بہار سے بس ذرا ہی سی رہتی ہے۔ یہ کتاب مجموعۂ کلام ہے ڈاکٹر حقیر آستانی کا۔ ڈیمائی سائز کے ۲۱۶ صفحے حسن و خوبی اور نفاست میں ڈوبے ہوئے۔ ہر صفحہ ایسا معلوم ہوتا ہے خیابانِ باغ یا دکانِ گل فروش ہے۔ کتاب بہت ہی نفیس چھپی ہے۔ سرورق پر ایک سیاہ دائرہ بھی بنا ہوا ہے اسی دائرے نے کتاب کو نظرِ بد سے بچا لیا۔

ڈاکٹر حقیر آستانی سے ملاقات ہوئی تو جی چاہا ان سے کہہ دوں آپ حقیر کیسے ہوئے۔ نہایت ہی مجلا اور شگفتہ قسم کے آدمی، صحت قابلِ رشک۔ سر پر بال نہیں ہیں لیکن کوئی حرج نہیں۔ پروفیسروں کے سر پر بال ہونے بھی نہیں چاہئیں۔ خاص طور پر اس وقت جب مضمون معاشیات ہو۔ ڈاکٹر حقیر آستانی اصلاً ڈاکٹر کیشو چندر سین ایم۔ اے (معاشیات) ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی (معاشیات یو ایس اے ہیں) برسوں یونیورسٹی میں طالب علموں کو معاشیات پڑھائی ہے۔ اب ورلڈ بینک کے مشیر ہیں (کبھی کہوں گا کہ ورلڈ بینک سے تھوڑا سا قرض۔ بلا سود کے مجھے بھی دلا دیں) بمبئی میں مقیم ہیں لیکن قیام کم ہی ہوتا ہے۔ سفر ان کا ذریعۂ معاش تو نہیں لیکن وسیلۂ معاش ہے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں لیکن ان سے کوئی فیض اس لئے حاصل نہیں کیا جا سکتا کہ معاشیات تو سب کی ہی بگڑی ہوئی ہے اور اس کے مزید بگڑنے کے امکانات روشن ہیں۔ زمانہ طالب علمی ہی سے انھوں نے اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیئے تھے۔ (عجلت کی وجہ سے) سینٹ زیویرس اسکول میں پڑھتے تھے لیکن قابلیت کالج کی رکھتے تھے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمیشہ معروف رہے اس پر مستزاد شاعری۔ اپنی علمی، حسابی اور سیاحتی مصروفیات میں تو انھیں گم ہو جانا چاہئے تھا لیکن شاعری کچھ کم طاقتور چیز نہیں ہوتی۔ اس نے بھی ان سے اپنا حق وصول کر لیا۔ افکارِ گریزاں۔ کی شکل میں۔

حقیر آستانی نے کہا بہت ہے۔ چھپے کم ہیں چرچے زیادہ۔ مشاعروں اور محفلوں میں کبھی نہیں پائے گئے اس لئے کہ رہے ہی ہندوستان سے باہر۔ یہ تو ان کی اندرونیت تھی جس نے ان سے اتنا کلام کہلوا لیا ورنہ شاعر کو تو صحبت، محفلیں، تبادلۂ خیال، بحث مباحثے (بلکہ مناقشے) درکار ہوا کرتے ہیں۔ ان سب چیزوں سے شاعر کی شعر گوئی کی صلاحیت جلا پاتی ہے حقیر آستانی خوش قسمت رہے کہ انھیں ان بیساکھیوں کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کتاب میں بھی کوئی دیباچہ یا مقدمہ نہیں ہے۔ (حالانکہ میرا خیال ہے یہ ایسا دیباچہ تو لکھوا ہی سکتے تھے جس میں انھیں پوری صدی کا نہیں، نصف یا ربع صدی کا بہترین شاعر ثابت کر دیا جاتا) اس استغنا اور لاتعلقی کی وجہ شاید یہ ہو انھوں نے جس آستانے سے خود کو وابستہ کر رکھا ہے وہ انھیں سب سے بے نیاز کر دینے کے لئے کافی ہے

ان کے مجموعۂ کلام میں جس کی نفاست کی پوری تعریف نہیں کر سکا ہوں۔ ۵۰ نظمیں، ایک قطعہ

۵ غزلیں اور ۵ گیت شامل ہیں (اچھا خاصا خزانہ
ہے) مینک کے منتشر ہیں اس لئے اپنا کھاتہ کا گرانقدر
بنا ہے۔ مجموعے کی پہلی نظم "قلم سے خطاب ہے" ۱۲
پر مشتمل یہ نظم قلم کی پوری کہانی ہے۔ ایک بند دیکھئے۔

کبھی خاموشی تصویر ہے تو ٭ کبھی سسکی ہوئی تحریر ہے تو
کبھی نازک بدن جیسے کہ شبنم ٭ کبھی چلتی ہوئی شمشیر ہے تو

ان کے یہاں جوش کی سی شوکتِ الفاظ نہیں لیکن
ذخیرۂ الفاظ کے معاملے میں یہ دوسرے تیسرے نمبر پر ضرور ہیں
جوش کے ساتھ کسی دوڑ میں شریک ہونا خود بہت بڑی
بات ہے۔ ان کی نظم "فرار" میں بھی الفاظ اور خیالات
کی رنگا رنگی ہے

جام جم ہو یا کہ آغوشِ صنم ٭ روح پرور عنبریں زلفوں کے خم
یا کہ چشمِ نازمائل بہ کرم ٭ ہر طرف ہے فقط دو چار دم
دم بہ دم ہے گردشِ لیل و نہار ٭ زندگی ہے ہو نہیں سکتا فرار

حقیر آستانی، دو ٹوک بات کہنے کے عادی ہیں ان
کے یہاں داؤں پیچ کم ہیں۔ وہ اپنی بات کو نہ تو گہنوں سے
سجاتے ہیں نہ میک اپ سے انھیں مصنوعی حسن عطا کرتے
ہیں۔ سادگی انھیں عزیز ہے۔ غزل میں البتہ رمز و اشارہ
سے کام لیتے ہیں کیونکہ غزل ہوتی ہی ہے در پردہ
گفتگو کے لئے۔ کیا عمدہ شعر کہا ہے ؎

روزِ محشر قریب ہے شاید ٭ شور ہر سو عبادتوں کے ہیں

عبادت جب نمائش بن جائے تو یہ قربِ قیامت
کی علامت ہے۔

ان کی وہ غزل جس کی ردیف گزرا ہے تغزل سے
مالا مال ہے۔ شعر دیکھئے۔

بہت زمانہ ہوا پھر بھی یاد آتا ہے
وہ ایک لمحہ جو دونوں کے درمیاں گزرا
جہاں جہاں سے خرد جھینپ جھینپ کر نکلی
وہیں وہیں سے جنوں بھی رواں دواں گزرا

ان کے یہاں دکھ درد کی پرچھائیاں بھی ہیں۔

یہ بے بسوں کی بستیاں یہ بے کسوں کی بستیاں
[illegible]

دین کے، نسل کے، رنگ کے نام پر
موت کے گھاٹ لاکھوں اتارے گئے

اپنے ہاتھوں پھونک ڈالیں آشیاں
اب تو شعلے آشیاں تک آ گئے

صحبتِ ناجنس میں بیٹھ کر اپنی شعری صلاحیتوں کو
سنبھال کر رکھنا انھیں پروان چڑھانا۔ انھیں صیقل کرنا
آسان کام نہیں۔ یہ تو ڈاکٹر حقیر آستانی کے ذہنی، دلی
اور روحانی آسودگی کا طفیل ہے کہ ایک خوبصورت مجموعۂ
کلام تولد ہو پایا۔ تاہم "اشکارِ گریزاں" کو میں ان کا
سرمایۂ حیات نہیں سمجھتا۔ ابھی تو انھوں نے صرف
کنارے پر کھڑے رہ کر اتنی سیپیاں جمع کر لی ہیں پانی
میں اتریں گے تو موتی بھی ہاتھ آئیں گے فی الحال جو موتی
ان کے یہاں ہیں ان سے زیادہ آب دار اور قیمتی موتی
شاعری اور غواصی میں بس تھوڑا سا ہی فرق ہے (یہی وجہ
ہے کہ صدیوں پہلے غواصی نام کا شاعر بھی پیدا ہوا تھا جو اپنے
کلام کی وجہ سے اب تک زندہ ہے)

حقیر تو بہت چھوٹا تخلص ہوا۔ شاعروں کا کام تعلّی
ہے انکساری نہیں۔ کیا ڈاکٹر کیشو چندر سین اس نکتے
پر غور کریں گے۔ یوں کہنے کو وہ ایس۔ ای۔ ان سیان
ہیں لیکن اصل میں ہیں ایس۔ اے۔ ان ی۔ فہیم و ہوشمند
اور ایک بات۔ انھیں اس قسم کے شعر نہیں کہنے
چاہئیں جیسا کہ یہ شعر ہے۔

بس اب تو جانے ہو؛ الٹے ہیں آج کل رستوں
حقیر سوئے عدم آپ کو خوشی ہوگی

ایسی باتیں صرف ثانی صاحب کو زیب دیتی تھیں۔

تعلیم اور آبادی

نذیر احمد
اعزازی مدیر اعلیٰ
اورینٹل گریجویٹ

آج کے حالات ماضی سے مختلف ہیں اور
اری ضروریات زندگی گذشتہ زمانہ کے مقابلہ میں بہت
یادہ ہوگئی ہیں۔ مختلف ادوار میں قوم کی ضروریات
ی مختلف ہوا کرتی ہیں۔ ایک غلام ملک کے باشندے
ی نئی پود کو جدوجہد آزادی سے ہٹ کر تعلیم دینے کا
صور بھی نہیں کر سکتے۔

آج ہم آزاد ہندوستان کے شہری ہیں آزادی
ہذیب اور شائستگی کا برتاؤ، اخلاق اور برادری کا
اس دلحاظ یہ سب کچھ اسی کی دین ہیں۔ اس ترقی
افتہ دور کی ضروریات بے اندازہ سرعت سے ترقی
رگئی ہیں کہ اب ہم کو اپنی اور اپنے خاندان، محلہ
ریاست، ملک اور دنیا کی ترقی کو پیش نظر رکھنا پڑ
رہا ہے۔ پہلے گھر یا زیادہ سے زیادہ گھرانے کے
لئے خاندان ایک اکائی تھا۔ لیکن اب خاندان،
حلہ، ملک اور دنیا اکائی بن گئی ہے۔ رشتوں کی
وسعت نے ساری دنیا کو سکیڑ کر رکھ دیا ہے۔
اور ضروریات کی یکسانیت نے عالمی مسئلہ کو
انسانی مسئلہ بنادیا ہے۔

انسان تو ساری دنیا میں بستے ہیں اور سب
انسان ایک ہیں اور سب کے ساتھ محبت اور
خلوص کا برتاؤ کرنا انسانیت ہے۔ اس طرح آج
انسان ریاستوں، ملکوں اور براعظموں میں بٹا
ہوا نہیں بلکہ سب انسان ایک ہیں اسی لئے سب کی
بھلائی اور بہبودی کے لئے ہم سب کو سوچنا پڑ رہا ہے۔
تعلیم نے ہم سب کے سوچنے کے ڈھنگ کو
بدل ڈالا ہے اور اپنے اور بیگانے کے فرق کو مٹا
دیا ہے آج ہمارے گھر اچھے خاصے محلہ یا کالونی
کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور محلہ تو آبادی کے اعتبار
سے گنجان اور وحشت ناک مناظر پیش کر رہا ہے
جدھر دیکھو بے ہنگم آوازیں شور و شغف سے
کان بہرے ہو رہے ہیں۔ سڑکیں ناقابل غور ہیں
ٹریفک کے بہترین انتظامات اور سڑکوں کی بے انتہا
وسعت بھی ناکافی ثابت ہو رہی ہے بڑھتی ہوئی
آبادی کی تیز رفتاری خود کئی اہم مسائل کو جنم دے
رہی ہے۔

ہماری ضرورتیں آئے دن بڑھتی ہی جارہی ہیں ہر
ماہ ملکہ ہر ضرورت میں غیر یقینی اضافہ اس کی محدود
اور مقررہ آمدنی سے تکمیل پانے میں بڑی دشواری
ہوتی ہے۔ اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ آئے دن کی بیماریاں
قیمتی دوائیاں ٹانک اور بیش قیمتی غذاؤں کی خریدی
کو صدر خاندان کی کمر ہی توڑ دیتی ہے۔ اس طرح "نہ جائے
رفتن نہ پائے ماندن" والی بات ہوگئی ہے۔
بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو روکنا مشکل مسئلہ بن گیا
ہے۔ مسائل کی فہرست بہت طویل ہوگئی ہے اس
کا طول ناپنا ماہرین ریاضی سے بھی ناممکن ہو رہا ہے
آبادی کے سیلاب نے انسانوں کو جس طرح بانٹ کا
تفرقہ پیدا کر دیا ہے ان پر غور و فکر کرنا ہی پڑے گا۔
مثلاً دو بچوں کے باپ اور آٹھ بچوں کے باپ کے
حالات ایک جیسے ہوتے ہوئے بھی ایک جیسے نہیں
ہوسکتے ایک ہی پیشہ اور ایک ہی آمدنی والے دو آدمیوں
میں جن میں سے ایک کو قدرت نے صرف دو بچہ
دیئے ہیں۔ اور دوسرے کو ماشاء اللہ آٹھ بچوں سے

نوازا ہو تو ایک ہی معیارِ زندگی ہرگز بسر نہیں کر سکتے بچوں کی خوراک، لباس، لاڈ و پیار، ناز و نعم میں کافی تفاوت ہوگا۔ ایک گھر خوشحال اور خوشیوں کا مرقع ہوگا تو دوسرے گھر میں حسرتوں اور نامرادیوں کے فسانے گونج رہے ہوں گے۔

"اپنی تنخواہ کی ندی میں ہے پانی آدھ پاؤ اور لاکھوں ٹن کی بھاری اپنی جیون کی ناؤ"

والی بات ہو گئی ہے آبادی کا اضافہ گھر یا گھرانا ساری دُنیا کے لئے ایک مستقل مسئلہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آٹھ بچوں والے گھر سے زیادہ پرسکون چار بچوں والا گھر ہوتا ہے اور چار بچوں والے گھر سے زیادہ مسرت دو بچوں کے والدین کو ہوتی ہے جہاں قدرت نے منّت، مراد، نذر و نیاز اور علاج معالجہ کے بغیر ہی اولاد نوازی عام کر دی ہے۔

وہیں انسانوں میں عقلِ سلیم کے خزانوں کے دروازے بھی کھول دیئے ہیں۔ بچوں کی حالت قدرت کا دخل ہو یا نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی نے خاندان کی عزت اور صدرِ خاندان کی شرافت کو تہس نہس کر ڈالا ہے یہ مسئلہ صرف خاندان، محلہ، گاؤں، شہر، ریاست یا صرف بھارت دیس کا ہی نہیں رہا بلکہ دُنیا کے ہر مہذب و متمدن ملک کو اپنی ترقی کی رفتار برقرار رکھنے کے لئے آبادی کی شرح کو بڑھنے سے روکنا ضروری ہو گیا ہے۔

ترقی پذیر و مہذب ممالک بھی اپنی خوشحالی کی ضمانت کے لئے آبادی پر کنٹرول کو ناگزیر قرار دے چکے ہیں، اس فہرست میں ایسے ممالک بھی شامل ہیں جو نسل پرستی کے زیرِ اثر افرادی قوت کے خواہاں تھے۔ جس کے لئے وہ افزائشِ نسل کے لئے منفعت بخش ترغیبات کا قانونی حق بھی دے چکے تھے۔ اور برسہا برس اس کا استفادہ بھی کر چکے ہیں۔ سماجی روایات اور معاشی انصاف کے لئے روٹی، روزگار، مکان اور تعلیم کے ابھرنے والے بنیادی گوناگوں مسائل نے انھیں بھی مجبور کر دیا کہ وہ مذہب، نسل، ذات پات سے بالاتر ہو کر انسان کی فلاح و بہبود کے لئے غور کریں۔

یونیسکو کے اعداد و شمار کے بموجب ۱۹۸۰ء میں دُنیا کی آبادی ۴ ارب ۵۰ کروڑ تھی۔ اور اس میں ہر سال ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ برِ اعظم ایشیا کی کل آبادی ۲۴ کروڑ ہے خطرناک سیلاب کی طرح بڑھتی ہوئی دھاکو آبادی ایک عام بشر کے لئے بھی لمحۂ فکر ہے۔

مہذب معاشرہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیم روٹی، روزگار اور مکان جیسے ابھرنے والے بے شمار مسائل سے نمٹنے کے لئے اقدامات اور جد و جہد کرے ترقی پذیر ملکوں نے ناخواندگی کے سوال پر جو کامیابی حاصل کی ہیں ان ملکوں میں ناخواندہ افراد کا تناسب جو ۱۹۷۰ء میں ۳۲،۴ فیصد تھا۔ ۱۹۸۰ء میں گھٹ کر ۲۸،۹ فیصد ہو گیا ہے۔

یونیسکو کو توقع ہے کہ ۱۹۹۰ء تک یہ تعداد ۲۵ فیصد ہو جائے گی اس کے باوجود دوسری طرف ناخواندہ افراد کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے اور اس وقت ساری دُنیا میں ۸۱ کروڑ ۴۰ لاکھ افراد ناخواندہ ہیں۔ پیش قیاسی کے مطابق موجودہ صدی کے اختتام تک ان پڑھ افراد کی تعداد ایک ارب تک پہونچ جائے گی۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ ترقی پذیر ممالک کے ہی ہوں گے۔

ہمارے ملک ہندوستان میں ۱۵ سال سے کم عمر کے بچوں کی تعداد کا اندازہ ۲۷ کروڑ لگایا گیا ہے جو ملک کی کل آبادی کا ۴۰ فیصد ہے اور اس ملک میں تقریباً ۱۳ کروڑ بچے ایسے ہیں جن کے لئے سماج اور سرکاری امداد و اعانت زندہ رہنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے بموجب ۶۸ کروڑ ۴۰ لاکھ

تھی۔ اور منصوبہ بندی سے شرح پیدائش اور اموات میں بالترتیب ۱۰ فیصد اور ۲۲،۱ فیصد کمی کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

صحت اور خاندانی بہبود سے متعلق وزارت کے مطابق ۱۹۸۲ء تک ۳ کروڑ ۹۲ لاکھ ۶۰ ہزار کی پیدائش کی روک تھام کی گئی ہے۔ ۱۹۸۵ء کے دوران ... ۶، ۳۶ فیصد جوڑوں کی کنبہ بندی کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا اور ۱۹۹۵ء تک ۶۰ فیصد جوڑوں کی کنبہ بندی کا منصوبہ ہے۔ یہ کامیابی کے نشانے یقیناً ہماری معاشی اور اقتصادی ترقی کے لئے نیک شگون ثابت ہوں گے جو خوش حالی کے لئے ملک کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

سماجی اور معاشی انصاف معیاری تعلیم کے ذریعہ ہی ممکن ہے اور سماجی اور معاشی تبدیلیاں ہی مسئلہ کی اصل جڑ ہیں صرف برتھ کنٹرول ہی اصل مسئلہ کا حل نہیں۔ گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا تھا۔ بچہ دنیا کی اولین دور کی بہترین مثال ہے۔ وقت، مقام، تعلیم اور روایات کے سبب انسان میں بہت سی تبدیلیاں آچکی ہیں۔

لیکن بچہ آج بھی وہی ہے جیسے کہ وہ لاکھوں سال پہلے تھا۔ اتنا ہی نازک معصوم اور دل آویز جتنا کہ وہ پہلے دن تھا۔ نفسیاتی، سماجی اور جسمانی طور پر طاقتور، صحت مند بچے ہی ملک و قوم کی امانت اور اثاثہ ہوتے ہیں۔ معذور، مریض، اپاہج اور کمزور بچے ایک بار گراں تصور ہوتے ہیں لیکن سماج پر ان کی بھی نگہداشت کی ذمہ داری عائد رہتی ہے علاوہ ازیں بیروزگاری، غربت اور جہالت بھی ملک کی معیشت کو خوش حال بنانے میں رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔

ہمارے منصوبے نشانوں کی تکمیل اور کامیابی کے باوجود ناکامی میں بدل جاتے ہیں اور ہر روزہ نوبہ

اول است" بن جاتا ہے۔ آج بھی ہمارے ملک کی برائے نام چند فیصد آبادی ہی بلحاظ آمدنی اعلیٰ اور اوسط طبقہ کے زمرہ میں آتی ہے باقی تمام ... غریب طبقہ کے زمرے میں شمار کی جاتی ہے۔

غربت کی مقررہ انتہائی حد سے بھی نچلی سطح کی زندگی گذارنے والوں کا تناسب سب سے زیادہ یعنی ۴۸ فیصد ہے۔

جو صرف کھانا، کپڑا اور مکان جیسی بنیادی ضرورتوں تک سے محروم ہیں۔ ان کے لئے صحت صفائی اور تعلیم و دیگر آسائشوں کا تصور بھی کہاں کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے ملک کی ۷۵ فیصد آبادی دیہاتوں میں رہتی بستی ہے۔

سارے ملک میں خواندہ افراد کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کے باوجود بڑھتی ہوئی آبادی میں خواندگی کا تناسب گھٹتا ہی جارہا ہے۔

حالانکہ تعلیم کو دستوری بنیادی حق قرار دیا گیا ہے، اور تعلیم قانوناً لازمی و جبری بھی ہے۔ متعدد ترغیبات کے باوجود ملک میں خواندگی کا تناسب ۲۵ تا ۳۰ فیصد سے بڑھ نہ سکا۔

ملک اپنے منصوبوں سے مادی ترقی کر چکا ہے آزادی کے بعد سے تمام تر کوششوں کے بعد بھی جو ۴ سالہ مدت میں ہی صد فیصد خواندگی کے منصوبے کا نشانہ مقرر تھا۔ لیکن اب بھی ۷۰ فیصد آبادی ناخواندہ ہی رہ گئی ہے۔ معاشی پسماندگی و بدحالی اور دیگر وجوہات کی بنا پر ایسے کم عمر بچے بھی جو اسکول میں شریک تو ہوتے ہیں لیکن المیہ یہ کہ ان میں سے ۷۵ فیصد بچے ترک تعلیم کر دیتے ہیں۔

ہماری سماجی تہذیب اور ثقافت کی نمائندگی کے ٹھیکیدار اور رہبر مبلغین اور مصلحین اس عالمی اور بنیادی انسانی مسئلہ کے مستقبل کے خطرناک اور بھیانک انجام کے ادراک سے محروم ہیں۔

اور وہ صرف موقتی اقتدار اور جزوی منفعت
کے لئے مذہب، زبان، علاقہ، ذات اور نسل کے
عنوانوں سے انسانیت سوز سرگرمیوں میں ملوث
اور سماجی استحصال کے مرتکب ہو گئے ہیں۔ اس
طرح وہ خود اپنی ہی نسل کے قومی سماجی اور انسانیت
کے بنیادی تقاضوں اور مطالبات سے یکسر غافل ہیں

ہمیں یہ احساس ضروری ہے کہ زمانہ اکیسویں صدی
کے دہانے پر پہونچ رہا ہے۔ ہمیں آبادی کے اس بڑھتے
ہوئے طوفانی سیلاب کو روکنے کے لئے ساری توانائیوں
کو بروئے کار لانا ہی ہوگا۔

اور ان تمام ذرائع اور وسائل کا بھرپور استفادہ
کرنا ہی چاہئے جو ہمیں دستیاب ہیں۔

جہاں حکومت نے ناخواندگی کو قوم کے لئے ایک
چیلنج تصور کرتے ہوئے ایک نئی قومی تعلیمی پالیسی کو
اپنائے ہوئے صد فیصد خواندگی کے نشانے کو
حاصل کرنے کے لئے انقلابی اقدام کے طور پر تعلیم کے
نظام میں بنیادی [illegible] کر چکی ہے۔ جس کے لئے
ہر سطح پر [illegible] اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ فنی درسی
تعلیم کے [illegible] اور تعلیم بالغان وغیرہ جیسے تعلیم کا نظام
رائج کر دیا [illegible] ہے۔ یقیناً اس کے مثبت اور مفید
اثرات ملک [illegible] پر مرتب ہو سکیں گے جس کی ہمیں
سخت ضرورت ہے۔

آزادی کے [illegible] بڑھتے ہوئے تناسب کی روک
تھام صرف معیاری [illegible] کے ذریعہ ہی ممکن ہے اس کے
لئے نہایت ضروری [illegible] آبادی سے متعلق تعلیم
ترقیاتی پروگراموں کا [illegible] لازمی جزو بنا دیا جائے۔

آج آبادی سے متعلق تعلیم وقت کی اہم ترین اور
اولین ضرورت بن گئی ہے۔ آبادی کے موضوع کو نصاب
تعلیم میں ہر سطح کے نظام [illegible] رائج کیا جانا چاہئے۔
اس سلسلے میں سرکاری کنٹرول کے [illegible] بہبود [illegible] اور تخویف
نہایت مضر اور منفی اثرات کے [illegible] ہوں گے۔

ترغیب و تحریص کے ساتھ ساتھ مختصر اور
خوشحال کنبہ کے مضرات اور افادیت سے متعلق بنیادی
اہم پہلوؤں کی موثر پیمانے پر تعلیم، تفہیم اور تشہیر بھی
ہو، چھوٹے اور بڑے کنبہ کے دائمی فوائد اور نقصانات
سے بھی اچھی طرح واقف کرانا چاہئے۔

رسمی و غیر رسمی اور تعلیم بالغان کے قومی نصاب
تعلیم میں آبادی کے موضوع کو اسباق سے بھی مربوط کیا
جائے۔ تاکہ اواخر بیسویں صدی اور اکیسویں صدی
جوان اور نوجوان جوڑے خطرناک بڑھتی ہوئی آبادی
کی ضرورتوں طلب اور رسد کی حقیقتوں سے واقفیت
پا سکیں۔

اور مستقبل کی عملی دشواریوں تلخ حقائق مصائب
اور مجبوریوں کے شعور [illegible] اپنے بہتر مستقبل کے
لئے وہ جو بھی راستہ اپنائیں گے وہ ایک سماج کے
باوقار فرد اور ملک کے ذمہ دار شہری کی حیثیت سے
مدبرانہ اقدام ہی ہوگا۔

بہتر تعلیم کا عمل ہی خوشگوار ذہنی تبدیلی ہے
جو انقلاب کا سرچشمہ ثابت ہوتی ہے۔ صرف صحتمند
اور خوش حال کنبہ ہی ملک کی ترقی اور خوشحالی میں معاون
اور حصہ دار ہوتا ہے۔

اور ہم خاندانی منصوبہ بندی سے ہی سائنس اور
ٹکنالوجی کی اس انقلابی ترقی کی دوڑ میں داخلی اور خارجی
چیلنجوں کا سامنا کرنے کی اہلیت پیدا کر سکتے ہیں اور یہی
عمل آج انسانیت کی بنیادی ضرورت ہے اور انسانی
نسل کی صحتمند خوشگوار ترقی و خوش حالی کے لئے ایک
عظیم اور بے مثال نمونہ بھی ہے۔

قابلِ تقلید

قدرت حجازی

جب میں آفس سے گھر پہنچا تو میری آواز سنتے ہی میری بڑی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور میرے ہاتھ میں ایک شادی کا دعوت نامہ تھما دیا۔ میں آفس سے تھکا ماندہ لوٹا تھا۔ مزاج چڑچڑا سا ہو رہا تھا۔ میں نے لڑکی کو ڈانٹ دیا۔ اری بے وقوف تو اتنی بڑی ہو گئی مگر ابھی تجھے عقل بھی نہیں آئی۔ یہ کون سا تک ہے کہ آدمی باہر سے تھکا ماندہ آیا ہوا اور آتے ہی اس کے ہاتھ میں دعوت نامہ تھما دیا جائے۔ میری ڈانٹ سن کر میری لڑکی بجائے بُرا ماننے کے ہنسنے لگی اور کہنے لگی، ابو آپ نہیں جانتے کہ اس رقعہ میں کیا ہے؟ ذرا اس کو پڑھ کر تو دیکھئے آپ کی سمجھ میں خود بخود آ جائے گا کہ میں نے اس بے تابی سے یہ رقعہ آپ کو کیوں دیا تھا؟

رضیہ نے سچ ہی کہا تھا۔ اس دعوت نامہ میں بات ہی کچھ ایسی تھی جس کو پڑھ کر کوئی بھی حیرت میں ڈوب سکتا تھا؟

ٹھیکے دار رام پرشاد کو کون نہیں جانتا تھا۔ سارے شہر میں ان کی نیک نامی و فیاضی کے چرچے ہیں ان کے اعلیٰ کردار و رفعِ اخلاق کی وجہ سے ہر آدمی ان کی عزت کرتا تھا۔ اور ہر ایک کے دل میں ان کے لئے عقیدت کا جذبہ موجود تھا۔ یہ رقعہ انہی کی لڑکی کی شادی کا تھا۔ حیرت تو اس بات پر ہو رہی تھی کہ لڑکی کا نام عائشہ اور نوشہ کا نام نعیم الحسن لکھا تھا۔ یہی بات مجھے محوِ حیرت کئے ہوئے تھی۔ دماغ چکرا رہا تھا۔ کیونکہ دُنیا جانتی ہے کہ رام پرشاد لاولد ہیں۔ ان کے کوئی اولاد ہی نہیں ہے۔ پھر یہ لڑکی کہاں سے آ گئی اور وہ بھی مسلم۔ اگر میں یہ فرض کر لوں کہ انھوں نے کسی بچی کو لے کر پال لیا ہو تو نام عائشہ کیسے ہو سکتا ہے اس گتھی کو سلجھانے کی بہت کوشش کی مگر سلجھا نہ سکا جس کی وجہ سے میرے دل میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ٹیلی فون کر کے رام پرشاد ہی سے پوچھ لوں۔ مگر ان کے برا مان جانے کے ڈر سے یہ جرأت نہ کر سکا۔ اسی ادھیڑ بن میں آدھا گھنٹہ گذر گیا اور مجھے اس کا پتہ ہی نہ چلا۔

میں خیالات کے اس تانے بانے سے اس وقت چونکا جب میری لڑکی رضیہ میرے لئے چائے لے کر آ گئی مجھے اس وقت خیال آیا کہ نہ تو میں نے ابھی کپڑے ہی بدلے ہیں اور نہ ہی منہ ہاتھ دھویا ہے۔ میں نے رضیہ سے کہا تم چائے رکھ جاؤ۔ میں پی لوں گا۔ میرے دماغ میں جو بات کھٹک رہی تھی وہ یہ تھی کہ ایک ہندو کی لڑکی مسلم کیسے ہو سکتی ہے؟ پھر اس خیال سے کچھ تسلی سی ہوئی کہ اس ماڈرن زمانہ میں سب کچھ ممکن ہے۔ ان کی اپنی بیوی سے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ممکن ہے ذات پات کے بندھنوں کا خیال کئے بغیر مسلم لڑکی سے شادی کر لی ہو۔ اور یہ لڑکی اسی کی ہو یہ بات الگ ہے کہ دُنیا کی انگشت نمائیوں سے ڈر کر اس بات کو انھوں نے راز میں رکھا ہو۔

شادی کے دن کا مجھے بے چینی سے انتظار تھا خیر سے وہ دن بھی آ گیا۔ اس دن مجھے دفتر میں کچھ زیادہ کام تھا۔ جس کی وجہ سے شادی میں پہنچنے تک دیر ہو چکی تھی نکاح ہو چکا تھا۔ لوگ آپس میں گلے مل کر مبارک باد دے رہے تھے مہمانوں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد جمع تھی ایسا روح پرور سماں تھا کہ دیکھ کر میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ کون کہتا ہے کہ ہمارے دیش میں

ہندو مسلم اتحاد نہیں ہے کوئی اس شادی کی تقریب کو دیکھتا تو اس کے دل سے یہ وہم نکل جاتا اور وہ اس بات کا یقین کرتا کہ ہمارے دیش میں آج بھی وہی بھائی چارگی و اتحاد برقرار ہے۔ کون کہتا ہے کہ اس دیش میں لوگ ذات پات کے نام پر کٹ مرتے ہیں؟ بات دراصل یہ تھی کہ اس تقریب میں آئے ہوئے مہمانوں میں ہندوؤں سے زیادہ مسلم نظر آرہے تھے۔ دلہا کی طرف سے آنے والے مہمان تقریباً سبھی مسلمان تھے۔ اور دلہن کی طرف سے رام پرشاد کے خاندان کے لوگ اور دیگر دوست احباب کثیر تعداد میں شریک تھے میں بھی اس بیاہ میں شریک ہو گیا۔ باوجود اتنی چہل پہل کے میرے ذہن میں صرف وہی ایک بات سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔

رام پرشاد سب سے ملتے ملاتے مبارکبادیاں لیتے ہوئے میری طرف آرہے تھے میں نے بڑھ کر گرمجوشی سے استقبال کیا اور اپنے پورے خلوص کے ساتھ ان کو گلے لگا کر مبارکباد دی۔ رام پرشاد کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر میرے دل میں وہ سوال اچھلنے لگا۔ اور بے ساختہ لب ہلے اور میں وہ بات پوچھ ہی بیٹھا جس کی جرأت عام حالت میں بھی کبھی نہ کر سکتا۔ میں نے کہا بھائی رام پرشاد اگر میں تم سے ایک نجی سوال پوچھوں تو برا نہیں مانو گے۔ ارے نہیں بھئی برا ماننے کی کیا بات ہے تم میرے دوست سے بھی زیادہ بھائی کی حیثیت رکھتے ہو تمہارے ہمارے تعلقات بہت قدیم ہیں۔ تم بلا جھجک، ہر بات پوچھ سکتے ہو۔ ....

کیا میں اس راز کو جان سکتا ہوں کہ آپ کی لڑکی مسلم کیسے جب کہ آپ کے کوئی اولاد ہی نہیں۔ یہ بات سن کر رام پرشاد مسکرائے اور کہا میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ آؤ چل کر دلہا دلہن سے مل لو اور انہیں مبارکباد کے کچھ دعاؤں سے بھی نوازو۔

جب سب لوگ مل چکے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو دلہا کی مسند پر رام پرشاد نمودار ہوئے اور کسی کو بلا کر مائیکروفون لانے کے لئے کہا۔ جب مائیکروفون ان کے سامنے آگیا تو .....

پہلے تو انھوں نے سب مہمانوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور کہا بھائیو، بزرگو، دوستو میں اس وقت ایک ضروری اور اہم بات بتانے جا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ لوگ اس طرف دھیان دیں گے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میرے دوست حمید نے مجھ سے ایک سوال کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوال نہ صرف حمید کا ہے بلکہ سب کا ہے۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ اور لوگ روا داری میں یہ بات پوچھنے کی جرأت نہ کر سکے ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بات تو سبھی کو معلوم ہونا چاہئے۔

اس واقعہ کو گزرے پانچ سال کا عرصہ ہوتا ہے آپ لوگوں کو یاد ہوگا کہ ایک آزاد خیال لڑکی کو چھیڑنے کا بہانہ لے کر ایک فرقہ وارانہ فساد بھڑک اٹھا جس میں کئی لوگ مارے گئے، مکانات دکانات جلا دئے گئے کرفیو کا نفاذ عمل میں آیا۔ تب کہیں جا کر کچھ سکون ملا پانچ دن تک شہر میں سناٹے کا راج رہا سوائے پولیس کے گشتی دستوں کی کاروں کی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ لوگ اتنے ڈرے سہمے ہوئے تھے کہ ریڈیو کے بجنے کی بھی آواز کہیں سے سنائی نہ دیتی تھی پانچویں دن دو گھنٹوں کے لئے کرفیو میں نرمی کی گئی تو لوگ اپنے اپنے گھروں سے اس طرح نکل پڑے جیسے کسی جیل سے چھوٹے ہوں ہر آدمی ایک غیر معمولی تیزی کے ساتھ اپنے راستوں پر رواں دواں تھا مجھے بھی خیال آیا کہ چل کر اپنے دوست رحمن سے مل کر اس کی خیریت دریافت کر آؤں اسی لئے میں نے ڈرائیور سے کار نکالنے کے لئے کہا رحمن کا گھر پرانے شہر کے ایک محلے میں تھا رحمن میرے بچپن کا دوست تھا۔ ہمارا گھر بھی ان کے پڑوس میں تھا۔ رحمن کے والد قادر نواب اس وقت کے مشہور و معروف لوگوں میں سے ایک تھے خاندانی

رئیس ہونے کے ناطے ان کے شاہانہ ٹھاٹ باٹھ کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ بھی ایک دا ریاست سے کم نہیں۔ مگر طبیعت کے اتنے سادہ اور ہنس مکھ خوش مزاج کہ جن کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس وقت ہم لوگوں کی مالی حالت اچھی نہیں تھی میرے والد غربت سے وظیفہ لے کر ایک چھوٹی درزی کرانے کی دکان لگا کر بیٹھ گئے۔ جس سے گھر کا خرچ بھی پورا نہ ہو پاتا تھا تعلیمی اخراجات برداشت کرنا تو ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ تو کہیے نواب صاحب کی شفقت اور مہربانی تھی کہ وہ رحمدلی کے ساتھ میری بھی تعلیم کے اخراجات برداشت کرتے اور ہر دسہرہ، دیوالی پر میرے لئے نئے کپڑے بنواتے اور آئے دن کچھ نہ کچھ ان کی ڈیوڑھی سے نوازشات کا سلسلہ جاری رہتا جس سے ہماری زندگی کے دن آرام سے کٹ رہے تھے۔ وقت گذرتا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات بھی بدلتے رہے۔ ہمارا دیش آزاد ہوا۔ بادشاہوں کی بادشاہت ختم ہوگئی۔ جاگیرداروں کی جاگیریں ضبط ہوئیں حالات نے یکسر پلٹا کھایا جس کی لپیٹ میں میرا دوست احمن بھی آئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی حالت دن بدن گرتی گئی جو کچھ ورثے میں ملا تھا وہ سب کچھ بک چکا اب وہ ایک کرایہ کے مکان میں رہتا تھا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اپنے دوست کی خیریت دریافت کرنے کے لئے اس کے گھر گیا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرے دوست کا مکان خالی اور ویران پڑا ہوا تھا اور دروازہ ٹوٹا ہوا تھا اور سامان نام کی کوئی چیز اس مکان میں نہیں تھی۔ اور خاص بات یہ تھی کہ نہ تو اس گھر میں میرا دوست ہی تھا اور نہ ہی اس کی اکلوتی لڑکی اب میں بے چین تھا کہ کس سے دریافت کروں۔ کوئی شناسا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں سامنے سے گنگا رام آتا ہوا دکھائی دیا وہ بھی مجھے دیکھ چکا تھا۔

نزدیک آکر ادب سے سلام کیا اور کہنے لگا صاحب آپ ادھر کیسے آگئے۔ میں نے کہا گنگا رام میرا ایک دوست اسی مکان میں اپنی لڑکی کے ساتھ رہتا تھا۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ اب کہاں ہے۔ گنگا رام نے کہا ہاں صاحب جانتا ہوں میں بھی یہیں پاس ہی رہتا ہوں وہ صاحب جو اس مکان پر رہتے تھے۔ وہ دنگے میں مارے گئے اور ان کی لڑکی جان بچا کر بھاگ نکلی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک درزی کے پاس ہے جو ان کے کپڑے سیا کرتا تھا۔ اچھا تو کیا تمہیں اس کا پتہ معلوم ہے۔ گنگا رام نے کہا ہاں صاحب معلوم ہے۔ تو چلو آؤ میرے ساتھ چلو۔ جب میں اس درزی کے مکان پر پہنچا تو اس کی لڑکی نے مجھے دیکھا اور راموکاکا کہتی ہوئی آ کر میرے پیروں سے لپٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی میں نے آگے سے گود میں اٹھا لیا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ اری پگلی تو کیوں فکر کرتی ہے تیرا باپ نہیں تو کیا ہوا تیرا کاکا تو ابھی زندہ ہے یہ کہتے ہوئے ان کی آواز رندھ گئی اور سب لوگ اس وقت رو رہے تھے۔ اور عورتوں میں سے تو دھاڑیں مار کر رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جب یہ طوفان کچھ تھما تو پھر رام پرشاد نے کہا یہ عائشہ وہی لڑکی ہے جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ میری کوئی اولاد نہیں ہے مگر میں نے اس دن اس کو اپنی بیٹی مان کر ہی اپنے گھر لایا تھا اس کی پرورش کی اور آج کنیادان کی کر رہا ہے اس کی شادی کی ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو گیا ہوں

جیسے ہی رام پرشاد نے تقریر ختم کی سب لوگ نے ایک زبان ہو کر یہ عہد کیا کہ ہم سب قسم کھا کر کہتے ہیں کہ آج کے دن سے ہم اپنے سماج میں کسی غیر سماجی عنصر کو پھلنے پھولنے نہیں دیں گے۔ ہم سب بھائی ہیں ہم سب بھائی بھائی رہیں گے اب کوئی قوت ہمارے عزم کو متزلزل نہیں کر سکتی۔

- بیوی سگریٹ کو اپنا رقیب سمجھتی ہے!
- ساتھ چھوٹ گیا تو زندگی میں کیا رہے گا!
- جو سگریٹ چھوڑ دے اس بے وفا کا کیا بھروسا!

ترکِ سگریٹ

راجا محمد افضل خاں

۱۹۲۹ء سے ۱۹۶۳ء تک ۳۴ سال کا طویل عرصہ ۳۰ اور ۵۰ کے درمیان روز کے سگریٹ پانچ لاکھ کے لگ بھگ ان کی کل تعداد ۱۹۲۹ء میں اعلیٰ سگریٹ ایک روپیہ کے پچاس۔ ۱۹۶۳ء میں ان کی قیمت پانچ گنا۔ سگریٹ نوشی کی کھانسی۔ پیلے پیلے بلغم کے کھنکار۔ اچھی غذا سے طبیعت ہر وقت اُچاٹ۔ یہ سب کچھ اعداد و شمار کے علاوہ۔

اور فائدے اتنے کم کہ نہ ہونے کے برابر۔ سگریٹ سے دماغی سکون حاصل ہوتا ہے اعصاب کا تناؤ کم ہو جاتا ہے۔ اکیلے پن کا ساتھی۔ ہاتھوں اور انگلیوں کا بے ضرر سہارا فلمی ہیرو کا امتیازی نشان اور خوف یہ کہ اگر یہ چھوٹ گیا تو وقت کیسے کٹے گا۔ سوچ معطل ہو کر رہ جائے گی۔ کام کرنے کی ترغیب کیسے مہیا ہو گی زندگی ایک عجیب خلا بن جائے گی۔

جب سگریٹ چھوڑنے کی ہمت نہ پڑی تو تعداد کم کرنے کا پختہ ارادہ کیا جاتا۔ اور کچھ دن تک ۳۰ سے ۵۰ کے بجائے ۵ سے ۱۰ سگریٹ تک کی تعداد گھٹا کر اپنے آپ کو سورما سمجھا جاتا۔ آہستہ آہستہ ۵ اور ۶ میں کیا فرق ہے اور ۱۰ اور ۱۱ تو ایک ہی بات ہے۔ اس طرح بڑھاتے بڑھاتے پھر وہی ۳۰ اور ۵۰ کے درمیان کم تعداد میں دوستیاں نہیں بنتیں۔ اور دوست بیوی سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں بیوی اگر سگریٹ نہیں پیتی تو سگریٹ کو اپنا رقیب سمجھتی ہے اس کے برعکس دوست تو دوست ہوتے ہیں۔ ہر حالت میں اپنے ساتھی۔ چنانچہ دوستی نبھانا زیادہ اہم۔ اس لیے اگر سگریٹوں کی تعداد کم کر کے دوستی پر آنچ آنے کا خطرہ ہو تو تعداد کی قربانی لازمی ہو جاتی ہے۔

سگریٹ کے ساتھ ۳۴ سال کی طویل دوستی کا خاتمہ بس یوں ہی ہو گیا۔ ایک روز میں دفتر میں بیٹھا حسبِ معمول سگریٹ سلگائے انہماک سے کام کر رہا تھا۔ میرے سامنے پلیئر نمبر ۳ کی آدھی ڈبیا اور سگریٹ لائٹر رکھا تھا۔ ایک سلگا ہوا سگریٹ میری پیلے زرد رنگ سے آلودہ دو انگلیوں میں پکڑا ہوا تھا۔ ابھی یہ سگریٹ نصف سے بھی کم جلا ہو گا کہ ایک کلرک ایک ضروری فائل لے کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ مُصر تھا کہ میں اس فائل کو فوری طور پر دیکھوں۔ اس کا یہ اصرار مجھے کچھ غیر معمولی طور پر مخلصانہ محسوس ہوا۔ اور پھر نہ جانے کیوں میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی تنخواہ کیا ہے؟ اس نے حیرانی سے جواب دیا "ڈیڑھ سو روپے"، ڈیڑھ سو روپے میں نے زیرِ لب ان اعداد کو دہرایا اور ساتھ ہی لاشعوری طور پر ایش ٹرے پر مسل دیا۔ اب میں بلند لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "ڈیڑھ سو روپے! اتنے پیسوں کے تو میں سگریٹ ہر ماہ پھونک دیتا ہوں۔ یہ عجیب اتفاق ہے۔

مجھے نہیں یاد کہ میں نے قائل سے کیا برتاؤ کیا۔ لیکن کلرک جب جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ ایک سوالیہ

شان سگریٹ وغیرہ ہی سے دوبالا ہوتی ہے۔ تم اگر وہاں سگریٹ کبھی نہیں پیو گے تو اپنے گنوارپن کو کیسے چھپاؤ گے ہم بھی دیکھیں گے کہ وہاں تم کیسے اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہو"۔

میرے دوست کا یہ طعنہ اس طویل سفر کے ایک قدم پر میرے کانوں میں گونجتا رہا۔ سگریٹ سے اجتناب ایک بار پھر میری عزت اور وقار کا مسئلہ بن گیا۔ اور جب میں اس ٹیسٹ میں بھی کامیاب واپس لوٹا تو میں نے محسوس کیا کہ میں اعصاب شکن جنگ جیت چکا ہوں۔

مارک ٹوین کہتا ہے کہ "سگریٹ چھوڑنا بھی کون سی بہادری ہے۔ میں نے اسے کئی بار چھوڑا ہے۔ اور مجھے کوئی کوفت نہیں ہوئی"۔ سگریٹ کے غلام اکثر یہی دلیل دیتے ہیں۔ اگر تعداد ہی کو بہادری کا معیار گردانا جائے تو ظاہر ہے کہ سگریٹ چھوڑنے والوں کی کم تعداد ہی انھیں بہادری کے زمرے میں ڈال دے گی۔

مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ سگریٹ سے نجات حاصل کرنے کے بعد میری خود اعتمادی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ میری صحت پر جو اثر پڑا ہے وہ اس کے علاوہ ہے میں نے اپنی ملازمت کے دوران کئی بار اصولوں پر جنگ لڑی ہے میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں سگریٹ پر قابو نہ پا لیتا تو مجھے کسی بھی ایسے مقابلے کی ہمت نہ ہوتی۔

۱۴ سال میں میری اور سگریٹ کی دوستی قطعی طور پر ٹوٹ چکی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مجھے نفرت پیدا نہیں ہوتی۔ مجھے شک ہے کہ اب بھی اگر میں اسے ایک بار ہونٹوں سے لگا لوں تو ۳۰ سے ۵۰ سگریٹ ہر روز پھونکنا پھر میرا معمول بن سکتا ہے۔ لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس کے راستے میں میری انا ضرور حائل ہوگی۔

غزل

مضطر صدیقی
بانسواڑہ

لوٹ کر جب کبھی ہم اپنے ہی گھر آتے ہیں
حادثے ساتھ مکانات میں در آتے ہیں

نذرِ آتش ہو دلہن یا کوئی قتل ہوا
شہر کے لوگ پریشان نظر آتے ہیں

یوں تو کرتے نہیں اظہارِ محبت لیکن
آئینے پر کبھی کچھ نقش ابھر آتے ہیں

آپ کے حسن ہوا بھی آپ کو معلوم نہیں
دل جراں ہو تو تمناؤں کے پر آتے ہیں

سر بہ خم ظلم کے آگے وہ نہیں ہو سکتے
قتل گاہوں سے بھی جو سینہ سپر آتے ہیں

رنگ لائی ہے تری خاک نشینی مضطر
شاہراہوں پہ نظر خاک بسر آتے ہیں

غزل

ڈاکٹر ہنومان پرشاد سریواستو
جگر بستوی

مسرت کے ابرِ کرم چھا گئے ہیں
وہ جب مسکراتے ہوئے آ گئے ہیں

مزا آ گیا مجھ کو خلدِ بریں کا
تصور میں جب وہ مرے آ گئے ہیں

محبت میں ایسا مقام آ گیا تھا
مجھے دیکھ کر جب وہ شرما گئے ہیں

یہ کیسی بہاریں ہیں اب کے برس کی
گلوں کے بھی چہرے جو مرجھا گئے ہیں

جو اس نے ابھی رخ سے [illegible] وہ
جگر ماہ و انجم بھی گھبرا گئے ہیں

اکیسویں صدی

مجبور جالندھری

یسویں صدی کی کریں آس چودہ سال؟
تا تھا رام نے بھی بن باس چودہ سال

اگلی صدی کی آس لئے کیتنے چل بسیں
دیکھیں کہ کس کو آتے ہیں یہ راس چودہ سال

آنے والا وقت ہی شاید بتا سکے
لھتے ہیں کہ وقت کا بھی پاس چودہ سال

اگلی صدی کو وقف بھوک کے لئے کریں
من مانی بھی کرے نہ مگر ساس چودہ سال

لے ویں صدی میں جنوں سے اماں ملے
رستے لہیں گے مل کے یہ اداس چودہ سال

انجام بیسویں صدی کا ہولناک سے
طاری رہے گا ذہن پہ احساس چودہ سال

میروں کے رشتے ٹوٹتے جاتے ہیں دم بدم
اخن سے کیا جدا کریں گے ماس چودہ سال؟

مجبور زندگی کے کٹنے کی ہے امید
بن کے رہیں اگر کسی کے داس چودہ سال

غزل

قمر واحدی قنوجی

اک دل چاک دامن لئے ÷ ہم رہے لطف گلشن لئے
بھو تو عکس حالات کا ÷ ہم کہ بیٹھے ہیں درپن لئے
م کے دیش میں آج کل ÷ لوگ ہیں شکل راون لئے
ل آئے ہیں باغ سے ÷ غنچہ و گل کی دھڑکن لئے
خواہش میں پھرتے ہیں ہم ÷ اپنی آنکھوں میں ساون لئے
قمر کی طرز مخصوص سے
[illegible]

سراج سخن جناب ضیا فتح آبادی کی وفات پر

عقیدت کے پھول

چرخ چنیوٹی

جوش و فراق و فیض کا ہمسر چلا گیا
اردو کا ایک اور پیمبر چلا گیا

پہلی سی سلکِ داغ میں تابش نہیں رہی
جو جاذبِ نظر تھا وہ گوہر چلا گیا

نازلیت جس نے اردو ادب کو دیا فروغ
وہ محسنِ ادب وہ سخنور چلا گیا

ہر موجۂ عروض کی کیوں آنکھ نم نہ ہو
بحرِ سخن کا ایک شناور چلا گیا

اب وہ نہ رنگ و نور نہ خوشبو نہ آب و تاب
جانِ چمن جو تھا وہ گلِ تر چلا گیا

حضرتِ ضیا کے جاتے ہی تہذیب رو اٹھی
آج اک پرانی وضع کا پیکر چلا گیا

جس میں نگینہ بن کے چمکتا تھا اپنا پن
اے چرخ وہ خلوص کا پیکر چلا گیا

قطعہ

کندن لعل گودھر

دل لخت لخت ہو تو
سر شعر و فن کہاں
ہو روح زخم زخم
تو شوقِ چمن کہاں
محشر ستانِ مرگ میں کیا
ذکرِ ناز و ساز؟
جانوں کی جب ہو فکر
تو فکرِ سخن کہاں؟

حنیفہ امیر ہاشمی (غازی آباد)

ترنگا

قومی ترنگا جھنڈا اونچا رہے جہاں میں
چمکے بلندیوں پر جوں چاند آسماں میں

تو شان ہے وطن کی تو جان ہے وطن کی
جلوے ترے فروزاں ہیں صحنِ گلستاں میں

یہ آن بان تری ہرگز نہ مٹنے پائے
جب تک زمیں میں گردش سورج ہے آسماں میں

تیغ و تفنگِ عالم تجھ کو جھکا نہ پائے
طاقت کا تو نشاں تھا ہر دستِ ناتواں میں

لہرا رہا تھا یوں ہی ہر شاخ ہر شجر پر
جب کشمکش تھی جاری صیاد و باغباں میں

باغِ وطن کے پھولوں کو تو نے تازگی دی
کانٹا رہا ہمیشہ ہر چشمِ دشمناں میں

رنگِ جبیں پہ تیرے قربان تھیں بہاریں
تیرا یہ حسنِ تاباں چمکا یوں ہی خزاں میں

احساسِ حبِّ قومی نغموں سے تیرے جاگا
ابھرا وطن کا جذبہ ہر پیر و نوجواں میں

مر کر گلے لگایا دیوانوں نے وطن کے
ہے ساتھ خاک تیری اب اُن کے خاکداں میں

بن کر لہو رواں ہے تیرا یہ حسنِ دلکش
حرکت ہے تیرے دم سے بھارت کے جسم و جاں میں

یا رب یہی دعا ہے تجھ سے تیرے ضیا کی
قومی ترنگا جھنڈا اونچا رہے جہاں میں

ڈاکٹر محمد یٰسین گھانا لکھنؤ

غزل

سارا جیون کاٹ دیا ہے خودداری کا احساس لئے
دریا دریا گزر رہا ہوں میں کرب و بلا کی پیاس لئے

یہ زر کی چمک ممکن ہی نہیں دل جیت سکے دیوانے
ہم لاکھ پھرو بازاروں میں یاقوت لئے الماس لئے

کوئی بھی اُن کا یار نہیں اللہ کو بھی ان سے پیار نہیں
ننگے بھوکے بیٹھے ہیں قسمت پاتھوں پر افلاس لئے

میری حقیقت کچھ بھی نہیں ناکام مسافر سے بڑھ کر
گویا تھک کر بیٹھ گیا ہوں ٹھوکر سے التماس لئے

عہد و پیماں توڑ کے سارے میرے ہم نگر سے دور گیا
اب تک بھی ہے ایک مسلماں آس لگا کر کی آس لئے

ڈاکٹر گوپال کرشن شفق

قطعات

راس آتی ہے زندگی کس کو
زندگی کس کو راہ دیتی ہے
روٹھ جاتی ہے زندگی جس سے
موت اس کو پناہ دیتی ہے

آہِ مظلوم طلسمات جگا سکتی ہے
تاجداروں کو تہہ خاک سلا سکتی ہے
زیر دستوں کی خموشی کو خموشی نہ سمجھ
وقت آنے پہ یہی حشر اٹھا سکتی ہے

اک لمحہ کے لئے چین کدھر پاتی ہے
اشک پیتی ہے کبھی داغِ جگر کھاتی ہے
مرنے کا غم بھی ہے تو کبھی جینے کا غم
زندگی ان ہی بکھیڑوں میں گزر جاتی ہے

جوہر دیوبندی

"ہندوستان ہمارا"

ہم مہرباں ہیں اس کے یہ مہرباں ہمارا — ہم رازداں ہیں اس کے یہ رازداں ہمارا
ہم ترجماں ہیں اس کے یہ ترجماں ہمارا — ہم پاسباں ہیں اس کے یہ پاسباں ہمارا

ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا

بغض و حسد کی دل سے رکھتے ہیں ہم صفائی — مشہور ہے جہاں میں بھارت کی ایکتائی
مذہب جدا جدا ہیں لیکن ہیں بھائی بھائی — مسلم ہوں یا کہ ہندو سکھ ہوں کہ ہم عیسائی

ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا

ہے سنگم ہمارا اس کا ہمالہ پربت — نہروں کا اس کی پانی تاثیر میں ہے امرت
کانٹوں میں بھی یہاں کے پھولوں کی ہے نزاکت — ہر ہر جواں وطن کا شمشیر کی ہے صورت

ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا

قرآن کا آئینہ ہے گیتا کا ہے یہ درپن — بانگ اذاں یہاں ہے ناقوس کا ہے شیون
شیر و شکر کی صورت ہیں شیخ اور برہمن — ممکن نہیں کہ کھڑکے برتن سے کوئی برتن

ہندوستان کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا

توحید کا ہے مرکز عرفان کا خزانہ — سایہ فگن ہے اس پر رحمت کا شامیانہ
ذرہ بھی اس زمیں کا ہے گوہر یگانہ — صدیوں سے جانتا ہے جوہر ہمیں زمانہ

ہندوستان کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا

اختر شاہجہانپوری

آج طوفاں میں سفینہ تو گھرا ہے اپنا — پار اتریں گے یہ ایماں بخدا ہے اپنا
آئینے گردِ کدورت سے ہیں دھندلائے ہوئے — چہرا ہر شخص مگر دیکھ رہا ہے اپنا
لوگ مسرور ہیں بستی میں اُجالا تو ہوا — کیا غرض اُن کو مکاں اس میں جلا ہے اپنا
امتحاں ہم بھی وفاداں کا کیا کرتے تھے — حوصلہ اب تو مگر ٹوٹ گیا ہے اپنا
مفلسی تو نے یہ کس حال کو پہنچایا ہے — اب تو بس گوہرِ احساس بچا ہے اپنا
اُس کی محفل میں جو پہنچے تو یہ محسوس ہوا — ہجر کا زخم تو مہکا سا ہوا ہے اپنا
چاہتا ہے کہ ملے ہم کو بھی عزت اختر — جو زمانے کی روش اور ہوا ہے اپنا

قسط ۶

اور دھرتی کانپ اٹھی

از محمد حسین شمش ایڈووکیٹ کشن گنج

دس

خدا گنج کے چوگرد تین چار میل تک کی بستیاں اس فرقہ وارانہ فساد میں ماخوذ ہوگئیں۔ دلاور خاں اور منگو نے جس شخص پر ہاتھ رکھ دیا وہی گرفتار ہوگیا۔ مولوی عنایت اللہ صاحب نے گاؤں میں گھوم گھوم کر لوگوں کو سمجھانا شروع کیا یہ سب مصلحت خداوندی ہے اس کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔ خدا ہم لوگوں کا امتحان لے رہا ہے ہر شخص کو اپنی قسمت پر شاکر رہنا چاہئے۔ تقدیر میں جو لکھا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے صبر کرو خدا صابروں کے ساتھ ہے تم لوگوں کے دل مذہب سے منحرف ہوگئے تھے اسی کی سزا ہے۔

اور عوام واقعی اپنی قسمت کو کوس کر رہ گئے یہ سانحہ انھیں اپنے ہی گناہوں کی پاداش نظر آ رہا تھا اور ادھر حسین بخش اور کشن لال کی بن آئی دونوں کو دس دس ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ ایک کو اپنی لڑکی کی شادی کرنی تھی۔ دوسرا خود ایک حسین دوشیزہ کے لئے بیقرار تھا۔

حسین بخش نے دلاور خاں کو اس کام پر تعینات کیا تھا۔ مالک کے اس فرمانبردار نوکر نے حق نمک ادا کر دیا۔

یہ صرف پندرھواں دن تھا اس منحوس سانحے کو کشن لال شام کے وقت میاں حسین بخش کے دولت کدے پر تشریف لائے میاں صاحب اس وقت مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے نماز کے بعد انھوں نے گڑگڑا کر خدائے غفور الرحیم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ کشن لال چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گئے ایک نوکر نے ان کے سامنے گلوریاں پیش کیں طشتری سے ایک گلوری اٹھا کر انھوں نے اس ملازم سے پوچھا دلاور خاں نظر نہیں

"وہ دوپہر ہی کو نکلا ہے ابھی واپس نہیں آیا ہے"

حسین بخش نے جیب سے تسبیح نکال کر کشن لال کی طرف منہ پھیر کر کہا "ایک موٹا دھان تو چھوٹ ہی گیا تھا۔ دیکھو دلاور لاتا ہے یا ناکام واپس آتا ہے۔

اچھا تم وظیفے سے فارغ ہولو تو باتیں ہوں گی

کشن لال کسی خیال میں غرق ہوگئے اور حسین بخش توبہ و استغفار میں مصروف۔

تھوڑی دیر کے بعد حسین بخش مصلی سے اٹھے اور جانماز سمیٹتے ہوئے کہا "ناشتہ اوشتہ کر آئے ہو"

کشن لال نے فوراً ذوق کا یہ مصرعہ پڑھ دیا

"اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر"

"اچھا تو چلو خاص کمرے میں"

یہ دونوں وہاں سے اٹھ کر خاص کمرے میں آئے حسین بخش ایک صوفے پر بیٹھے اور کشن لال ایک پلنگ پر لیٹ رہے ملازم نے پہلے ہی وہاں حقہ تازہ کر رکھ دیا تھا حسین بخش نے پیچوان سنبھالا۔

کشن لال نے مسکراتے ہوئے کہا "کہو کیسی چال رہی"

"تمہاری عقل کا کیا کہنا پیارے سے شہ پڑ گئی"

"کچھ اندازہ لگایا اب تک کتنے آئے"

"پچیس ہزار نوٹ کی صورت میں میری آہنی پیٹی میں قید ہیں"

"اور داروغہ صاحب؟"

"تیسرا حصہ میں نے انھیں تھما دیا ہے"

"اب کیا ارادہ ہے"

"ابھی نہیں مقدمہ کھل جانے دو۔"
"تو کیا اب اور بھی کچھ امید ہے؟"
"کیوں نہیں تمھیں نے تو کہا تھا اللہ خیر الرازقین
ضرور بھیجوا ان۔ ہاتھ میں لے کر میاں حسین
بخش نے کہا بھئی کشن لال تمہاری چال تو ایسی ہوتی
کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ میں نے کبھی وہم
میں بھی نہ سوچا تھا کہ اس آسانی سے علاء الدین کا
چراغ ہاتھ آ جائے گا۔
کشن لال نے منہ بنا کر کہا "کبھی تم نے میری
عقل کی تعریف بھی تو نہیں کی"
"تعریف کیا خاک کروں ابھی تک عشرت کے
کی بنیاد نہیں پڑی"
کشن لال پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور آہستہ سے
کہا حسین بخش جلدی نہ کرو۔ میں تمہارا کام کر رہا
ہوں لڑکی کا باپ تمہیں اپنی لڑکی دینے کے لئے تیار
نہیں میں نے آج مولوی عنایت اللہ کو ان کے
یہاں بھیجا اگر وہ سید صاحب منہ راضی نہ ہوا تو اسے
پھانسی کی یاد دلائی جائے گی وہ بڈھا ایسا نہیں تو
ایسے دے گا وہ حرام خور کہتا ہے کہ اس کی لڑکی میاں
صاحب کی بیٹی کی عمر کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہر لڑکی شادی
کرنے والے کی بہن کی عمر کی ہوتی ہے تو کیا اس سے
آدمی شادی کرنا چھوڑ دے! اور پھر "عمر سے کیا ہوتا
ہے اصل تو قوت ہونی چاہیے"
حسین بخش نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر
"اسے کیا معلوم کہ میں افیون نہیں کھاتا
ہوں"
"ارے قوت کا تعلق تو غذا سے ہے بال کا سفید
ضعف کی علامت نہیں بال تو نزلہ سے بھی سفید
ہوتے ہیں آج کل کے جوانوں کو دیکھو تیس پینتیس
سال ہی کی عمر میں ٹیں بول دیتے ہیں بدن میں گوشت
[illegible]

دیتا ہوں کہ ذرا مجھ سے پنجہ تو ملا لیں عمر طاقت مردانگی
کی ذمہ دار نہیں"
"اچھا تو عشرت کا باپ سید صاحب راضی نہ
ہوگا"
"راضی تو سو کے وزن سے ہوگا ابھی اس نے کشن
لال کے غصے کو دیکھا ہی نہیں"
"اسے بھی عام کسانوں کی ہوا تو نہیں لگ گئی"
"کسان اور مزدور تو وہ چور ہو رہے ہیں کہ اب زندگی
بھر کسی پارٹی کا نام نہ لیں گے۔ دھرنے اور دھرتی
بانٹنے والوں کو یہ نہیں معلوم کہ اس دیار میں ابھی کشن
لال اور حسین بخش زندہ ہیں"
"خواہ مخواہ ان لوگوں کا مزاج بگاڑ دیا تھا"
اور حسین بخش حقہ پینے لگے۔
"یہ نام نہاد کمیونسٹوں کا کام تھا"
"ان کی نانی مرے جو اب ادھر قدم رکھیں"
"اچھا یہ کہو تم پہلے حج کرنا چاہتے ہو یا شادی"
"بھئی حج تو میں اس سال نہیں آئندہ سال بھی
کر لوں گا"
"اچھا تو دیکھو مولوی صاحب کیا خبر لاتے ہیں"
کشن لال نے کہا "اگر وہ ناکام واپس آئے تو کل
میں خود جاؤں گا بڈھے کو وہ ڈانٹ بتاؤں گا کہ
ساری شیخی دھری کی دھری رہ جائے گی۔
ناہنجار اپنی جوان بیٹی کا اچار بنائے گا"
"وہ کمبخت نماز پڑھ لیتا ہے تو اپنے کو خدا کا
خاص بندہ سمجھنے لگا ہے"
"اس کی سب ملا گیری بھلا دوں گا"
اتنے میں دلاور خاں نے آواز دی حسین بخش
نے کہا "اندر آ جاؤ"
دلاور خاں مسکراتا ہوا کمرے اندر آیا
کشن لال نے پوچھا "کیا خبر ہے؟"
دلاور خاں نے کہا "فرید میاں اور تیواری

جھتو آئے ہیں۔"

کشن لال نے کہا "اے بنواری لال! لاؤ کمبخت کو میرے سامنے سو بیگھہ زمین خرید لیا ہے تو آسمان پر اڑنے لگا اور یہ فرید میاں کون ہیں۔

دلاور نے کہا "یہ اس علاقے کے مشہور بلیک مارکیٹ کرنے والے ہیں۔ اسمگلنگ کی بدولت کافی روپیہ کمایا ہے اس کمبخت نے۔ کوٹا کے زمانے میں ایک دفعہ اس نے مجھے دھتکار دیا تھا اسی وقت سے ان پر میری نظر ہے"

"کہاں ہیں وہ دونوں"

باہر بیٹھک میں بٹھا آیا ہوں

"کیا ان کے بھی آدمی گرفتار ہیں" حسین بخش نے پوچھا۔

دلاور نے کہا "قیدیوں کے تو سب رشتہ دار یکے بعد دیگرے حضور کے یہاں حاضری دے گئے مگر ان دونوں کو کبھی تو زیر کرنا ہے اگر یہ دونوں چھوٹ گئے تو سمجھیے سیاسی لیڈروں کی جائے پناہ انھیں لوگوں کے یہاں ہو جائے گی۔

کچھ توقف کے بعد کشن لال نے کہا "اچھا لاؤ اندر"

دلاور خاں کے جانے کے بعد حسین بخش نے پوچھا "ان دونوں سے کیا بات ہوگی؟"

"کم بخت میں اور دلاور دو سال سے چلتے ہیں کہ ان کے حلق میں انگلی ڈال کر اگلوا لیں گے اور یہ کیفیت بنواری تو کشن لال بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ ابھی میرے پاس آیا تھا کہ نواب صاحب کی ایک تحصیل نیلام پر چڑھی ہوئی ہے اگر اجازت ہو تو خرید لوں یہ کل کا بنیا آج کا سیٹھ ابھی اس کمبخت کے سر پر غرور کو کچل دیتا ہوں اس نے سمجھ کیا رکھا ہے" اور کشن لال غصے سے پیچ و تاب کھانے لگے۔

تھوڑی دیر میں دلاور خاں ان دونوں اسامیوں کو لئے ہوئے کمرے کے اندر آیا وہ دونوں آداب بجا کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ حسین بخش نے انھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ دونوں ایک طرف بیٹھ گئے۔

کشن لال نے بنواری سے کہا "کیوں جھتو نواب صاحب کی تحصیل خرید چکے"۔

بنواری نے بڑی لجاجت سے کہا "سرکار آپ کی اجازت کے بغیر میں کوئی کام کیسے کر سکتا ہوں"

"مگر حوصلہ تو بڑا بلند ہے کیوں نہیں آخر بلیک مارکیٹ کے روپے کہاں کام آئیں گے"

"میں تو صرف بدنام ہوں سرکار" بنواری نے کہا "لوگوں نے خواہ مخواہ میرے خلاف پروپیگنڈہ کر رکھا ہے جو ان تو لوٹے لاکھ کوٹ کھائے والی مثل ہے"

"اب بنو نہیں مجھے سب علم ہے روپے پیدا کرنے کی صورتیں تو عجیب عجیب نکال رکھی ہیں تم نے"

"افواہ ہے سرکار" بنواری نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

کشن لال نے فرید میاں کی طرف مخاطب ہو کر کہا "اور میاں صاحب آپ کے روزگار کا کیا حال ہے؟"

(جاری)

بقیہ ص ۱۳ رشکِ مالوہ

اُن کے رخسار پہ بکھری ہوئی زلفوں کا سماں
گاؤں کی اُجلی فضاؤں میں گھٹا ہو جیسے
کسی کے ظلم و ستم کا گلہ نہیں مجھ کو
فریب کھانے کی عادت ہے کیا کیجیے
کل بچھڑ جائیں گے رہ جائیں گی یادیں باقی
آج تو سارے حجابات اُٹھا دے
میری تباہی پہ روتی ہے گردشِ دوراں
مرے غموں سے خدا تجھ کو آشنا
بہت مذاق اڑاتے تھے میری غربت کا
عروج آپ کا پستی میں ڈھل گیا
یہ انتہائے زندگی ہے اسے کیسے بھول جاؤں
ہزاروں لذتیں عطا کیں ترے غم نے

Phone: 275602
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-1
Regd. with the Registrar of Newspaper at . No. /57
Regd. No D- (DN) 353
SEPTEMBER 1986

قیمت : پندرہ روپے

شان دار ادبی دستاویز ہے۔ اِس میں شامل ہیں:

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔

★ نادر و نایاب تصویریں۔

… ہزار رنگ و منتخب کلام۔

…ت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔

… پاکستان، روس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اُردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شانِ سند
سرور تونسوی
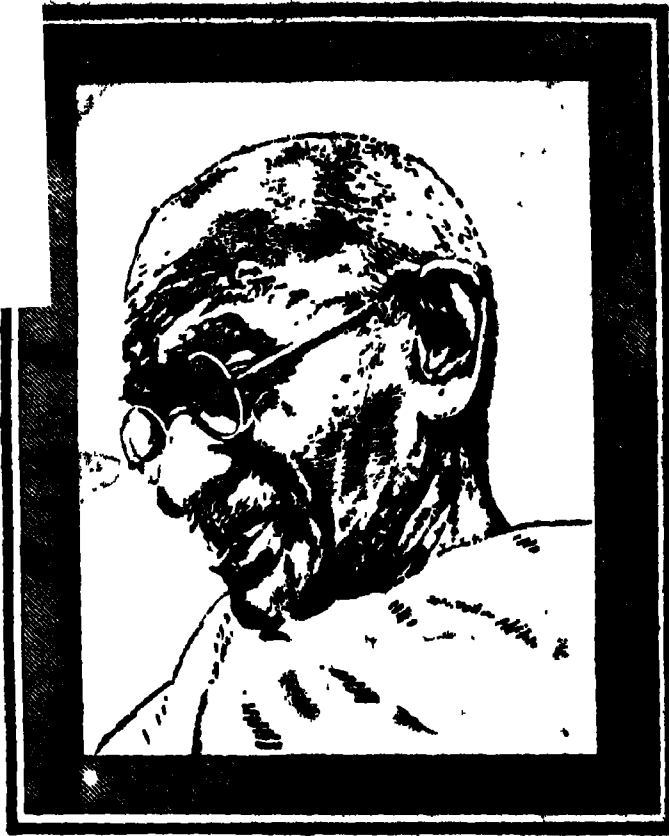
باپو کا مذہب
میرے مذہب کی کوئی جغرافیائی حدود نہیں ہیں.
میرے مذہب کی بنیاد سچ اور عدم تشدد ہے.
میرا مذہب مجھے کسی سے نفرت کرنے سے منع کرتا ہے.
مذہب لوگوں کو جدا کرنے کے نہیں۔ اُن کو باہم جوڑنے کے لئے ہے.
یہ تھا مہاتما کا مذہب
محبّت اور بُردباری کا مذہب

فون نمبر: ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۲۲/۵۷ رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۳۵۳

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرہ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں

فیاض گوالیاری

ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سردار تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زر سالانہ ۲۴/- روپے

جلد ۲۷ | اکتوبر ۱۹۸۶ء | شمارہ ۱۰

افکارِ گریزاں کا ایک ورق

ڈاکٹر حسین اختر آستانی
ڈبل ایم اے، ایل ایل بی
پی ایچ ڈی [illegible]

ہر خواب یہاں اپنی تعبیر کا حصہ ہے
ہر آہ یہاں اپنی تاثیر کا حصہ ہے

تقدیر میں کیا کیا ہے اس کو تو خدا جانے
تدبیر کا ناخن بھی تقدیر کا حصہ ہے

شاہین کا خاکستر شاہین کا گہوارا
تخریب کا پہلو بھی تعمیر کا حصہ ہے

تحریر شروع ہی سے غماز قلم نکلی
احساس قلم جیسے تحریر کا حصہ ہے

ہے اپنی جگہ لیکن تصویر ادھوری ہے
ہر دیکھنے والا بھی تصویر کا حصہ ہے

لازم تھا گزر جانا جاں سے کہ یہ ظاہر تھا
زنجیر میں رہنا بھی زنجیر کا حصہ ہے

شمشیر خود اپنے ہی دستے سے نہیں چلتی
قاتل کی کلائی بھی شمشیر کا حصہ ہے

ناپاک ارادوں نے بس لوٹ لیا اس کو
یہ سارا جہاں جس کی جاگیر کا حصہ ہے

چھپتا ہی پھرا ہم سے جلوہ وہ حسین اختر
تاریک سیہ جس کی تنویر کا حصہ ہے

پرنٹر پبلشر سردار تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے اور سرورق کے صفحات پرنٹرز بلیماران دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند بلیماران ۶ - الفاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲ سے شائع کیا۔

دیوالی اس طرح سے مناؤ

توصیف علوی عاصی کیرانوی

ہر سو شمعِ حیات جلاؤ تو بات ہے
انسانیت کی ضو کو بڑھاؤ تو بات ہے
دیوارِ نفرتوں کی گراؤ تو بات ہے
انساں کے دل میں جوت جگاؤ تو بات ہے
دیوالی اس طرح سے مناؤ تو بات ہے

ہے بجلیوں کی زد میں ابھی گلشنِ حیات
شعلوں سے پُر ہے آج بھی انساں کی کائنات
چھائی ہوئی ہے چار سو اب تک غموں کی رات
پھر صبحِ نو افق سے اٹھاؤ تو بات ہے
دیوالی اس طرح سے مناؤ تو بات ہے

دیر و حرم کی راہیں ہیں اب تک جدا جدا
ہے اب بھی دلوں میں شیخ و برہمن میں فاصلہ
ناقوس اور اذاں کی الگ ہے اُٹھی صدا
راہیں یگانگت کی دکھاؤ تو بات ہے
دیوالی اس طرح سے مناؤ تو بات ہے

انسان کے قدم ہیں ابھی تک رُکے رُکے
جذباتِ فکر و شوق ہیں اب تک دبے دبے
پرچم ہیں زندگی کے ابھی تک جھکے جھکے
عظمت کا ہر ستون اُٹھاؤ تو بات ہے
دیوالی اس طرح سے مناؤ تو بات ہے

صحنِ چمن میں آج بھی افسردگی سی ہے
مرغانِ گلستاں میں ابھی بے دلی سی ہے
ہر خار اور گل پہ اک بیچارگی سی ہے
غنچۂ حیات کھلاؤ تو بات ہے
دیوالی اس طرح سے مناؤ تو بات ہے

بے رنگ سی ہے آج بھی تصویرِ زندگی
اُلجھی ہے خواب میں ابھی تعبیرِ زندگی
رکھتی ہے ظلمتیں ابھی تنویرِ زندگی
ذروں کو بھی ستارے بناؤ تو بات ہے
دیوالی اس طرح سے مناؤ تو بات ہے

تشنہ لبی کی بات ہے میخانہ میں ابھی
ملتی نہیں ہر ایک کو پیمانہ میں ابھی
افسردہ ہیں حقیقتیں افسانہ میں ابھی
بزمِ نشاط پھر سے جماؤ تو بات ہے
دیوالی اس طرح سے مناؤ تو بات ہے

دامن ہے زندگی کا ابھی تک بھی تار
سوزِ دروں سے آج بھی انساں ہے بیقرار
سینہ میں زخم ہیں ابھی دنیا کے بے شمار
ذوقِ نظر کو اور بڑھاؤ تو بات ہے
دیوالی اس طرح سے مناؤ تو بات ہے

ہر شامِ غم کو آؤ بدل کر سحر کریں
گلہائے زندگی کی مہک تیز تر کریں
خاکِ وطن کے ذروں کو رشکِ قمر کریں
پیغامِ آشتی کا گونجاؤ تو بات ہے
دیوالی اس طرح سے مناؤ تو بات ہے
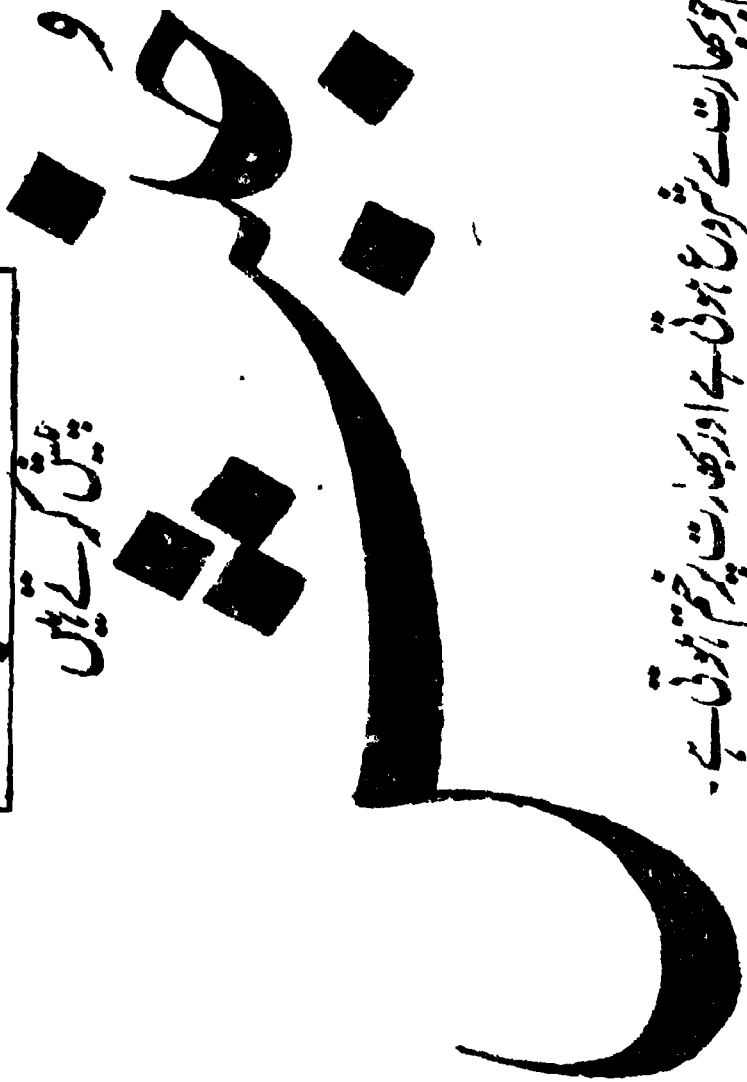
اُردو اکاڈمی دہلی

گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کی فخریہ پیشکش

- امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد پر اہم دستاویز
- دلّی کی مایہ ناز شخصیت پر مبنی اہم کتاب۔
- دلّی کی تہذیب و تمدن سے متعلق پانچ اہم کتابیں۔

۱۔ **مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے** ۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۔ قیمت ۴۸ روپے، صفحات ۱۰۲

۲ **بزمِ آخر** ۔ مصنف منشی فیض الدین، مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی، قیمت ۲۱ روپے، صفحات ۱۲۰

۳ **دلّی کی آخری شمع** ۔ مصنف مرزا فرحت اللہ بیگ، مرتبہ ڈاکٹر صلاح الدین ۔ قیمت ۲۲ روپے ۔ صفحات ۱۰۴

۴۔ **دلّی کا آخری دیدار** ۔ مصنف سید وزیر حسن دہلوی، مرتبہ سید ضمیر حسن دہلوی ۔ قیمت ۱۷ روپے ۔ صفحات ۴۷

۵ **دلّی والے** ۔ مرتبہ ڈاکٹر صلاح الدین ۔ قیمت ۳۶ روپے صفحات ۳۵۷

۶ **قلعہ معلی کی جھلکیاں** ۔ مصنف عرش تیموری، مرتبہ ڈاکٹر اسلم پرویز ۔ قیمت ۱۷ روپے ۔ صفحات ۷۲

رسومِ دہلی :۔ مصنف مولوی سید احمد دہلوی، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم قیمت ۲۸ روپے، صفحات ۲۰۸

○ اکادمی کی شائع کردہ تمام کتابیں بذریعہ آفسیٹ طبع ہوئی ہیں۔
○ اکادمی کی تمام کتابیں پیپر بیک میں ہیں اور ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی ہیں۔
○ اکادمی کی سیل ڈپو کا کوئی سول ڈسٹری بیوٹر نہیں ہے
○ لائبریری کو ۱۵٪ فیصد کمیشن پر کتابیں فروخت کی جائیں گی۔
○ مبلغ پانچ سو روپے تک کی کتابوں پر ۳۳ ⅓٪ فیصد کمیشن دیا جائے گا۔
○ مبلغ پانچ سو روپے سے زائد کی کتابوں پر ۴۰٪ فیصد کمیشن دیا جائے گا۔
○ دلی سے باہر کے آرڈر پر کمیشن منہا کرنے کے بعد اگر بل کی رقم مبلغ سو روپے سے زائد ہوگی تو کتابوں کا ڈاک خرچ اکادمی برداشت کرے گی۔

انچارج سیل ڈپو

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

اردو کے حمایتی یا دشمن

معاصر ٹائمز آف انڈیا میں ڈاکٹر احمد حسین صاحب کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کی شائع کردہ ٹیکسٹ بک "اردو کی نئی کتاب" سے متعلق قطعی طور پر مخالفت برائے مخالفت کے زیر تحت اپنی وطن دوستی کا جتانے کی کوششیں کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایل سی - آر - ٹی کو اس سکیم کے لئے تیار کیا کہ ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو اردو ٹیکسٹ بکس تیار کرے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ اردو کی ٹیکسٹ بکس تیار کرانے کے لئے ملک کے بہترین اردو دانشوروں کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے چیرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ مقرر ہوئے انگریزی اور شاید ہندی کے علاوہ صرف وہ اردو زبان ہی ہے جس کی ٹیکسٹ بکس کی تیاری کے لئے ایسی کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی سفیر اردو کے طور پر جو نمایاں شہرت حاصل کر چکے ہیں اس کے باعث ہندوستان کے اکثر مسلمان اردو دانشوروں کی نیندیں حرام ہیں اور اسی وجہ سے یہ زک خوردہ مسلمان اردو دانشور کبھی پروفیسر گوپی چند نارنگ کو پاکستانی جاسوس کہہ کر بدنام کرتے ہیں تو کبھی تبدیلیٔ مذہب کا جھوٹا سرٹیفکیٹ چھپواتے ہیں اور کبھی کسی ممبر پارلیمنٹ کی کاسہ برداری کر کے پارلیمنٹ میں یہ سوال اٹھواتے ہیں کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ پاکستانی جاسوس ہیں۔

اگر پاکستان میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو کے ایک مخلص اور جاں نثار خادم کی حیثیت سے مشہور ہیں اور پاکستانی حضرات ان کی عزت کرتے ہیں تو ہندوستان کے مسلمان اردو دانشوروں کو ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اردو کے سچے اور مخلص خادم بن کر ویسی ہی شہرت حاصل کرنے کی کوششیں کرنی چاہیئے نہ کہ نارنگ صاحب پر بہتان لگا کر اور انھیں بدنام کر کے اپنے خبثِ باطن کی تسکین کرنی چاہیئے۔

چنانچہ ڈاکٹر احمد حسین صاحب کا یہ خط بھی محض پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مخالفت میں دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لئے ہی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر نارنگ نے پہلی بار اردو کی ٹیکسٹ بکس کی تیاری کے لئے جو کمیٹی قائم کرائی ہے اس کے لئے ملک کے ہر اردو کے بہی خواہ کو ان کا ممنونِ احسان ہونا چاہیئے تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی بھی کام ایسا نہیں ہے جس میں خوبیاں اور خرابیاں نہ ہوں۔ اگر آپ اردو سے محبت رکھتے ہیں تو جو بھی خامیاں آپ کو ان اردو کی ٹیکسٹ بکس میں نظر آئی تھیں۔ ان سے کمیٹی کے صدر کو آگاہ کرتے تاکہ آئندہ ان کا ازالہ کیا جا سکتا مگر جب مقصد ہی یہ ہو کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مخالفت کی جائی ہے اور وہ بھی انگریزی زبان میں تاکہ حکومت کے ارباب جو اردو سے نابلد ہیں ان تک انگریزی کی مدد سے پہنچا جائے اور وہ اس مخالفت کو دیکھتے ہوئے اس سکیم کو ہی بند کر دیں ورنہ اردو کی مخالفت انگریزی زبان میں کرنے کا اور کیا مقصد

ہو سکتا ہے۔

آئیے آپ کو اس کی ایک مثال دے کر ذہن نشین کرایا جائے کہ اُردو کے یہ مسلمان دوست نما دشمن کس انداز سے اُردو کشی کا مقدس فرض ادا کرتے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر آل احمد سرور کو ایک لاکھ روپیہ دیا گیا کہ وہ تاریخ ادب اُردو کو کئی جلدوں میں ترتیب دیں اور اس سلسلے میں جس قدر بھی روپیہ درکار ہوگا انھیں سرکار مہیا کرے گی۔ چنانچہ سرور صاحب نے ملک کے بہترین محققین اور ناقدین سے آرٹیکل لکھوائے اور تاریخ ادب اُردو کی پہلی جلد نہایت اہتمام سے شائع ہوئی۔ بعض محققین اور ناقدین کی غیر ذمہ داری کے باعث پہلی جلد میں کچھ غلطیاں رہ گئیں۔

جناب رشید حسن خاں نے جب ان غلطیوں کی نشان دہی کی تو ان سے کہا گیا کہ وہ پروفیسر آل احمد سرور کو ان غلطیوں سے آگاہ فرمادیں تاکہ وہ آئندہ احتیاط فرمائیں۔ اور اگر سرور صاحب ایسا نہ کریں تو پھر آپ جیسا چاہیں کریں مگر رشید حسن خاں صاحب نے سستی اور آسان شہرت حاصل کرنے کے لئے ان غلطیوں پر ایک مقالہ "ماہنامہ تحریک" میں شائع کیا اور پھر اس کا انگریزی ترجمہ کرائے [illegible] کو بھجوایا اور یہ پوری اسکیم واپس لے لی گئی۔ جو پہلی جلد تاریخ ادب اُردو کی شائع ہوئی تھی وہ بھی رہ گئی۔ یہ تھی رشید حسن خاں صاحب کی اُردو نوازی کہ حکومت جو لاکھوں روپیہ اس پراجیکٹ کے لئے دیتی وہ ملنے سے رہ گیا اور یہ کام بھی رہ گیا۔

آپ جانتے ہیں کہ رشید حسن خاں صاحب نے یہ "نیک کام" کیوں کیا۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ تاریخ ادب اُردو ترتیب دینے کے لئے انھیں معقول معاوضہ پر ملازمت دی جائے اور آل احمد سرور جانتے تھے کہ رشید حسن خاں ایسا محدود پڑھا لکھا شخص یہ کام انجام دینے کے قابل نہیں ہے۔ جناب رشید حسن خاں صاحب نے بقول نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی اس پروجیکٹ کو تارپیڈو کر دیا اور اُن کے اعمال نامے میں اُردو کی "بیش بہا خدمت" درج ہو گئی۔

ہندی کی ٹیکسٹ بکس سب پڑھ چکے ہیں اس کے لئے ڈاکٹر احمد حسین یا رشید حسن خاں نے کوئی قدم کیوں نہیں اُٹھایا کہ ہمارے بچوں کو فرقہ پرست کیا جا رہا ہے اور اورنگ زیب اور شیواجی کے بارے میں کئی غلط روایات مشہور ہیں۔ جو اورنگ زیب اپنے باپ اور بھائیوں کو قتل کرا سکتا ہے وہ مسلمان کیا ہوا۔ وہ تو سیاست اور اقتدار کا دیوانہ تھا۔ اورنگ زیب تو کیا ساری مغل حکومت وغیرہ سب غیر اسلامی حکومتیں تھیں کیونکہ اسلام کا تو یہ کہنا ہے کہ الیکشن سے خلیفہ انتخاب ہو۔ اسلام نے تو بادشاہت کی جڑ اسی لئے اُکھاڑ دی تھی۔

ہمیں ایسا لگتا ہے کہ اس سلسلے میں بھی کوئی رشید حسن خاں ہی الوالوڈ ہے جس کا اپنا کوئی مفاد شامل ہے۔ یہ سب کچھ کوئی نہ کوئی [illegible] کردار ہے بلکہ وہ [illegible] احمد حسین کا اوڑھے ہوئے ہے جس اُردو کی [illegible] سے متعلق ڈاکٹر احمد حسین نے [illegible] گوہر افشانی فرمائی ہے وہ گیارھویں جماعت کے لئے ہے۔ فراق بی۔ اے میں پڑھایا جاتا ہے گیارھویں جماعت میں نہیں۔ ہمارے ہاں نئی کتاب برائے چھٹی جماعت۔ نویں جماعت گیارھویں جماعت برائے تبصرہ آئی ہیں۔ دعوے سے کہہ سکتے ہیں کوئی بھی ماہر تعلیم انہیں قابل تعریف قرار دے گا۔ مگر افسوس کہ یہ اُردو کی بیخ کنی کا مقدس فرض خود اُردو کے دانشوروں نے ہی پورا کرنا ہے تو پھر کوئی اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہے۔

اُبھرتے فن کاروں کا مشاعرہ

دلّی اُردو اکاڈمی نے پچھلے دنوں مُلک بھر سے اُردو کے بیس نئے اُبھرتے ہوئے شعراء کا مشاعرہ منعقد کیا۔ یہ مشاعرہ اکاڈمی ہذا کے لال قلعہ اور جشنِ آزادی کے مشاعروں سے بھی زیادہ کامیاب مشاعرہ تھا۔ بے شک اس مشاعرہ میں بے تکے اور غیر سخن شناس سامعین کا ہجوم نہیں تھا مگر چونکہ تمام شعراء نے ایسا کلام سنایا جو سامعین کے لئے بالکل نیا کلام تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ یہ مشاعرہ ہر طرح سے کامیاب رہا۔ بڑے مشاعروں میں پیشہ ور شعراء وہی کلام سناتے ہیں جو کم از کم چوتھائی صدی سے سناتے چلے آرہے ہیں جس سے سامعین یا تو ہوٹنگ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور یا پھر شاعروں اور منتظمین دونوں کو کوستے ہوئے خاموش ہو رہتے ہیں۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک شاعر اُردو اکاڈمی کے ہر بڑے مشاعرہ میں گذشتہ تین سال سے مدعو کئے جاتے ہیں اور وہ ان تین سالوں میں چھ مشاعروں میں ہر بار وہی کلام سناتے ہیں جو وہ پہلی بار سنا چکے ہیں۔ اگر اکاڈمی اپنا ریکارڈ دیکھے تو اُنھیں اس کا علم بخوبی ہو سکے گا۔

اس اُبھرتے فن کاروں کے مشاعرہ کی نظامت بھی ایک اُبھرتے ہوئے شاعر منصور عثمانی مراد آبادی نے نبھائی۔ پیشہ ور نظامت کرنے والوں سے کافی ہٹ کر مختصر اور مختصر تعارف کے بعد ہر شاعر کو اس انداز سے کلام سنانے کی دعوت دی گئی کہ سامعین ہر بار اس نظامت کی تعریف کرتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ منصور عثمانی کو کلام سنانے کا ہی معاوضہ دیا گیا اور نظامت کا نہیں جب کہ کامل قریشی صاحب باوجود اس کے کہ وہ اُردو اکاڈمی کے ممبر ہیں کلام سنانے اور نظامت کا الگ الگ معاوضہ لیتے رہے ہیں جب کہ اُن کی نظامت ہر بار مشاعرہ کو ناکام کرنے کی موجب رہی۔

بہرکیف اُردو اکاڈمی دلّی اس مشاعرے کے لئے مبارکباد کی مستحق ہے کہ اُس نے مُلک کے اچھے اور نئے اُبھرتے ہوئے شعراء کو مدعو کر کے اچھا اور نیا کلام سننے کا اہلِ دلی کو موقع دیا۔

پیش کش اور ترتیب انجم عثمانی کی

پچھلے دنوں اُردو اکاڈمی کے زیرِ اہتمام ہوئے مشاعرہ جشنِ آزادی کی کچھ جھلکیاں دُور درشن پر دکھائی گئیں اس پروگرام کی پیش کش اور ترتیب بھی انجم عثمانی کی رہینِ منت تھی۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انجم عثمانی نے اس پروگرام کو پیش کرتے وقت نہ تو حق و انصاف سے کام لیا اور نہ اُنھوں نے اُس سرکاری فرض کے انجام دینے میں دیانت داری سے کام لیا جو اُن کے لئے ضروری تھا۔

اگر تو انجم عثمانی دُور درشن کو جناب گیند اکل کی طرح اپنا ذاتی ادارہ سمجھتے ہیں تو وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں اور اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دُور درشن قومی حکومت کا ایک سرکاری ادارہ ہے تو پھر اُنھیں بغیر کسی رُو رعایت کے اپنی ڈیوٹی انجام دینی ہوگی۔ راجیو گاندھی کی حکومت میں اگر گیند اکل ایسے خود سر وزیر کو اپنے گھر میں بیٹھنے پر اکتفا کرنی پڑ سکتی ہے تو بیچارے انجم عثمانی کس گنتی میں ہیں۔

مذکورہ بالا مشاعرہ میں جن شعرائے کرام کو ٹی۔ وی کی سکرین پر نہیں دکھایا گیا۔ اُن کو پورا پورا حق ہے کہ وہ انجم عثمانی کی اس من مانی کے خلاف آواز بلند کریں۔ جن فضول اور عام قسم کے شاعروں کو کئی کئی اشعار سنانے کے لئے منتخب کیا گیا اگر اُنھیں کم وقت دے کر کچھ دوسرے شاعروں کو بھی سکرین پر دکھایا جاتا تو دُور درشن کا کچھ نقصان نہیں تھا بلکہ اُس کی تعریف ہوتی۔ ہم دُور درشن کے ذمہ دار افسران سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس سلسلہ میں انجم عثمانی کی خود سری پر کچھ روک لگائیں گے۔

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گرد و پیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
- ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر اُن جگہوں کو صاف و شفاف کیوں نہ رکھیں جنھیں ہم سب استعمال کرتے ہیں۔
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں اور در حقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گرد و پیش کو صاف و شفاف رکھنا بہت ضروری ہے ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے۔ جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلے میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں آپ صرف اتنا خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف و شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور ملحقہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں وہ صرف آپ کی خدمت کے لئے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے ادھر اُدھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑادان میں پھینکا جائے۔ آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھئے

ناردرن ریلوے

گاندھی جی اور اُن کے برت

توصیف علوی عاصی کیرانوی

گاندھی جی اس دور کی ایسی ہمہ گیر اور تاریخ ساز شخصیت تھے۔ جنھوں نے ہندوستان ہی کی نہیں بلکہ اس دنیا کی تاریخ بدل دی اور اس زمانہ کے اندازِ فکر کو بالکل ایک نیا موڑ اور نئی سمت عطا کی وہ ایک ہی وقت میں ہندوستان کے سیاسی پیشوا بھی تھے اور قوم کے اعلیٰ ترین ہیرو بھی تھے میر کارواں بھی تھے اور دیش کے سچے سپاہی بھی۔ سماج سدھارک بھی تھے اور اونچے درجہ کے مہاتما بھی مختصر یہ کہ وہ ایک ایسے یگ پرش۔ اور مردِ زمانہ "انسان" تھے جنھوں نے ایک طرف ہندوستان کو اس کی شانِ گم گشتہ اور عظمتِ رفتہ سے ہمکنار کرایا تو دوسری طرف اس حیران و پریشان دنیا کو بھی ایسے اچھوتے اور نئے نظریات دیئے جو اس دور اور اس زمانہ کے لیے مشعلِ راہ اور سنگِ میل ثابت ہوئے۔

گاندھی جی کی تمام زندگی اور کردار میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز رہی وہ ان کا اٹوٹ "ایشور پریم" اور بے پناہ حق پرستی" تھی اُن کے اسی ایشور پریم اور حق نمائی نے انھیں زندگی میں ستیہ رہی" اور "مردِ حق" بنا دیا تھا وہ زندگی اور قوم کے ہر بڑے سے بڑے مسئلہ میں "ستیہ" کو اپناتے منزلِ حیات کے ہر ایک پیچیدہ سے پیچیدہ موڑ پر حق و صداقت کی روشنی تلاش کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ ایک ستیہ گرہی اور حق جو انسان کبھی امن، شانتی اور حق جوئی کی راہوں کو چھوڑ کر جبر و تشدد کی طرف رخ نہیں کر سکتا۔ اور "حق رو" کبھی "باطل رو" نہیں بن سکتا۔ اسی لیے گاندھی جی زندگی کے ہر سخت سے سخت طور پر بھی اہنسا کے پرستار اور عدم تشدد کے علمبردار نظر آتے ہیں اور اُن کے ہر قدم اور ہر کردار پر ستیہ اور اہنسا کی پوری پوری چھاپ ہے۔ انھوں نے سیاست اور دھرم کی کڑیوں اور خطوں کو کچھ اس طرح ملایا اور روحانیت کو اس طرح اپنایا تھا کہ اُن کی کوئی جدوجہد اور کوئی تحریک روحانی طاقت اور "آتم شکتی" کے بغیر کارفرما نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ بہت سے مشکل ترین اور پیچیدہ مراحل میں ستیہ اور اہنسا سے کام لینے اور حق و صداقت کی روشنی حاصل کرنے کے لئے جو انھوں نے بالکل نیا اور ایک دم اچھوتا طریقہ اپنایا تھا وہ "اُپواس اور برت" دھارن عام طور سے "برت اور اُپواس" کا نام گاندھی جی سے پہلے صرف مذہبی حلقوں اور دھارمک دنیا میں سنا جاتا تھا۔ اس لئے کہ حقیقت میں "برت" "جیسے اسلامی دنیا میں روزہ" کہتے ہیں ایک ایسی عبادت اور ریاضت ہے جو کسی نہ کسی انداز اور شکل سے ہر مذہب میں موجود ہے۔ لیکن ہر جگہ یہ مذہبی عقائد اور روحانی اقدار کا آئینہ دار ہے تاہم اپنی جگہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر مذہب میں "برت" کا ایک ہی مقصد اور نصب العین ہے وہ ہے مادی طاقتوں کے خلاف آتمک اور روحانی قوت کو بل دینا "آتما" کو شدھ کرنا۔ نفس کا تزکیہ کرنا اور روحانیت کو اتنی روشنی اور جلا دینا جس سے وہ مادیت کی تاریکی اور باطل کے اندھیروں پر غالب آجائے اگرچہ تاریخ میں یہ پہلا بار دیکھنے میں آیا کہ گاندھی جی نے "برت" کو سیاسی آلہ

اور حربہ کے طور پر استعمال کیا اور جو برت رکھے وہ نگاہِ عام میں مذہبی اور دھارمک حدود سے باہر سیاسی سطح پر رکھے گئے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ گاندھی جی ایک ایسی شخصیت تھے جو کہ سیاست داں کے ساتھ ساتھ اونچے درجے کے روحانی بھی تھے وہ روحانیت، مذہب اور دھرم کی حقیقت کو بخوبی جانتے تھے اسی لئے ان کی زندگی میں سیاست اور دھرم کوئی متضاد چیزیں نہیں تھیں بلکہ ایک ہی تصویر کے دو رخ اور ایک ہی دریا کے دو کنارے تھے۔ ان کے یہاں سیاست مکاری اور عیاری اور فریب "ڈھونگ اور ڈھکوسلہ" کا نام نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی نے کبھی سیاست اور دھرم کو الگ الگ سطح پر نہیں رکھا [illegible] سیاست کو ہمیشہ دھرم کی سیدھی اور سچی راہ پر [illegible] سے حق و انصاف امن و آشتی اور صفائی اور [illegible] کی منزلوں سے روگرداں نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ ہماری تحریک آزادی کی طویل اور عریض داستان اس امر کی شاہد ہے کہ سیاست اور دھرم کے اسی انوکھے امتزاج اور اشتراک نے ہماری جنگ آزادی کو دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ستیہ اور اہنسا کی پُرامن راہوں سے فتح و ظفر کی منزلوں تک پہونچایا۔ اسی لئے گاندھی جی کا ہر برت اگرچہ عام نظروں میں سیاسی جدوجہد کی ایک کڑی سمجھی جاتی تھی مگر درحقیقت اس میں "برت" کا روحانی اور حقیقی فلسفہ مضمر کارفرما ہوتا تھا جو مادیت پر روحانیت کے غلبہ اور باطل پر حق کی فتح سے عبارت ہے۔

گاندھی جی نے جتنے برت رکھے اگر ان کے پس منظر اور ان کی "آتما شدھی" کا تجزیہ کیا جائے تو چند حقیقتیں سامنے آتی ہیں اور پھر ایسے مخصوص حالات کی نشان دہی ہوتی ہے جو گاندھی جی کی اس تپسیا اور ریاضت کا باعث ہے۔ اول یہ کہ جب [illegible] اہنسا اور [illegible] بھلا کر [illegible] حد سے کہیں آگے [illegible] رہی ہے۔ [illegible] انصاف کا گلا گھونٹا جا رہا ہے معلوم

اور بے بس انسانیت بُری طرح ظلم و تشدد اور بربریت کا شکار ہے اس وقت انھوں نے روحانیت کے فروغ اور آتم شکتی کو بل اور تقویت دینے کے لئے برت کا سہارا لیا۔ دوسرے یہ کہ جب بھی تحریک آزادی ستیہ اور اہنسا کی راہوں سے ہٹ کر تشدد اور دہشت گردی کی طرف رخ کرنے لگی اور آزادی کے پرستار کے قدم امن و آشتی کی منزلوں سے ڈگمگانے لگے اس وقت گاندھی جی نے اُپواس اور برت کے ذریعہ آزادی کے دلوں میں آشا کی جوت جگا کر ان کے بھٹکے اور ڈگمگاتے قدموں کو ستیہ اور اہنسا کی راہوں پر مضبوط مستحکم بنایا۔ تیسری حقیقت جس نے گاندھی سے برت اور اُپواس کا راستہ اختیار کرایا وہ یہ تھی کہ جب کبھی سامراجیت نواز اور باطل پرست قوتوں نے ہمارے قومی اتحاد اور یکجہتی میں شگاف ڈالنے اور اسے پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی اور بھارت میں فرقہ وارانہ نفرت اور تعصب کے شعلوں کو جنم دیا اور اس صورت حال کو بدلنے میں مادی قوتیں ناکام ہو گئیں تو گاندھی جی روحانیت کے فروغ اور آتم شکتی کو بڑھانے کے لئے برت رکھا اور روحانی چمتکار کے ذریعہ اس طلسم سامری کو توڑ دیا۔ چوتھی برت کی صورت [illegible] صورت حال یہ تھی کہ بعض دفعہ گاندھی جی کے سامنے پیچیدہ مسائل اور سنگین مراحل آتے تھے کہ ان کا اور آسان حل مشکل ہو جاتا تھا چنانچہ گاندھی جی اس وقت اپنی آتما شانتی کو جگاتے اور روحانی شمع روشن کرتے تھے اور "مون برت" سے کام لیتے تھے غرض گاندھی جی کے ہر برت اور اُپواس کے پیچھے اپنی کوئی ذاتی غرض یا کوئی خواہش نہیں بلکہ اصل مقصد آتما اور عوام میں ایک نئی بیداری پیدا کرنا۔ آتم شکتی کو بل دینا اور حق و صداقت کی روح کو جلا دینا ہی تھا۔ اور یہی ہوا بھی۔

گاندھی جی نے سب سے پہلا اُپواس شا

عدالتوں، اسکولوں اور سرکاری منصوبوں اور عہدوں کو خیرباد کہہ کر حکومت سے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تلقین کی۔ اس مہم میں گاندھی جی کو جیل یاترا کرنی پڑی مگر گاندھی جی کی علالت کی وجہ سے سرکار کو انھیں چھوڑنا پڑا۔

۱۹۲۴ء کے آغاز میں جب گاندھی جی جیل سے باہر آئے تو انھوں نے دیکھا کہ سامراجی طاقتوں کا جادو ایک بار پھر چل گیا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کی جس چٹان پر آزاد ہندوستان کی تعمیر ہونی تھی وہ پاش پاش ہوئی جا رہی تھی ہندو مسلمان بدیشی طاقت کے خلاف سینہ سپر ہونے کے بجائے خود ہی ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے تھے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک دم توڑ رہی تھی انگریز سرکار کا ٹھینگو اصلاحات کے کھلونوں سے ہندوستان کے عوام کو بہکانے کی کوشش کر رہی تھی ان کاغذی پھولوں پر ہمارے کچھ رہنما گمراہ ہونے بھی لگے تھے اس صورت حال سے گاندھی جی کو بڑا دکھ ہوا۔ انھوں نے سوچا کہ مولیشی طاقت کے خلاف نبرد آزما ہونے اور آزاد ہندوستان کی بنیاد کے لئے قومی ایکتا اور باہمی اتحاد کا استحکام ضروری اور نہایت ضروری ہے۔ مگر صورت حال بڑی نازک اور سنگین تھی۔ اس لئے اس سحر سامری کو توڑنے کے لئے گاندھی جی کی نظر پھر اتنی اہم شکتی اور روحانی طاقت پر گئی اور انھوں نے ۱۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو ہندو مسلم اتحاد کے لئے اکیس دن کا ایک لمبا "برت" رکھا اور اسے مولانا محمد علی کے مکان پر شروع کیا۔ یہ برت خیر و شر کا ایک مقابلہ اور حق و باطل کا معرکہ تھا اس میں قومی اتحاد اور باہمی یگانگت کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی۔ ایثار و قربانی کبھی بیکار نہیں جاتے۔ خیر کی ہمیشہ شر پر فتح ہوتی ہے روحانیت مادیت پر غالب آتی ہے۔ فضا بدلی۔ ٹوٹے ہوئے دل جڑنے لگے۔ نفرت و تعصب کی آندھیاں باہمی یگانگت اور آپسی میل ملاپ کی ہواؤں میں بدلنے لگیں۔ ہندو مسلمان دونوں کے سربراہوں نے مل کر گاندھی جی کے سامنے ایک دل ہونے کی قسم کھائی گویا حرم ایک بار پھر گلے مل گئے اور گاندھی جی نے قرآن پاک، وید، اور بائبل کے مقدس جملے سن کر ڈاکٹر انصاری کے ہاتھ سے نارنگی کا رس پی کر برت کھول دیا۔

اب گاندھی جی ملک کے واحد سیاسی پیشوا، قوم کے عظیم ترین سربراہ بن گئے تھے اور جنگ آزادی کا تمام تر بار ان کے کندھوں پر آ پڑا تھا۔ تحریک آزادی بڑی سرگرم منزلوں اور مرحلوں سے دوچار تھی اور آئے دن ان کے سامنے پیچیدہ اور سنگین ترین مسائل آتے جا رہے تھے۔ مادیت کا طوفان روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اس ہنگامہ خیز اور طوفانی دور میں گاندھی جی کے لئے ضرورت تھی کہ وہ امن و سکون کے ساتھ اس پیچیدہ اور لا ینحل صورت حال پر غور کریں اور آتم شکتی سے روشنی لے کر صحیح لائحۂ عمل تلاش کریں۔ چنانچہ اس مقصد سے انھوں نے نومبر ۱۹۲۵ء میں ایک بار پھر برت اور اپواس کی راہ اختیار کی۔ مگر یہ عرصہ اور مدت جنگ آزادی کی پر پیچ راہوں پر چلنے اور سنگین مسائل سے دوچار ہونے کے ناکافی تھی۔ اس لئے چند سال کی خاموشی کے بعد انھوں نے ۱۹۳۱ء میں ایک "مون برت" کا سلسلہ شروع کیا وہ ہر سوموار کو مون برت رکھتے تھے اور روزمرہ کی ہنگامہ آرائیوں سے علیحدہ ہو کر خاموش اور پرسکون ماحول میں ٹھنڈے دل سے ملک کے مسائل سلجھانے اور اس کے لئے روحانی روشنی حاصل کرنے کی فکر کرتے تھے اس سلسلہ میں گاندھی جی نے ایک بار اس دوران فرمایا تھا۔ میں ہفتہ میں ایک دن آرام کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے مون برت کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ سمجھئے کہ بعد میں

میں نے اس برت کو طرح طرح کے اوصاف سے
ایک دیا اور روحانی جامہ پہنا دیا۔ بہرحال گاندھی
جی نے سنگل بھر کے اس "مون برت" سے اپنے
دل و دماغ کو سکون دے کر بھارت کے سکون کے
لئے سوچا اور سوچا ہم کے سارے عوام کے لئے اور
آخر کار بھارت کی آزادی کے لئے وہ راہیں ڈھونڈ
نکالیں، جن سے ہماری منزل مقصود قریب سے
قریب تر ہوتی چلی گئی۔ بھارت کی آزادی کی وہ
منزل تھی ۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء، لیکن یہ سال
آزادی کا سال ضرور تھا۔ مگر ہندوستان کی تاریخ
میں بڑا ہنگامہ خیز ا[illegible] سامان دور تھا اس میں
اگرچہ صدیوں کی غلامی کی زنجیریں پاش پاش ہوگئی
تھیں۔ لیکن سامراجیت کے گل ہوتے ہوئے
چراغوں نے بھارت میں فرقہ واریت اور نفرت و
تعصب کی ایسی خوفناک آگ لگا دی تھی جس نے
"جنت ارضی" کا کونہ کونہ جلا اٹھا تھا مذہب
کے جنون نے انسانیت کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔
دنیا حیران رہ گئی اور دیش چلا اٹھا چنانچہ محبت کا
دیوتا اور اہنسا کا سچا پجاری امن و آشتی کی شمع
لے کر ایک بار پھر شیطنت کے اس جوار بھاٹے
کا ... کو دیکھا اور یہ آگ اور خون کا طوفان جب کسی
طرح ٹھنڈا نہ ہونے دیا یا تو دیش کے اس مہاپرش
نے اپنے خون کے آخری قطرے بھی چھڑکنے سے
دریغ نہیں کیا اس وقت بنگال میں یہ طوفان زیادہ
شدت خیز تھا۔ گاندھی جی کلکتہ پہونچے اور سوچا
پھر صبر کے امتحان کا پھر وقت آگیا ہے ضرورت
[illegible] کے اس بے پناہ طوفان میں ایک
روحانیت کے مشعل روشن کئے جائیں چنانچہ
[illegible] ۱۹۴۷ کو انھوں نے قومی یکجہتی فرقہ وارانہ
اور امن و آشتی کے پرچم بلند کرنے کے لئے
مرن برت شروع کیا۔ ایسے سنگین حالات

کے بعد گاندھی جی کا یہ بڑا آزمودہ حربہ تھا۔ برت
رکھتے ہی فضا میں پلٹنے لگیں آپس میں تکرار بند ہوا
اور عوام نے اپنے اپنے ضمیروں کو ٹٹولا۔ اور باطن
کی آواز کو سنا جو کہہ رہی تھی "نفرت سے محبت
اور شیطنت سے انسانیت ہمیشہ بہتر ہے اور اسی
میں زندگی اور بہتر انی ہے۔ آزادی دشمنی سے
نہیں دوستی سے قائم رہے گی" آخر کار آگ اور خون
کا یہ طوفان سرد پڑ گیا اور ہندو مسلمان، سکھ عیسائی
عوام و خواص، شر پسندوں اور امن کے علمبرداروں
غرضیکہ ان سبھی لوگوں نے جن کے سینے میں انسانیت
بھرا دل تھا گاندھی جی کے سامنے امن و سکون۔
دوستی اور اخوت کا عہد کیا اور عہد کیا باہمی بھائی
چارے اور سلامتی کا چنانچہ ۴ر ستمبر کو مہاتما جی
نے سید سہروردی کے ہاتھ سے نیمبو کا رس لے کر
برت کھول دیا۔

لیکن اس آگ اور طوفان کو بھڑکانے اور
شعلہ بار رکھنے میں بہت بڑی فسطائی اور سامراجی
طاقت کا ہاتھ تھا اور یہ سب کچھ ایک منصوبہ بند
کی کارکردگی تھی اس لئے اس آگ کا دبنا محال تھا
اور اسی آگ کی چنگاریاں ہیں جو اب تک بھی
ہندوستان کو شعلہ فشانی رکھتی ہیں۔

بہرحال اس وقت وہ آگ کلکتہ میں بجھی تو اس
نے دہلی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دہلی ہندوستان
کا دل ہے۔۔ اس میں شورش اور قیامت آمیزی
سارے بھارت کے لئے ہی نہیں بلکہ شہداء
وطن کے خون سے نئی حاصل شدہ آزادی کے
لئے بھی خطرہ تھا۔ اس شورش نے دہلی میں بڑی
بھیانک صورت اختیار کر لی تھی۔ انقلاب زندہ
باد وہ گویا زندہ باد بنتا جا رہا تھا۔ تاریخ
اپنے بدترین صدمات سے دوچار تھی۔ گاندھی
جی کا دل ایک بار پھر دکھ گیا اور [illegible] میں ڈوب گیا

اس تلاطم اور گرداب سے دیش کو نکالنے کے لئے
انھوں نے ضمیر انسان روحانی حربہ کی طرف دیکھا اور
۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو اپنے آخری برت کا اعلان
کرتے ہوئے کہا کہ انسانی سعی و کوشش کی صورت
میں جب میرے تمام ذرائع فیل ہو گئے تو میں نے
اپنا سر ایشور کی گود میں رکھ دیا۔ جس نے میرے
لئے "اپواس" بھیجا۔ اس اپواس کا فیصلہ کرنے کے
بعد گاندھی جی کے دل میں آنند اور سکون کی ایک
عجیب لہر دوڑ گئی۔ وہ جانتے تھے کہ اس مہم میں
ان کی موت بھی ہو سکتی تھی لیکن دیش پریم کے سامنے
انھیں اس کی پرواہ نہیں تھی اس لئے گاندھی جی
سوچا کہ موت میرے لئے باعزت نجات ہوگی اور اس
سے تو اچھی ہوگی کہ میں ہندوستان میں بے حس ہو کر
ہندو مسلم اور سکھ دھرم کی تاراجی دیکھتا رہوں"
بہرحال گاندھی جی کا یہ آزمودہ تیر تھا جسے نشانہ پر لگنا
ہی تھا ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ خیر نے شر پر اور
روشنی نے اندھیرے پر ہمیشہ فتح پائی ہے اس
لئے ۱۸ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہر جماعت اور پارٹی، ہر
فرقہ اور طبقہ کے پیشوا اور رہنما اور حکومت کے
ذمہ داران ایک بار پھر اس امن کے دیوتا کے
سامنے حاضر ہوئے اور امن و آشتی اور باہمی
انس و محبت کا تحریری حلف لیا اس موقعہ پر اور
ذمہ داروں کے علاوہ اس وقت کے پاکستانی
ہائی کمشنر جناب زاہد حسین بھی موجود تھے گاندھی جی نے
سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "دلی ہندوستان
کا دل ہے اور آپ لوگ دلی کی جان ہیں اگر آپ سارے
تمام دیش کو یہ محسوس نہیں کرا سکتے کہ ہندو سکھ
مسلمان سب بھائی بھائی ہیں تو ہندوستان اور
پاکستان دونوں کا مستقبل تاریک ہے۔ اور پھر
مولانا ابوالکلام کے ہاتھ سے نارنگی کا رس لے کر
[illegible] کر دیا۔

گاندھی جی کے اس آخری برت اور جان کی
آخری بازی سے امن و امان کی فضائیں تو ہموار
اور استوار ہو گئیں مگر شر پسند عناصر اور وطن دشمن
اپنی اس بار بار کی شکست سے بوکھلا اٹھے اور
انھوں نے اپنے راستہ سے اس سب سے بڑے
کانٹے کو ہمیشہ کے لئے ہٹانے اور انسانیت کے
اس پجاری کو جام شہادت پلانے کا ارادہ کر لیا
آخر ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ستیہ اور اہنسا کا یہ پجاری
شانتی کی دیوی پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قربان
اور دیش بھگتی اور انسان دوستی کے عظیم مشن پر
خون کا آخری قطرہ بھی بہا دیا۔

یہ تھا گاندھی جی کے تمام برت اور اپواسوں کا
اور پس منظر جو تاریخ میں پہلی بار اگرچہ [illegible]
کی ہنگامہ آرائیوں میں رونما ہوئے گئے۔ مگر ان
اصل اور عظیم مقصد وہی نیکی اور خیر کی سربلندی
شکتی اور روحانی طاقت کی ضیا پاشی، اور انسان
نیز حب الوطنی کی راہ میں ایثار و قربانی تھا جو گا
جی جیسے مہان پرشوں اور عظیم ہستیوں کی زندگی
آدرش رہا ہے اور جس کے لئے ہمیشہ انھو
قربانیاں دی ہیں۔ گاندھی جی کے یہ برت
بھی ہمارے لئے شمع ہدایت اور مشعل راہ ہیں
ہر اس ہندوستانی کو جس کے سینہ میں ایک انسا
دل اور رگوں میں حب الوطنی کا خون ہے یہ
رہے ہیں کہ زندگی کے ہر مجاہدہ اور ہر
ستیہ اور اہنسا ہی کامیابی کا بہترین ذ
گاندھی جی کی زندگی میں بار بار اپنا
اپواس ہمیں [illegible] یہ پیغام اور
رہے ہیں کہ بھارت واسیوں کا رشتہ
باہمی میل و محبت ہی نئے بھارت کے
روشن مستقبل کی بنیاد اور ضمانت
[illegible] کی یہ تپسیا اور ریاضت اور او

انھوں نے اپنی [illegible]
[illegible] یاد دلائی — اور [illegible] ہر ایک
ہندوستانی بلا لحاظ مذہب و ملت اور رنگ و نسل قوم
کی حقیقی روح اور دیش کی سچی طاقت ہے ہمارے
ملک کی آزادی اور خوشحالی کے محل کی ہر ایک اینٹ پر
روشن اس حقیقت کی گواہ ہے کہ اس کی بنیاد و تعمیر
شان و شوکت اور سربلندی میں ہم سب کا خون شامل
شامل ہے گاندھی جی کے یہ تمام برت اور یہ قربانیاں ہمیں
بجا طور پر یہ درس دے رہی ہے کہ اس دیش کی
ترقی، عظمت اور سلامتی کا راز قومی یکجہتی،
فرقہ وارانہ ہم آہنگی، ذہنی یگانگت اور [illegible]
قرابت میں مضمر ہے کاش ہم سب اس سچائی کو دل سے
اپنائیں اور قومی زندگی کے لئے لائحہ عمل بنائیں اور
گاندھی جی کی اس دھن کو دنیا کے چپہ چپہ میں [illegible]
اور ساکار کر کے دکھائیں۔ اللہ ایشور تیرے نام
سب کو سمتی دے بھگوان۔

ہمت رائے شرما

ہندو مسلمان

چاہیں تو ایک ہی کر رہ سکتے ہیں

"ہندوستان ہندوؤں کا ہے" دھرم پرکاش نے کہا۔

"نہیں، مسلمانوں کا" دین محمد نے جواب دیا "میں کہتا ہوں اس ملک پر آریہ لوگ راج کرتے تھے اس لئے بہت پہلے سے یہ ملک ہندوؤں کا ہے۔" دھرم پرکاش نے غصہ میں آکر کہا۔

"تو کیا ہوا۔ یہاں مسلمانوں نے بھی تو حکومت کی ہے" دین محمد چلایا۔

"کی ہوگی" جوزف بات کاٹ کر کہنے لگا۔ اس وقت اس ملک کا بادشاہ شاہ برطانیہ ہے تم دونوں جھوٹے ہو۔ میں نے اپنے بڑے بھائی کی کتاب میں پڑھا ہے کہ اصلی باشندے کول دراوڑیں گونڈ اور بھیل ہیں۔ آریہ لوگ اور مسلمان بعد میں آئے

"ہاں ہاں" مگر ہمارا بھگوان بہت بلوان ہے دھرم پرکاش نے بات کا رخ بدلنے کے لئے کہا۔

"اجی ہمارا اللہ میاں سب سے بڑا ہے۔ تمہارے بھگوان سے بھی زیادہ طاقتور ہے"

بھگوان اور اللہ کا نام زبان پر آتے ہی دونوں بچے آپس میں گتھ گئے۔ آدھی چھٹی کے وقت۔ اسکول کے بچوں کو لڑنے جھگڑنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ تو چاہیے ہی۔ ہمارے راہنما لوگ سناتے رہتے ہیں یا کسی نہ کسی کو ان سے لڑانا چاہتے ہیں جن کا تمام غصہ وہ ایک دوسرے پر نکالتے ہیں۔

چنانچہ دھرم پرکاش اور دین محمد نے دل کھول کر ایک دوسرے کو پیٹا۔ اسکول کے سارے بچے جمع ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب بھی چھڑی ہلاتے ہوئے آپہنچے۔ ان کا آنا تھا کہ بچے کائی کی طرح پھٹ گئے۔ "یہ سب کیا ہے؟" انہوں نے آتے ہی پوچھا۔ اور جوزف بولا۔ "جناب اس نے" خاموش! گورمکھ سنگھ! تم سچ سچ کہو کیا بات ہے" ہیڈ ماسٹر صاحب تحکمانہ انداز سے بولے۔

اور گورمکھ سنگھ کہنے لگے۔ جناب جوزف نے دھرم پرکاش کی نقشہ کشی کی کاپی پھاڑ ڈالی اور ہندوستان کا نقشہ لے کر اس پر لیڈ پر چیک بنایا۔ پھر دھرم پرکاش نے کہا یہ میری کاپی کا نقشہ ہے اس پر ہندوؤں کا نقشہ بناؤ۔ تب دین محمد بولا مسلمانوں کا کیوں نہیں۔ میں اپنی کاپی پر مسلمانوں کا جھنڈا بناؤں گا۔ سبز رنگ کا جھنڈا اس کاپی کے پیسے میری دادی اماں نے دئے ہیں۔ کاپی دھرم پرکاش کی ہے تو کیا ہوا پیسے تو ہمارے ہیں۔ پھر دونوں آپس میں جھگڑنے لگے۔

"نقشہ کہاں ہے؟" ہیڈ ماسٹر نے پوچھا

"وہ رہا جناب" ایک لڑکے نے کہا

ہیڈ ماسٹر صاحب نے نقشہ کی طرف دیکھا جو ایک دو ٹکڑوں کی شکل میں پڑا تھا۔۔۔ ہندوستان کا

نقشہ ... دونوں جس کے لیے لڑے ۔ دونوں جس پر لڑتے لڑتے گرے دونوں کا خون جس پر لڑتے وقت گرا اور دونوں کے خون نے جس پر بنے ہوئے یونین جیک کو اپنے "سرخ رنگ" میں چھپا لیا تھا ۔ اس پھٹے ہوئے ہندوستان کے نقشہ کو ہیڈ ماسٹر صاحب نے بڑے احترام سے اٹھایا ۔ آنکھوں سے لگایا ۔ پھر دونوں کی طرف دیکھا اور کہا ۔ تمہیں شرم آنی چاہئے ۔ تم دونوں اس نقشے کے حقدار ہو ۔ یہ ملک ہم سب کی ملکیت ہے ۔ ہر ہندوستانی اس کا مالک ہے خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو سمجھے ۔ خبردار جو پھر کبھی جھگڑا کیا تو ۔ جاؤ سب لڑکے اپنی اپنی کلاسوں میں اور تم دونوں آؤ میرے کمرے میں ۔"

اپنے کمرے میں پہنچ کر ہیڈ ماسٹر صاحب دھرم پرکاش اور دین محمد سے مخاطب ہوئے ۔ "نالائقو! تمہیں آپس میں لڑتے ہوئے شرم نہیں آتی ۔ ایک ساتھ پڑھتے ہو ایک محلہ میں رہتے ہو ۔ تمہارے گھر پاس پاس ہیں ۔ تمہاری پرورش کی ذمہ داری بھی ایک ہی کے سر پر ہے جس کے سر پر اب خدا کے سوا کسی کا سایہ نہیں ۔ وہ غریب بڑھیا جب آپس میں تم کو لڑتے جھگڑتے دیکھے یا سنے گی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی وہ بے چاری کس پیار سے تم دونوں کی دیکھ بھال کر رہی ہے ۔ تم جانتے ہو کہ تم کون ہو؟ سنو! تم دونوں موضع چنڈ بالہ ضلع امرتسر کے رہنے والے ہو ۔ میں بھی اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں امرتسر جیسے شہر میں آنے سے پہلے میں بھی وہیں رہا کرتا تھا ۔ تم دونوں کے والد پڑوسی تھے اور ایک دوسرے کو بھائی کہا کرتے تھے ۔ دھرم پرکاش! تمہارے والد لالہ مادھو رام کی زمین جائداد کی وجہ سے کسی سے دیرینہ دشمنی چلی آ رہی تھی ۔ آخر ایک دن انہیں کسی جاٹ نے قتل کر دیا ۔ اور دین محمد! تمہارے والد میاں غلام نبی نے اپنے منہ بولے بھائی کا بدلہ لینے کے لئے نہر کے پل پر اس جاٹ کو اس قاتل کو قتل کر دیا ۔ ادھر وہاں سے بھاگ کر غلام نبی سیدھا گھر پہنچا ۔ پتہ چلا کہ اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے ۔ تھوڑی ہی دیر میں خبر ملی کہ اس کے مرحوم دوست مادھو رام کے گھر بھی لڑکا پیدا ہوا ہے ۔ مگر بچے کی ماں بچے کے اس دنیا میں آنے کے بعد اس دنیا میں اپنے خاوند کے پاس چلی گئی ہے ۔ اور غلام نبی کے نام سندیسہ چھوڑ گئی ہے کہ مرحوم دوست کے یتیم بچوں کا خیال رکھیے ۔ غلام نبی فوراً مادھو رام کے گھر پہنچا ۔ نومولود بچے کو کپڑے میں لپیٹا اور سوچا اس کی پرورش بھی اپنے نوزائیدہ بچے کے ساتھ ساتھ ہو جائے گی ۔ پھر مادھو رام کی چھوٹی سی بچی کو ساتھ لے کر جونہی گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ اس کی رفیقۂ حیات بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ گئی ہے ۔ ہرے بھرے گلشن اجڑتے دیکھ کر غلام نبی کے دل پر بجلی سی گری اور اس نے سوچا ان پھولوں سے بچوں کا رکھوالا کون ہو گا ۔ اتنے میں پولیس آ پہنچی ۔ غلام نبی دیوار پھاند کر میرے آنگن میں آیا سارا ماجرا بیان کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ غلام نبی نے آہستہ سے کہا پولیس ہے اچھا گر رہا ۔ پھر یکایک وہ پچھواڑے کی دیوار کی طرف لپکا اور پھاندتے وقت اتنا کہہ گیا کہ اس دنیا میں اب رکھا کیا ہے ۔ ننھی منی دو جانیں کھاٹ پر پڑی ہیں ساتھ ہی چھوٹی سی بچی ہے ۔ اب یہ جانیں اور ان کی تقدیر ۔ ہمارا امرتسر والا مکان تو تم جانتے ہو ۔ وہ جو جلیانوالہ باغ کے پاس کوچہ [illegible] ہے وہاں آج کل میری ماں رہتی ہے ۔ ان بچوں کو اس کے پاس پہنچا دینا ۔ مادھو رام کا ایک رشتہ کا [illegible] اسی گلی میں رہتا ہے وہ کیسری داس ۔ تم جانتے ہو ۔ اچھا زندہ رہا تو کبھی ملوں گا ۔ خدا حافظ ۔

کے بعد وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اور آج تک لاپتہ ہے۔ بیچارا خدا دوست آدمی تھا خیر۔ اس کے بعد میں تمہیں لے کر امرتسر آیا۔ وہ ننھے ننھے بچے تم ہو سمجھے؟

اتنا کہنے کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب کچھ سوچنے لگے دین محمد نے جو بڑے غور سے یہ سب سن رہا تھا۔ دھرم پرکاش کی طرف دیکھا جو یہ سوچ رہا تھا کہ آج تک کسی نے سوائے اس کے کہ ان کے ماں باپ مر چکے ہیں اور کچھ نہیں بتایا۔ دادی اماں نے بھی کبھی ایسی بات نہیں کی۔ دونوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نظریں نیچی کر لیں۔ دونوں دل ہی دل میں شرمندہ تھے۔

دونوں کے کپڑوں پر لگے ہوئے خون کے دھبے اب گہرا رنگ اختیار کر چکے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ابھی تک کسی گہری سوچ میں تھے اور سامنے دیوار پر لگے ہوئے ایشیا کے نقشے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ یہ نقشے۔ یہ جغرافیے یہ تواریخ کی کتابیں کیا سبق دیں گی۔ اور سرکار کے اشاروں پر چلنے والے یہ مصنف "نقشہ نویس" کہیں ایک دن ہندوستان کا نقشہ ہی نہ بدل دیں۔

اتنے میں اسکول کی گھنٹی بجی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب چونک کر اٹھے اور دونوں بچوں سے کہا "دیکھو تم بھائی بھائی ہو۔ خبردار جو آج سے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی جھگڑا نہ کرنا۔ جاؤ۔ کھیلو، کودو اور لکھو پڑھو..."

اور اسی طرح کھیل کود اور لکھائی پڑھائی میں کا سال بیت گئے۔ اب یہ لڑکے بڑے ہو چکے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے۔ گویا... دھرم اور دین "یک جان دو قالب" تھے۔ لیکن دونوں اکثر مضطرب رہتے سینے میں جذبۂ آزادی کا دم گھٹا جا رہا تھا۔

آج شہر میں جلسہ تھا۔ محبانِ وطن نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ جلسہ میں تقریر کرنے والے ایک صاحب نے بڑے جوش میں آ کر کہا! "ہندو مسلمان ایک ہیں۔ آج سے ہندو مسلم کا سوال پیدا نہیں ہونے دیا جائے گا" اس پر حاضرینِ جلسہ میں سے کسی کی آواز آئی۔ "ہندو پانی" اور پھر ساتھ ہی دوسری آواز سنائی دی "مسلمان پانی"۔

"نہیں! ہرگز نہیں۔ آج سے ایسا نہ ہوگا۔ تقریر کرنے والے صاحب گرج کر بولے اور ساتھ ہی انہوں نے پانی کا گلاس جسے پینے کی غرض سے میز پر رکھا تھا اٹھایا اور کہا "یہ پانی۔ جو آج تک ہمارے دلوں میں انگریز کے بوئے نفاق کے بیج کو سینچ رہا ہے اب سیلاب بن کر اسے بہا لے جائے گا۔ یہ پانی، یہ پانی نہیں مادرِ وطن کا دودھ ہے جس پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا برابر حق ہے۔ دونوں مل کر اسے پئیں گے... برادران آگے بڑھے۔ چنانچہ سب سے پہلے دھرم اور دین آگے بڑھے ان دونوں کی دیکھا دیکھی سب نے ایک گلاس میں پانی پیا۔ ان کے خیال کے مطابق اسی گلاس میں برطانوی سامراج کا بیڑہ غرق ہو سکتا تھا۔

شہر میں ہندو مسلم اتحاد کے ایسے روح پرور نظارے دیکھنے میں آئے جن کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن "حکومتِ برطانیہ" جس کے لئے دونوں آنکھیں برابر ہونی چاہئے تھیں! اسے یہ مثال۔ ہندو مسلم بھائی بھائی ایک آنکھ نہ بھائی۔ حاکمِ وقت نے وقت کا فائدہ اٹھایا اس رات ضلع مجسٹریٹ کے بنگلے پر تمام افسران جمع ہوئے ہندو بھی مسلمان بھی کیوں کہ "مغربی سفید ہاتھی" جانتے تھے کہ ہاتھیوں کو پکڑنے کے لئے سدھائے ہاتھی سدھائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں غداروں کی کمی نہیں۔

دوسرے دن شہر میں رام نومی کا تہوار بڑی شان و

زا [illegible] نہیں"

"کیوں ـ کوئی فکر کی بات نہیں، تم میری وہ قمیص تو نکالو [illegible] میں سے وہ جو میں نے راکھی اور بیساکھی کے [illegible] پہنی تھی"

چنانچہ کپڑے بدل کر دھرم پرکاش جب دین محمد کے ساتھ جانے لگا تو شانتی نے کہا "آج مت جاؤ"

"کیوں؟" دین محمد نے پوچھا۔

شانتی نے کہا "میرا دل دھک دھک کر رہا ہے شگون اچھا نہیں ہے ـ وہ دیکھو کالی بلی جس کے [illegible] میں کبوتر تھا تمہارا راستہ کاٹ گئی ہے"

"واہ تم لوگ بھی وہم نہ کیا کرو" دھرم پرکاش نے [illegible] اور پھر قمیص کی جیب سے سات آٹھ راکھیاں اپنی راکھی نکال کر اپنے ہاتھ میں باندھتے ہوئے بولا "یہ لو تمہاری [illegible] راکھی میری حفاظت کے لئے کافی ہے اور ہاں شام کو میرا انتظار نہ کرنا ـ ہو سکتا ہے ہم دیر سے آئیں"

یہ کہہ کر دھرم پرکاش دین محمد کے ساتھ چلا گیا ـ آج جلیانوالے باغ میں عجیب بہار تھی ـ شہر میں زیادہ تر دکانیں بند تھیں ـ مگر بازاروں میں سرفروش نظر آتے تھے ـ جو ہر قیمت پر ناموس وطن خریدنے کو تیار تھے ـ بیساکھی کے تہوار کی وجہ سے لوگ دور دور سے [illegible] ہوئے تھے ـ ایک تو بیساکھی دوسرے [illegible] لیکچر ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ ایک ہوائی جہاز نے بہت کم بلندی پر پرواز کرتے ہوئے چکر لگانے شروع [illegible] ـ جس کے اندر ہوا باز جھنڈیوں سے اشارہ [illegible] ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا ـ ہوائی جہاز [illegible] پیچھے اڑانے لگا ـ

شاید اپریل کے مہینے میں جو موسم بہار کا مہینہ [illegible] ہوائی جہاز کی شکل میں باغ پر خزاں منڈلا رہی [illegible] آسمان ابر آلود تھا یہ دیکھ کر بڑے بوڑھے یہ کہہ [illegible] گئے کہ صیاد [illegible] نے اچھے دام [illegible] اس [illegible] دام بچھایا ہے

تھوڑی دیر بعد شہر میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اتنے میں خبر پھیلی کہ جالندھر چھاؤنی سے جنرل ڈائر فوج لے کر شہر میں آیا ہے اور سیدھا باغ کی طرف گیا ہے آج اس باغ میں جمع شدہ نونہالان ہند شاید اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے ـ پانچ بج چکے تھے ـ شانتی پانی بھرنے کے لئے جو نکلی تھی کنوئیں کے پاس پہنچ کر تڑ تڑ کی آوازیں آنے لگیں ـ آناً فاناً کہرام مچ گیا ـ گولیاں چلنے کی آواز سے فضا کانپ اٹھی ـ کبوتر پھڑ پھڑا کر اڑے اور چکر کاٹنے لگے ـ چھوٹے بچے خوشی کے مارے اچھلتے کودتے بھاگ کر باہر آئے ـ سمجھے کہ بیساکھی کے دن دیوالی آ گئی کوئی پٹاخے چھوڑ رہا ہے ـ مگر بڑے سہم گئے ـ شانتی بھاگی ہوئی ڈیوڑھی میں آئی اور اپنے سینے پر دو ہتڑ مارتے ہوئے کہنے لگی "دادی اماں! دادی اماں غضب ہو گیا ـ باغ میں گولی چل گئی ـ دھرم پرکاش اور دین محمد دونوں باغ میں لیکچر سننے گئے ہیں ـ کوچہ بندی کے پاس آ کر دیکھا کہ زخمی گرتے پڑتے چلے آ رہے ہیں ـ کوئی نالی میں گرا تو کوئی سڑک پر بیچ ، کوئی کسی دکان کے چبوترے پر لوٹ رہا ہے تو کوئی کسی سیڑھی پر پڑا تڑپ رہا تھا ـ

جام شہادت پی چکنے کے بعد نشہ آزادی میں چور وطن کی محبت دل میں لئے یہ دیوانے لڑکھڑاتے ہوئے باغ سے چلے آ رہے تھے ـ لوگوں کے جسموں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے ـ چوک فوارے کے بیچ جو باغ سے تھوڑی دور ہے سڑک پر گرے ہوئے خون کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ خون ہندو کا ہے یا مسلمان کا ـ

چاروں طرف سے پانی پانی کی صدائیں آ رہی تھیں بڑے بڑے امیرزادے جو شربت کے دریا بہا دیں وہ صرف پانی کو ترس رہے تھے ـ کچھ خوش نصیب گندی نالیوں کا پانی پی رہے تھے ـ اتنے میں تھوڑی سی کالے کا پانی پانی چلاتا ہوا بدحواسی کے عالم

میں کنوئیں کی طرف لپکا اس کے گھٹنے سے خون بہہ رہا تھا۔ دادی نے پوچھا
"ہمارے بچے کہاں ہیں؟"
"وہ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے اب پتہ نہیں کہاں ہیں" یہ کہہ کر لڑکا بے ہوش ہو کر گر گیا۔
دادی نے سوچا شاید جان بچانے کے لئے بھاگ نکلے ہوں، جس سے بھی پوچھا کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا۔ جھٹ پٹا ہو چلا تھا اب دادی سے نہ رہا گیا۔ شانتی سے کہنے لگی "میں جاتی ہوں" شانتی نے کہا "میں بھی ساتھ چلتی ہوں" بڑھیا گھر سے مٹی کے تیل کا لیمپ اٹھا کر لائی لیکن وہ مغربی ہوا کے ایک ہی جھونکے سے گل ہو گیا۔ دونوں جوں ہی گلی کے دروازے سے باہر نکل کر بازار میں پہنچیں تو دیکھا کہ گورے سنگینیں لئے گھوم رہے ہیں۔
"انقلاب زندہ باد" کی آواز جسے انگریزوں نے گولیوں کی آواز سے دبانا چاہا تھا اب بھی کہیں نہ کہیں سے آ رہی تھی۔ دادی نے گوروں کے چہرے کی طرف دیکھا آتش بازی کر چکنے کے بعد فرنگی آتش بازوں کے چہروں پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں۔
جلیانوالہ باغ جو ان کے گھر کے قریب ہی تھا آج کوسوں دور دکھائی دے رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح جب دونوں باغ کے اندر پہنچیں تو دیکھا کہ باغ خونِ شہیداں سے لالہ زار بنا ہوا ہے۔ لوگ اپنے اپنے رشتہ داروں کی لاشیں پہچان رہے ہیں۔ جگو مالی باغ سے پھول چننے آیا تھا اپنے پھولوں سے کمسن بھتیجے کے جو لوگوں کے پاؤں تلے کچلا جا چکا تھا۔ شام سنگھ اپنے باپ حکیم رام سنگھ کی نبض دیکھ رہا تھا جو اب ساکت ہو چکی تھی۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو صرف سونے کے بٹن اور انگوٹھیاں تلاش کر رہے تھے شہیدوں کے سونے میں آج ان

کی چاندی تھی۔ کئی زخمی ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہ سکتے تھے۔
کئی بدنصیب ابھی تک سسک رہے تھے تھوڑی دیر ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد شانتی نے کہا "دادی آؤ ذرا اس سمادھ کے پیچھے دیکھ لیں۔" دونوں سمادھ کی جانب بڑھیں وہیں انہیں ایک اور محلہ دار ملا جو لالٹین لئے مدھم سی روشنی میں اپنا نورِ نظر تلاش کر رہا تھا۔ دونوں کو قریب آتے دیکھ کر کہنے لگے۔ "اس میدان میں کے اس باغ میں روز جلسے ہوتے تھے دادی۔ میں جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ باغ ضرور کھلا کے رہے گا۔" پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے لالٹین دادی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے دائیں طرف اشارہ کیا۔ دادی آگے بڑھی شانتی چلائی "وہ دیکھو دادی" دھرم پرکاش کے ہاتھ پر بندھی راکھی دور سے لالٹین کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ شانتی قریب آئی اور کہا "پہچان لیا نا بہن نے راکھی والا ہاتھ" دادی نے یہ سن کر سر پیٹ لیا پھر غور سے جو دیکھا تو دین محمد سسکیاں لے رہا تھا خیرات کی بتی اکساتے ہوئے بڑھیا نے جب خاندان کا چراغ بجھتے ہوئے دیکھا تو بآواز بلند کلمۂ طیبہ پڑھا جان کنی کی حالت میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے ایک بھاشنے جی کو جو دین محمد کے پاس ہی پڑے تھے اللہ کا نام سن کر ایک اور گولی سی لگی۔ وہ ذرا پرے کھسک گئے شاید اکیلے سورگ میں جانا چاہتے تھے اور مسلمان کا ساتھ گوارا نہ تھا۔
دادی نے پوتے کا سر اپنی گود میں رکھتے ہوئے محسوس کیا جیسے اس کی گود بھر گئی ہے۔ دین محمد نے آخری ہچکی لیتے ہوئے بڑی مشکل سے پانی کہا اور عین اسی وقت بوڑھی دادی کی آنکھ سے آنسو کا قطرہ دین محمد کے خشک ہونٹوں پر آ گیا۔ آرزوئیں تھیں جو سمٹ سمٹا کر ایک آنسو کی

میں نمودار ہوئی۔

دین محمد دادی اماں کی گود میں ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ بڑھیا نے اس کے سونے کے بعد لوری شروع کردی۔ لوری گاتے گاتے دادی پر وحشت سی طاری ہوگئی۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "پیاسے ہی چل دیئے" پھر دل میں دفعتاً شہیدانِ کربلا کا خیال آیا اور دین محمد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "بیٹا! کیا جامِ شہادت پی چکنے کے بعد بھی پانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔"

بڑھیا کی آنکھ سے گرا ہوا آنسو جو دین محمد کے ہونٹوں پر گرا تھا ابھی تک ویسا ہی تھا۔ بوڑھوں کی آنکھ سے گرے ہوئے آنسو بڑی دیر کے بعد خشک ہوا کرتے ہیں۔ آنسو کا یہ قطرہ دین محمد کے گلاب سے ہونٹوں پر ہیرے کی طرح چمک رہا تھا۔ اب دادی نے دونوں بچوں کے سر گود میں رکھ لیے اور کہا "اس چاند اور سورج کی جوڑی کو کس نے گہنا دیا؟ ارے یہ دونوں بچے اپنے خاندان کا نام اور آثاثہ تھے ظالمو! ان پر تو ترس کھایا ہوتا۔ یہ بچے میں نے پال پوس کر اتنا بڑا کیا کیا اسی دن کے لئے تھے!"

شانتی گم صم بیٹھی تھی وہ دین محمد اور دھرم پرکاش کے جسموں سے نکلے ہوئے خون کو دیکھ رہی تھی جو تھوڑی دور جاکر ایک ہوگیا تھا ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے گنگا جمنا ایک ساتھ بہہ رہی ہوں سرسوتی کی کسر تھی وہ شانتی کے آنسوؤں نے پوری کردی۔ تڑپنے لگی۔ اتنے میں ان کے نزدیک ہی جگر خراش صدائیں بلند ہوئیں۔ ایک دلہن کہ جس کے ہاتھ کی مہندی بھی میلی نہ ہوئی تھی دیوانوں کی طرح اپنے سر میں مٹی ڈال رہی تھی وہ ماتم کر رہی تھی۔ باغ کی مٹی سے انتقام لینا چاہتی تھی اس کا خیال تھا کہ باغ کی مٹی نے اس کے خواب مٹی میں ملا دیئے ہیں۔

جنہیں کبھی اسے چومتی چومتی اس لیے کہ اس کی آرزوؤں کا خون اس کے خاوند کے خون کے ساتھ باغ کی مٹی میں جذب ہو چکا تھا۔

رات بھر گریہ وزاری کی صدائیں آسمان تک پہنچتی رہیں۔ مگر آسمان والا امرتسر شہر سے دور۔ رات کے وقت کہیں لمبی تان کر سو رہا تھا۔

کچھ شہاب شہیدوں کی شہادت کے شاہد بنے تو ہولے۔ سنسان رات کے پچھلے پہر کائنات کی آنکھ لگ جایا کرتی ہے اور اس کے مہین مہین خراٹوں کی آواز حساس دلوں کو صاف سنائی دیا کرتی ہے۔ آج چونکہ امرتسر شہر شہر خموشاں بنا ہوا تھا اس لئے یہ آواز زیادہ صاف سنائی دے رہی تھی۔

دوسرے دن امرتسر کی کایا پلٹ چکی تھی جنرل ڈائر کے مطابق سولہ کارتوس کارآمد ثابت ہوئے۔ منتوں پر گولیاں برسائی گئیں۔ باغ کے دروازے کے مقابل کھڑکی میں ایک بچہ روٹی کھانے بیٹھا گولی کھا کر باغ میں آ رہا۔ سنگینیں بغیر کسی سنگین جرم کے استعمال کی گئیں۔ ٹکٹکیاں لگوائی گئیں ایک جگہ کوئلے کی دکان میں گوروں نے گھس کر منہ کالے کئے رؤسا سر بازار رسوا کئے گئے۔ شہر پر قہر ٹوٹا کہ الامان الحفیظ۔

دھرم پرکاش اور دین محمد کی لاشیں محلے میں لائی گئیں۔ جیب میں ابھی تک آج ان کے جنم دن کے شکر پارے موجود تھے۔ بہن کی دی ہوئی راکھی ابھی تک حفاظت کے طور پر لاش کے ہاتھ پر بندھی ہوئی تھی۔ البتہ دین محمد کا کرتہ۔ وہ نیا کرتہ جو اس نے آج جنم دن کی خوشی میں پہنا تھا خاک و خون میں لتھڑنے کی وجہ سے پرانا ہو گیا تھا۔

دادی نے بچوں کو نہلا دھلا کر کفن پہنائے۔ آج سرِ شام انگریز کی بدولت۔ دھرم اور دین کا جنازہ

اٹھنے والا تھا۔ دونوں بچے رخصت ہونے والے تھے
سعادت مند بچے کہ تمہیں حکم میں جنہوں نے کبھو نفی
نہ کیا تھا آج بغیر کسی کی پرواہ کئے بنا کچھ کہے سنے جا چکے
تھے۔ دونوں ایک ہی گھاٹ پر لٹا دئے گئے۔ یہ گھاٹ
[illegible] کے حیز میں آئی تھی۔ مارشل لاء کی وجہ سے
شہر میں کوئی ساماں نہ ملتا تھا۔

گھاٹ پر جب شہید سلا دئے گئے تو گھاٹ کے
نصیب جاگ اٹھے۔ شانتی اور دادی کسمپرسی کی حالت
میں لاشوں کے پاس کھڑی تھیں۔ کیسری داس دائم
المریض تھا۔ بشیر احمد، ملکی رام اور تیجا سنگھ سے
چونکہ اس گھرانے کے تعلقات تھے وہ اور دو چار لوگ
اس شرط پر جنازہ اٹھانے کو تیار ہوئے کہ براستہ
گھی منڈی وہ رام تلائی تک جنازہ چھوڑ آئیں گے۔
کیونکہ شہر کے سبھی دروازے بند تھے۔ دھرم اور
دین کا دروازہ ایک ساتھ اٹھا رام اور اللہ کی صدائیں
ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

لاشیں رام تلائی کے باہر باواجی، جو ان کے
سہانے حربی تھے کے باغیچے میں پہنچائی گئیں۔ آہٹ
پاکر اندھے باواجی لکڑی ٹیکتے باہر آئے اور کہا "عمر
ہے تمہاری دین محمد ابھی ابھی یاد کیا تھا کہو اکیلے
آئے ہو یا دھرم پرکاش بھی ساتھ ہے؟"

دادی نے جواب دیا "دونوں بھائی ساتھ
ساتھ آئے ہیں بھلا دھرم دین کا ساتھ کیسے چھوڑے
گا" اور باواجی بولے "اچھا کیا جو آگئے۔ سنا ہے
شہر میں شور شرابہ ہے کچھ دن یہاں رہو آرام سے
کھاؤ پیو بیٹھو سوؤ" "اب یہ یہاں ہمیشہ کے لئے
سونے آئے ہیں۔ جگہ ملے گی انہیں؟" شانتی نے
بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور باواجی سہم گئے۔ لنڈی
سانسوں اور باغیچہ کے دروازے کی طرف چل دیئے
شانتی اور دادی کی طرف چوکیدار نے اشارہ
کرتے ہوئے پوچھا... کون ہیں ہندو یا مسلمان؟

باواجی خود ایک اکڑ کر بولے "ہندو بھی مسلمان بھی۔
انسان ہیں۔" اس پر چوکیدار کہنے لگا "ہندو کو
جلانے کی اجازت تو میں دے سکتا ہوں کیونکہ وہ
سامنے والی زمین میرے سوا گیہ ہندو مالک کی ہے"
باواجی بات کاٹ کر بولے۔ "نہیں ایک جگہ بندوبست
ہونا چاہیئے"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" چوکیدار نے کہا پھر کچھ سوچ
کر بولا "وہ ساتھ والی زمین میاں احسان احمد کی ہے
وہاں اگر وہ" ابھی بات ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ میاں
احسان احمد مرحوم کی زمین کی دیکھ بھال کرنے والا
آپہنچا کہنے لگا۔ "مسلمان کے لئے میں اجازت دے
سکتا ہوں" باواجی نے کہا "ناممکن دونوں مر کر بھی
ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔" اتنے
میں میلا رام چوکیدار نے شانتی سے کہا "تم جاکر لکڑیوں
کا بندوبست کر دو باقی سب ہو جائے گا۔"

باواجی نے کہا "ہاں! جہاں دونوں کی زمینیں
ملتی ہیں وہاں پاس پاس انتظام کر دیں گے" تب
شانتی تنہا دادی کو لے کر شہر کی طرف چلدی اور جب
شہر سے لوٹیں تو دیکھا کہ باواجی کے باغیچے کے سامنے
بھیڑ لگی ہے۔ دھرم اور دین کے ٹھیکے داروں کی
بھیڑ کے بیچ ایک فقیر کو زدوکوب کیا جا رہا ہے دادی
نے کہا "ارے۔ اب کیا ہوا؟" اور ایک مسلمان نے
آگے بڑھ کر کہا "اس فقیر نے اور باواجی نے مل کر
ایک مسلمان کی لاش کو نذر آتش کرنے کی کوشش کی
ہے اور وہ بھی اس کے وارثوں سے پوچھے بغیر۔"
اور پھر ایک ہندو بولا۔ "اور یہ ہندو کی لاش کو دفنانے
کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم نے پکڑ لیا۔ باواجی کے منہ میں
کپڑا ٹھونس کر انہیں سامنے والی کوٹھڑی میں بند کر دیا
ہے ہم نے۔" دوسرے ہندو نے کہا۔

دادی نے پوچھا "مگر یہ سائیں کون ہے؟"
"تمہارا بیٹا غلام نبی۔ مجھے پہچانتی ہو اماں" فقیر

آگے بڑھ کر کہا۔

دادا جی ہکا بکا رہ گئی۔ شانتی دونوں کی طرف دیکھنے لگی اور فقیر نے پھر لوگوں سے کہا: "جسے تم دھرم کا شش سمجھ رہے ہو وہی میرا دین محمد ہے۔ دیکھو اس کی کھوپڑی کے نیچے کالا نشان - یہ نشان پیدائشی ہے۔ اور اس کے بائیں ہاتھ میں چھ انگلیاں ہیں۔ مجھے یاد ہے سب کچھ یاد ہے اتنے برس گزرے ہیں تو کیا ہوا۔ میں اپنے بچے کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ باپ سے کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ میں کل شام یہاں پہنچا اور آج صبح کریم چند سے مجھے سب حال معلوم ہوا۔ یہاں آکر میں نے تجہیز و تکفین کی تیاری کی تو یہ جھگڑا پیدا ہو گیا۔ مرے ہوئے کے لئے جھگڑا پیدا کرنا فضول ہے۔ باقی رہا زمینوں کا معاملہ یہ ہندو کی زمین پہلے مسلمان کی تھی اور مسلمان کی زمین ہندو کی۔ اور اس سے پہلے یہ زمینیں پتہ نہیں کس کس کی تھیں۔ یہ زمین بھی کبھی کسی کی ہوئی ہے ہم سب اسی زمین کے ہیں اور جس مالک کی یہ زمین ہے یہ دھرم اور دین (۲) کے بندے کے ہیں۔ ان بچوں کو تو مٹی میں ملنا ہے اب چاہے کسی طرح ملا دو۔ یہ جسم تو خاک ہو کر رہے گا ایک دن ــــ اس خاک کو کون پہچانے گا کہ یہ خاک ہندو کی ہے یا مسلمان کی۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ خاک ہندوستانی ہے۔"

غزل

حضرت ادیب لکھنوی

چاہے اپنا چاہے کوئی غیر ہو
ہم دعا کرتے ہیں سب کی خیر ہو

آئے تھے دنیا میں ہم لڑتے ہوئے
یا الٰہی خاتمہ بالخیر ہو

زندگی دی ہے تو یہ توفیق دے
کاش مجھ سے کوئی کارِ خیر ہو

الٹی سیدھی باتیں کہہ دیتے ہیں لوگ
کچھ نہ کچھ تو بات کا سر پیر ہو

دل کو ہے اک آستانے سے غرض
یہ نہیں پروا حرم یا دیر ہو

سیرِ دنیا ختم - اجل کا حکم ہے
چلئے اب ملکِ عدم کی سیر ہو

نام تیرا ہی رہے وردِ زباں
نزع میں حالت جو میری غیر ہو

آتی جاتی ہے یہ دنیا سے ادیب
چار دن میں کیوں کسی سے بیر ہو

جوزف آکار

خاتم الشعراءِ ہند عرف لُبدم چچا

اگر آپ خاتم الشعراء صدر انجمن پہلوانانِ سخن حضرت لُبدم چچا سے واقف نہیں تو اعتراف کر لیجئے کہ اردو شعر و ادب تو کُجا۔ ابھی آپ اردو زبان ہی سے ناواقف محض ہیں ...

لبدم چچا کی طبیعت بچپن ہی سے کچھ ایسی عاشقانہ و والہانہ رہی ہے گویا ان کو گھٹی ہی میں کسی شاہی حکیم کا معجونِ جلالی ملا کر پلا دیا گیا ہو۔ تعلیمی ایام میں بھی اس والہانگی نے عجب رنگ دکھائے یعنی جس جماعت میں گئے اسی کے ہو کر رہ گئے۔ آٹھویں جماعت کے تین سال کے ایام میں تو لبدم چچا کی مونچھیں نکل آئیں مگر ممتحن حضرات کے ارمان نہ نکلے۔ معمول کے مطابق روزانہ پچیس پچاس اُٹھک بیٹھک گھر پر والد صاحب لگواتے تو پچیس پچاس سکول کے اساتذہ حضرات اس بلا ناغہ کی ورزش میں قدرت کی سازش دیکھئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے لبدم چچا کا بدن گٹھیلا و کسرتی ہو گیا اور اس نعمتِ غیر مترقبہ کا فائدہ لبدم چچا نے اس طرح اٹھایا کہ وہ ہر روز شام کو اکھاڑے میں جانے لگے اور ایک ہی سال میں وہ کسب کمال حاصل کیا کہ اکھاڑے میں کوئی اُن کا مدِمقابل باقی نہ رہا شہر میں مشتاق پہلوان رستمِ ہند بننے کے مشتاق تھے لیکن اس سے قبل کہ وہ رستمِ ہند بننے کو ... کی جوڑ لبدم چچا سے طے کرا دی۔ شہر ... میں جب اس دنگل کے ... دیکھے تو اسکول کے اساتذہ حضرات نے بھی پہلی دفعہ لبدم چچا کے کسرتی چوڑ بدن کا بغور جائزہ لیا تو اُنھیں علم ہوا کہ وہ ملک کے ہونہار شہسوار کی رکاب میں فضول اپنی ٹانگیں پھنسائے ہوئے ہیں اور جیسے دنگل میں لبدم چچا نے آٹھ سیکنڈ میں مشتاق پہلوان کو چاروں شانے چت کر دیا تو انھیں پہلی دفعہ اس بات کا بھی احساس ہوا کہ آج تک جس طالب علم کو وہ سو میں سے آٹھ نمبر دے رہے ہیں دراصل وہ سو میں سے آٹھ کا نہیں بلکہ اسّی کا مستحق ہے لہٰذا پہلی ہی فرصت میں اساتذہ حضرات نے انھیں فرسٹ ڈویژن کے نمبر دے کر فارغ التحصیل یعنی مڈل پاس کی ڈگری عطا کر دی۔ اُدھر اکھاڑے کے پہلوانوں نے بھی اُنھیں اپنا خلیفہ بنا لیا۔

اس منتہی تعلیم کے بعد ہر اردو داں کا یہ فرض بلکہ قومی فرض بن جاتا ہے کہ وہ میدانِ شعر و سخن میں قدم رکھے۔ چنانچہ لبدم چچا نے بھی کچھ اس اہتمام سے میدانِ سخن میں قدم رکھا کہ ایک ہی سال میں غزل کو عورتوں کی گفتگو سے مردوں کی گفتگو بنا کر اچھے اچھوں کے میدانِ سخن کے دانت کھٹے کر دئیے۔ گٹھ بندی اردو داں شعرا کا دوسرا قومی فریضہ ہے چنانچہ لبدم چچا نے بھی اپنے شاگرد پہلوانوں کا جن کا شین، قاف درست تھا اُنھیں ایک ایک تخلص عطا کر کے شہر میں اپنی ایک الگ انجمن بنا ڈالی۔ انجمن کا نام بھی اسم بامسمیٰ کے یعنی "انجمن پہلوانان" رکھا گیا۔ اس انجمن کے اراکین وہ پہلوان حضرات بھی تھے جو شعر کو سیر اور غزل کو ...

تھے - یہ اعزازی اراکین کارکنانِ انجمن یعنی
والنٹیر کے فرائض سرانجام دیتے تھے - گُندم چچا
نے اپنی انجمن کے پہلوانوں کو تخلص بھی عجیب و
غریب دیئے - مثلاً کالو پہلوان تیجہ، ممتاز
پہلوان بگدا، مُنا پہلوان پنجی، خدا بخش
پہلوان لنگی - چند ماہ میں تو انجمن پہلوانانِ سخن
نے شہر کی دیگر تمام انجمنوں کے چھکے چھڑا دیئے -
شہر کے پیشہ ور مشاعرہ بازوں کا بھی قافیہ
تنگ - کیا مجال کہ شہر کی کوئی انجمن مشاعرہ کرائے
یا کوئی پیشہ ور مشاعرہ باز کوئی آل انڈیا مشاعرہ
کرائے اور انجمن پہلوانانِ سخن کے شعرا حضرات
کو دعوتِ مشاعرہ نہ دی جائے، مگر یہ اعزاز انجمن
پہلوانانِ سخن کو کچھ ایسے ہی حاصل نہیں ہوا - شہر
کے سینکڑوں شعرا حضرات کے جیب و داماں کی
دھجیاں اُڑائی پڑی تھیں - مدعوئین بیرونی شعرا
حضرات کی بھی گاڑی سے اترتے ہی اسٹیشن پر
اُن کی خاطر خواہ خاطر تواضع کرنی پڑی - کتنے ہی
شعرا کو تو معاوضہ کی رقم تو کجا اپنی گرہ کی رقم گنوا کر
یہاں ہی گاڑی سے اُلٹے پاؤں واپس اپنے گھر
بھاگنا پڑا - ملک کے کئی مشہور ترنم باز شاعروں
کی بتیاں آج بھی اس مرحلۂ دار و رسن کی مشاہد
ہیں -

آج بفضلہٖ شہر کا کوئی مشاعرہ گُندم چچا اینڈ
پارٹی کے بغیر منعقد ہو ہی نہیں سکتا بیرونی شعرا
حضرات بھی اب منتظمین مشاعرہ سے یہ پتہ چلا کر ہی
مشاعرہ کا دعوت نامہ قبول کرتے ہیں کہ انجمن
پہلوانانِ سخن کے تعاون سے یہ مشاعرہ
ہو رہا ہے کہ نہیں - معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا
بلکہ اور دو فریاد تک بھی پہنچتا ہے - مشاعرہ
جلسہ ایسا کم ہو کہ قومی یکجہتی کے نام پر سٹیج
پر جلوہ افروز شعرا حضرات کی کیا مجال کہ
انجمن پہلوانانِ سخن کا کوئی شاعر اپنا کلام
پڑھے اور اُسے داد نہ دیں - مشاعرہ میں
پر اکثر یہ ہوتا ہے کہ سخن فہم شعرا حضرات کی
دودھ اور جلیبی سے تواضع کی جاتی اور تا آخر
سخن شعرا حضرات کو کھانے جا کر رپٹ لکھوانی پڑتی
گُندم چچا نے اب اپنا حلیہ بھی ملک کے ممتاز
اساتذہ جیسا بنا لیا تھا اب اُن کی اُستادوں
کے کچھ گُر بھی سیکھ لئے تھے اب وہ سٹیج پر جلوہ گر
ہوتے ہی اپنی آنکھیں موند کر سر جھکا کر اس
طرح بیٹھ جاتے تھے گویا مراقبے میں چلے گئے ہوں
اور اُس وقت تک مراجعت نہیں فرماتے جب تک
اُن کا نام نامی و گرامی پکارا نہیں جاتا -
انجمن پہلوانانِ سخن کا اثر سامعین حضرات پر بھی
کچھ کم نہ تھا - انجمن کے اعزازی اراکین پہلوان
حضرات جیسے ہی گُندم چچا کا نام نامی پکارا جاتا -
فوراً پنڈال کے گیٹوں پر جا کر کھڑے ہو جاتے - کیا
مجال کہ کوئی سامع باہر جا سکے - اگر کوئی جانے کی
کوشش بھی کرتا تو یہ حضرات اُسے روک لیتے -
"حضور کہاں جا رہے ہیں - اُستادِ محترم کا کلام
سُن کر جائیے -
"زور کا پیشاب لگا ہے" سامع گھبرا کر کہتا -
"تو اُدھر قنات سے لگ کر فارغ ہو جائیے"
"مگر"
مگر کی تو .... اور اس موٹی سی گال کے
ساتھ سامع کے وہ زوردار جھانپڑ پڑتا کہ وہیں
فراغت ہو جاتی -
مشاعرہ کی نظامت عموماً کا بڑان قسم کے شعرا
حضرات کرتے ہیں - لہٰذا یہ حضرات بھی بڑے محتاط
ہو کر گُندم چچا کا اسم گرامی پکارتے حضرات میں
اب ملک ایسے ملتا ہے روزگار اُستاد شاعر کو
زحمتِ سخن دینے کی جرأت کر رہا ہوں جن کا نام

نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں اور اس کے ساتھ
ہی مخدوم چچا کے ہر شعر پر سبحان کا ایسا پنڈال شکن
نعرہ لگاتے کہ مشاعرہ کے اختتام پر مصری کی ڈلی
سے دعوتِ سخن کے بدلے دعوت دہن ہوتی۔
ایک انڈو پاک مشاعرہ میں تو ناظمِ مشاعرہ نے
ضرورت سے زیادہ سخن فہمی کا مظاہرہ کیا اور
سبحان اللہ کے نعرے کے ساتھ پھر اتنا اونچا اچھلے
کہ سامنے رکھا مائک خارِ مغیلاں بن کر پیوستِ
رگِ جاں ہو گیا اور ساتھ ہی ناظم نے "ہائے
مر گیا" کا دوسرا نعرہ لگایا اسٹیج پر بیٹھے شعرا
حضرات نے بعد مشکل ناظمِ مشاعرہ کی اس حال
پُر ملال سے گلو خلاصی کرائی اور دوسرے دن ہی
مخدوم چچا نے ناظمِ مشاعرہ کے اس نقص و زیاں کا
ازالہ دعوتِ مرغ و ماہی دے کر کر دیا۔
اگلے ماہ شہر میں ایک کُل ہند مشاعرہ ہونا تھا۔
اس دفعہ منتظمینِ مشاعرہ نے بڑی گہری سازش
کی۔ کسی طرح انھیں علم ہو گیا کہ رام پور کے ایک
نامور پہلوان اللہ بخش نے بھی شہ زور کا تخلص
رکھ کر شاعری ہی نہیں بلکہ خلیفہ الخلفا ہند کے
خطاب کے ساتھ رامپور میں بھی "انجمن پہلوانان
سخن" کے طرز کی ایک انجمن "دی گریٹ فائٹرز
اینڈ رائیٹرز"
بنا کر اردو کے بقا کے
لئے لڑائی شروع کر دی ہے۔ چنانچہ منتظمینِ
مشاعرہ نے استاد اللہ بخش اور ان کے
شاگردوں کو بھی مشاعرہ کا دعوت نامہ بھیج دیا۔
مشاعرہ سے ایک دن قبل فریقین ہی نہیں
بلکہ اہلِ شہر کو اس دنگل مشاعرہ کی اہمیت کے
[illegible] طرح علم ہو چکا تھا۔ لہٰذا مشاعرہ
کا پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔
مشاعرہ شروع ہوا تو صدرِ محترم کے دائیں جانب

چچا اور بائیں جانب استاد اللہ بخش شہ زور
اپنے پورے کروفر یعنی اپنی اپنی زلفوں سے
اپنا آدھا چہرہ چھپائے اپنی اپنی آنکھیں موندے
سر جھکائے بیٹھے تھے۔
کئی شعرا اپنا اپنا کلام سنا کر چلے گئے مگر
دونوں استاد مراقبے کے عالم ہی میں رہے۔
ایک مرتبہ مخدوم چچا نے سر جھکائے اپنی آنکھوں
کی کمانیوں کو قدرے وا کرتے ہوئے استاد
اللہ بخش کو دیکھا تو دیکھا کہ استاد اللہ بخش
شہ زور بھی انھیں کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔
دونوں کی آنکھوں نے ایک دوسرے کو چیلنج دیئے
اور پھر دونوں واپس مراقبے میں چلے گئے۔ مخدوم
چچا نے مقامی شاعر ہونے کے ناطے نہیں بلکہ از
راہِ عنایت استاد شہ زور سے پہلے اپنا کلام
سنانا قبول فرما لیا تھا۔
جب مخدوم چچا کا نامِ نامی پکارا گیا تو مخدوم
چچا نے سر اٹھایا اور ایک نگاہِ غلط انداز استاد
شہ زور پر ڈالتے ہوئے مائک پر آ گئے۔ سامعین
نے تالیوں سے خیر مقدم کیا ادھر فریقین کے شاگردوں
نے بھی اپنی اپنی آستینیں چڑھا لیں۔ اسٹیج پر بیٹھے
شعرا حضرات بھی سنبھل کر بیٹھ گئے۔
مخدوم چچا کی غزل کے چار شعر سبحان اللہ۔
سبحان اللہ کے نعروں کی نذر ہو گئے مگر استاد شہ زور
مراقبے کے عالم ہی میں رہے۔
مخدوم چچا سے رہا نہ گیا۔ پانچویں شعر پر
بہ بانگِ دہل استاد شہ زور کو مخاطب کیا "یہ شعر
خصوصاً آپ کو نذر کرتا ہوں"
"پڑھئے" استاد شہ زور نے کمال بے نیازی سے
کہا۔
مخدوم چچا مائک پر گرجے۔ ؎

شہ زور تو دنیا میں کئی آئے ہیں لیکن
ہے کس میں جگر تاب جو آ جائے مرے آگے

"مہمل شعر ہے۔ غالب کا چربہ ہے" استاد شہ زور نے غصے میں پیر اٹھاتے ہوئے کہا۔

بگدم چچا نے بھی جنون کے عالم میں مائیک کو اٹھا کر فرش پر دے مارا۔

"ابے او ناخلف۔ غالب کا چربہ آتا ہے کہ نہیں مگر آج تیری چربی ضرور اتار دوں گا" یہ کہتے ہوئے بگدم چچا نے آستینیں چڑھا لیں۔

"ابے او پاگل آج ہم بھی تیرا پاگل پن دور کیے دیتے ہیں" استاد شہ زور بھی مٹھیاں بھینچ کر کھڑے ہو گئے۔

سامعین حضرات کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ سٹیج کے شعراء حضرات بھی سٹیج سے کود کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

"حضرات میں مشاعرہ کو یہیں ختم کرتا ہوں آپ بیٹھے رہیے۔ نہیں اٹھ کر جائیے۔ اب مشاعرہ کا اصلی دور شروع ہوتا ہے۔" اتنا کہہ کر ناظم مشاعرہ مائیک چھوڑ کر بھاگ کر سامعین کی صف میں جا بیٹھے۔

سامعین کے اٹھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، آج زندگی میں پہلی دفعہ انھیں اس قسم کے لوازمات دلکش مشاعرہ میں شرکت کا موقعہ ملا تھا..

"ہاں تو سالے۔ جیل ابھی ملا ایک مرتبہ پھر تو کہہ کہ شعر مہمل ہے" بگدم چچا نے گرجتے ہوئے کہا۔

"ہاں شعر مہمل ہے، مہمل ہے اور یہ ہے اس کا ثبوت" یہ کہتے ہوئے استاد شہ زور نے ایک بگدم چچا کی کنپٹی پر وہ گھونسہ رسید کیا کہ ایک لمحے کے لیے تو بگدم چچا بھی چکرا گئے۔ مگر دوسرے لمحے بگدم چچا نے خود کو سنبھالتے ہوئے استاد کو ایک نہایت ہی موٹی ماں کی گالی دیتے ہوئے پچھاڑ مار کر استاد شہ زور سٹیج پر چاروں شانے چت جا گرے۔ چشم زدن میں بگدم چچا نے پٹانے بند کا داؤں لگا کر استاد شہ زور کو معلّق بنا دیا اور ان کی چھاتی پر سوار ہو گئے۔

اسی اثنا میں بگدم چچا کے شاگرد بھی اپنے اپنے مصرع ہائے طرح پر گرہیں لگا چکے تھے۔ استاد شہ زور کی گردن اب بگدم چچا کے ہاتھوں کی گرفت میں آ چکی تھی اور استاد شہ زور کی آنکھیں اپنے جائے وقوع سے کافی حد تک باہر آ چکی تھیں۔

"ابے او ناظم کے بچے مائیک پر کا منڈی بول" بگدم چچا چھاتی پر بیٹھے ہی بیٹھے چلائے۔ ناظم مشاعرہ نے ڈرتے ڈرتے مائیک اٹھا لیا۔

"ہاں تو سامعین حضرات اب ہاں ملک کے ایسے شاعر کو زحمت سخن ..." ابھی ناظم مشاعرہ جملہ بھی پورا نہ کر پائے تھے کہ بگدم چچا بپھر گئے۔

"ابے او کیا الّول جلول بک رہا ہے۔ ٹھہر میں اس کے بعد تیری نظامت کی حجامت بناتا ہوں" ناظم مشاعرہ نے گھبرا کر خود کو سنبھالا۔

"ہاں تو سامعین حضرات اب ملک کے مشہور و معروف یکتائے روزگار شاعر حضرت پاگل جو کہ استاد شہ زور کو اپنے زیرِ زانوئے ادب لا کر ان کو تختۂ مشق سخن بنا چکے ہیں"

اب بگدم چچا نے اپنے ہاتھوں کی گرفت کو اور سخت کیا تو استاد شہ زور کی آنکھیں مزید باہر نکل آئیں اور وہ تڑپنے لگے۔

"اب بتا شعر مہمل ہے کہ الہامی۔ غالب کا چربہ ہے؟"

"حضور ذرا اپنے ہاتھوں کی گرفت تو ڈھیلی کیجیے" استاد شہ زور نے بمشکل تمام تڑپتے ہوئے کہا۔ بگدم چچا نے اپنے ہاتھوں کی

بقیہ صفحہ ۳۲ پر

احمد حسین نقشی ایڈوکیٹ (کشن گنج)

اور دھرتی کانپ اٹھی

قسط ۱۷

"حضور پاکستان ہندوستان ہو کر تو تجارت چوپٹ ہو گئی لیکن کھانے بھر اللہ دے دیتا ہے"

"یہ کیوں نہیں کہتے مولوی صاحب کہ پاکستان ہندوستان ہو کر آپ کی گوری لال ہو گئی" حسین بخش بول اٹھے۔

"اب حضور جو کبھی بندے نے تو سچ سچ عرض کر دیا ہے"

"اور اسمگلنگ؟" کشن لال نے پوچھا۔

"سرکار پولیس کے پہرے سے کون بچ سکتا ہے"

"کیوں؟ پولیس تو تمہاری بڑی مداح ہے"

"یہ سب ہوائی باتیں ہیں سرکار"

"ہوائی باتوں پر کشن لال یقین نہیں کرتا فرید میاں" کشن لال نے لہجے میں ذرا کرختگی پیدا کی۔ "مجھے ذرے ذرے کی خبر ہے۔ اب تک میں خاموش تھا کہ تم سدھر جاؤ گے مگر... تم سماج کے جسم میں ناسور ہو۔ تمہارا علاج بہت جلد کرنا ہو گا"

فرید اور تیواری دونوں کانپ اٹھے وہ دونوں کشن لال کو اچھی طرح پہچانتے تھے آج اس طرح کمرے میں ان کی طلبی یقیناً کوئی پیام روح فرسا لانے والی ہے رات کا وقت اور یہ تنہائی۔

تیواری نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی دھرما اوتار"

"اب بہت جلد سمجھ جاتے ہو" اور پھر کشن لال نے دلاور خاں کی طرف رازدارانہ انداز سے دیکھا دلاور خاں نے اشارے کا جواب اشارے سے دیا۔

فرید میاں نے کہا "دو پیسے کما لیتا ہوں لیکن لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے"

"یہ کمانے کی خوب کہی تم نے" کشن لال نے ذرا بگڑ کر کہا "تم دونوں عوام کے خون چوستے ہو"

"حضور آخر ہم لوگوں نے کیا خطا کی ہے"

"خطا؟" کشن لال نے کہا "تمہارے ظلم سے تو غریب چیخ رہے ہیں تم نے پبلک کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا ہے ایک کی جگہ دس وصول کرتے ہو اور پھر پوچھ رہے ہو کیا خطا کی ہے"

فرید نے کہا "تو ہم لوگ تجارت کرنا چھوڑ دیں"

"تو تم تجارت کے پردے میں لوگوں کے منہ کا نوالہ چھینو گے؟"

"میں نے ایسا ہرگز نہیں کیا سرکار"

کشن لال نے پوچھا "اچھا تو دیکھو تم دنیا کے تختے پر جھوٹا مظاہرہ کرتے ہو"

"حسین بخش نے تاثیر کی سودا کی چوری کے تو ایک سادہ کا بھی ہوتا ہے"

تیواری نے پوچھا "یہ پھانسی کیوں سرکار"

"اس لئے کہ تم دونوں کے نام چھوٹ گئے"

"مگر ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں حضور" دونوں بول اٹھے

کشن لال نے کہا "قصور بے قصور تو [illegible] فیصلہ کرے گی ہم لوگ تو سرکار کے نمک خوار ہیں حکومت سے غداری نہیں کر سکتے منگلو اور دلاور کہہ رہے ہیں کہ تم دونوں بھی بلوائیوں میں شریک [illegible]"

اور پھر انھوں نے دلاور سے پوچھا "دلا[illegible]

بات ہے؟"

دلاور نے کہا: "سرکار جب اللہ اکبر اور بجرنگ بلی کا نعرہ بلند ہو رہا تھا تو یہ دونوں بھی تلوار لے کر اپنی اپنی دکان سے نکلے تھے تیواری نے تو خود مجھ پر تلوار چلائی تھی وہ تو کہئے خیر ہوئی اللہ نے مجھے بچا لیا ورنہ آج میں بھی اگر مر نہیں گیا ہوتا تو زخمیوں کے ساتھ ہسپتال میں ضرور پڑا ہوتا" اور دلاور خان نے حسین بخش کی طرف دیکھا۔

تیواری بول اٹھا: "کیوں جھوٹ بولتے ہو دلاور خان!"

حسین بخش نے ڈانٹ کر کہا: "خاموش میرے برق انداز کو جھوٹا کہہ رہے ہو کھال کھنچوا لوں گا"

اور تیواری کے ساتھ فرید بھی کانپ اٹھا۔

کشن لال نے کہا: "وہ تو خیریت ہوئی بلوہ بازی میں تم دونوں کے نام دلاور اور ملنگو بھول گئے ورنہ تم دونوں بھی آج حوالات میں ہوتے مگر ابھی تک تحقیقات جاری ہے کہو تمہیں اپنی جان کیا پیاری نہیں ہے؟"

"حضور اگر کچھ ہو گیا تو میرے بال بچے بھوکوں مر جائیں گے" فرید نے گڑگڑا کر کہا۔

تیواری کی آنکھوں میں تو آنسو ہی آ گئے اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "مجھے قربان کرنے سے حضور کو کیا مل جائے گا میں ہی تو ایک کمانے والا ہوں اگر سزا ہوئی تو میرے گھر کا حال کیا ہو گا"

"سزا کے معنی تم کیا سمجھتے ہو۔ قید؟" کشن لال نے پوچھا۔

حسین بخش نے کہا: "اس دفعہ میں جیل نہیں ہے اس دفعہ میں پھانسی ہے"

فرید نے کہا: "حضور میری جان بخشی ہو جائے میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں" اور فرید کی آنکھیں پھندا دیکھنے لگیں اس کا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔

کشن لال نے پوچھا: "تم مجھے لالچ دیتے ہو نمک حرامو؟"

"..........."

پھر کشن لال نے ذرا سنجیدگی سے کہا: "موقع بار بار نہیں آتا فرید اب کرو میں تم دونوں کو پھانسی پر لٹکا ہی کے دم لوں گا دولت نے تمہارے دماغ کو آسمان پر چڑھا رکھا ہے ساری دولت دھری کی دھری رہ جائے گی لاش پر کوئی رونے والا تک نہ ہو گا بال بچے کتے اور بلیوں کی موت مر جائیں گے"

تیواری بول اٹھا: "سرکار معاف کر دیا جائے اس کے عوض جو کہیں میں کرنے کو تیار ہوں"

کشن لال ذرا دھیمے پڑے انہوں نے دیکھا دھمکی دینا کام کر گئی۔

"ہاں کچھ شرطیں ہیں تم دونوں کو چھوڑ سکتا ہوں"

دونوں بول اٹھے: "حکم ہو سرکار"

"پہلی شرط ہے لیڈروں سے اپنا رشتہ توڑ لو"

"منظور ہے"

"آج سے لیڈروں کو اپنے گاؤں میں قدم رکھنے نہ دو"

"منظور ہے"

"تم دونوں ایک ایک سو روپے منگوا اور دلاور کی جیب میں رکھ دو"

"منظور ہے"

"اور فی آدمی پندرہ سو روپے ابھی گن دو"

"یہ تو ذرا مشکل شرط ہے" تیواری نے کہا۔

"تو اپنی خوشی سے مجبوری سمجھ لو" کشن لال نے بے پروائی سے کہا۔

فرید نے تیواری سے کہا: "چوں چرا کرنے کا وقت نہیں دیکھتے نہیں علاقے میں کیا قیامت آئی ہے"

"مگر پندرہ سو روپے ابھی میں کہاں سے لاؤں"

حسین بخش بول اٹھے: "یہ دوسری بات ہے

ابھی نہیں کل سہی "

"تب منظور ہے" دونوں بول اٹھے۔

"کشن لال نے کہا " مگر کل سے یہ نہ سمجھ لو کہ میں تمہیں یوں ہی جانے دوں گا۔ ابھی پندرہ سو روپے کا ہینڈ نوٹ بنا دینا ہوگا کون جانے یہاں سے جانے کے بعد تم لوگ سیدھے گوپال کے پاس پہنچ جاؤ اور وہاں کسی وکیل مختار سے مشورہ لینے کے بعد مکر جاؤ۔ نہیں۔ ابھی تم دونوں کو سادے فلسکیپ پر اپنے انگوٹھے کے نشان اور دستخط بنا دینے ہوں گے جب جا کر پیچھا چھوڑوں گا۔

فرید اور بنواری دونوں راضی ہو گئے۔ حسین بخش نے دلاور کو اشارہ کیا وہ قلمدان اٹھا لایا۔ اس سے چھ فرد سارے فلسکیپ نکالے گئے اور تین تین پر الگ الگ دلاور نے ان دونوں کے انگوٹھے کے نشان اور دستخط لے لئے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد کشن لال نے کہا " اچھا اب تم دونوں جا سکتے ہو کل صبح آ کر روپے دے جاؤ اور ہینڈ نوٹ واپس لے لو مگر خبردار اس کا ذکر کہیں نہ کرنا ورنہ ابھی مقدمہ کھلا نہیں۔ ذرا بھی گستاخی کی تو سر کچل کر رکھ دوں گا تم لوگوں نے ابھی کشن لال کے غصے کو دیکھا نہیں "

فرید اور بنواری آداب بجا کر وہاں سے رخصت ہوئے ان کے جانے کے بعد حسین بخش نے ان کاغذات کو پھر اسی قلمدان میں بند کر دیا اور کشن لال سے پوچھا " تین تین فلسکیپ پر دستخط لینے کے معنی ؟"

کشن لال ذرا مسکرائے اور حسین بخش کے کان میں کچھ کہا حسین بخش کا چہرہ کھل اٹھا۔

حسین بخش نے دلاور سے کہا " دیکھو کھانے میں کتنی دیر ہے "

دلاور کمرے سے باہر نکلا اور پھر فوراً کمرے کے اندر آ کر کہا " حضور مولانا صاحب مولانا صاحب بیٹھک میں چپ چاپ نہ جانے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں "

حسین بخش نے ذرا سنبھل کر پوچھا " مولانا وہ کب سے بیٹھے ہوئے ہیں "

"معلوم نہیں "

"جاؤ انھیں جلد بلا لاؤ "

(باقی)

بقیہ صفحہ ۲۹ - خاتم الشعرائے ہند

کی گرفت کو قدرے ڈھیلا کیا تو استاد شہزور نے قدرے سکون کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

حضرت شیخ ابراہیم ذوق ... یہ راز ابھی ہے ... غالب تو کیا غالب کے مجلہ شارحین بھی ان کر اسکی شرح نہ کر سکے گندم چچا نے جھل کر استاد شہزور کی پیٹھ کر گئے۔ فوراً شاگردوں نے بھی اپنے اپنے مد مقابل کو چھوڑ کر گندم چچا کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا لنگی پہلوان نے مائیک پر نعرہ لگایا۔

"استاد گندم چچا "

۔۔۔ حسین نے بطور داد بیک آواز لبیک "زندہ باد"

"خاتم الشعرائے ہند" لنگی پہلوان نے پھر نعرہ لگایا۔

"زندہ باد" اور مشاعرہ کا پنڈال زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔

اور تب سے آج تک خاتم الشعرائے ہند حضرت گندم چچا حرف بہ حرف پوری آردو زبان کی حیات اور اس کے شعرا حضرات کی حیات کی جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں۔

Phone: 275602
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57
Regd. No D- (DN) 353
OCTOBER 1986

خرید کر پڑھئے
مانگ کر پڑھئے
یا پھر
چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمّل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک

قیمت : پندرہ روپے

شان دار ادبی دستاویز ہے۔ اِس میں شامل ہیں:

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
★ نادر و نایاب تصویریں۔
★ سدابہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
★ فیض کی زندگی کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔
★ ہندوستان، پاکستان، روس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہ راست ہم سے منگوائیے۔

شانِ ہند
سرور تونسوی

فون نمبر ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپرز (انڈیا) رجسٹریشن نمبر ۲۴۴۷/۵۷ رجسٹرڈ نمبر (ڈی ڈی این)

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی
دیوالی ایڈیشن

ایڈیٹر سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زرِ سالانہ -/۲۴ روپے

جلد | نومبر ۱۹۸۶ | شمارہ ۱۱

افکارِ گریزاں کا ایک ورق

ڈاکٹر حقیر آستانی

پہلو میں اپنے عالمِ گذراں لیے ہوئے
ہم پھر رہے ہیں دیدۂ حیراں لیے ہوئے

اہلِ خرد ہیں تنگیِ داماں لیے ہوئے
اہلِ جنوں ہیں دست و گریباں لیے ہوئے

وہ در بدر ہیں زحمتِ عصیاں لیے ہوئے
ہم جا رہے ہیں فرحتِ نسیاں لیے ہوئے

نظارہ کر رہے ہیں روایاتِ خام کا
ہیں ضو فگن جو عکسِ گریزاں لیے ہوئے

ظلمت کدوں میں قلب و نظر کے لیے رقاص
کون آ رہا ہے شمعِ فروزاں لیے ہوئے

رہنے لگا ہے جب سے کوئی دل کے آس پاس
اٹھنے لگا ہے درد بھی درماں لیے ہوئے

اہلِ جنوں سنا ہے کہ اہلِ خرد کے ہاں
جائیں گے آج جشنِ بہاراں لیے ہوئے

ہم جا رہے ہیں سوئے عدم اپنے شوق سے
کب تک جئیں گے عمر کا احساں لیے ہوئے

دیکھا کیے ہیں زیست کی تاریکیاں حقیر
آنکھوں میں اپنی مہرِ درخشاں لیے ہوئے

دیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چتلی قبر بنگلو جامع مسجد دہلی سے اور سرورق کے صفحات رین بو پرنٹرز بلیماران دہلی سے چھپوا کر دفتر ۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

غیر روایتی ذرائع سے بجلی
دلّی سب سے آگے

دلّی انتظامیہ ملک بھر میں پہلی انتظامیہ ہے جس نے تیار پور واقع سیفٹی رڈری لینڈ فل [illegible] سے گیس حاصل کرنے اور اس سے بجلی تیار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ لینڈ فل گڑھا یا گیا کے کوڑا کرکٹ ڈالنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

اس طریقے سے حاصل کردہ بجلی کی قیمت محض دس پیسے فی یونٹ آتی ہے جب کہ مروجہ طریقوں سے حاصل کردہ بجلی کی پیداواری لاگت ساٹھ پیسے فی یونٹ ہے۔

اگر دلّی کا سارا کوڑا کرکٹ منصوبہ بند طریقوں سے ان الگ الگ بھراؤں میں جمع کیا جائے۔ تو اس سے ہر روز قریباً ساٹھ میگا واٹ بجلی پیدا کی جا سکے گی جو کہ دلّی کی ضرورت کے آٹھ فیصد کے برابر ہوگی اس طرح سے حاصل کردہ بجلی صارفین تک پہنچانے کے لئے ڈیسو کے گرڈ میں ڈالی جا سکتی ہے۔

اس نئی اسکیم سے دوہرا فائدہ ہوگا ایک تو خلاء کی آلودگی پر قابو پانے میں مدد ملے گی جس سے ہوائی کرہ صاف ستھرا رہے گا اور دوسرے کچھ حد تک راجدھانی کے باشندوں کی بجلی کی بڑھتی مانگ کو پورا کیا جا سکے گا۔

دلّی انتظامیہ ایک اور پلانٹ قائم کر رہی ہے جس میں کھیتی باڑی سے بچے کوڑے کرکٹ اور کاغذ کے کچرے وغیرہ کا کچھ مال کو [illegible] شکل میں استعمال کر کے بجلی اور گیس پیدا کی جائے گی۔

یہ پلانٹ علی پور بلاک کے بکولی گاؤں میں قائم کیا جائے گا جہاں ایک انرجی پارک کو ترقی دی جا رہی ہے اس پلانٹ کے ذریعہ پیدا کردہ بجلی اور رسوئی گیس مروجہ بجلی اور رسوئی گیس سے کافی سستی پڑے گی۔

اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو دلّی کے دیگر مقامات پر بھی ایسے پلانٹ لگائے جائیں گے۔

دلّی اور ہماد کا سی ابھی کمرشل [illegible] دیہاتی 3 जन विकास [illegible] نے بھی لبا سپور کا ؤں میں ایک انرجی پارک سنٹر کا قیام کیا ہے۔ یہاں پر انرجی کے کچھ سے استعمال ہو سکنے والے ذرائع کے بارے میں ریسرچ کی جا سکے گی اور انرجی کے نئے نئے ذرائع کو فروغ دیا جائے گا۔ اس کے لئے دس کروڑ سے زائد روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔

بائیو گیس پلانٹ سولر چولھا الکٹرک کے چولھے ایندھن کی بچت کرنے والے چولھے سنکندر چولھے وغیرہ مختلف آلات سے پر چالا اور استعمال سے پہلے ہی ۸ میگا واٹ بجلی کی بچت ہو رہی ہے۔

اگر آپ کے پاس کسی دیگر ذریعہ سے بجلی کی پیداوار بڑھانے کے لئے کوئی تجویز ہو تو براہ کرم لکھیں۔

جگدیش چندر
چیف ایگزیکٹو کونسلر
اولڈ سکریٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۵۴

جاری کردہ:۔ ڈائرکٹوریٹ برائے اطلاعات و نشریات دہلی انتظامیہ دہلی

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

اُردو کے ہندو ادیبوں کے خلاف منظم سازش

(عتیق صدیقی نامی ایک شخص کی دریدہ دہنی)

کچھ عرصے سے اُردو کے مسلمان دانشور (جنہیں دانشور کہنا دانشوری کی توہین ہے) اُردو کے ہندو ادیبوں اور اُن کے ہمدرد مسلمان ادیبوں کے خلاف بری سازش میں سرگرم ہیں۔ درحقیقت ان اُردو دشمن مسلمان ادیبوں کو یہ ناگوار گزرتا ہے کہ بعض ہندو ادیبوں کو اُن کا حق کیوں ملتا ہے ... کا کہنا ہے ہندو ادیب اکیڈیمیوں اور حکومت کی مختلف کمیٹیوں میں صرف اس لئے شامل کئے جاتے ہیں کہ وہ ہندو ہیں ... ہم اُن ملک دشمن اور اُردو دشمن فرقہ پرست اور جاہل مطلق ادیبوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اُردو میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو ادیب ہیں ان میں اہل بھی ہیں اور نااہل بھی۔ جیسے کہ مسلمان اردو کے ادیبوں میں زیادہ تر جاہل مطلق ہیں اور ان کے چند مسلم ادیب ایسے ہیں جو صحیح معنوں میں ادیب کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ اکیڈیمیوں اور سرکاری کمیٹیوں میں کتنے ہندوؤں کو شامل کیا گیا ہے۔ کسی بھی صوبائی اکیڈیمی میں دو تین سے زیادہ ہندو ادیب نہیں ہیں جبکہ ہر صوبے میں ہندو ادیبوں اور شاعروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر دلی اُردو اکادمی کا صرف ایک ہندو ممبر ہے جبکہ دہلی میں مسلمان ادیبوں کی نسبت ہندو ادیبوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے اور پچاس لاکھ کی جو مالی گرانٹ دلی حکومت کی طرف سے اُردو اکادمی کو دی جاتی ہے وہ زیادہ تر ہندو باشندگان دلی کے دیئے گئے ٹیکسوں کی بدولت ہی نصیب ہوئی ہے۔

"شانِ ہند" نے ہمیشہ حق اور انصاف کی بات کی ہے کبھی ہندو اور مسلمان میں فرق نہیں کیا اور نہ انشاء اللہ کبھی ایسا ہوگا۔ اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ کچھ عرصے سے بعض مسلم ادیبوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے خلاف ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ مختلف جعلی ناموں سے انگریزی اور اُردو کے اخباروں میں پروفیسر صاحب کے خلاف لکھا جا رہا ہے اعتراض یہ ہے کہ پروفیسر نارنگ نے این۔سی۔آر۔ٹی کی اُردو نصابی کمیٹی میں بعض نااہل اور جاہل مطلق مسلم ادیبوں کو شامل کیوں نہیں کیا۔ اور ہندو ہوتے ہوئے پروفیسر نارنگ اس کمیٹی کے چیئرمین کیوں ہیں۔

این۔سی۔آر۔ٹی نے اُردو کی نصابی کتابیں فی الحال چھاپی۔ نویں اور گیارھویں کلاسز کے لئے شائع کی ہیں۔ چھپی ہوئی نویں کلاس کی نصابی کتابوں کے بارے میں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر گیارھویں کلاس کی نصابی کتاب کو موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا ہے اور وہ محض اس لئے کہ اس وقت گیارھویں کلاس کے لئے جو اُردو کی نصابی کتاب رائج ہے وہ ڈاکٹر قمر رئیس اور دیگر مسلمان ادیبوں کی ترتیب دی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ... ترتیب دی ہوئی گیارھویں کی متعارفہ نصابی کتاب فی الوقت رائج نصابی کتاب سے بہت بہتر ہے اس لئے یار لوگوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں اور پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کی آڑ لے کر محض دکھاوے

کی ہندوستان سے محبت اور عقیدت کا شور مچا رہے ہیں
جب کہ خود اُن کی فی الوقت رائج گیارھویں کی نصابی
کتاب میں جوش، فیض اور اقبال پاکستانی شعرا کا کلام
اور تذکرہ شامل ہے۔

اب بات حد سے گزر گئی ہے۔ ملک رام صاحب
جیسے معزز، شریف اور عظیم محقق اور ادیب کے خلاف محاذ
قائم کیا گیا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ کچھ دن ہوئے اتر پردیش
اردو اکاڈمی کا رسالہ "اکادمی" نظر سے گزرا تو اس میں
ملک رام صاحب کے خلاف حنیف نقوی نامی کسی شخص
کا ایک طویل مضمون پڑھا جس میں اس عظیم محقق پر کیچڑ
اچھالا گیا ہے۔

مدیر شانِ ہند نے یہ نام پہلی بار پڑھا تھا اس لئے
کئی ادیبوں اور شاعروں سے اس کے بارے میں دریافت
کیا گیا اور تو اور دفتر شانِ ہند میں بیرونی حضرات کی
تشریف آوری پر اُن سے بھی دریافت کیا۔ مثلاً مشہور غالب
پرست محقق جناب کالی داس گپتا رضا، جناب ہمت
رائے شرما مگر افسوس نہ۔ حنیف نقوی کے حسب نسب سے
کچھ بھی واقفیت حاصل نہ ہو سکی۔ کئی دنوں کی تحقیق
و تلاش کا جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو اتفاقاً اتر پردیش اردو
اکاڈمی کے ایک کارندے دفتری کام کے سلسلے میں دلی
آئے تو دفتر شانِ ہند میں بھی تشریف لائے۔ اُن سے
دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ یہ صاحب بنارس یونیورسٹی
میں استاد ہیں اور "شعرائے اردو کے تذکرے" کے
نام سے ان کی ایک کتاب بھی شائع ہو چکی ہے چنانچہ
اردو بازار سے یہ کتاب نہایت آسانی سے مل گئی حالانکہ
۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں دس
سال کے طویل عرصہ میں بھی اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جو معمولی
تعداد میں چھپا فروخت نہیں ہو سکا اور کتب فروشوں کے
ہاں حنیف نقوی کی اس اکلوتی کتاب کی جلدیں خریداروں
کا انتظار کر رہی ہیں۔

ایک بزرگ ادیب جو دفتر شانِ ہند میں
"اکیڈمی" میں شائع شدہ حنیف نقوی کے مضمون کو
پڑھ کر مدیر شانِ ہند سے حنیف نقوی کی دریدہ دہنی
پر بحث کر رہے تھے انھیں "شعرائے اردو کے تذکرے"
کتاب دکھائی گئی تو سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہ بزرگ
ادیب فرمانے لگے۔ بھائی آپ نقوی کو درجہ چہارم
کا ادیب بھی نہیں ہیں۔ نوکری حاصل کرنے کے لئے
جس طرح عام طور پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے
لکھے یا لکھوائے جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک تیسرے
درجے کا مقالہ ہے۔ چونکہ یہ مقالے پی۔
ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے ملازمت حاصل
کرنے کے لئے لکھے یا دوسروں سے اپنے نام پر
لکھوا لئے جاتے ہیں۔ اس لئے ممتحن حضرات اس
قسم کے مقالے منظور تو کر دیتے ہیں لیکن پابندی
لگا دیتے ہیں کہ یہ کتابی شکل میں شائع نہیں کئے جائیں
ان بزرگ ادیب کو حیرت تھی کہ اس مقالے پر اشاعت
کی پابندی کیوں نہیں لگائی گئی۔ بزرگ ادیب
فرمانے لگے شکور صاحب اس کتاب کا کوئی صفحہ ایسا
نہیں ہے جس پر دو تین تحقیقی غلطیاں نہ ہوں
۸۹۶ صفحات کی یہ کتاب ہے۔ اس کا مطلب ہے
کہ اس میں کم سے کم ۲۶۸۸ غلطیاں ہیں

عرض کیا کہ پھر آپ ایک مقالہ تحریر فرما دیجئے
فرمانے لگے کہ بھائی! میں نے زندگی بھر بڑا کام
خود کیا ہے۔ دوسروں کے کاموں سے شہرت حاصل کرنے
کی ذلیل کوشش نہیں کی۔ یہ کام لومڑیوں کا ہے
کہ وہ شیر کے مارے ہوئے شکار کو چوری چھپے کھاتی ہیں
لومڑیوں کی مجبوری یہ ہے کہ وہ خود شکار نہیں
کر سکتیں۔

پھر دوبارہ گزارش کی گئی کہ اس کتاب پر ایک
مقالہ ایسا لکھ دیجئے جو "تنبیہ الغافلین" کے طور پر
استعمال کیا جا سکے۔ بہت پس و پیش کے بعد بڑے
مہربان راضی ہوئے لیکن شرط یہ لگا دی کہ اس

طرح کا ذلیل مقالہ اُن کے نام سے نہ شائع کیا جائے۔ ہاں اگر بعد میں ضرورت پڑے تو ان کے نام کا اعلان کر دیا جائے۔

اب "شعرائے اُردو کے تذکرے" کی چند تحقیقی غلطیاں نمونۂ مشتے از خروارے مصداق ملاحظہ فرمائیے۔ تفصیلی مقالہ بہت جلد شان ہند میں ملاحظہ فرمائے گا۔

حنیف نقوی نے "شعرائے اُردو کے تذکرے" میں لکھا ہے۔

تذکروں میں اکثر ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جنھیں شاعر پست المعیار قرار دے کر اپنے کلام سے خارج کر دیتا ہے یا کسی اور وجہ سے مجموعے میں شامل نہیں ہو پاتے۔ غالب کے منسوخ کلام کا ایک اچھا خاصا حصہ اسی طرح دستیاب ہوا ہے۔ (ص ۳۹)

(حضرت مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم جو رُتبے میں اور علم میں یقیناً نقوی سے بہت کم تھے) نے جو دیوان غالب مرتب کیا ہے۔ اس میں "یادگار نالہ" کے عنوان کے تحت وہ اشعار دیئے گئے ہیں جو متداول دیوان غالب میں نہیں ہیں۔ یہ اشعار غالب کے خطوط، علائی کی بیاض، اور بعض ایسی کتابوں سے لیے گئے ہیں۔ جن کے غالب نے قطعہ تاریخ لکھے تھے۔ ایک بھی وہ شعر نہیں ہے جو کسی تذکرے سے لیا گیا ہے۔ تذکروں میں صرف وہی اشعار ہیں جو غالب کے دیوان میں موجود ہیں۔ ایسی صورت میں اتنی غیر ذمہ داری کا بیان پڑھا لکھا محقق نہیں دے سکتا۔

نقوی نے لکھا ہے کہ ولی نے ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی (ص ۱۱۰) موصوف کو اس کا علم نہیں کہ یہ بہت پرانی تحقیق ہے اور اس کی کتاب چھپنے سے چار سال پہلے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مقالے "ولی کا سال وفات" مطبوعہ جشن صد سالہ نمبر اورنٹیل کالج میگزین ۱۹۷۲ء لاہور) یہ ثابت کر دیا تھا کہ ولی کا انتقال ۱۱۳۳ھ اور ۱۱۳۸ھ کے درمیان ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب تاریخ ادب اُردو جلد اول میں اس موضوع پر دوبارہ تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ محترم و مکرم ڈاکٹر حنیف نقوی کو مالک رام صاحب کی تحقیقی غلطی کا تو علم ہے لیکن یہ نہیں پتہ کہ ولی کی وفات پر محققین کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔

ہماری بدنصیبی ہے کہ فارسی جاننے والوں اُردو ادیبوں کی تعداد دن دن کم ہوتی جا رہی ہے اور اُردو کے کلاسیکی ادب پر فارسی کے علم کے بغیر کام نہیں ہو سکتا۔ ورنہ وہ صورت ہوتی ہے جو نقوی کی کتاب میں نظر آتی ہے۔ چونکہ نقوی فارسی نہیں جانتا۔ اس لیے جہاں کہیں فارسی کا ترجمہ پیش کیا ہے وہ غلط اور بے انتہا غلط۔ اور جہاں جہاں فارسی کی اصل عبارتیں پیش کی ہیں۔ وہ غلط ظاہر ہے کہ نقوی کی سمجھ میں اصل عبارت ہی نہیں آئی۔ نقوی نے "دستور الفصاحت" کے حوالے سے لکھا ہے کہ:۔

"دہلی کے ادبی حلقوں میں اُن (خواجہ احسن الدین خاں بیان) کا کلام نہایت مقبول تھا۔" (ص ۱۲۴)

"دستور الفصاحت" کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"شاعر متین و مربوط کہ کلامش نہایت مقبول و مضبوط۔ خواجہ احسن الدین خاں بیان است"

"دستور الفصاحت" کے مصنف حکیم سید احمد علی خاں یکتا نے یہ بات صیغۂ حال میں کہی ہے جب کہ نقوی نے صیغۂ ماضی بنا دیا۔ اس سے مفہوم پر جو اثر پڑا وہ اہل علم ہی جان سکتے ہیں پھر یکتا نے بیان کی مقبولیت کو "دہلی کے ادبی حلقوں" تک ہرگز محدود نہیں کیا۔ یہ اضافہ یا تحقیقی غیر ذمہ داری اس شخص کی ہے جو مالک رام صاحب جیسے قابل

مثلاً درخت، دھوپ، پانی، مٹی اور مختلف گیسوں کے ذریعے اپنی غذا خود فراہم کرتا ہے۔ جبکہ PARASITE اس درخت کی فراہم کی ہوئی غذا پر گزارا کرتی ہے۔ اردو ادب میں ایسی کچھ بیلیں ہیں، جو دوسروں کے کام پر اعتراضات کرکے جھوٹی شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نقوی کو متنبہ کرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ انہوں نے آج سے تقریباً اٹھارہ سال پہلے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے "شعرائے اردو کے تذکرے" کے نام سے جو تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ اس میں ہزاروں غلطیوں کی بھرمار ہے۔ اسے درست کریں۔ اور اگر وہ پسند کریں تو ہمارے بزرگ یہ کام کرنے کو تیار ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی غلطیاں چھاپ کر شہرت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ بلکہ نقوی کو بھیج دیں گے۔ ہاں ان غلطیوں کے ساتھ چلو بھر پانی بھی بھیجیں گے۔ ہمارے بزرگ ادیب کا دعویٰ ہے کہ ان کی کتاب "شعرائے اردو کے تذکرے" میں اگر مکمل ہزاروں تحقیقی غلطیاں ہوں گی۔ تو وہ خود چلو بھر پانی میں نہیں دریائے جمنا میں ڈوب مریں گے۔

ہم اردو کے تمام ادیبوں، محققوں اور نقادوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس طرح کی غنڈہ گردی کے خلاف موثر اقدام کریں۔ طریقہ اس کا یہ ہوگا کہ جو شخص کسی محقق کی غلطیاں نکال کر شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرے تو خود اس کے کام کا جائزہ لے کر اسے آئینہ دکھایا جائے۔

ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اگر نقوی نے ہمارے لائق صد احترام مالک رام صاحب یا کسی دوسرے معزز ادیب کے خلاف کچھ لکھا تو ہم ان کی کتاب کا پورا جائزہ لے کر اردو والوں کو یہ بتائیں گے کہ دوسرے کے ادیب وقتی شہرت حاصل کرنے کے لئے کیسے ذلیل کام کرسکتے ہیں۔

آخر میں ایک بات اور کہنا چاہتے ہیں کہ اکیڈمی ایک سرکاری ادارے کا رسالہ ہے اس میں قیمت پر گندہ گردی اور ... کی لوٹ ... اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ہم اترپردیش کے ... یا وزیر اعلیٰ، وزیر تعلیم، اور دوسرے ذمہ داران کو خطوط لکھ کر اس ادبی غنڈہ گردی کی طرف ان کی توجہ مبذول کرا رہے ہیں۔ اکیڈمی کے رسالے کا مقصد اردو زبان و ادب کا فروغ ہے۔ اس کا مقصد ہرگز نہیں ہے کہ لوگ شہرت حاصل کرنے کے لئے انتہائی گھناؤنی اور ذلیل سازشیں کریں۔

مسیحی مشاعرہ

۲ر نومبر کو آل انڈیا کرسچین کانفرنس کے زیر انتظام ملک بھر کے مسیحی اردو شعراء کا مشاعرہ نئی دہلی میں کانفرنس کے ہال میں منعقد ہوا۔ یہ مشاعرہ گو ایک مخصوص شعری نشست کی سی حیثیت رکھتا تھا مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مسیحی مخصوص مشاعرہ اچھے اچھے مشاعروں سے کہیں بہتر تھا۔ اکثر و بیشتر شعرائے کرام کا کلام ملک کے بہترین اردو مشاعروں کے مقابلے میں رکھا جاسکتا تھا مگر افسوس ہے کہ اردو کی بقا و حیات کا دعوے کرنے والے اکثر ادارے اور آکاش وانی، دوردرشن اردو کے مسیحی شعراء سے سوتیلا سلوک کرنے میں ندامت محسوس نہیں کرتے۔ دلی اردو اکاڈمی اور اترپردیش اردو اکاڈمی اور فخر الدین علی احمد میموریل سوسائٹی لکھنؤ نے مسیحی شعراء اور ادیبوں کی کسی حد تک قدر افزائی ضرور کی ہے مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے مسیحی شعراء اور ادیبوں کو بھی ملک کے دیگر شعرائے کرام اور ادیبوں کی طرح ہی نوازا جائے۔ اس سلسلے میں ہم آکاش وانی احمد آباد کو مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں کہ اس نے ایک مسیحی اردو ادیب سے

کشمیری اور پنجابی زبان کے شعرائے کرام جمع ہیں۔ اور کیا وُنڈ میں شامیانے کے اندر سامعین کا وہ ہجوم ہے کہ تل دھرنے کو جگہ مشکل سے ملے گی۔ یہ سب اہتمام فریدیہ بزم ادب فرید آباد ڈوڈہ (جموں و کشمیر) کی جانب سے ایک کل ہند مشاعرہ بسلسلۂ قومی یکجہتی کے انعقاد کے لئے کیا گیا ہے۔ فریدیہ بزم ادب اس علاقہ کی سرگرم ادبی انجمن ہے۔ اس انجمن کی یہ پہلی کوشش ہے جو ایک کل ہند مشاعرے کی شکل میں اہل ذوق حضرات کے سامنے ہے۔ اردو، کشمیری اور پنجابی زبان کے چیدہ چیدہ اور نامور شعراء کو یکجا کرنا واقعی ایک قابل ذکر کارنامہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں اپنی طرز اور نوعیت کا یہ پہلا مشاعرہ ہے جس میں تین مختلف زبانوں کے شعراء کو ایک ہی اسٹیج پر لایا گیا ہے اور سامعین کی کثیر تعداد اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ وہ اس میل جول کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ مشاعرے کے آغاز [illegible] ہے اور [illegible] پر مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آ رہا ہے۔ مشاعرے کی صدارت منظور امام صاحب، ڈائرکٹر دوردرشن کیندر سری نگر کشمیر فرما رہے ہیں اور مہمان خصوصی ہیں جناب محمد اقبال کھانڈے ترقیاتی کمشنر ڈوڈہ۔ مہمانِ خصوصی اور صدرِ محترم کا شایانِ شان استقبال کیا جا رہا ہے۔ استقبالیہ خطبہ دیتے ہوئے جناب محمد سلیم منیر صاحب ڈوڈہ یا فرید آباد کی شعری و ادبی تاریخ پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں جناب قائد حسین صاحب جو ڈوڈہ کے پروجیکٹ آفیسر ہیں جو مائیک پر ہیں اور ایک مقامی شاعر ولی محمد اسیر کشتواڑی صاحب سے گزارش کر رہے ہیں کہ وہ اپنے مرثیے سے شاعری کا آغاز فرمائیں۔ اسیر کشتواڑی ترنم میں کشمیری زبان میں مرثیہ پڑھ رہے ہیں اور سامعین سے داد وصول کر رہے ہیں۔ مرثیہ ختم کرکے اسیر صاحب مائیک سے رخصت ہوئے تو نقیب مشاعرہ یہ شعر پڑھ کر شہدائے کربلا کی یاد دلا رہے ہیں ؎

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور اب مشاعرہ کا باقاعدہ آغاز کرنے کے لئے پروفیسر محمد اسد اللہ وانی صاحب کو آواز دی جا رہی ہے۔ اسد اللہ وانی آج کل جموں میں گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن میں پروفیسر ہیں۔ مائیک پر آکر ترنم میں اپنی غزل سنا رہے ہیں۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

ایک تم ہو جس کو چاہا ٹوٹ کر ورنہ یہاں
آج تک ہم نے کسی سے دل لگایا بھی نہ تھا

تو مجمع میں سے آواز آئی "ابھی عمر پڑی ہے"! اس فقرے پر ایک ہلکا سا قہقہہ لگا ہے۔ وانی صاحب فرما رہے ہیں

پھر وہی تاریکیاں مایوسیاں تنہائیاں
اپنی بستی میں سویرا ایسا پھر آیا بھی نہ تھا
ہم نے خود پھونکا یہاں کا خرمنِ امن و سکوں
اجنبی اس شہر میں تو کوئی آیا بھی نہ تھا

اسد اللہ وانی ان اشعار پر داد پاتے ہوئے الگ ہوئے تو مقامی شاعر محمد اسحاق درویش سے گزارش کی جا رہی ہے۔ اسحاق درویش بزرگ بھی ہیں ضعیف بھی لہٰذا لوگ انھیں سہارا دے کر مائیک پر لا رہے ہیں۔ اسحاق درویش کشمیری زبان میں اپنا کلام سنا رہے ہیں اور سامعین انھیں توجہ سے سن رہے ہیں۔ ان کے بعد پنجابی کے شاعر سرت صاحب کو آواز دی گئی۔ سرت صاحب بھی کامیاب ہو کر مائیک سے ہٹے تو شبیر بھی آئے۔ وہ بھی کچھ شعر پڑھ کر رخصت ہوئے۔ اب رسا اکر جاروی مائیک کے سامنے ہیں اور کشمیری زبان میں غزل سنا کر داد لے رہے ہیں۔ چونکہ مجھے کشمیری اور پنجابی زبان کا علم نہیں ہے اس لئے کشمیری اور پنجابی میں کلام سنانے والے شعراء کے منتخب اشعار نوٹ نہیں کر سکا بہر حال سامعین برابر شعرائے کرام کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں جس سے مشاعرہ کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے

اب عبدالقیوم آس آگئے ہیں اور تحت میں اپنی غزل سُنا رہے ہیں۔ ان کے دو شعر آپ بھی سنئے ؎

رنگ عالم کے کم نہیں بدلے ✽ آپ میرے ہی غم نہیں بدلے
روک لیتا میں اپنی نظروں کو ✽ تیری زلفوں کے خم نہیں بدلے

اب پنجابی شاعر منجیت رعنا کی باری ہے وہ بھی سامعین سے داد وصول کرنے میں کامیاب ہو گئے تو عبدالغنی بیکس کو دعوت دی گئی۔ بیکس کا یہ مطلع غنیمت رہا ؎

کوئی کہہ دے اس بُتِ گلفام سے
ہم تو بیگانہ ہوئے آرام سے

اب راجکمار چندن سے درخواست کی جا رہی ہے راجکمار چندن مائیک پر آکر تحت میں غزل سُنا رہے ہیں خاص طور سے ان کے یہ دو شعر بہت پسند کئے گئے ؎

برف میں جم رہے ہیں پاؤں مرے
بال مرے سر پہ آفتاب سہی

مجھ میں تحلیل و منتقل ہو جا
تو کوئی بیکراں کتاب سہی

اب مشاعرے کی واحد شاعرہ سرجیت سلمی سے درخواست کی جا رہی ہے۔ سرجیت سلمی پنجابی کی مقبول شاعرہ ہیں۔ سرجیت سلمی نوجوان بھی ہیں اور قبول صورت بھی۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان کا ترنم بھی خوشگوار ہے جس کی وجہ سے مشاعرے کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ سامعین ہمہ تن گوش ہو کر شاعرہ کا کلام سماعت فرما رہے ہیں اور واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور و غل سے مشاعرہ گاہ میں ہنگامہ مچا ہے۔ طویل بحر میں غزل پڑھ رہی اور سامعین سے بھرپور داد لینا سب کے بس کی بات نہیں۔۔۔ سرجیت سلمی کی غزل کا ہر شعر موجودہ دور کے مشاہدات اور تجربات کی عکاسی کر رہا ہے۔ رات کا دامن سرد ہواؤں سے نم ناک ہو رہا ہے مگر شامیانے میں ہلچل سی مچی ہوئی ہے۔ سرجیت سلمی کے کچھ شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

گئی رات تک لوگ کرتے رہے نے
سرِ عام ہوئی شرارت دا چرچا
سویرے سے ہی مڑ کے شروع ہو گئے جانے
کسی ہور سجری بغاوت دا چرچا

یہ گمنام قاتل یہ گلیاں چہ دہشت
یہ کمزور چہرے تباوت دی رنگت
یہ نظراں ہی نظراں چہ کہوں کر رہے نے
کسی بہت اچھی عمارت دا چرچا

سرجیت سلمی تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں مائک سے بہت کامیاب واپس ہو رہی ہیں۔ اب ارند کشمیری مائیک پر آکر کشمیری زبان میں اپنا کلام سُنا رہے ہیں یہ معمولی کلام کسی کو متاثر نہیں کر پا رہا ہے۔ ان کے پنجابی زبان کے شاعر مشتاق وارثی آگئے ہیں جو مالیر کوٹلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مشتاق وارثی پنجابی کے اچھے شاعر ہیں اپنے اشعار سُنا کر سامعین سے داد لینے میں مشتاق وارثی کامیاب ہو گئے ہیں۔ اب بعد ازاں شاعر ساغر صحرائی کو آواز دی جا رہی ہے۔ ساغر پہلے ایک نظم "ابو ب میں نہیں" سُنا رہے ہیں ان کی شاعری سے سامعین متاثر ہو رہے ہیں۔ نظم ختم کر چھوٹی بحر میں ایک غزل سُنا رہے ہیں۔ ان کا ترنم رنگ لا رہا ہے۔ مجمع جھوم جھوم کر داد دے رہا ہے۔ ان کے چند شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

اہل دل بیشمار دیکھے ہیں ✽ ہاں مگر اشکبار دیکھے ہم
آنسوؤں کے ہجوم ہیں سنئے ✽ حسرتوں کے مزار دیکھے ہم
ٹوٹے میں کفن جراحت کا ✽ ہم نے وہ شہر یار دیکھے ہیں
سچ کہے دیوانے ہم نے اے ساغر ✽ روز و شب سوگوار دیکھے ہیں

ساغر صحرائی مائک سے مسکراتے ہوئے اٹھ رہے ہیں۔ اب ناظم الحروف کو آواز دی جا رہی ہے صدر محترم سے اجازت لے کر پہلے میں نے یہ قطعہ پیش کیا ؎

یہ تعصب یہ تشدد کی بھڑکتی ہوئی آگ
شہر کا شہر سلگتا ہے جہنم کی طرح
کوئی تو ہوتا جو اظہارِ مسرت کرتا
عید بھی لوگ مناتے ہیں محرم کی طرح

سامعین اور شعرائے کرام نے حوصلہ افزائی فرمائی تو ایک غزل سنانے کی ہمت پیدا ہوئی۔ حسبِ معمول ترنم میں ایک غزل پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ غزل کے دو شعر جو سامعین نے پسند فرمائے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

جس جام کے پینے سے تفرقے کی بو پھیلے
ساقی ترے ہاتھوں سے وہ جام نہیں لیں گے
اندازِ تکلم میں خنجر کی روانی ہے
پہچان تو قاتل کو ہم نام نہیں لیں گے

میرے بعد مقامی شاعر اشتاق فریدی مائیک پر آ گئے ہیں۔ اشتاق فریدی کشمیری زبان میں ایک مرثیہ سنا کر جا رہے ہیں۔ ان کے بعد محمد سلیم بسمل جو ڈوڈہ کے ڈویژنل انجینئر ہیں نے مائیک پر آ کر اپنی غزل سے نوازا ہے۔ ان کے بعد جموں ریڈیو سے تعلق رکھنے والے شاعر آربتر صاحب آ گئے ہیں مگر وہ بھی زیادہ متاثر نہیں کر پائے۔ یہاں مشاعرہ تھوڑا سست ہو گیا ہے تاہم سامعین کی تعداد میں کمی نہیں ہو رہی ہے اب ناظمِ مشاعرہ جموں کے مشہور شاعر عابد مناوری سے درخواست کر رہے ہیں۔ عابد صاحب مائیک پر آ کر ارشاد فرما رہے ہیں ؎

دل میں بے چینی نہ تھی سر میں کوئی سودا نہ تھا
یہ ہے قصہ ان دنوں کا جب تمہیں دیکھا نہ تھا
ایک پل میں تم بھلا دو گے کئی برسوں کا پیار
یوں بھی ہو سکتا ہے میں نے یہ کبھی سوچا نہ تھا

غزل پرانی سہی مگر اچھی ہو تو سامعین داد ضرور دیتے ہیں۔ یہی حال یہاں بھی ہے۔ عابد صاحب اپنے رنگین و رومانی اشعار سے ماحول کو رنگین اور رومانی بنا گئے سنا رہے ہیں۔ اب دوسری غزل سنا رہے ہیں۔ اس میں بھی وہ کامیاب ہیں۔ غزل کا مقطع خوب ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

ابھی انسانیت زندہ ہے عابد
ابھی اس شہر میں کچھ جھونپڑے ہیں

عابد صاحب غزل ختم کر کے مائیک سے تشریف لے گئے ہیں۔ اب ایک اور مقامی شاعر جناب آثم صاحب کو آواز دی جا رہی ہے۔ آثم محفل کے تاثر کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے یہ شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

آنسوؤں میں بھی آتش تر ہے
ان کا پینا بھی کیسا آذر ہے
جان پر کھیل آبرو کے لئے
آب گوہر ہی جانِ گوہر ہے

آثم صاحب کے بعد ایک اور مقامی شاعر فرید احمد کو آواز دی گئی ہے۔ فرید صاحب تحت میں پڑھتے ہیں ان کے بعد ایک اور مقامی شاعر تمکین بڈانوی تشریف لا رہے ہیں جو اپنی وضع قطع سے بھی شاعر معلوم ہوتے ہیں ان کا یہ شعر سامعین نے بہت پسند فرمایا ؎

یہ نہ سمجھو کہ ذرا سا پیرہن جل جائے گا
آگ دامن کو لگی تو سب بدن جل جائے گا

اب ایک مہمان شاعر خاکد کنایت مالیر کوٹلوی سے درخواست کی جا رہی ہے۔ مائیک پر آ کر خاکد کنایت بڑے اطمینان سے اپنی غزل نذرِ سامعین کر رہے ہیں مگر ان کا کلام سننے میں اتنا محو ہو گیا کہ سوائے مقطع کے اور کچھ نوٹ نہیں کر سکا ؎

اس شہر میں صلیب تو اک اک قدم پہ تھی
خاکد مسیح تیرے سوا دوسرا نہ تھا

سامعین کے اصرار پر اپنی دوسری غزل سنا رہے ہیں اور اس میں بھی کامیاب ہیں۔ چند شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں

تتلیوں کے پر سجے البم کو اب وہ
روندتی بار بار کرنا چاہتا ہے

ہے تو وہ سرحدوں راہوں کا مسافر
سب سرحدوں کو پار کرنا چاہتا ہے
خواہشوں کے جال میں جکڑا ہوا ہے
قید سے انکار کرنا چاہتا ہے
پھر ہوا ہے مہرباں حد سے زیادہ
پھر وہ کوئی وار کرنا چاہتا ہے

[ف]الکنایت تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں داد و [ست]ائش دامن میں لئے واپس ہو رہے ہیں۔ [illegible] [تر]نم یا تحت میں کلام سنانا اور سامعین سے بھرپور داد [حاص]ل کرنا بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتا ہے اور [اب] ادب و احترام کے ساتھ کشمیر یونیورسٹی کے [illegible] [شعب]ہ [کے] صدر جناب ڈاکٹر مرغوب بانہالی صاحب کو زحمتِ سخن [دی] جا رہی ہے۔ ڈاکٹر مرغوب بانہالی کشمیری زبان کے [اچھ]ے شاعر ہیں اور مائک پر بھی کامیاب ہیں۔ اپنا کلام [خت]م کرنے کے بعد نشاط کشتواڑی کا کلام سنا رہے ہیں۔ [نش]اط کشتواڑی کسی وجہ سے مشاعرے میں شریک نہیں ہو [س]کے۔ نشاط کشتواڑی کے یہ دو شعر پسند کئے گئے ؎

عنادل میں چھڑی یہ جنگ کیا ہے
چمن کا یہ انوکھا رنگ کیا ہے
کوئی ترسے کوئی ہو مست ساقی
یہ تیرے میکدے کا ڈھنگ کیا ہے

مشاعرہ کامیابی کے ساتھ دھیرے دھیرے اپنی [منز]ل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب احترام و ادب کے [س]اتھ ڈوڈہ کے بزرگ اور معتبر شاعر محترم شوکت فریدی [صا]حب کو زحمتِ سخن دی گئی ہے۔ آپ ایک نظم سنا رہے [ہیں] "نوخیز شعراء سے خطاب"، چند شعر آپ بھی سنیں ؎

خدا سے مانگ وہ جذبِ دروں وہ سوزِ پنہانی
تنِ خاکی میں ہو بیدار جس سے روحِ انسانی
جلا ڈالے خس و خاشاک نفرت فتنہ و شر کو
تری آتش بیانی گرم گوئی شعلہ سامانی
صدائے حق سے کر ہنگامۂ دار و رسن پیدا
سنا دے قصۂ منصور کی تمہید طولانی

قبائے لالہ و نرگس شفق کا خوں فشاں منظر
[illegible] سے بخشے کربلا کا ذوق قربانی

نظم خاصی کامیاب رہی ہے اور اب جموں کے مہمان شاعر دیا رتن عاشی مائک پر آ گئے ہیں اور چھوٹی بحر میں غزل شروع کی ہے فرماتے ہیں ؎

سرخرو کب کے ہو گئے ہوتے ،، کاش پتھر کے ہم بنے ہوتے
ہم نہ ہوتے تو منزلوں کا سراغ ،، دور تک صرف راستے ہوتے

ادھر دیا رتن عاشی اپنی غزل ختم کرکے مائک سے لوٹ رہے ہیں ادھر اردو کے جانے پہچانے شاعر پرتھی پال سنگھ بیتاب کو زحمت سخن دی جا رہی ہے۔ سامعین بے تابانہ ہمہ تن گوش سن رہے ہیں۔ بیتاب صاحب تحت میں پڑھتے ہیں۔ دو شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

مٹی کے ساتھ رشتے ہمارے قدیم تھے
یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم حکیم تھے
پگڈنڈیوں کے جال نے الجھا دیا ہمیں
وہ راستے کہاں گئے جو مستقیم تھے

بیتاب صاحب غزل ختم کرکے اپنی جگہ آ گئے تو کشتواڑ کے بزرگ شاعر جناب آر الفت کشتواڑی کو زحمت دی گئی الفت صاحب کشمیری زبان میں اپنی غزل سنا رہے ہیں مگر سامعین انہیں توجہ سے نہیں سن رہے ہیں۔ ان کے بعد پنجابی زبان کے شاعر ڈاکٹر منوجیت صاحب آئے مگر وہ بھی کچھ بجھے بجھے سے دکھائی دئے۔ ان کے بعد نمیر [illegible] اور منشور بانہالی نے مشاعرے کو سنبھالا۔ دونوں کامیاب رہے اور اس سے پہلے کہ صدر محترم مظہر امام صاحب سے درخواست کی جاتی شیونا بھدرواہی صاحب مائک پر آ گئے ہیں مگر افسوس کہ میں ان کا کوئی شعر نوٹ نہیں کر سکا۔ دراصل میری توجہ بٹی ہوئی تھی۔ اسٹیج پر کچھ جانے پہچانے شعراء کلام سننے کی بجائے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ یہ فعل شعر و سخن کے آداب کے خلاف ہے۔ بہرحال [illegible] بھدرواہی غزل سنا کر مائک سے واپس ہو رہے ہیں۔ اب مختصر سے تعارف کے بعد صدر محترم مظہر امام صاحب سے التماس کی جا رہی ہے کہ وہ اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمائیں۔ اس وقت بارہ بجنے والے ہیں۔ سامعین کی تعداد ابھی بھی باقی [illegible]

"گندم چچا کا ادب برائے زندگی"

جوزف انور

علی الصبح ابھی ہم نے چائے کی پیالی مونہہ سے لگائی ہی تھی کہ گندم چچا یا اللہ کا نعرہ لگاتے ہوئے سامنے رکھے ہوئے صوفے پر آدھمکے اور اس طرح متفکرانہ انداز سے بیٹھ گئے کہ فکر تونسوی بھی دیکھ لیتے تو فکر میں پڑ جاتے۔ سوچا یقیناً حضور کا ذہن شریف پیاز کے چھلکے اُتارنے میں مصروف ہے۔

"سنو جی گندم چچا آئے ہیں ایک چائے کا کپ اور لے آنا۔"

ہمارے اس جملے پر گندم چچا جھٹ اُٹھے اور ہمیں میزبانی کا پورا حق ادا کرنے کا موقع عنایت فرماتے ہوئے بولے

"بھابھی جان چائے مت لانا۔ ایک گلاس لسی یا دودھ کا لے آنا۔"

اور جب گندم چچا دودھ کا گلاس بیگم کی دل ہی دل میں دی ہوئی صلواتوں کے ساتھ پی چکے تو ہماری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔

"اب تم ضرور ہمارا شرف نیاز بخشنے کا سبب پوچھو گے"

"جی ہاں۔ فرمایئے یہ آج صبح سویرے غریب خانے پر کیسے زحمت اُٹھانی پڑی"

ہم نے پوچھ ہی لیا۔

گندم چچا ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ "انور بھائی میرے ادبی کارہائے نمایاں سے تو تم بخوبی واقف ہو۔ پچھلے نصف صدی سے ادب پر جو جمود طاری تھا وہ تو میں نے توڑ دیا ہے۔ اظہر من الشمس ہے کہ رہتی دنیا تک نہ سہی مگر جب تک میر و غالب کا نام زندہ رہے گا خاکسار کا نام نامی و گرامی بھی تابندہ رہے گا بلکہ میرے قیاس سے تو سال چھ مہینے زیادہ ہی چلے گا۔"

"یقیناً" ہم نے لقمہ دیا۔

گندم چچا پھر پیاز کے چھلکے اُتارنے لگے

"بھائی میاں اب میں ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کی جانب اپنا زورِ بازو صرف کرتا ہوں۔ میں ادب برائے زندگی کو بطور پیشہ اپنا رہا ہوں۔"

"ادب برائے زندگی کا پیشہ تو ہماری کئی شاعرات پہلے ہی سے اپنائے ہوئے ہیں۔"

ہم نے لقمہ دیا

"یار تم طفل ناداں کب تک رہو گے؟ بہرکیف کل اخبار دیکھ لینا۔" اتنا کہہ کر گندم چچا تو چلے گئے اور پیاز کے چھلکے اُتار گئے صبح جو اخبار آیا تو اس میں گندم چچا کا یہ اشتہار پڑھ کر واقعی دم بخود رہ گئے۔ کہ

مشاعرے بازوں کے لئے نادر و نایاب موقع

مناسب حق محنت کے عوض انجمن پہلوانان سخن کی خدمات حاصل کر کے اپنے مشاعرے کو لال قلعہ کے مشاعرے کی طرح بھی کامیاب بنایئے۔

ہماری انجمن کی امداد مندرجہ ذیل امور کے لئے حق محنت پر حاصل کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً

(۱) صبح کی اذان سے قبل سامعین کو پنڈال سے کھسکنے نہیں دینا۔

(۲) مدعوئین شعراء حضرات کو وقتِ معینہ پر بنفس لا کر ڈائس پر بٹھا دینا۔

(۳) شراب سے دھت شعرا حضرات کا نشہ با

"ہاں بل تو کہا ہے" ہم نے انتہائی بے کسی کے عالم میں کہا۔

ٹھیک ہے تو چچا جان اگر آپ کو ہماری خدمات کے کشف و کرامات کا امتحان ہی لینا ہو تو ترسوں کا اخبار دیکھ لینا۔ یہ کہہ کر گندم چچا چلے گئے۔

کل ہند طرحی مشاعرہ کے سلسلے میں مشاعرہ نے چونکہ گندم چچا کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں لہٰذا برقی قمقموں سے [illegible] کر شعرا حضرات کے جوتے چپلیں سب تڑپنے سے تھے۔ آج ہماری بیگم بھی خواتین کی پہلی صف میں صف آرا تھیں۔

مصرع طرح تھا۔

ع رفتہ رفتہ اُن سے بھی ہم کو کدورت ہو گئی

پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ملک کے ممتاز شعرا مع انجمن پہلوانانِ سخن کے شعرا حضرات ڈائس پر بیٹھے تھے۔ گندم چچا صدر محترم کے پہلو میں بیٹھے تھے۔

مشاعرہ شروع ہونے والا تھا۔ انجمن پہلوانانِ سخن کے والنٹیر حضرات بھی اپنا اپنا مورچہ سنبھال چکے تھے اچھے سے اچھے ترنم باز شعرا حضرات پر مناسب حق محنت والے ساعت لے جا رہے تھے جب ہمارا نام پکارا گیا تو گندم چچا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ مطلع ہی سے داد کے میلے کا میلہ لگ گیا۔ ہوتا یہ کہ ہمارے شعر کے ختم کرتے ہی گندم چچا سبحان اللہ کا نعرہ لگاتے ظاہر ہے ایسی ہی میں [illegible] عافیت کی سلامتی تھی۔ ہمارے حوصلے بھی بڑھ چلے تھے۔ ہم نے جب گرج کر یہ شعر پڑھا ۔

اُف جلالِ عشق کی وارفتگی کا یہ کمال
جو حسیں چہرہ نظر آیا محبت ہو گئی

"جلالِ عشق" کو دہراتے ہوئے گندم چچا نے کچھ ایسا فلک شگاف نعرہ لگایا کہ لرزتے ہوئے سامعین ہی گندم چچا نے اپنے سینے پر دو ہتڑ مارے اور جلالِ عشق جلالِ عشق کے ورد کے ساتھ سینہ کوبی کرتے ڈائس پر تڑپنے لگے۔ سامعین میں سے کسی نے کہا انور [illegible]

ان کی حرکت قلب بند ہو جانے کا خطرہ ہے۔

ادھر پنڈال کے گیٹ پر تعینات رما دین پہلوان کو بھی جو زندگی میں پہلی ادبی کارگزاری کی جو سوجھی تو وہ کبھی سبحان اللہ ۔ جلالِ عشق ۔ زلالِ عشق کا نعرہ لگاتے ہوئے سامعین کے بیچ میں کود کر لوٹنے لگے۔ مشاعرہ میں کہرام مچ گیا آدھے سے زیادہ سامعین رما دین پہلوان کی لوٹن سے گھبرا کر پنڈال سے بھاگ گئے۔ اُدھر گندم چچا کے لوٹنے میں آکر کئی بزرگ شعرا حضرات ڈائس سے نیچے گر چکے تھے۔

شعر کو دہراتے ہوئے جب ہم بھی بے حال ہو کر حال کھیلنے ہی والے تھے تو گندم چچا یا اللہ، یا اللہ کہتے ہوئے [illegible] بیٹھ گئے اور ہچکتے ہوئے بولے

"حرام زادو ٹھنڈے پانی کا گلاس لاؤ اور جب ان کی [illegible] لڑکھڑاتے ہوئے مائیک پر آکر کپکپاتی ہوئی آواز میں بولے۔

"مصرع طرح پر انور صاحب کے اس شعر سے بہتر شعر تو آج تک کوئی کہہ سکا ہے نہ کبھی کہہ سکے گا۔ [illegible] کی اس حاصلِ مشاعرہ غزل کے بعد اب کسی [illegible] شاعر کا کلام سننا تو حماقت ہو گی لہٰذا میں [illegible] صاحب کو ان کی اس حاصلِ مشاعرہ غزل پر مبارکباد دیتے ہوئے اس مشاعرہ کو یہیں ختم کرتا ہوں [illegible]

دوسرے دن کے اخبارات میں جلی حروف میں [illegible] تھا۔

"انور صاحب کی حاصلِ مشاعرہ غزل سے کل ہند طرحی مشاعرہ کا خاتمہ۔"

ہندی اکادمی دلّی

ہندی دِوس کی بار دِک بدھائی اور شبھ کامنائیں

اکادمی کی اہم خدمات اور حصول

(۱) اعزازات۔ انعامات۔ وظائف اور مالی امداد وغیرہ وغیرہ

- ادیبوں کو اعزازات: گیارہ ادیبوں کو اعزاز دیا گیا
- ادبی تخلیقات پر انعامات: پچیس تخلیقات پر انعام دیا گیا
- ابھرتے ہوئے قلمکاروں کے لئے انعامی مقابلے: ستائیس ابھرتے ہوئے قلمکاروں کو انعام دیا گیا۔
- ریسرچ اسکالروں کیلئے وظائف: دلّی کے ادب / لوک ادب پر دس ہزار روپے ہر سال
- ادیبوں کی مالی معاونت: پندرہ ادیبوں یا ان کے پسماندگان کو مالی امداد دی گئی۔
- طالب علموں کیلئے انعامات: چودہ طالب علموں کو انعامات دیئے گئے
- چھوٹے اخبارات و رسائل کی سرپرستی
- بچوں کیلئے دلکش ادب کی سرپرستی
- یوا پرتبھاؤں کی کھوج
- پرکاشن سہیوگ: پندرہ تخلیقات پر

۲۔ ادبی مذاکرے۔ سیمینار۔ مباحثے کوی سمیلن وغیرہ

تعلیمی سیمینار۔ ترجمہ سیمینار۔ آچاریہ ہزاری پرساد دویدی سیمینار، کبھانجلی، سمند رڈاکٹر راجندر پرساد جنم شتابدی جیابا، ہندی ٹیچرس کانفرنس سنسکرت سیمینار ہندی زبان کے کارکنوں کی کانفرنس ہندی؛ اور قومی ایکجہتی و دیا گوشٹھی ساہتیہ اور سوبار و سنگوشٹھی بھاشا بھارتی یوجنا کے تحت لسانی و جذباتی یکجہتی اور ساہتیہ ایک سو بارہ کے پوشٹ آور وکاس کیلئے کاریہ کرموں کا آیوجن ماسک سماہتیکی کاریہ کرم ہندی دوس اور پکھواڑے کا آیوجن ہندی کی بیس لگنت (۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۵ء تک کی مدت کے لئے دولیہ ملیار) من کوی سمیلنوں کا آیوجن) یوم جمہوریت پر قومی کوی سمیلن کے علاوہ راشٹریہ ایکتا و چیتنا کے سلسلہ میں؛ یکتا کے سور، چیتنا کے سور اور لہرتا کے سور، عنوانات پر اہم کوی سمیلن) نئے اور نوجوان پرتبھاوان کویوں کے لئے ابھرتے سور یوا کوی منچ راشٹر کوی میتھلی شرن گپت جنم شتابدی سمارودھ کے موقعہ پر راشٹریہ کوی سمیلن۔ یوم آزادی کوی سمیلن۔ انٹرویو اور موضوعاتی مباحثے

(۳) پستکالیہ و پرکاشن

حوالہ جاتی کتب خانوں اور دارالمطالعوں کا قیام۔ شعری انتخاب "جیوتی کلش" نوجوان ادیبوں کی انعام یافتہ تخلیق "اگنی کرمیں" ہزاری پرساد دویدی سیمینار کا مجموعہ "یوا درشن سمرتی سنکلن"، دلی ساہتیہ کاروں کی ڈائرکٹری ہندی سیوکوں وغیرہ کا اہم

(۴) دیگر مختلف

ہندی کے پرچار پرسار کیلئے ملے جلے اور معاون پروگراموں کا آیوجن۔ بھاشا کاریہ شالاؤں (ورک شاپوں) کا آیوجن وغیرہ۔

ڈاکٹر نارائن دت پالیوال
سکریٹری ہندی اکادمی دلی
۲۶/۲۷ سلائٹ انشورنس بلڈنگ
آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ٹیلیفون: 733950

بچوں کی لوک کلا

بی. رویندرن نائر

دہلی میں ہو رہے قومی ثقافتی میلے میں بال دوس یعنی بچوں کے دن کی خصوصی اہمیت ہے۔ اس موقع پر میلے میں متعدد موضوعاتی پروگراموں کے ذریعہ بچوں میں میلے میں اشتراک کا احساس پیدا کیا جائے گا۔ انھیں فن کاروں و اہلِ حرفہ کی دنیا سے متعارف کرایا جائے گا۔

انسانی ذہن کی پُراسرار کارکردگی خطوط، رنگوں اور شکلوں کے چونکا دینے والے ذریعے سے زندہ ہو جاتی ہے جنھیں ملا کر فن یا لوک کلا کا نام دیا گیا ہے۔ تاریخ کے مختلف مراحل میں ہر ملک میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ شاعری کی مانند فن بھی وقت اور خود فن کار یا فن کارہ کے ان کے خیالات عقائد اور جمالیاتی احساسات کو گرفت میں لے کر ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ ہر تخلیق اور اصل فن میں فرد کی چھاپ نظر آتی ہے۔

ایک پروان چڑھ رہے بچے پر والدین دوستوں رشتہ داروں قدرت اور تفریح کی اشکال کے اثرات پڑتے ہیں۔ اثر قبول کرنے والی طفولیت کی عمر میں دیومالائی قصے کہانیاں اور لوک فنون کی شکل میں بیان کردہ تاریخ بچے میں تجسس کا مادہ پیدا کرتی ہے اور وہ ہر چیز کے بارے میں جاننے کا خواہشمند رہتا ہے۔ یہ مواقع اس کی ذہانت کو جلا دیتے ہیں اور ان سے اسے فہم یا سماج کا جو پہلا ذائقہ حاصل ہوتا ہے وہ الیکٹرانک ذرائع ابلاغ سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

ایک بچے کے لیے فلم یا ٹیلی ویژن پروگرام ایک وقتی تفریح ہے لیکن کسی لوک کلا کے مظاہرے کی یاد اس کے ذہن میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

ان کے گرد و پیش کی دنیا جس میں وہ پروان چڑھتے ہیں کس طرح بھرپور طور پر ان پر اثر انداز ہوتی ہے اس

کی شکل بھوپال میں کچھ بچوں کی بنائی ہوئی تصویروں سے ملتی ہے جو ابھی تک تاریخ کے بدترین صنعتی المیے کے ڈراونے خواب کے تحت زندہ ہیں۔ کیڑے مار دوائیں تیار کرنے والے کارخانے کے نواحی بستیوں کے قریب پچاس بچوں کو جو بارہ برس سے کم عمر کے تھے۔ کاغذ اور رنگدار پنسلیں دے کر کہا گیا کہ وہ کسی بھی چیز مثلاً درختوں، جانوروں، سڑکوں، کھڑکیوں یا کھیتوں، کاروں، آسمان، پھولوں، مردوں یا عورتوں کی تصویریں بنائیں۔ ان بچوں نے عظیم المیہ کے ٹھیک ایک سال بعد جو تصویریں بنائیں ان کے ذریعہ انھوں نے ایک برس پہلے کی تاریک رات کی تصویر کھینچ کر رکھ دی جس نے چند گھنٹے ہی میں بھوپال کو ایک بڑے قبرستان میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

بھوپال کی تباہی نے ان کے ناپختہ ذہن پر ایسی دیرپا خراشیں چھوڑ رکھی تھیں کہ انھوں نے ہسپتالوں کی تصویریں کھینچیں جو کلفت درد اور دکھ سے بھرپور تھے جہاں ڈاکٹر بھاگے پھر رہے تھے۔ اور مریض لمبی قطاروں میں انتظار کر رہے تھے۔ ایسی تصویریں بھی تھیں جن میں ملوں میں سے گیس نکل رہی تھی گیس کے بادل بن رہے تھے اور بادل لوگوں کا پیچھا کر رہے تھے۔ سڑکوں کی تصویریں تھیں جو مرتے ہوئے مرد عورتوں اور بچوں سے بھری پڑی تھیں۔

اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بچے اظہار کے کسی ذریعہ کے متلاشی ہیں۔ ایک بچے کی تصویر کشی کی قابلیت کے ابتدائی دور میں بچے کی پوری جسمانی، جذباتی اور ذہنی نشوونما کی بیش قیمت کلید ہوتے ہیں۔ جب آپ بچے کے ہاتھ میں پہلی بار چاک تھماتے ہیں اور وہ دیوار فرش یا اخبار پر کوئی نشان بناتا ہے اس لمحے سیدھی وہ آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتا رہا ہوتا ہے جو وہ شاید کسی اور ذریعہ سے نہیں بتا سکتا۔

وہ کچھ بیان کرنا نہیں چاہتا بلکہ ان کا مقصد اپنے آپ کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ بچے خطوط کھینچ کر اپنے آپ کا اظہار کرتے ہیں اور بالغوں کی دنیا ان کے لئے یہ کر سکتی ہے کہ وہ بچے کو چاک کوئلہ رنگدار پنسلیں بہت سے کاغذ اور دوسرا سامان مہیا کرے۔

لوک کلا کا جادو

لوک کلا کی دنیا کی ہر بچے سے فوری اپیل ہوتی ہے اور لوک کلاؤں کے ذریعہ کا، تحریری مواد کی نسبت بچے پر کہیں زیادہ اثر ہوتا ہے۔ لوک کلاؤں کے ذرائع میں کئی نوعیتیں جیسے کہ لوک تمثیل، لوک گیت لوک رقص اور لوک تصویریں شامل ہو سکتی ہیں۔ بچے رام لیلا کے میلے میں راماین کے لوک کھیلوں میں جو دیہات وغیرہ میں پیش کئے جاتے ہیں اثرات قبول کرتے ہیں وہ انھیں ان پورے ڈراموں کے دوران مبہوت رکھتے ہیں اور وہ رات گئے تک جاگتے رہتے ہیں اور یہ کھیل دیکھتے رہتے ہیں۔

لیکن ایک بچے کے لئے پتلیوں کے تماشے سے زیادہ دلکش کوئی اور چیز نہیں ہوتی جو فن کی ایک قدیم شکل ہے اور بھارت کے مختلف حصوں میں اب بھی زندہ ہے۔ اسی لوک کلا کی بے پناہ صلاحیت آج بھی برقرار ہے حالانکہ کہیں زیادہ طاقت ور ابلاغ کے ذرائع اس دنیا میں داخل ہو گئے ہیں۔ راجستھان کی کٹھ پتلیوں کے ڈراموں میں رومان اور جنگ و جدل سے بھرپور جو واقعات دکھائے جاتے ہیں بچے ان میں بہت جاتے ہیں۔ کٹھ پتلیاں انھیں اکبر اعظم کے دربار کی شان و شوکت یا راجہ امر سنگھ راٹھور کی لڑائیوں کے دور میں لے جاتی ہیں۔

راجستھان کی کٹھ پتلیاں قریب دو فٹ لمبی ہوتی ہیں۔ ان کے سر بڑی خوبصورتی سے لکڑی میں سے تراشے گئے ہوتے ہیں جن پر بڑی بڑی آنکھیں ہوتی ہیں ان کے پاؤں نہیں ہوتے اور انھوں نے صرف لمبے گھاگھرے پہنے ہوتے ہیں جن سے ان کی حرکت میں لہر پیدا کی جاتی ہے۔ ان کے ہاتھ مشکل سے حرکت میں آتے ہیں کیونکہ وہ کپڑے کے بنے ہوتے ہیں اور ان میں جوڑ نہیں ہوتے۔

لیکن تامل ناڈو کی کٹھ پتلیاں کہیں زیادہ رنگین اور دلکش ہوتی ہیں بچے انھیں دیکھنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جاتے ہیں لگے رہتے ہیں۔ یہ پتلیاں قریب تین فٹ لمبی ہوتی ہیں وہ بہت اچھی تراشی گئی ہوتی ہیں۔ ان کے ملبوسات بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور وہ زندگی کے حیران کن انداز سے بھارت ناٹیم کے رقص کر سکتی ہیں۔ انھیں بوما لاٹم کے نام سے پکارا جاتا ہے جہاں تک بچوں کا تعلق ہے بوما لاٹم کے ذریعہ ان کی پرانوں راماین اور مہابھارت کے بارے میں واقفیت میں اضافہ ہوتا ہے جو انھیں دادی اماں سے ملی ہوتی ہے۔ عالم اور تربیت یافتہ پتلیوں والے ماضی کے مناظر میں جان ڈال کر بچوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح آندھرا پردیش میں تولو بومالاٹا اور بنگال میں پتلی گھر ہیں جو کرشن کے بچپن یا رزمیہ داستانوں کے قصوں کے رنگین موضوعات سے بچوں کو مسحور کر دیتے ہیں۔

گیتوں سے تحصیل علم

لوک گیت جو ایک کے بعد دوسری نسل کو ورثہ میں ملتے ہیں جو بچوں کو اپنے آبائی گرد و پیش سے

آگاہ رکھتے ہیں اور ان میں اپنی مخصوص وراثت کے بارے میں فخر کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ لوک گیت ہماری لوک وراثت کا ایک عظیم حصہ ہیں

گیت، موسیقی کی مانند بچوں کو تسکین دیتے ہیں انھیں خوش کرتے ہیں اور زندگی کے گرم و سرد کو آسانی سے برداشت کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اس سے ہمیں موسیقی سے بچوں پر طاری اثرات کا جائزہ لینے کا موقع ملتا ہے۔ کیا کوئی شخص ان لوریوں کے اثرات کو بھلا سکتا ہے جو ایک والدہ اپنے بچوں کو سلاتے وقت گاتی ہے۔ موسیقی انسان کے وجود میں موجود ہے جو اس میں تحریک پیدا کرتی ہے۔ اس میں طاقت اور مضبوطی پیدا کرتی ہے۔ ایک بچہ بھی موسیقی کے اثر سے متاثر ہوتا ہے اور جب موسیقی اپنا سکون بخش اثر اس پر چھوڑتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ موسیقی خوشی دیتی ہے اور اس طرح سُروں کا جو میلاپ پیدا ہوتا ہے اس کا داخلی انسان پر اثر پڑتا ہے۔

خوشی کا مقام ہے کہ آج اسکولوں اور بال بھون جیسے اداروں میں لوک کلاؤں کو پھر سے زندہ کیا جا رہا ہے اور وہاں بچوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ ان فنون کو سیکھیں اور ان میں حصہ لیں اسکولوں کی سالانہ تقریبوں میں بچے رنگا رنگ کی پوشاکیں پہن کر ملک کے مختلف حصوں کے لوک ناچ پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح بال بھونوں میں بچے بچوں کی نشوونما کے لئے آزادی تخلیق اور برجستگی کا ماحول مہیا کیا جاتا ہے جہاں لفاظی کتابوں کی بیڑیوں کے بغیر ان کی تجرباتی اور اختراعی قوتوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ ایک بال بھون میں بچہ ایک جذباتی کے احساس اور کتابوں کے علم سے بالاتر آگاہی کے ساتھ سوال کرنے کا ہنر سیکھتا ہے۔

لوک کلا انسان کی داخلی قراداری اور گرد و پیش کی زندگی کے آزادانہ اظہار، زندگی اور ثقافتی

جانب اس کے رویے اور اس کے اعتقاد اور سادگی کی علامت ہیں۔ یہ ایک عظیم خزانہ ہے جو صدیوں سے ہمارے حوالے کیا جا رہا ہے اور ہم اسے پھر سے زندہ کر کے اور محفوظ رکھ کر بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ بچوں کے لئے یہ خزانہ بھارت کے عظیم ثقافتی وراثت کی جھلک مہیا کرتا ہے۔

بقیہ :- مشاعرہ دوڈرہ

اچھی خاصی ہے منظر امام مائیک کے سامنے ہیں۔ کلام سنانے سے پہلے سازگار ماحول بنانے کے لئے تمہید فرما رہے ہیں۔ اور جب یہ کہہ گئے کہ سامعین کلام سننے کے موڈ میں آ گئے ہیں تو متفرق اشعار سنانے لگے ہیں۔ چند اشعار آپکی ضیافت طبع کے لئے حاضر ہیں ؎

بے آب آئینے بھی تھے بے لباس تھے
دُنیا بہت اُداس تھی جب ہم اُداس تھے

بے سراب جسم و جاں ہی تو اُٹھا لے جائے گی
زندگی مجھ سے خفا ہو گی تو کیا لے جائے گی

ہم نے شب بھر اک تجھ کو جو دُعا دی ہے
میں نے بھی چراغوں کی لَو اور بڑھا دی ہے

اپنی ہی یادوں کی ابر سیہ رِدا لے جائے گا
میرے گھر تک بھی وہ آئے گا تو کیا لے جائے گا

اور کیا رکھا ہے میرے پاس لے جائے گا اب
میرا قاتل آئے گا میری دُعا لے جائے گا

خاصی داد پانے کے بعد سامعین کی پُر زور فرمائش پر ایک نظم سنا رہے ہیں جس کا عنوان ہے "گمشدہ جسموں کا درد" اس میں بھی منظر صاحب کامیاب ہیں۔ آخر میں ایک مؤثر حمد سنانے کے بعد منظر امام صاحب تالیوں کے شور میں مائیک سے رخصت ہوئے۔

اس طرح یہ مشاعرہ رات کے بارہ بجے اختتام کو پہونچا۔ ماشاء اللہ دوڈرہ اور اطراف کے لوگ شعر و سخن کا صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں مشاعرے کے اختتام تک بھی سامعین کی کثیر تعداد موجود رہی۔ مشاعرہ بہت کامیاب رہا جس کے لئے نوجوان بزم ادب [illegible] دوڈرہ کے تمام اراکین مبارکباد کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

افسانہ

مذہبی بیچارہ

ڈاکٹر اُدے سرن آرمان بلاروی

حکیم صاحب نے محمد علی کو رائے دی کہ وہ اپنے مفلوج لڑکے کو روزانہ ایک جنگلی کبوتر کا گوشت کھلایا کرے حالانکہ وہ ایک اچھے ڈاکٹر کے زیرِ علاج تھا تاہم اس نے حکیم صاحب کی رائے بھی مان لی اس کے اصطبل میں جنگلی کبوتر وافر تعداد میں بسیرا کئے ہوئے تھے۔ محمد علی اصطبل میں آہستہ آہستہ داخل ہوا۔ روشن دان میں دو کبوتر سڑک کی طرف منہ کئے ہوئے بیٹھے تھے۔ یہ دونوں باپ بیٹے تھے۔ کبوتری باہر چلی گئی تھی۔ ایسے بیٹھی ہوا کھا رہی تھی کبوتری دن کے وقت گھونسلے میں رہنے کے خلاف تھی۔ کیونکہ گھونسلے میں آرام ملتا ہے اور آرام غفلت کو جنم دیتا ہے دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ دشمنوں نے ہمیشہ دوسرے فریق کی غفلت ہی کا فائدہ اٹھایا ہے کبوتری یہ سب کچھ اپنے کبوتر اور بچے کو سمجھاتی رہی اور ثبوت میں ظہورِ آدم سے لے کر شومتی اندرا گاندھی تک کی مثالیں دیں کہ کس طرح کسی متوقع خطرہ کو نظر انداز کرنا کس قدر اذیت ناک ہو سکتا ہے مگر ان دونوں باپ بیٹے پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ محمد علی نے سایہ کی طرح پیچھے سے ہاتھ بڑھایا اور ایک دم پنجہ پھیلا کر دونوں کو دھر دبوچا۔ آج کبوتر کو کبوتری کی بات یاد آئی مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا کبوتری چیخی چلائی اور غٹرغوں غٹرغوں کرتی رہ گئی۔ بیچاری چڑیا تو تھی نہیں جو حملہ کرکے چھڑا لیتی۔ دوسرے کبوتر پھڑپھڑا کر اڑ گئے۔

"اب کیا ہوگا؟" ایک ہاتھ میں گرفتار بیٹے نے دوسرے ہاتھ میں گرفتار باپ سے سوال کیا کبوتر نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا "یہ کٹر مسلمان ہے یعنی مذہبی آدمی ہے بہت شریف ہے سینکڑوں کبوتر اس کے اصطبل میں سالوں سے بسیرا کئے ہوئے ہیں اس نے آج تک کسی کو نہیں ستایا اس کا نام محمد علی کتنا پیارا ہے مسلمانوں میں اس سے بڑھیا نام اور کوئی نہیں ہو سکتا حضرت علی حضرت محمدؐ کے داماد تھے۔ دونوں فرشتہ سیرت انسان تھے کیا ان کا کوئی وصف اس میں نہیں ہوگا اور کیا ان کی طرح یہ رحم دل نہیں ہوگا؟"

"تم نے ماں کی بات پر یقین نہیں کیا اور ایک آدمی کی بات کا یقین کر رہے ہو۔ جو آدمی آدمی کا خون بہانے سے نہیں چوکتا وہ تمہیں بخش دے گا" یہ سنتے ہی محمد علی کے دماغ میں ہابیل اور قابیل سے لے کر ہٹلر کے دور تک کے تمام خونی واقعات گھومنے لگے۔ اپنی تعریف سن کے اسے خوشی ہوئی تھی وہ اڑنچھو ہو گئی۔ اور محمد علی سوچنے لگا کہ کبوتر صحیح کہتا ہے کہ اشرف المخلوق یعنی آدمی کے ہاتھ میں گیتا، وید، پران، بائبل اور قرآن کے ہوتے ہوئے بھی ظلم کی تلوار انہیں کے ساتھ رہی ہے یہ انسان نہ بن سکا جبکہ تمام مذاہب کا عندیہ بھی یہ ہے کہ اُس کے ماننے والے انسان بنیں۔ محمد علی طرح طرح کی باتیں سوچ رہا تھا کہ کبوتر نے اپنے بچے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بیٹے آدمی آدمی کا خون کبھی نہیں کرتا۔ بلکہ مذہب سے ناواقفیت اور تنگ نظری اس خون خرابے کی مرتکب ہوتی ہے ایک بار حضرت علی کے سامان میں دکاندار کے یہاں سے ایک چیونٹی بھی آگئی انہوں نے اس کو وہیں پہنچا دیا کیونکہ ان کے خیال کے مطابق وہ اپنے خاندان سے بچھڑ گئی تھی۔ کسی کو اس سے جدا کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ حضرت علی کا یہ خیال ان کی رحم دلی کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ کیا ان کے نام لیوا ان کی تعلیم پر عمل نہیں کرتے ہوں گے؟ ان کی طرح رحم دل نہیں ہوں گے؟"

"اس طرح دھوکے سے پکڑ کر لے جانے سے تو کوئی

ایسی بات ظاہر ہوتی نہیں ہے۔ اس نے نوجوان بچہ
کو ہم کو ہمارے خاندان سے جدا کر دیا۔ بیٹے نے
مشکوک انداز میں کہا " ہو سکتا ہے یہ ہمیں اپنے گھر
میں پالنا چاہتا ہو۔ ہمارے پنکھوں سے نکلی ہوئی
ہوا نزلے کے لئے مفید ہوتی ہے۔ ہم شانتی کے دوت ہیں۔
چٹھی رسانی بھی کرتے ہیں ہم سے کبھی کسی کو کچھ نقصان
نہیں پہنچا ہے۔ اس کے برعکس طوطا کی بلا ہے سارا
کنبہ اس کو بڑے لاڈ پیار سے رکھتا ہے وقت پر دانہ
دنکا پانی وغیرہ دیتا ہے اور ہوا بارش گرمی دھوپ سے بھی
حفاظت کرتا ہے جب کہ طوطا ہر پرندہ سے زیادہ نقصان
دہ اور بے وفا ثابت ہوا ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا یہ کھیتوں
میں سرسوں کی پھلیاں، تل کا گھڑا، ہری مرچیں، چنا، مٹر، آم، امرود
وغیرہ سبھی کچھ کتر کتر کر کھا لیتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ
کاٹ کاٹ کر زمین پر گرا دیتا ہے اس طرح یہ کسان اور
قوم دونوں کا بڑا دشمن ہے بے وفا اتنا ہے کہ چالیس سال
سے پنجرے میں پرورش پاتے ہوئے بھی کھڑکی کھلتے ہی پھر
ہو جاتا ہے اور پھر کبھی ہاتھ نہیں آتا ہے۔ جو انسان
ایسے ظالم اور بے وفا طوطے کو پالتا ہے کھلاتا سکھلاتا ہے
دیکھ ریکھ کرتا ہے وہ ہمیں کیوں ستانے لگا ہے ہم نے
تو کبھی کسی کو کوئی نقصان ہی نہیں پہنچایا۔"

" آدمی نے ہمارے ساتھ ظلم ہی کیا ہے۔ وفاداروں
اور شریفوں ہی کو ستایا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے۔" بیٹے نے
ریمارک کسا اور دونوں نے ایک بار پھر ۱۸۵۷ء کے غلام
ہندوستانیوں کی طرح آزاد ہونے کے لئے پر پھڑپھڑائے
مگر محمد علی نے انگریزوں کی طرح گرفت اور بھی سخت کر لی جس
سے دونوں کو سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔ اب دونوں خاموش
اور مایوس ہو گئے تھے جیسے کسی بادشاہ کے حملے اور طوفان
کی آمد سے پہلے فضا میں خاموشی سی چھا جاتی ہے بیٹے
کا ریمارک محمد علی کے دماغ میں پیہم ضرب کاری کرنے لگا۔
اور وہ سیاسی دنیا کی چالوں پر غور و خوض کرتا ہوا کمرہ
میں داخل ہوا۔

" دو کبوتر کیوں پکڑ لائے؟" بیگم نے دیکھتے ہی سوال کیا
" کل کو مجھے انکم ٹیکس افسر کے یہاں دعوت میں شراب
بھجوانی ہے۔ اس کے لڑکے کی سالگرہ ہے۔ انکم ٹیکس کمشنر
بھی آ رہے ہیں۔ انہیں میں یہ دو پکڑ لایا ہوں کام کو
انجام دینے۔"

" بیٹے نے شراب؟ کیسے لوگ پینے دیتے ہیں۔ الحفیظ"
" پولیس افسر اور انکم ٹیکس والے اور سرکاری کے کام فری میں
ہوتے نہیں۔ یہ ادھر پیسے دیتے تو تجھے ہی کیوں کچھ کسی او
سے نہ منگا لیتے۔ مگر اتنی [illegible] بات پر چونک گئیں لالا
چونچ لال کو تو سادہ مرغے کا کر دیتے ہیں۔ جس طرح کمزور
آدمی پولیس سے، غریب لوگ حاکم سے، فقیر اللہ سے
ہیں اسی طرح امیر انکم ٹیکس افسر سے ڈرتا ہے۔" یہ کہتے
ہوئے محمد علی نے ایک کبوتر بیگم کی طرف بڑھایا۔
" لیکن ایک آدمی ایسا ہے جس سے سبھی ڈرتے ہیں"
بیگم نے سوالیہ انداز میں کہا " بدمعاش سے؟" محمد علی نے
جواب دیا۔ بیگم مسکرائی اور بولی نہیں میرے سوال کا
جواب صحیح نہیں ہے شیڈولڈ کاسٹ سے سب ڈرتے ہیں
ایک برہمن کو برہمن، جاٹ کو جاٹ، تیلی کو تیلی، کمہار
کو کمہار کہہ دیجئے کچھ نہیں ہوگا لیکن چمار کو چمار اور بھنگی
کو بھنگی کہنے پر نوکری اتر جائے گی۔ پتہ ہے ایک ڈپٹی
شیڈولڈ کاسٹ آ گیا تھا اس نے تمام لوگوں کی ناک
میں دم کر دیا تھا بڑا ہی انتقامی رویہ تھا اس کا" کبوتر
ہاتھ میں لیتے ہوئے بیگم نے کہا۔
" آزاد طبع ہونا اور آزادی کے صحیح معنوں میں آشنا
ہونا بڑی دیر میں آتا ہے۔ نالیوں میں بہتا ہوا گندہ انسا
خون اس بات کا شاہد ہے کہ ان نادان اور مذہبی جنون
کے مارے ہوئے چند لوگوں کو تو کیا پورا ملک جس کو ۴۰
سال آزاد ہونے کو آ رہے ہیں آزادی کا معنی اور آزادی
کا اصل مقصد نہیں جانتا۔" چاقو پر دھار لگاتے ہوئے
محمد علی نے جواب دیا۔ محمد علی کو چاقو پر دھار لگاتے ہوئے
دیکھ کر بیٹے نے باپ سے کہا " اب تم ضرور ملک سے [illegible]

یں نہ تو حضرت عمرؓ جیسی رحمدلی نظر آتی ہے اور نہ
رت علیؓ جیسی مہربانی" یہ تو وقت بتائے گا کہ یہ کیسا
ال ہے لیکن میں اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ
بوں اگر مذہبی انسان بن جائے تو اس سے کسی کا کوئی
ان نہیں ہوگا۔ یہاں مذہب ہماری جان بچانے
مدد گار ثابت ہو سکے گا مجھے اس پر بالکل یقین نہیں ہے
ری دیر میں ہم دونوں کا سر دھڑ سے الگ ہو جائے گا۔
واللہ دیکھ رہا ہے کہ دونوں بے گناہ موت کے منہ میں
نے والے ہیں۔ جب وہ ہی ہماری مدد نہیں کر رہا تو
ب کیا مدد کرے گا۔ یہاں بھلے کا انجام بھلا نہیں ہوتا
ہم نے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا نالیوں میں
موے کھانے کے بیکار ٹکڑے کھیت کھلیانوں میں
ربکھرے پڑے اناج کے دانے ڈھونڈ کے کھا کر ہم
ن جیتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ یہ انسان طوطے
یسے نقصان دہ ظالم بے وفا پنچھی کو تو پالتا ہے اور ہم
ہے بھولے بھالے پرندوں کو مار کھاتا ہے اگر دنیا میں
یا ہی ہوتا رہا تو یہ دنیا جلدی تباہ و برباد ہو جائے گی۔
علوم بھگوان کیوں چپ ہے وہ کیوں مدد نہیں کرتا کوئی
ضاف نہیں کرتا" اس طرح کہہ کر بیٹا چپ ہو گیا۔
مد علی نے چاقو تیز کر کے کبوتر کی گردن پر چلانے کے لئے
گے بڑھایا۔ اس وقت بیگم کے ہاتھ میں گرفتار
ے نے چاقو کی طرف اپنی گردن لمبی کر دی تاکہ اس کے
پ کی جگہ محمد علی اس کی گردن پر پہلے چاقو چلائے۔
یگم کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑوانے کی کوشش نہیں
۔ چاقو دیکھ کر ہر ایک ڈر جاتا ہے۔
جان بڑی پیاری چیز ہے مگر کبوتروں کا خوشی
رشی قربان ہونے کا منظر دیکھ کر محمد علی پل بھر کو ٹھہر
یا اور بولا "تم دونوں اپنی اپنی گردنیں کیوں بڑھا رہے
ہو؟ کیا تم کو مرنے سے ڈر نہیں لگتا۔ تمہیں تکلیف کا
احساس نہیں ہوتا؟"
"ہم بھی آدمی کی طرح مرنے سے ڈرتے [illegible]

نے کہنا شروع کیا "مگر میرے ساتھ میرے باپ کا قتل
ہوتا رہے اور میں دیکھتا رہوں یہ کتنی بری بات ہے
اگر میں اپنے باپ کی جان بچانے سے مجبور ہوں تو ان
سے پہلے مر تو سکتا ہوں۔ دھرم کے لئے مرنا اور ظلم کے
خلاف لڑنا ہی تو مذہب کا عین منشا ہے"۔
"اور تمہارا کیا خیال ہے" محمد علی نے باپ سے پوچھا۔
"میرا بھی ایسا ہی خیال تھا۔ میرے پاس انسان جیسا
دل نہیں ہے وہ تو اپنے بیٹے کی گردن پر چھرا بھی چلا سکتا
ہے اندر آنا بھی مگر میں تو اپنے بیٹے کا قتل بھی اپنی آنکھوں
سے نہیں دیکھ سکتا"۔ یہ سنتے ہی محمد علی دل و دماغ کی
آزمائش میں الجھ گیا۔ بیگم کے دماغ میں بھی خلیل اللہ اور
راجہ موردھج کی کہانیاں گھومنے لگی۔ اور آج جمعرات ہے
آن واحد میں بیگم کے دماغ میں ایک مذہبی نکتہ ابھرا اور اس
نے محمد علی کا ہاتھ پکڑ کر کہا "آج جمعرات ہے یہ مذہبی عقیدہ
ہے کہ جمعرات کے دن شکار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ روحیں اس
دن طرح طرح کا روپ دھارن کر کے دنیا میں گھومتی ہیں اور
خدا کے بندوں کا جائزہ لیتی ہیں۔ کیا پتہ یہ خاموش کبوتر
بھی ہمارا امتحان لینے والے ہوں"
محمد علی کو بات جچ گئی اور اس نے اپنے ہاتھ کا کبوتر
(مَن لا یَرحَم لا یُرحَم) جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم
نہیں کیا جاتا) آیت پڑھ کر اڑا دیا اس کے فوراً ہی
بعد بیگم نے بھی (الدینُ النصیحۃ) (دین غمخواری کا
نام ہے) پڑھ کر اپنا کبوتر بھی اڑا دیا۔ باپ بیٹے دونوں
آزاد ہو کر تار پر بیٹھی سلامتی کی دعا کر رہی کبوتری کے پاس
جا بیٹھے "تمہاری جان کس نے بچائی؟" باپ نے فخریہ
انداز میں بیٹے سے سوال کیا۔
"بھگوان نے" بیٹے نے ماں کی طرف سرکتے ہوئے
جواب دیا۔
"نہیں! مذہبی عقیدے نے!" یہ سنتے ہی کبوتری
دونوں کے درمیان آکر بیٹھ گئی جیسے وہ اس معمہ کی بابت
تفصیل سے معلوم کیا چاہتی تھی۔

غزل

حضرت طالبؔ شاہ آبادی
حیدرآباد

رہوں گا جا کے ویرانوں کے اندر
بہت لوٹا گیا شہروں کے اندر

ملی غیروں میں وہ جنسِ مروّت
جسے ڈھونڈا کیے اپنوں کے اندر

ریاکاری، بہانے، بے وفائی
نکل آیا جو تھا یادوں کے اندر

بڑے باہر سے ستھرے اور اُجلے
بھری ہے گندگی جسموں کے اندر

نمک چھڑکو، ہزاروں بار چھڑکو
مگر جھانکو کبھی زخموں کے اندر

ہُوا معلوم دل پر چوٹ کھا کے
سمندر بند تھا آنکھوں کے اندر

بہت باہر گھٹا ساون کی برسی
ہمیں بیٹھے رہے کمروں کے اندر

سنبھل کر ان میں پیسہ ڈالیے گا
بہت سوراخ ہیں جیبوں کے اندر

مجھے کاغذ کی ناؤ نے ڈبویا
میری میراث تھی لوگوں کے اندر

نئی تہذیب شاید جنم لے گی
خرابوں میں نہیں، غاروں کے اندر

گپھاؤں میں جسے ہم کھوجتے تھے
ملا بھگوان وہ لوگوں کے اندر

ہُوا ظاہر یہ اُس کے بولنے سے
چھپا ہے آدمی باتوں کے اندر

میاں بیوی مشینیں بن گئے ہیں
محبت مر گئی دونوں کے اندر

مسیحا آج بھی بے خانماں ہے
مسیحی بند ہیں گرجوں کے اندر

ہُوا رازِ محبت فاش طالبؔ
کبھی چھپتی ہے بو کلیوں کے اندر

یہ غزل کل ہند مسیحی مصنفینِ اردو کے سالانہ مشاعرہ منعقدہ ۲ نومبر ۱۹۸۹ء بمقام دہلی پڑھی گئی

از ڈاکٹر خاور ہاشمی

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی ہمارے ان اکابرین ادب میں شامل ہیں۔ جنھوں نے اپنی پوری زندگی اردو کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی لیکن جن کی خدمات کا اعتراف اس طرح نہ ہوسکا یہ ہماری بے حسی ہے کہ علامہ کیفی کی ہمہ جہت شخصیت تاریخ ادب میں صحیح مقام نہیں پاسکی۔ کیفی صاحب کی عظیم الشان خدمات کے پس پشت [illegible] نسبت کا وہ جذبہ کارفرما تھا جو اردو کے لیے ہمیشہ ان کے دل میں موجزن رہا۔ ان کے سامنے کوئی [illegible] تھا۔ [illegible] منفعت کوئی سماجی مرتبہ کی یا شہرت و عزت کی خواہش نہ تھی۔ ایسے بے لوث خادم اردو کے ساتھ یہ بے انصافی ایک طرف تنقیدی ادب کی محرومی و بے مائیگی اور دوسری طرف اردو دنیا کی [illegible] کی دلیل ہے۔

کیفی صاحب کی شخصیت اور ان کی خدمات کے بارے میں ان کی زندگی میں چند مقدموں اور تعارف کے سوا کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ ان کی وفات (۱۹۵۵ء) کے بعد بھی چند مضامین مالک رام، عرش ملسیانی، دیا ناتھ مست کاشمیری اور ڈاکٹر شوکت سبزواری [illegible] نوسندی کے قلم سے نکلے اور رسالہ تحریک اور آج کل اور شانِ ہند دہلی میں بھی شائع ہوئے۔ یہ مضامین اکثر تاثراتی ہیں۔ انتقال کے فوراً بعد کا زمانہ یوں بھی تاثراتی ہوتا ہے تجزیاتی دور بعد میں آتا ہے ایک مختصر سی کتاب ۱۹۵۹ء میں [illegible] زندگی تاجور سامری کے قلم سے نکلی اور شائع بھی ہوئی [illegible] میں کسی قدر شرح و بسط کے ساتھ اور منطقی نقطۂ نظر سے کیفی صاحب کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے یہ کتاب بہر حال نقش دل کی حیثیت رکھتی ہے یہ فرض کفایہ ادا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ لیکن اس سے علامہ کیفی کا وہ حق ادا نہ ہوسکا جو اردو والوں پر اور خود کتاب کے مصنف پر عائد ہوتا تھا۔ اس کتاب میں تاجور سامری نے علامہ کیفی کے ساتھ اپنی شخصیت کو بھی ابھار کر سامنے رکھا ہے۔ اس کتاب کے بعد اس موضوع پر کسی نے بھی قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ امید تھی کہ مالک رام صاحب کے قلم سے علامہ کیفی کی زندگی ان کے عہد اور کارناموں پر کوئی مبسوط کتاب منظر عام پر آسکے گی۔ لیکن ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

علامہ کیفی کی ولادت ۱۸۶۶ء میں اور وفات ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ یہ دور اردو زبان و ادب کی ترقی و توسیع کا دور تھا۔ اردو نظم و نثر عروج کے اس نقطے تک پہنچے جہاں سے آگے اب تک ایک قدم بھی نہ بڑھ سکا یہ دور تحریکوں اور انقلابوں کا دور تھا۔ ہماری زندگی اور ادب میں فیصلہ کن انقلاب اور اہم ترین مرحلے اسی زمانے میں آئے۔ سرسید اور ان کے عظیم رفقاء کی وجہ سے اردو زبان و ادب نے ہماری زندگی اور سماج کے ترجمان اور نقیب کی حیثیت اختیار کی۔ اردو نظم و نثر مقصدیت اور زندگی کے سود و زیاں سے آشنا ہوئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب نئی تہذیب روایات ہماری مشرقی زندگی کی اعلیٰ قدروں کے ساتھ ادب میں جگہ پا رہی تھی نئی زندگی اور نئے نقطۂ نظر کے ساتھ نئے خیالوں کی نئی اور زندہ اردو نثر اور اردو شاعری کی جان و ایمان بنتی جا

کھیں۔ اُردو ادب میں حقائق و جذبات کی توسیع کے ساتھ زندگی کے نئے اور زیادہ سنجیدہ و پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے علاوہ جن بزرگوں نے زبان کی تعمیر و تشکیل جدید پر خصوصی توجہ صرف کی۔ ان میں علامہ کیفی کا نام سرفہرست ہے۔

کیفی صاحب ایک بسیار گو شاعر تھے۔ بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے تھے۔ جن میں دل سے زیادہ دماغ کی کاوش اور جذبے و وجدان سے زیادہ عقل و خرد کی کارفرمائی شامل ہوتی تھی ان کے ضخیم مجموعۂ کلام "واردات" میں اصناف سخن کے تمام نمونے نظر آتے ہیں۔ مناظر قدرت۔ قومی آزادی۔ حُب وطن، حسن و عشق اور فلسفہ و تصوف کے مضامین ان کی شاعری کے موضوع بنے۔ اُردو شاعری میں آزاد نظم کا باوا آدم راشد کو کہا جاتا ہے لیکن ان سے بہت پہلے علامہ کیفی کے ہیئت کے نئے تجربے ملتے ہیں۔ انھوں نے بے قافیہ اور آزاد نظمیں لکھی ہیں۔ کیفی صاحب نے ایک طویل مسدس "بھارت درپن" بھی لکھی جس میں اہل ہند اور خصوصاً اہل ہنود ان کے مخاطب ہیں۔ یہ مسدس سراسر انھوں نے حالی کی مسدس مدوجزر اسلام سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ لیکن کیفی کی "بھارت درپن" کو مسدس حالی کی طرح مقبولیت عام حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ اس میں نہ تو حالی کا سا زور بیان اور جوش و خروش تھا۔ اور نہ اس کے پس منظر میں عظیم ماضی کا وہ شدید بلکہ کربناک احساس تھا۔ جو مسدس حالی کی تخلیق کا سبب بنا۔

علامہ کیفی کی شاعری کا اصل کارنامہ ان کی مثنوی "سنجوگ بیتی" ہے۔ اس مثنوی کی کہانی اور کردار ہمارے سماج اور زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں یہ مثنوی اپنی بحر۔ انداز بیان فن اور ادبی چابکدستی کے اعتبار سے اُردو کی بڑی بڑی مثنویوں کے ہم پلہ ہے۔ تقسیم ہند کے بعد اُردو دنیا میں جو افراتفری اور نفسی نفسی کا عالم ہوا تو اس میں اتنا ہوش کسی کو کہاں تھا کہ اس طرف توجہ ہوتی۔ علامہ کیفی کا آخری مجموعۂ کلام "چند نظمیں" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ کیفی صاحب کو اپنی زندگی میں ہی اس کا شدید احساس تھا کہ انھیں بحیثیت شاعر وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی شاعری کو دانستہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں ان کے تحقیقی مضامین ان کی شاعری سے کم تر حیثیت اور اہمیت رکھتے تھے۔ مالک رام کے نام ایک خط میں یوں رقم طراز ہیں:

"میں دیکھ رہا ہوں کہ ٹھیک اس موقع پر ان کے شاگرد۔ (کچھ موقعے ہیں) مقالے لکھنے کے لیے "منشورات" اور "کیفیہ" کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں یہ کتابیں میرے بعد کچھ نہ کچھ مدت تک زندہ رہیں گی۔ مگر ایک شاعر کی حیثیت سے میرا جو کام ہے اس کی جانچ ابھی تک کسی نے نہیں کی۔ یا تو لوگ "واردات" کی "ضخامت" سے مرعوب ہو کر رہ جاتے ہیں یا میرے اجتہادات اور خدمات کو قابل قدر نہیں سمجھتے" لیکن جن لوگوں نے ان کی شاعری کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے جانتے ہیں کہ مجموعی طور پر ان کی شاعری کا رنگ اور مزاج تقلیدی اور روایتی ہے۔ شاعری میں وہ کوئی اپنی منفرد راہ نہیں بنا سکے۔ وہ کسی طرز خاص کے نہ موجد تھے نہ مقلد۔ تاجور سامری کا خیال ہے کہ ان کی علمیت اور فضیلت میں شبہ کسے کو ہو سکتا ہے مگر ان کی شخصیت کا تجزیہ وہ سائنسی اور عقلی نتیجہ نہ بن سکے جو زمانہ ساز یا تاریخ ساز کہلاتے ہیں۔ انھوں نے سماج اور سیاست کو دور سے ایک اداس تماشائی کی طرح دیکھا۔

اسی لیے وہ ہمیشہ آورد سے کام لے کر ہر موقع پر قلم برداشتہ طویل نظمیں لکھتے رہے اور عام طور سے ان کا کلام سپاٹ اور بے لطف رہا۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے وہ صرف ایک بار ۱۸۸۹ء میں منعقدہ

کانگریس کے جلسے میں لبطور ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔
البتہ وہ بعض صنفی اور ادبی تحریکوں کے محرک تھے
چونکہ ان کی زبان دانی مسلمہ ہے اس لئے ان کے
یہاں ایک شعر بھی بے معنی اور بیکار نہیں ملتا لیکن
تاثر، جوش، روانی کا فقدان نمایاں ہے خیال کی
ندرت اور جذبے کی شدت سے شعر عبارت ہے
لیکن اجزائے شعری کی تلاش کیفی صاحب کی شاعری
میں بے سود ہے۔ ان کی شاعری دلوں کو نہ گرما سکی۔
اسی لئے مقبولیت عام سے محروم رہی۔ شعر گوئی میں وہ
دل سے زیادہ دماغ سے کام لیتے رہے۔ اس کمزوری
کا احساس انھیں آخری عمر میں ہو گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ کیفی کو زندہ رکھنے والی چیز
ان کی وہ ٹھوس خدمات ہیں جو اردو کی تشکیل کے لئے وہ
عمر بھر کرتے رہے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا یہ خیال صحیح
ہے کہ وہ شخص جس نے پرانے دور کی اندھی تقلید، زبان
زبان کے سنگ بند تصور اور لسانی پاکبازوں کی
سخت گیری، کٹرپن اور دقیانوسیت کے خلاف جہاد
کا علم بلند کیا اور لسانی سطح پر اردو کو جدید دور کی عقلیت
پسندی اور آزاد خیالی سے روشناس کرایا اور اسے
عربی فارسی کے جبر و تشدد سے آزاد کرانے اور زبان
کی حیثیت سے آزاد مقام دلانے میں بھرپور کوشش
کی وہ کیفی اور صرف کیفی تھے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ کیفی نے اردو کو
سلیس اور عام فہم بنانے کے لئے جد و جہد کی اور وہ
عربی فارسی کے ثقیل الفاظ اور تراکیب کے استعمال کو
ناپسند کرتے تھے لیکن حیرت ہے کہ خود ان تحریروں
میں انھوں نے اپنے نظریات کا عملی ثبوت نہیں دیا۔
عربی فارسی کے عام الفاظ اور تراکیب جو اردو میں مستعمل
تھے ان سے وہ اپنا دامن نہ بچا سکے۔ نارنگ صاحب کا
یہ کہنا بھی درست نہیں کہ اردو کو عقلیت پسندی اور
آزاد خیالی سے روشناس کرانے والے صرف کیفی صاحب

تھے۔ یہ کارنامہ سرسید کی اصلاحی تحریک کا ہے جس کے
اثر سے زبان و ادب ہی نہیں ہماری زندگی کا کوئی شعبہ
نہیں بچ سکا۔ علامہ کیفی بھی اردو کو سلیس اور عام فہم
بنانے کی تبلیغ و تلقین کرتے رہے۔ یہ ضروری بھی تھا اس کے
بغیر اردو کا بحیثیت زبان جو بھی حشر ہوتا وہ تو ہوتا ہی اردو
میں ادب العالیہ کے تخلیق کے سوتے خشک ہو جانے کا خطرہ
بھی تھا۔ بڑی شاعری عوام سے خود زندگی حاصل کرتی ہے۔
علامہ کیفی کا خیال تھا کہ جس تحریر میں قاموس یا شبد کوش کی
ضرورت پڑے اسے اردو نہیں کہہ سکتے۔

وہ چاہتے تھے کہ اردو میں صرف ہندوستانی مزاج
کی جلوہ گری ہو۔ اس کے دامن میں مانگے کے سہرے موتی
دیکھنا انھیں گوارہ نہ تھا۔ فرماتے تھے کہ ہم کو اردو زبان
کی ترقی کے لئے جس طرح کیلاش اور بنارس جانے کی ضرورت
نہیں۔ اسی طرح قاہرہ اور طہران جانے کی بھی ضرورت نہیں
عربی فارسی کے بعض وہ پرانے الفاظ بھی اردو میں رائج تھے
جن کا مفہوم ضرورت زندگی کے مطابق خود ان زبانوں
میں بدل چکا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں عربی فارسی کے جدید
رجحانات اور اجتہادات سے بے خبری کے باعث پرانے
الفاظ اپنے قدیم مفہوم کے ساتھ رائج رہے۔ یہ صورت حال
اردو کی ترقی کے لئے سازگار نہیں تھی اور کیفی صاحب کو اس
کا احساس تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے روزمرہ کے بعض الفاظ
اختراع کئے۔ یہ الفاظ اگرچہ مستعمل نہ ہو سکے۔ لیکن اس سے ان
کی جودت طبع کا ثبوت ضرور ملتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو میں
ضرورت اور وقت کے مطابق نئے الفاظ اور تراکیب کا اضافہ ہوتا
جس سے یہ زبان ہماری سماجی و معاشرتی زندگی کے ہر شعبہ
کی صحیح نمائندگی کا فرض ادا کر سکے۔ زبان کے زندہ رہنے
اور ترقی کرنے کے لئے ایجاد و اختراع سے کام لے کر زبان کی
توسیع ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"متاخرین اردو ان سے بڑھ کر معاصرین نے یہ سوچا کہ وہ
جو اور زبانوں کے لغات اندھا دھند لئے جاتے ہیں۔ ان کا
نتیجہ کیا ہوگا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ پچھلے پچاس برس میں اردو

میں ایک لفظ، ایک مرکب یا ایک محاورہ بھی وضع یا اختیار نہیں ہوا۔ بزرگوں کی کمائی کہاں تک ساتھ دے گی۔ زبان کا تصریفی اور اشتقاقی عمل معطل ہو رہا ہے۔ یہی حالت رہی تو یاد رہے یہ تعطل مستقل صورت پکڑ جائے گی۔

ہماری زبان آنے والے دن بھیک کا کاسہ ہاتھ میں لیے اور زبانوں کے دروازے پر الکھ جگاتی پھرا کرے گی۔ لنگڑے تانگے کی خوشباشی اور قرض پر دھوم دھام کو قبول نہیں کرتے۔

علامہ کیفی کا خیال تھا کہ ہم اردو کے واحد اور آخری مالک نہیں ہیں وہ اسے ایک جدی جائیداد سمجھتے تھے جس کی ملکیت ہم پر ختم نہیں ہوگی۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو جس حالت میں ہمیں ملی ہے ہم اس سے بہتر حالت میں اپنی آئندہ نسلوں کے سپرد کر جائیں۔ ان کی نثری تصانیف "کیفیہ" اور منشورات کے ہر صفحہ پر ان کا یہ جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ روداد اور لکھنے کے موضوع پر بھی ان کی توجہ ادب سے زیادہ زبان پر مرکوز رہی ہے۔

علامہ کیفی ان بزرگوں میں سے تھے۔ جنہوں نے اردو کے مزاج کو سیکولر بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا وہ اردو میں ایسے الفاظ، تراکیب اور تلمیحات کے استعمال کو پسند نہیں کرتے تھے جن سے غیر ملکی فضا بنتی ہے اور جن کا رشتہ کسی سطح پر مذہبی عقائد و تصورات سے ملتا ہے۔ اسے محض انتہا پسندی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آج اردو سے زیادہ وسیع النظر اور سیکولر اور کوئی زبان نہیں ہے اور یہ امتیاز اردو کو اسی جذبے اور رجحان نے عطا کیا ہے جس کے حامل کیفی صاحب بھی تھے۔

کیفی صاحب ادب و زندگی میں انقلاب، اصلاح و ترقی کے خلاف نہیں تھے۔ لیکن مشرقی زندگی کی اقدار بہرحال انھیں عزیز تھیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: "میں بھی مشغول اور عمر بھر کا پروردہ ذوق چاہے کچھ بھی ہو۔ ترقی و آزادی اور ترمیم و اصلاح کا ہمیشہ حامی اور موافق رہا ہوں۔ انتہا پسندی میرے مسلک اور ادبی نظریات میں ہمیشہ نفرت رہی ہے قاعدہ اور آئین جس طرح معاشرت

کا جزو اعظم ہے اسی طرح ادب میں بھی جاری ہے۔ جو لوگ زمانے کے ساتھ چلنا اور انقلاب کے ساتھ بدلنا پاپ اور کفر سمجھتے ہیں۔ ان کو ہمیشہ بدلتی دنیا میں سانس لینے کا حق نہیں۔ ہاں اصل اصول اور معاشرت کے ذاتی جوہر فنا کرنا انتہائی فعل ہوگا۔ کیفی صاحب زبان و ادب میں گروہ بندی کے سخت خلاف تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ہماری نظریاتی جنگ میں زبان و بیان کے اصل جوہر فنا ہو جائیں۔ وہ زمانے کی شدت اور لاثانیت کے نتیجے میں یہ ہرگز گوارا نہیں کرتے تھے کہ فصاحت و لطافت سلاست و کیفیت کی جگہ جدلیاتی نظریہ، جاگیردارانہ نظام پر دلداری اور بورژوا سماج کو دے دی جائے۔

علامہ کیفی کی زندگی اور عمل میں بعض تضادات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مذہب کو ناپسند کرتے تھے اور سیکولر کردار کے حامی تھے۔ وہ مذہبی رسومات اور روایات کی عمر بھر پابندی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ مولوی بھی کہلاتے تھے۔ وہ اردو زبان کے شیدائی تھے لیکن اردو کے نام کے لیے لڑنا ایک ہٹ دھرمی تھی، کیونکہ ان کے خیال میں اس نام کی کوئی زبان ملکی زبان نہیں ہو سکتی۔ وہ اردو کے رسم الخط کو ناقص سمجھتے تھے اور اس سے مطمئن نہیں تھے۔

علامہ کیفی، بابائے اردو مولوی عبدالحق کے رفیق کار رہے لیکن اردو کے مستقبل سے مایوسی ان کے ذہن سے دور نہ ہو سکی۔ بہرحال یہ تضاد بھی اس معاشرے کا مزاج تھا جس کے وہ پروردہ تھے۔

علامہ کیفی کی علمیت اور ادبی اجتہادات سے انکار ممکن نہیں ان کے تحقیقی اور علمی کارنامے ایسی اہمیت اور افادیت کے حامل ہیں جنہیں نظر انداز کرنا ہماری محرومی ہوگی۔

کیفی صاحب ایک اچھے شاعر اور اعلیٰ درجے کے مترجم تھے انھوں نے تحقیق و تدوین کے میدان میں بعض ناقابل فراموش کام کیے ہیں ان کا درجہ بہرحال ہماری ادبی اور تہذیبی زندگی میں بہت بلند ہے تقسیم ہند کے بعد جن بزرگوں نے دہلی میں اردو کو بچائے رکھا علامہ کیفی انہی میں سے ایک تھے۔ ان کے ذکر و فکر کے بغیر ہماری ادبی تاریخ نامکمل رہے گی۔

مہاراشٹر اُردو اکاڈمی بمبئی کی سرگرمیاں

مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کے نئے بورڈ نے پروگراموں میں تیز رفتاری کا ثبوت دیا ہے۔ گزشتہ دنوں کئی اچھے اچھے پروگرام منعقد کیے گئے۔

۱۹ ستمبر ۱۹۸۶ء کو اکاڈمی کے نئے بورڈ کا پہلا اجلاس منعقد کیا گیا۔ جس میں اکاڈمی کے آئندہ تین برسوں کے لئے تجاویز منظور کی گئیں۔ تجاویز میں اُردو ملن، اُردو سبھا کے علاوہ امکان، انعامات، انسائیکلوپیڈیا، اُردو کانگریس، آڈیو ویڈیو، اُردو میلہ اور [illegible] کے لئے پلان پاس کئے گئے۔ اور پرانی اسکیموں کے طریقہ کار پر نظرِ ثانی کی گئی۔

۳۰ ستمبر ۸۶ء کو ساہتیہ سبھا کے دربار ہال میں افتتاحی جلسہ منعقد ہوا۔ وزیر اعلیٰ شنکر راؤ چوہان نے صدارت فرمائی۔ اور گورنر مہاراشٹر ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے افتتاح فرمایا۔ وزیر اعلیٰ شنکر راؤ چوہان نے اکاڈمی کے پروگراموں کے لئے اپنی ہر ممکن امداد و تعاون کا یقین دلایا۔ آپ نے اُردو اور مراٹھی ادب کے شاہکاروں کو دونوں زبانوں میں منتقل کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور فرمایا کہ اُردو مراٹھی کے امتزاج سے ایک خوبصورت ادب تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ گورنر ڈاکٹر شرما نے بمبئی کو اُردو کا ایک اہم مرکز بتاتے ہوئے کہا کہ اب یہ بمبئی والوں کا فرض ہے وہ اس شیریں زبان کی ترویج و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اور حکومت کو بھی چاہئے کہ وہ اُردو کے فروغ کے لئے ہر ممکن کوشش کرے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ اُردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دینا احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔ مسلمانوں نے اس ملک کی آزادی کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اور تحریکِ آزادی میں اُردو زبان کے مؤثر اور نتیجہ خیز کردار کو فراموش کرنا نادانی ہے۔ اُردو کسی کی میراث نہیں اور یہ اپنے بل پر زندہ رہی اور زندہ رہے گی۔

۱۸ اکتوبر کو اکاڈمی کی جانب سے ادبی نشست اُردو ملن کا اہتمام کیا گیا۔ سلام بن رزاق اور انور قمر نے تازہ ترین کہانیاں سنائیں۔ عبدالاحد ساز نے غزلیں اور نظمیں پیش کیں۔ بعد ازاں ان تخلیقات پر مباحثہ ہوا۔ جس میں [illegible] واصل، عبداللہ کمال، علاؤالدین جینابڑے، اسلم خان، یعقوب راہی، آتما رام، ڈاکٹر [illegible] انصاری اور دیگر حاضرین نے حصہ لیا۔ صدارت ممتاز افسانہ نگار سریندر پرکاش نے فرمائی۔

۹ اکتوبر کو باندرہ ہائی اسکول میں اُردو سبھا کے تحت اُردو غزل [illegible] مباحثہ ہوا۔ صدارت ممتاز مراٹھی ادیب اور صحافی دنکر ساکیکر نے فرمائی۔ ممتاز شاعر مجروح سلطانپوری نے غزل کے فن پر جامع تقریر کی اور موجودہ عہد میں غزل کی ضرورت پر زور دیا۔ استاد اسلم خاں اور وجاہت حسین نے داغ، ناصر کاظمی اور مجروح کی غزلیں پیش کیں۔

۲۰ اکتوبر کو اکاڈمی بورڈ کی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں مختلف سب کمیٹیاں تشکیل دی گئیں تاکہ سرگرمیوں کو تیز سے تیز تر کیا جا سکے۔

۲۳ اکتوبر کو اندرا گاندھی کی یاد میں [illegible] کمیٹی [illegible] قومی یکجہتی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں اُردو مراٹھی [illegible] نے شرکت کی۔ گورنر شنکر دیال شرما نے صدارت کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر رفیق زکریا

تھے۔ انھوں نے گورنر ڈاکٹر شرما کا مختصر تعارف اور اردو سے ان کی عقیدت کا ذکر کیا اور اکادمی کے اقدامات کی سراہنا کی۔ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ ہندوستان جن حالات سے گذر رہا ہے اس میں شعرا پر بہت بڑی ذمہ داری آتی ہے۔ عوام نے سیاستدانوں کو سننا بند کر دیا ہے۔ ایسے ماحول میں شعرا کا فرض بنتا ہے کہ عوام کے دلوں تک پہنچیں۔ آپ نے اردو اور مراٹھی کا ملا جلا مشاعرہ منعقد کرنے پر نائب صدر ڈاکٹر حفظ انصاری کو مبارکباد دی اور فرمایا کہ اس سے قربت بڑھتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔

بشر نواز، ظفر گورکھپوری، قیصر الجعفری، ڈاکٹر حقیر آستانی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن مفتا، گنیش بہاری طرز لکھنوی، نارائن سروے، کیشو مشرام، شنکر ویدیا اور کوی اپتا بھ نے اپنی غزلوں اور نظموں سے حاضرین کو نوازا۔

۳ ار نومبر کو اردو ملن کی تقریب ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر حقیر آستانی نے فرمائی۔ سریندر پرکاش نے اپنے تازہ ترین افسانہ سے حاضرین کو نوازا۔ اسلام بن رزاق نے راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ کلیانی کا تجزیہ کیا۔ اور ارتضیٰ نشاط نے غزلیں پیش کیں۔ حاضرین نے ان تخلیقات پر کھل کر داد دی۔

مہاراشٹر اردو اکادمی کے زیر اہتمام ۱۴ ار نومبر ۱۹۸۶ء کو اردو ملن کا انعقاد یونیورسٹی کلب ہاؤس بمبئی میں کیا گیا۔

ڈاکٹر حفظ انصاری۔ نائب صدر اردو اکادمی نے نشست کے آغاز میں فرمایا کہ اردو اکادمی نے ادیبوں، شاعروں کو مل بیٹھنے اور تخلیقات پیش کرنے اور ان پر کھل کر تنقید کرنے کے لئے اردو ملن کا اہتمام کیا ہے۔ آج فنکار اور قاری کا رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے۔ ۔۔۔ ہمیں اسے پھر سے

کیا جائے۔ آپ نے نشست کے صدر ڈاکٹر حقیر آستانی اور سریندر پرکاش کا مختصر تعارف پیش کیا۔ ممتاز افسانہ نگار سریندر پرکاش نے اپنا تازہ ترین افسانہ بجوکا کا اعلان پیش کیا جو راجندر سنگھ بیدی کے مشہور افسانہ "بھولا" سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ اسلام بن رزاق نے بیدی کے ایک اور افسانہ کلیانی کا تجزیہ پیش کیا۔ اور ارتضیٰ نشاط نے اپنی تازہ ترین غزلیں سنائیں۔

ارتضیٰ نشاط کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے عبداللہ کمال نے فرمایا کہ ارتضیٰ نئی نسل کے ایک ذہین اور حساس شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ ریت کی رستی کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور ان کی شاعری تہہ داری اور طنز کی گہری کاٹ سے عبارت ہے۔

آخر میں صدر نشست ڈاکٹر حقیر آستانی نے اپنی نظمیں پیش کیں۔

رتلام کے آل انڈیا مشاعرے کا آنکھوں دیکھا حال

آج اکتوبر کی ۱۸ر تاریخ ہے شہر و اسٹیڈیم دلہن کی طرح سجا ہوا ہے ہر طرف رنگ برنگی بجلی کی روشنی ہے مشاعرہ گاہ تک جانے والے راستے سامعین کی آمد سے بھرے ہوئے ہیں موٹر کاریں موٹر سائیکلیں اور سائیکلوں کا ایک باضابطہ اسٹینڈ بنا ہوا ہے ایک طرف چائے کی ہوٹلوں کی قطار ہے دوسری طرف پان کے ٹھیلے سجے کھڑے ہیں رات کے ۹½ بجے ہیں اعلان ہو رہا ہے کہ شعراء کرام تشریف لا رہے ہیں آپ لوگ اپنی اپنی نشست حاصل کر لیں لیکا یک تالیوں کی گونج میں شعراء کرام کی پہلی قسط ڈائس کی طرف رواں دواں ہے حضرت شعری بھوپالی ہوش نعمانی ثقلین حیدر ہمایوں پروین لکھنوی۔ کنوینر مشاعرہ حضرت دانش علیگڑھی مائک پر آئے ہیں۔ اور سامعین سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت بزم ادب کے اس شاندار مشاعرے کے آغاز میں اب چند لمحات ہی باقی ہیں دیکھئے شعراء کی دوسری قسط بھی ڈائس پر آپہنچی ہے امتیاز جے پوری ساحرہ پالو نازاں ساحر اختر اندوری ابراہیم کوثر ایڈوکیٹ جاوید کھنڈری ماجد دیوبندی، اقبال گلشن آبادی نگینہ بھارتی مراد آبادی میزبان شاعر ماہر رتلامی شبیر راہی وغیرہ۔ دانش صاحب فرما رہے ہیں۔ حضرات بزم کی طرف سے جن شعراء کرام کو دعوت نامے جاری کئے گئے تھے وہ سب ہماری گذارش پر تشریف لے آئے ہیں۔ اب میں بعد احترام عالیجناب بنسل صاحب ضلع مجسٹریٹ سے گذارش کر رہا ہوں کہ وہ مسند صدارت پر تشریف لے آئیں۔ تالیوں کی گونج میں کلکٹر صاحب ڈائس پر تشریف لے آئے ہیں دانش علیگڑھی کی آواز پھر فضا میں لہرائی اور مشاعرے کے مہمان خصوصی جناب سیٹھ منوہر لال ناگپال سے گذارش کی ہے کہ وہ شمع روشن فرما کر مشاعرے کا آغاز کریں اور اس کے بعد دانش علی گڑھی نے۔ جناب ایس کے راوت ایس پی صاحب اور جناب خورشید انور سماجی اور سیاسی رہنما کانگریس (آئی) کا بھی شکریہ ادا کیا اس کے بعد شعراء کا پھولوں سے استقبال کلکٹر صاحب نے فرمایا۔ دانش علیگڑھی نے مشاعرے کی باگ ڈور ثقلین حیدر کے سپرد کرتے ہوئے ان سے نظامت کی گذارش کی ہے۔ ثقلین حیدر نے حسب عادت پُر اثر تقریر کرتے ہوئے اردو زبان کو فروغ دینے اور قومی یکجہتی کو تقویت دینے کے لئے مشاعروں کو ایک خوبصورت ذریعہ قرار دیا تقریر کے بعد وہ میزبان شاعر جناب ماہر رتلامی سے مشاعرے کا آغاز کرا رہے ہیں ماہر رتلامی اچھے ترنم سے ایک اچھی غزل سے نواز کر واپس ہوئے اور شبیر راہی نے بہت ہی اچھے شعر سنا کر مشاعرے کو ایک نیا موڑ دے کر واپس لوٹے اس کے بعد مہمانوں کا سلسلہ شروع ہو کر حضرت شعری بھوپالی تک پہنچا اور دوسرے دور کا آغاز ۱½ بجے رات شروع ہوا جس میں ۔۔۔ شعراء کا کلام سنا گیا جس میں شعری بھوپالی نگینہ بھارتی، ماجد دیوبندی، اسحاق اثر، ہوش نعمانی، ہمایوں پروین، امتیاز جے پوری۔ مشاعرہ نہایت کامیابی کے ساتھ صبح ۴½ بجے ختم کیا گیا۔ رتلام کے عوام کے علاوہ آس پاس جاورہ، آلیکین اور بدنور سے بھی کافی لوگ مشاعرہ سننے آئے تھے۔ مشاعرہ بہت کامیاب رہا بعد میں دانش علی گڑھی نے تمام شاعروں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا

"بشارت علی بشارت"

[illegible] 275602 Regd. No. D. D-No 353
E SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 NOVEMBER 1986
Regd. with the Registrar Newspaper at R. No [illegible]

شانِ ہند
ناول
سرور تونسوی

فون نمبر: ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴/۴/۵۷ رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۲۵۳

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرہ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند

نئی دہلی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زر سالانہ ۲۴ روپے

ایڈیٹر
سرور تونسوی

جلد ۲۷ | دسمبر ۱۹۸۶ء | شمارہ ۱۲

... گیر کے لئے یہ لازم تھا کہ انھیں سلام کریں ورنہ سلام نہ کرنے والے کو ریاستی پولیس یا نواب صاحب کے ہمراہ جا رہے مصاحبین کوڑوں کی سزا دیتے۔

کہاں گئے وہ لوگ

۱۹۴۷ء میں ملا واحدی کراچی چلے گئے تو انھیں شاہجہاں کی دلی بھلائے نہیں بھولتی تھی لہٰذا انھوں نے جامع مسجد کی سیڑھیوں کی خاک اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار مبارک کے پیر وں صحن کی خاک دہلی سے منگا کر الگ الگ، دو شیشیوں میں بھر کر اپنے سامنے میز پر رکھ لی اور ان شیشیوں میں رکھی دلی کی مٹی کو دیکھتے رہتے اور آنکھوں سے آنسو بہاتے رہتے۔

مرحوم میر عثمان علی خاں صاحب نظام دکن جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے تو ان کی آمد سے پہلے یہ شاہی اعلان کیا جاتا کہ جب والی دکن نماز ادا کرنے آئیں تو ان کی تعظیم میں کوئی بھی کھڑا نہ ہو۔

تقسیم ملک سے پہلے ریاست بہاول پور کا نواب اپنی ریاست میں حسب معمول جیسے کبھی گزرتا تو ہر راہ...

ضروری اعلان

جنوری ۱۹۸۷ء سے "شان ہند" آفسٹ پرنٹنگ سے شائع ہوگا لیتھو پرنٹنگ اور آفسٹ پرنٹنگ میں کتابت، چھپائی اور دیگر کئی قسم کے اخراجات میں بہت فرق ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اب شان ہند پر تین گنا زیادہ لاگت آئے گی اس کے علاوہ محکمہ ڈاک نے محصول ڈاک میں تین گنا اضافہ کر دیا ہے۔

ان حالات میں شان ہند کا زر سالانہ یکم جنوری ۱۹۸۷ء سے چھتیس روپے سالانہ ہوگا اور ایک شمارہ کی قیمت تین روپیہ ہوگی۔ (ادارہ)

[illegible] ادارہ کا [illegible] سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر [illegible] نے [illegible] پرنٹرز بلی ماران دہلی سے چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ ۵۵ ... دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

دلّی کی ادبی سرگرمیاں

سال ۱۹۸۶ء کے آخری دنوں میں راجدھانی میں ادبی سرگرمیوں کی بڑی ریل پیل رہی۔ ہندی اکاڈمی دلی نے ۱۹ر دسمبر کو ہماچل بھون کے کانفرنس ہال میں آچاریہ کاکا صاحب کالیلکر کی جنم شتابدی شایان شان انداز میں منائی۔ ہندی اکاڈمی دلی اپنے فرائض کی ادائیگی کو جس فرض شناسی سے انجام دے رہی ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے اور اسی روز شام کے ۵ بجے عزت مآب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ نے ایوانِ غالب نئی دہلی میں بین الاقوامی غالب سمینار کا افتتاح فرمایا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر محمد ایوب تاباں صاحب اور جناب محمد شفیع قریشی صاحب سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ کے حسن انتظام کے باعث یہ تقریب انفرادی حیثیت کی حامل تھی۔ عزت مآب برنی صاحب کا افتتاحی مقالہ حسب سابق برنی صاحب کی ادبی، علمی اور معلوماتی ساکھ کا آئینہ دار تھا۔ یہ سمینار تین دن چلا اور اپنی سابقہ روایات کو قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب اور جناب عابدی صاحب سمینار کی کامیابی پر شرکائے سمینار سے مبارکباد قبول فرماتے ہوئے اپنی کامیابی پر خوش تھے۔ "اذکارِ گریزاں" کے خالق جناب ڈاکٹر حقیر آستانی بمبئی نے بھی اس بین الاقوامی سمینار میں شرکت فرمائی۔ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی ۷۲ ویں سالگرہ جوبلی ۲۲ر دسمبر کو پیارے لال بھون میں بڑے اہتمام سے منائی گئی۔ دلی کے لفٹننٹ گورنر جناب کپور صاحب نے اس تقریب کی صدارت فرمائی اور جموں و کشمیر کے چیف منسٹر کی جگہ اُن کے کیبنٹ منسٹر جناب حبیب صاحب مہمانِ خصوصی نے "ہمارے کنور صاحب" نامی کتاب کو ریلیز فرمایا۔ ملک بھر کے شعرائے کرام اور ادیبوں نے کنور صاحب کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ سب مضامین اور منظوم کلام اس کتاب میں شائع کیا گیا ہے۔ جناب کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی صاحب نے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے اس موقع پر ایک "سوونیر" بھی جاری کیا گیا۔ جناب مجتبےٰ حسین صاحب نے کنور صاحب پر نہایت دلچسپ خاکہ پڑھا۔ مشہور فلم آرٹسٹ جناب اوم پرکاش کی پنجابی اُردو ملی جلی تقریر نے خاصی دلچسپی پیدا کی۔ ستیش بترا اور بشیر احمد خاں (پاکستانی) نے کنور صاحب کی غزلیں گائیں اور مس لتا دوگرہ نے کنور صاحب کی غزلوں پر بیلے ڈانس کیا جو بہت پسند کیا گیا۔

۲۳ر دسمبر کی شام کے پانچ بجے راشٹرپتی بھون میں صدر جمہوریۂ ہند عزت مآب عالی جناب گیانی ذیل سنگھ صاحب نے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی سوانح عمری "یادوں کا جشن" ریلیز فرمائی۔ اس موقع پر جناب راشٹرپتی صاحب نے بہت ہی اچھے الفاظ میں کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی سحر کے بارے میں تعریفی کلمات فرمائے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ہندوستان اور اُردو کی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے راشٹرپتی اُردو زبان میں بہت اچھی شد بد رکھتے ہیں۔ اور اُردو

کو ایک زندہ زبان سمجھتے ہیں۔ مذہبی رواداری، مانوسیت اور اردو دوستی کی ایک پہچان بن گئے ہیں۔ ادارہ شانِ ہند کنور صاحب کی ڈائمنڈ جوبلی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور خدا سے دعا کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ کنور صاحب کا جشن صد سالہ منانے کی مہلت دے۔

۲۳ دسمبر کو ہی دلی ہندی اکاڈمی کی طرف سے تروینی سبھاگار، تان سین مارگ نئی دہلی میں پنڈت مدن موہن مالویہ کے جنم دن پر مالویہ جی کی صحافتی اور ادبی خدمات پر ایک گوشٹی کا اہتمام کیا اور اس مبارک موقع پر مالویہ جی کو دلی خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کے جشن طلائی کا پروگرام ۲۶ دسمبر کی شام کو ہماچل پردیش بھون، منڈی ہاؤس نئی دہلی میں شروع ہوا افتتاحی اجلاس میں جناب اندر کمار گجرال نے خطبہ استقبالیہ پڑھا اور جناب علی سردار جعفری نے صدارتی تقریر فرمائی۔ خطبۂ استقبالیہ اور صدارتی تقریر دونوں ہی اپنی نظیر آپ تھے۔ ملک بھر کے سرکردہ اردو مصنفین اس اجلاس میں تشریف فرما تھے۔ اس افتتاحی اجلاس میں جو کلچرل پروگرام پیش کیا گیا وہ بھی یقیناً قابلِ تعریف تھا۔ اس کے بعد ۲۷ اور ۲۸ دسمبر کو بھی اس جشن طلائی کے اجلاس آندھرا پردیش بھون۔ اشوکا روڈ نئی دہلی میں منعقد ہوئے جو حسبِ روایات بہتر انداز میں جاری رہے۔ اردو اکاڈمی دلی نے اس جشن طلائی کو کامیاب بنانے میں ہر طرح سے مدد دی۔

۳۰ اور ۳۱ دسمبر ۱۹۸۶ء کو ہندی اکاڈمی دہلی ہندی اردو آپسی تعلقات پر ایک سیمینار تروینی سبھاگار تان سین مارگ نئی دہلی میں منعقد کر رہی ہے۔ ہندی اکاڈمی دلی کا یہ قدم یقیناً قابلِ مبارکباد ہے کہ وہ اردو زبان میں اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ ڈاکٹر نارائن دت پالیوال سکریٹری ہندی اکاڈمی تعریف کے قابل ہیں کہ وہ ہندی اکاڈمی کو دن دونی فعال ادارہ بنانے میں کوشاں ہیں۔

ہندی اکاڈمی کے ۳۰ و ۳۱ دسمبر کو ہونے والے ہندی اردو آپسی تعلقات سیمینار کا افتتاح جناب لفٹیننٹ گورنر دہلی فرما رہے ہیں۔ اس سیمینار کی رپورٹ شانِ ہند کی اشاعت آئندہ میں دی جائے گی۔

۲۷ دسمبر کی شام کو غالب اکاڈمی بستی نظام الدین میں مرزا غالب کے ۱۸۹ ویں یوم ولادت کے موقع پر ایک بہت ہی اچھی تقریب کا اہتمام غالب اکاڈمی کی طرف سے کیا گیا جس کی صدارت ماہر غالبیات جناب مالک رام صاحب نے فرمائی۔

غالب کا یوم ولادت ہر سال منایا جاتا ہے مگر آج اس تقریب میں جو گہما گہمی تھی وہ اس سے قبل کسی سال سے نہیں دیکھی گئی تھی۔ اس سال یوم غالب کی اس تقریب میں چونکہ ملک کے مشہور شاعر، ادیب اور محقق غالب بلکہ غالب شناس جناب کالی داس گپتا رضا (بمبئی) نے "دیوان غالب کامل" عنوان سے مقالہ پڑھنا تھا۔ اس کے باوجود کہ شہر میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کا سیمینار ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ دو اور بھی ادبی تقاریب ہو رہی تھیں۔ مگر پھر قابلِ ذکر اردو کا شیدائی جناب کالی داس گپتا رضا کا مقالہ سننے کے لئے غالب اکاڈمی میں موجود تھے۔ ہال اور گیلری سامعین سے اٹے ہوئے تھے۔

جناب کالی داس گپتا رضا نے پچھلے کچھ ہی سالوں میں غالب شناس کی حیثیت سے جو شہرت دنیائے اردو اور غالب کے پرستاروں میں پائی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اور غالب پر جو کام انھوں نے اب تک کیا ہے وہ کسی بھی دوسرے ماہر غالبیات سے کم نہیں ہے۔ رضا صاحب آج کل "دیوان غالب کامل" کی ترتیب اور اشاعت کا کام کر رہے ہیں۔ دیوانِ غالب میں کل پانچ ہزار کے قریب غالب

کی غزلیات کو وہ پیش کر رہے ہیں اور انھوں نے یہ کام نو حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ آج کے مقالہ میں انھوں نے "دیوانِ غالب کامل" کی صرف پہلی اور آخری جلد "غزل" پر ہی مختصر روشنی ڈالی ۔ مقالے میں رضا صاحب نے اُن کئی باتوں کو ثبوت اور دلیل کے ساتھ جھٹلایا ہے جو غالب کے کلام کے بارے میں کہی گئی ہیں مقالہ پسند کیا گیا ۔ اور مقالہ کیسے لکھا جاتا ہے ۔ یہ انداز رضا صاحب نے دلی کے اکثر پیشہ ور خود ساختہ مقالہ نگاروں پر واضح فرما دیا ہے ۔

اس تقریب کے آخر میں کرن شکلا اور پرتیما شکلا (بھوپال) نے غالب کی غزلیات سنائیں جنھیں پسند کیا گیا ان دونوں بہنوں نے مجھکل بندی کا سے جو لوک گیت سنایا وہ ان کی ساکھ کو خراب کرنے کا باعث ہو سکتا ہے لہٰذا اگر یہ لوک گیت اس قسم کی ادبی تقاریب میں نہ سنایا کریں تو ان کے لئے کاروباری طور پر مفید رہے گا

ٹی ۔ وی کا بزم پروگرام

پہلے اس عنوان سے ایک مکتوب پڑھئے جو روزنامہ پرتاب میں شائع ہوا ہے ۔

"ٹی وی کا بزم پروگرام روز بروز پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے اسکرین پر ایسے ایسے چہرے نظر آتے ہیں جو اردو دنیا میں کوئی جگہ نہیں رکھتے ۔ ۲۶ دسمبر کے بزم پروگرام میں جہاں ایک پیشہ ور فوٹو گرافر کی پبلسٹی کی گئی پروگرام کمپیئر کرنے والے شہباز رضا نے بڑھ چڑھ کر اپنی علمی استعداد کا ثبوت دیا ۔ ذہین نقادوں کی شخصیت بہرحال قابل احترام ہے لیکن جو فوٹو گرافر پیشہ ور ہے اور جس نے آج تک کوئی نیشنل یا انٹرنیشنل ایوارڈ ہی کسی بھی تصویر کے لئے حاصل نہیں کیا اسے ہی اس اردو دنیا کریش کرنا کہاں کی عقلمندی ہے ۔ کیا ٹی ۔ وی کے اعلیٰ حکام "بزم" کے نام پر چل رہی اناپ شناپ کو روک کر اس پروگرام کو بہتر اور عوام کے لئے قابل قبول بنانے کی کوشش کریں گے ۔ (شاہد علی ۔ ۱۶۵ حوض رانی نئی دہلی)"

دراصل دوردرشن کے افسران اعلیٰ اردو زبان سے قطعاً نابلد ہیں اور انھوں نے سن رکھا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے لہٰذا وہ اردو پروگرام کے لئے اپنے اسٹاف میں سے کسی بھی مسلمان کو اردو پروگرام کا انچارج بنا دیتے ہیں خواہ اس مسلمان کو اردو سے صرف نام کی ہی واقفیت ہو یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم ملک کے بعد اردو کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا تھا اور اسکولوں سے اردو حرف غلط کی طرح مٹا دی گئی تھی ۔ لہٰذا ۱۹۴۷ء کے بعد کئی سال تک اسکولوں سے اردو کو دیش نکالا دے دیا گیا اور مسلمان طلبا بھی اردو ڈھنگ سے نہ پڑھ سکے ۔ پہلے دوردرشن والوں نے عصمت سلیم کو اردو پروگرام کا انچارج بنایا وہ بیچاری اردو سے واجبی طور پر ہی واقف تھیں اور ہیں ۔ مگر کسی نہ کسی طرح اپنا وقت گذار گئیں ۔ انجم عثمانی صاحب کی عمر کے نوجوانوں کو اردو اسکولوں میں پڑھنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی بلکہ گھروں پر ہی ماں باپ سے اردو کی حروف شناسی کے بعد یہ نوجوان اردو کے ادیب بن بیٹھے اور سرکاری محکموں خصوصاً دوردرشن والوں نے ان خود ساختہ اردو ادیبوں میں سے انجم عثمانی کو اردو پروگرام کا انچارج بنا دیا ۔ انجم عثمانی صاحب سے ایک مرتبہ ہماری گفتگو دوردرشن کے اردو پروگرام کے بارے میں ہوئی تھی تو انھوں نے فرمایا تھا کہ وہ اردو پروگرام میں نئے چہروں کو دوردرشن میں لانا چاہتے ہیں ۔ ان کی یہ خواہش یقیناً قابل تعریف ہے مگر فلموں میں تو نئے چہرے اپنے حسن ۔ قد و قامت اور صلاحیتوں کے باعث کامیاب ہو جاتے ہیں مگر دوردرشن کے اردو پروگرام میں نئے چہرے وہی تو لائے جا سکتے ہیں جنھیں اردو صحیح ڈھنگ سے آتی ہو خواہ وہ کتنے ہی بدصورت اور ناک میں بولنے والے کیوں نہ ہوں مگر انجم عثمانی صاحب نے تو اردو پروگرام میں نئے چہروں کی آڑ میں اردو کو غارت کرنے والوں کی بھرمار کر دی ہے ۔ وہ اپنے نوجوان احباب کو دوردرشن پر ضرور دکھائیں اور انھیں دوردرشن سے معقول یا معمولی معاوضہ بھی دلوائیں مگر کم سے کم انھیں خود ہی ٹریننگ تو دے دیا کریں مگر خود ٹریننگ دینا بھی تو ہر کسی کے بس کی بات نہیں باقی [illegible]

[illegible]

ایک باشعور شاعر۔ شاہد رتلامی

از بسمل نقشبندی
کسٹم وارڈ۔ بانسواڑہ

ذوقِ شعرگوئی ایک خداداد صلاحیت ہے اور قدرت کا یہ قیمتی عطیہ کچھ مخصوص لوگوں کو ہی نصیب ہوتا ہے اسی کے ساتھ نطقِ بیان اور اظہارِ خیال کا سلیقہ بھی خدا کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک شاعر یا ادیب کی قوتِ مشاہدہ اور شعورِ محسوسات ایک عام آدمی سے مختلف ہوتے ہیں عام آدمی اپنے ذاتی مسائل اور مفاد کی آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے اور اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر اپنی زندگی کے دن گزارتا ہے۔ اس کے برعکس ایک شاعر یا ادیب کائنات کی ہر ذی روح مخلوق کے داخلی اور خارجی حالات پر نظر رکھتا ہے اور گرد و پیش کے ماحول کے ساتھ ساتھ حالاتِ حاضرہ کی نبض کو بھی ٹٹولتا رہتا ہے۔ فنکار اپنے ذاتی مسائل کو نظرانداز کرکے عام آدمی کے درد کو اپنا درد اور اس کی تسکین کو اپنے لئے راحت محسوس کرتا ہے۔

اردو شاعری میں تین چیزیں بہت مشہور ہیں۔ "صبحِ بنارس"۔ شامِ اودھ۔ اور شبِ مالوہ، اور اس زندہ حقیقت سے ہر باہوش و ذی شعور انسان متفق ہے!

"مالوہ" کی سرزمین نے کئی ایسے فنکاروں کو جنم دیا ہے جن کی فنی صلاحیتوں اور ادبی کارناموں کے پرچے ہنوز ملک کے گوشے گوشے میں سنائی دیتے ہیں

"رتلام" مالوہ کا ایک خوبصورت شہر ہے اور تقریباً ڈیڑھ سو سال سے جہاں اردو زبان کی خدمات میں کئی حضرات کے نام تاریخ مالوہ میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

رتلام ضلع میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے جاورہ جسے گلشن آباد بھی کہتے ہیں۔ یہاں سے ۱۹۰۰ء بلکہ اس سے بھی پہلے ایک رسالہ اردو میں ماہنامہ "مالوہ" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ جس کے ایڈیٹر محمد انور خاں بیدل اور معاون منشی عبد المجید خاں علوی تھے۔ اسی زمانے میں رتلام کے مہاراجہ رتن سنگھ جی کے نام پر ایک اردو لیتھو پریس جس کا نام "رتن پریس" تھا رتلام میں اردو کی خدمات انجام دے رہا تھا۔

چونکہ جاورہ نوابی ریاست تھی اور نواب صاحبان خود شعر و سخن کے بہت قریب تھے۔ اس لئے آئے دن یہاں ادبی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ خواجہ اکبر حسین اکبر اجمیری۔ جناب محمود الحق صاحب بسمل بھوپالی جناب غلام محمد صاحب تاقب اجمیری، جناب مولوی محمد حسن رضا خاں صاحب حسن بریلوی، جناب لطف علی خاں سہیل گلشن آبادی، مرزا وقار الاعظم شرف گلشن آبادی جناب محمد برہان الدین صاحب شعلہ گلشن آبادی جناب مولانا ظہیر الدین صاحب ظہیر دہلوی جیسے اساتذۂ فن موجود تھے اور "ماہنامہ مالوہ" میں ان حضرات کا کلام شائع ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ رتلام میں جناب منشی شوکت حسین صاحب شوکت (جو ہز ہائینس رتلام کے میر منشی اور مخصوص شاعر تھے) جناب منشی شہرت صاحب، جناب عبد الرزاق صاحب قاضی، محترمہ شیریں صاحبہ جناب منشی احسان الحق صاحب احسان، جناب بابو

شفیق احمد صاحب شفیق کاکوروی۔ جناب منشی عبدالرحمٰن صاحب قائل، جناب محمد عمر صاحب مظلوم، جناب سیٹھ نظر محمد صاحب نظر، جناب اندر ناتھ طہور ثاقب، جناب فنی بزمی، جناب عشرت گیلانی، جناب حامد نور خاں صاحب حامد، جناب عبدالمجید صاحب مجید (استادِ مالوہ) جناب ظہور احمد صاحب برتر جیسے پختہ گو سخن شناس، اور فنکار شعراء گیسوئے اردو سنوارنے میں مصروف تھے۔

اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ رتلام کے آب و ہوا میں سخن فہمی اور ادب نوازی اس سنجیدگی سے گھل مل گئی ہے کہ آج بھی یہاں بڑے بڑے آل انڈیا مشاعرے منعقد ہوتے ہیں اور عوام کی ایک بڑی تعداد دلچسپی اور ذوق و شوق سے پوری پوری رات بیٹھ کر نہایت سکون و استقلال سے مشاعرہ سن کر لطف اندوز ہوتی ہے۔

اسی رتلام کی زرخیز اور ادب نواز دھرتی نے سنہ ۱۹۴۷ء میں ایک شاعر کو جنم دیا جسے آج ملک میں عبدالحکیم شاہد رتلامی کے نام سے جانا جاتا ہے

جب شاہد رتلامی کا شعور بالغ ہوا تو خداداد صلاحیت نے اپنا اثر دکھایا اور ان کا رخ ادبی محفلوں کی جانب موڑ دیا۔ شاہد رتلامی کے دل میں حصول علم و فن کا جذبہ بیدار تھا اور انھیں یہ بھی احساس تھا کہ کسی کامل فنکار اور استاد شاعر کے سامنے زانوئے ادب طے کئے بغیر اکتساب فن کی منزل تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اسی لئے انھوں نے کچھ عرصہ حضرت منشی عبدالرحمٰن قائل کے زیر اثر رہ کر مشق سخن جاری رکھی اور حضرت قائل کے بعد استاد الشعراء علامہ حضرت صادق اندوری کے باقاعدہ شاگرد ہو کر ان سے فنی نکات کا درس لیتے رہے۔

حضرت صادق اندوری کی سرپرستی میں رہ کر شاہد صاحب نے جو ترقی کی وہ قابل رشک اور لائق تحسین ہے شاہد صاحب کا ادبی شجرہ اس طرح ہے:۔

مرزا غالب دہلوی، مولانا حالی پانی پتی، جناب سرب سکھ دیال عاشق لکھنوی، جناب صادق اندوری اور شاہد رتلامی۔

شاہد صاحب نے اپنی زندگی کے ۹ سال بغداد شریف اور کویت کی سرزمین پر بھی گزارے ہیں جہاں انھیں پاکستانی شعراء کے ساتھ رہنے کا موقع بھی ملا اور "بزم سخن کویت" کے تحت ہونے والے مشاعروں میں کلام سنانے کا بھی۔

کویت ریڈیو اسٹیشن سے ان کا کلام بھی نشر کیا گیا اور وہاں سے نکلنے والے اخبارات میں بھی کلام شائع ہوا شاعری قلب و روح کی پاکیزگی احساسات کی تہہ داری اور تخلیقی جوہر کی بلندی کا نام ہے اور یہ تمام خوبیاں فکر کی توانائی کے ساتھ شاہد صاحب میں موجود ہیں۔

اکثر و بیشتر ان کی شاعری میں شعری قدریں اپنے ارد گرد کے ماحول ملک کے سیاسی اور سماجی اتار چڑھاؤ نیز عام آدمی کی زندگی کا کرب سمیٹ کر اس خوبصورت اور سلیقے انداز سے سما جاتی ہیں کہ قاری اور سامع شاہد صاحب کی فنی صلاحیت اور شاعرانہ عظمت کا قائل ہو جاتا ہے ان کی غزلوں میں جہاں اخلاقی قدروں کے تحفظ کا درس ہوتا ہے وہاں معاشرے کی بدعنوانیوں پر نشتر زنی بھی دکھائی دیتی ہے۔

انھوں نے بیشمار معیاری غزلیں کہی ہیں۔ جن میں زبان کی شیرینی، الفاظ کا حسن ترتیب اور لہجے کا بانکپن نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

حالانکہ قلی قطب شاہ سے لے کر میر تقی میر تک اور میر سے لے کر غالب تک اور غالب سے لے کر جگر، جوش، فراق اور فیض احمد فیض تک اردو غزل نے

"دِس از بڑودہ" (یہ ہی بڑودہ ہے)
" اور دی ہیل - بٹا دِس از واڈو ڈرا" (لاحول ولا
مگر یہ تو واڈو ڈرا ہے)
یہ کہتے ہوئے امریکی سیاح نے جلدی سے سامان
لپیٹا اور چلتی گاڑی سے کود گئے اور ہمارے دیکھتے ہی
دیکھتے پلیٹ فارم پر چار غلانٹ کھا گئے۔ تو صاحب ہم
خود بھی غلانٹ کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی کھلاتے
ہیں۔

لہٰذا دلی چیستاں ہمارے لئے اور چیستان بن گیا
دہلی میں ہمارا قیام گجرات بھون کے عین سامنے تھا
سوچا وَلی گجراتی جو اردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان
شاعر ہیں ان سے بہتر دلی کو کون جان سکتا ہے چلئے
گجرات بھون جا کر ہی اس معمہ کو حل کریں مگر یقین مانئے
گجرات بھون جا کر یہ گتھی اور الجھ گئی احاطہ کے دروازہ کے
ایک جانب دلی لکھا تھا اور دوسری جانب دہلی اور
بلڈنگ کو دیکھا تو اور چکرا گئے کیونکہ وہاں دلی، دہلی
کے بجائے "دِل ہی" لکھا تھا۔ بہرکیف یہ سوال چونکہ
اکاڈمک نوعیت کا ہے لہٰذا اس کا جواب بھی دہلی
اکاڈمی کے اردو دانشوروں پر چھوڑتے ہیں۔

کانفرنس چیستاں

لیجئے صاحب تھامس لوائز ہوم پر کنشاعروں کا
انبار لگ گیا۔ اطراف ہند سے غالب شاہ آبادی،
کامیر بھی، قربان مراد آبادی، شوق جالندھری، براہم
جالندھری، ایم ایم دانش منظور، محترمہ تمنا منظور،
مونس اختر لدھیانوی، ڈاکٹر راہی، کمال لدھیانوی،
مخدوم جھنڈاکوی، جبیر جالندھری، [illegible] شملوی،
اداری بدر، ظفر میرٹھی، ڈینس اجمیری، آ رتھا
کھنوی، کیپٹن کوہلی اور جوزف آنور کے علاوہ دلی
سے عشرت ادیب، یحییٰ دہلوی، ڈاکٹر ضیا
لدھیانوی، زاغ زیب رضوانی اور ثاقب [illegible] کی

صاحب تشریف لا چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ شعرا حضرات
کی شرکت چونکا دینے والی حد تک کم تھی معلوم ہوا
ہے کہ دہلی والے بے حد مصروف ہیں۔ پچھلی کانفرنس
کے کنوینر جناب ایس ایم لال صاحب تو اس قدر عدیم
الفرصت تھے کہ کانفرنس میں شرکت تو درکنار انھیں اپنی
جانب سے چھپوائے ہوئے ہینڈ بل کے پروف پڑھنے
کے لئے وقت نکالنا مشکل ہو گیا اور پرنٹنگ ڈیول
اپنا کام کر ہی گیا اور ہینڈ بل میں ۲۹ نومبر کا ۱۶ نومبر
چھپ گیا۔ جناب عاقل صاحب بڑی آسانی سے
کہہ سکتے ہیں کہ اگر برٹینکا انسائکلوپیڈیا میں برطانیہ کی
وزیر اعظم مسز مارگریٹ تھیچر کو پرائم منسٹر کی جگہ کرائم منسٹر
(جرائم منسٹر) اور پرائم منسٹر کی جگہ پرائیم منسٹر (بیت الخلاء) چھپ
سکتا ہے تو ۱۶ کا ۲۹ ہو جانا تو نہایت معمولی بات ہے
آپ ۲۹ کو قلمزد کر دیجئے۔ لیجئے ہم نے کر دیا اور مسئلہ
حل ہو گیا۔

کچھ لوگ بجا طور پر پوچھ سکتے ہیں کہ جناب اگر حالات
اس قدر نامساعد تھے تو آپ کو کانفرنس کروانے کو ن
سا بدم ہوش کا خطاب حاصل کرنا تھا۔ آپ کا فرمانا
بجا مگر دراصل کچھ حضرات کا خیال تھا کہ موجودہ جنرل
سیکریٹری کے ہوتے ہوئے ایسوسی ایشن ترقی نہیں کر سکتی
کچھ لوگ یہ بھی سوچتے تھے کہ ہم اپنی کرسیوں پر ٹوہن کو دہ
لگا کر بیٹھے ہیں اور تادم حیات اس سے چپکے رہیں
گے۔ کافی بدگمانیاں پھیلائی گئیں مجھ جیسے فاتر العقل
[illegible] کو وظیفہ خوار مشن کے خطاب سے نوازا
گیا۔ لہٰذا ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ضروری تھا صدر
[illegible] ڈاکٹر [illegible] کی صدارت میں کانفرنس
[illegible] کہ یہ مت سوچئے کہ ہم ہمیشہ کا
[illegible] بیٹھے ہیں ہو سکتا ہے کہ کل ہم
آپ کی کرسی پر بیٹھے ہوں اور آپ یہاں بیٹھے ہوں
[illegible] دستور تھا کہ آپ گفتار سے
[illegible] ہمیں بھی آتا ہے۔ ہاں مگر

کردار کے غازی بننے کے لئے آپ کو کانفرنس کے انعقاد سے ایک ماہ قبل دہلی کے راج مارگ کی خاک چھانی ہوگی ڈاکٹر طالب شاہ آبادی کی طرح جو حال ہی امریکہ کی طویل طویل مسافت کے بعد اپنے گھر حیدر آباد پہنچے تھے۔ الٹے پاؤں واپس دہلی بھاگنا ہوگا۔ یہ ہی کانفرنس چلیست کا جواب ہے۔ بہرحال ہم تھامس لوائز سکول کے جناب انور فضل مسیح صاحب کے مشکور ہیں کہ وہ اس آڑے وقت میں سامنے آئے ورنہ اس آنے پن کو بھی ٹیم میں کھڑا کرنا مشکل ہو جاتا۔

افتتاح چلیست

امسال بھی سالِ گذشتہ کی طرح کسی عزت مآب بشپ صاحب کے دستِ مبارک سے نہ ہو سکا۔ تعجب ہے کہ اس دور میں جب کہ اہلِ نظر پلیٹ فارم ڈھونڈتے پھرتے ہیں لوگ ہمیں فٹ پاتھ سے بھی گیا گزرا کیوں سمجھتے ہیں۔ جب کہ ہماری ایسوسی ایشن پلیٹ فارم کیا۔ ڈائیونگ بورڈ کا کام سرانجام دے سکتی ہے شاید ہم ہی پبلسٹی ٹیکنک سے واقف نہیں۔ اگر ہم اپنی ایسوسی ایشن کے سالانہ کانفرنس کا افتتاح بشپ صاحب کے بجائے صوبائی گورنر یا وزیر تعلیمات سے کرائیں اور دوردرشن والے ہمیں پاس سے آکر دیکھیں تو یقین مانیئے ٹی وی پر ایک ہی جھلکی دیکھ کر ہمارے پاس ہمارے مشن کے نمبر ایوں سے شکایتی خطوط آنے لگیں گے کہ حضور ہمارے صوبے میں ہماری اردو ایڈیٹرز کانفرنس کا انعقاد ہوا اور ہمیں اس کی اطلاع بھی نہ دی جائے یہ تو سراسر ظلم ہے۔ بہرحال امسال یعنی ۲ر نومبر ۱۹۸۶ء کو کل ہند مسیحی اردو رائیٹرز ایسوسی ایشن کی آٹھویں کانفرنس کا انعقاد صدرِ انجمن ڈاکٹر طالب شاہ آبادی کے دعائیہ کلمات سے ہوا۔

انتخابات چلیست

۲ر نومبر کی دوپہر کو ایسوسی ایشن کے نئے عہدہ داران کے انتخابات ہونے تھے۔ انتخاب کمیٹی جو تین اشخاص پر مشتمل تھی، نے جناب طالب شاہ آبادی کی رہنمائی میں آنے والے عہدہ داران انجمن کی ایک فہرست بنائی اور مجلس عاملہ سے لے کر عام جلسے کے ہر فرد کو یہ اختیار دیا کہ اگر وہ ان ناموں سے متفق نہ ہو تو کسی بھی نام کے بجائے دوسرا کوئی نام پیش کر سکتا ہے اور بوقت ضرورت خفیہ بیلٹ ووٹ سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ الحمد للہ ایک ہی گھنٹے میں تمام نئے عہدہ داران انجمن کو بلا مقابلہ کثرتِ آرا سے چن لیا گیا۔ فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

سرپرست:- سراج سخن علامہ گریفن جونز صاحب جبرؔ
صدر:- ادیب ملت جناب ہنری ولیم صاحب صادقؔ
نائب صدر:- روح سخن جناب ایڈون واصل صاحب واقف جالندھری
جنرل سکریٹری:- کیپٹن ڈاکٹر کیفی صاحب
جائنٹ سکریٹری: جناب البرٹ صاحب ساحل لدھیانوی
مجلس عاملہ کے ممبران:- جناب ایم ایم داس منظور صاحب - جناب صوفی بدایونی صاحب، پادری ایم بی ہینڈ بدر صاحب، جناب ایم ایم فلپ میگ ابحری صاحب اور جناب وی۔ آئی بھجن راغب رضوانی صاحب

آپ یقیناً پوچھیں گے کہ اس میں انتخابات چلیست جیسی چیز ہے ہی کہاں؟ نہیں صاحب ہے اور یہ ہے کہ جن مجوزہ عہدیداران انجمن کو صرف ایک ہی گھنٹے میں بلا مقابلہ کثرتِ آرا سے چن لیا گیا انتخاب کمیٹی کو وہ لسٹ تیار کرنے میں تین گھنٹے تک سر کھپانا پڑا تھا۔

بجٹ چلیست

کچھ لوگوں کو مغالطہ ہے کہ مسیحی انجمنوں کی مالی استقامت

تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انھیں تو امریکہ، انگلینڈ، ہولینڈ اور لینڈ جیسے ملکوں سے ڈھیر سا پیسہ آتا ہے مگر جہاں کل ہند سطح کی اردو رائٹرز ایسوسی ایشن کا سوال ہے یہ درست نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر ایس۔ وی جیسے صاحب طالب شاہ آبادی جو حسن اتفاق سے ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ہونے کے ساتھ شاعر و ادیب بھی ہیں اور جو ہر سال اپنے ادارہ سے انجمن کی ایک ہزار سے مالی امداد بہم پہنچاتے ہیں اور اپنے اثر و رسوخ سے ادھر ادھر سے ہزار ڈیڑھ ہزار اور جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر شمع انجمن نہ ہوتے تو شمع مشاعرہ ہمارے سامنے نہیں آتی۔ آپ ہی سوچیے کیا دو ڈھائی ہزار روپے میں کسی کل ہند کانفرنس اور مشاعرہ کا انعقاد ہو سکتا ہے۔ کیا ہم قیام و طعام کے اخراجات سے قطع نظر مدعوئین شعراء حضرات کو آمد و رفت کے لئے سیکنڈ کلاس ریل کا کرایہ دے سکتے ہیں؟ پھر ہم میں کوئی پیشہ ور مشاعرہ باز بھی نہیں۔ ہم تو ایک کاز کو لے کر چلے ہیں اور مشنری سپرٹ سے کام کر رہے ہیں۔

آج تک ڈاکٹر طالب صاحب کے تدبر اور دور اندیشی کے طفیل ہمارے عہدہ داران انجمن اور مجلس عاملہ کے ممبران نے یہ رویہ اپنا رکھا تھا کہ ہر شخص حسب توفیق اپنی جیب خاص سے انجمن کو کچھ نہ کچھ عطیہ دیتا تھا اور طالب صاحب بزنس میٹنگ میں ایسی چال چلتے کہ سب سے پہلے وہ اپنی طرف سے ایک خاص رقم کے عطیہ کا اعلان کر دیتے لہٰذا دیگر ممبران کو بھی لبیک کہے بغیر کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ حد تو یہ ہے کہ جب طالب صاحب کے چھوٹے سگے بھائیوں کا نمبر آتا تو طالب صاحب ان سے پُر زور لہجے میں اپیل کرتے۔

"بھائی تم تو میاں بیوی دونوں کماتے ہو تم تو اس سے بھی زیادہ دے سکتے ہو!"

ہم کوئی طالب صاحب کو کمتر نہیں دینا چاہتے مگر ان کے خلوص و ایثار سے مشعل راہ کا کام ضرور لینا چاہتے ہیں۔ انجمن کے عام اجلاس میں پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ نئے عہدہ داران انجمن بھی اس قسم کا عطیہ دیں؟ ظاہر ہے تعزیرات ہند کی کسی دفعہ میں یہ شامل نہیں۔ یوں تو سوال میں جواب پوشیدہ تھا مگر طالب صاحب کی حاضر جوابی ملاحظہ فرمائیے۔

"جی ہاں یہ کوئی ضروری نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جہاں ہم سو روپے دیتے تھے وہاں آپ حضرات دو سو کا اعلان کریں" بجا کہ ہم میں کئی ایسے ارسٹوکریٹ ہیں کہ وہ چاہیں تو شعراء حضرات کیا ڈیلیگیٹ کا ایک کل ہند مشاعرہ کرا سکتے ہیں مگر مشن کے کسی وظیفے کی صورت ہی نہیں ہو سکتی۔

یہاں وکی کا ایک شعر سن لیجئے

یہ خط کا حاشیہ گرچہ وکی ہے مختصر لیکن
سطور کے معانی کا کھلا ہی مدعا دیتا

بجٹ جیست ابھی تک واقعی جیسٹ ہی بنا ہوا ہے۔ آپ پھر پوچھیں گے کہ حضرت آپ کی ایسوسی ایشن کے سال آئندہ کا بجٹ ہی ساڑھے چھ ہزار کا ہے اس میں بھی ایک ہزار خسارہ کی مد میں ہے۔ یہ جیسٹ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ جی ہاں یہ جیسٹ ہی ہے ہمیں نہ کہیں سے پونڈ ملتا ہے نہ کہیں سے ڈالر۔ ہمیں نہ کسی اکادمی سے امداد ملتی ہے نہ حکومت کی سرپرستی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے شعراء حضرات کسی قسم کے ہدیہ یا معاوضہ کا مطالبہ نہیں کرتے۔ وہ کچھ دینے ہی آتے ہیں لینے نہیں۔

اب آپ ہی بتائیے کیا مسیح شعراء ادباء اردو کی حیات و بقا کی جدوجہد میں ہم لوگ کسی سے پیچھے ہیں؟ ہاں تو لیجئے صاحب ۱ر نومبر کو ہمارا کل ہند مشاعرہ بھی ہو گیا۔ ۲ر نومبر کو نئے عہدہ داران کا انتخاب بھی ہو گیا اور شام کو نعتیہ مشاعرہ

اور اس کے بعد جناب بنجامن رحمت صاحب قوال کی پارٹی کی قوالی بھی۔ مسیحی مشاعرہ میں مدیر شانِ ہند جناب سرور تونسوی صاحب کی شرکت بھی قابلِ ذکر ہے جو مسیحی شعراء و ادبا کے جائز حقوق دلوانے کے لئے علمِ جہاد بلند کر چکے ہیں۔ خدا انہیں نوح کی عمر نہ دیتا ہو تو نہ دے مگر سو سالہ حیات تو ضرور دے۔

بہر کیف ہماری انجمن کی نئی ٹیم سر بکف میدانِ جنگ میں آچکی ہے۔ ہم نہیں چاہتے ہیں کہ نئی ٹیم کا کوئی عہدہ دار ہمارے سامنے آکر کہے کیونکہ اگر مونا لیزا کا مصور نام نہاد نقادوں کو ٹنگ لگانے کی اجازت دے دیتا تو آج مونا لیزا مسکراتی ہوئی نہیں بلکہ روتی نظر آتی۔ خدا نے چاہا تو ہماری ایسوسی ایشن کے سالانہ مشاعرہ ہوتے رہیں گے۔ ہم چاول نہیں کھائیں گے اور ضرورت پڑی تو

دیگر بادی کرنے والی بربادی کی اشیاء کو بھی ترک کر دیں گے۔

آخر میں ہم کھاس بوائز ہوم کے معصوم بچوں کا اور خاص طور پر اے۔ بی سنہا، راجیش، مارٹن اور سموئیل مسیح کا خاص طور پر ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جنہوں نے ہمیں ہمارے بچوں کا سا پیار دیا اور مزدوروں کی طرح ہمارے لئے اپنی خدمات وقف کر دیں۔ ہم یہ سرگزشت سرگشتہ انہی معصوم بچوں سے منسوب کرتے ہیں اور ولی کا یہ شعر انہیں سناتے ہیں

جب تک رہے گا آسمان و زمین جگ میں برقرار
جیوں پھول اس جہاں کے چمن میں بلند اکر ہو

ساہتیہ کلا پریشد

صرف اُردو اور پنجابی ڈرامہ نویسوں کے لئے

خاص اطلاع

کُل ہند اُردو اور پنجابی ڈرامہ نویسی مقابلہ کی آخری تاریخ بڑھا کر یکم دسمبر 1986 کی بجائے

15 جنوری 1987ء کر دی گئی ہے

شرائط و قواعد ساہتیہ کلا پریشد کے دفتر 6/4 بی آصف علی روڈ نئی دہلی 110002 سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

فون:۔ 278227

سریندر ماتھر
سکریٹری

وقت کی آواز

توصیف علوی عاصی کیرالوی

دوستو آؤ محبت کے اٹھائیں پرچم
آج کے دور کے انسان کو بیدار کریں
وہ کہ جاتی ہیں جو یکجہتی کے نغمہ کی طرف
ان ہی راہوں کو اک بار پھر ہموار کریں

دوستو آؤ اخوت کے جگائیں سپنے
نفرتوں کی ہر اک دیوار کو ڈھاکر دیکھیں
شیطنت کے جسے جھونکوں نے بجھا ڈالا ہے
آدمیت کی وہی شمع جلاکر دیکھیں

دوستو کیوں یہ گلستاں میں ہیں شعلے رقصاں
شاخِ گل دینے لگی خود ہی ہوائیں کیسی
صحنِ گلشن میں ہے کیوں برق و شرر کا یہ ہجوم
آگ اگلنے لگیں ہر سمت فضائیں کیسی

دوستو، صلح کا گونجا تھا جہاں سے پیغام
آج اس دھرتی پہ کیوں ناچ ہے شمشیروں کا
جن میں تھا رنگ بھرا اپنے لہو سے برسوں
خود اڑانے لگے کیوں رنگ انھیں تصویروں کا

دوستو آؤ کہ دنیا کو دکھا دیں پھر سے
بھائی سے بھائی کبھی چھوٹ نہیں سکتا ہے
ان سے خون کا ہوتا ہے جو رشتہ باہم
وقت کی ضرب سے وہ ٹوٹ نہیں سکتا ہے

دوستو آؤ کہ لوٹائیں بہاریں پھر سے
غنچے غنچے سے پھر اک تبسم پھوٹے
جن کے ہونٹوں پہ زمانے نے لگا دیں مہریں
ان ہی کانٹوں سے پھر اک بار کلی پھوٹے

دوستو آؤ کہ پھر اک بار گلے مل جائیں
خیال بھول کے ماضی کے ہر افسانہ کی
پھر سے رندوں میں بڑھیں فکر و نظر کے رشتے
پھر سے تابندہ روایات ہوں میخانہ کی

دوستو آؤ کہ یکجہتی کے پھر جام چلیں
پھر وہی بزم سجے پھر وہی نغمیں پھوٹیں
پھر سے ناقوس و اذاں کی اٹھے مل کر آواز
ربط باہم کے پھر ہر سمت سے چشمے پھوٹیں

دوستو آؤ کہ پھر کھائیں محبت کی قسم
امن کی پھر سے کریں بات زمانہ میں بپا کا پھیرے
سانس لے سکھ کا پھر اک بار سسکتی دنیا
آگ اور خون کا اٹھتا یہ تلاطم پھر سے

دوستو آؤ بنائیں پھر اک تاج محل
روشنی جس کے مناروں کی یہ دنیا پائے
جس کی صناعی میں ہو زندہ وفا کی جھلک
روح کو جس کا ہر اک نقشِ حسیں گرمائے

دوستو آؤ کہ وقت کی آواز ہے اک
آج کے بدلے ہوئے دور کے کچھ تو تقاضے سمجھو
خود فراموشی نہیں کرتی ہے تاریخ معاف
ہوش سے کام لو فطرت کے اشارے سمجھو

اُردو اکادمی دہلی

گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اُردو مصنّفین اور شعراء کی ڈائرکٹری

اُردو کے موجودہ ہندوستانی مصنّفین اور شعراء کی کوئی ایسی ڈائرکٹری نہیں ہے جس سے ضروری سوانحی معلومات فراہم ہو سکیں۔ اُردو اکادمی دہلی نے اس کی اشاعت کا منصوبہ بنایا ہے اس سلسلے کا بیشتر کام ہو چکا ہے اور ڈائرکٹری عنقریب پریس کے حوالے کر دی جائے گی۔ جن مصنّفین اور شعراء نے (جن کی کم از کم ایک کتاب شائع ہو چکی ہو) ابھی تک ڈائرکٹری کا فارم پُر کر کے روانہ نہ کیا ہو وہ پندرہ دن کے اندر اندر ذیل کے پتہ پر خط لکھ کر فارم منگوالیں یا سادہ کاغذ پر ذیل کی معلومات لکھ کر سکریٹری اُردو اکادمی دہلی کو بھجوا دیں۔

1۔ نام/قلمی نام 2۔ والد کا نام 3۔ تاریخ پیدائش مع جائے پیدائش۔
4۔ مکمل پتہ۔ 5۔ تعلیم/ڈگری۔ 6۔ مشاغل، ملازمت وغیرہ۔ 7۔ تصانیف مع سنۂ اشاعت۔ 8۔ اعزازات، انعامات وغیرہ

فارم یا معلومات بھیجنے کی آخری تاریخ 15 جنوری 1987ء

سکریٹری، اُردو اکادمی، دہلی
گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 110002

آبروئے غزل فخر راجستھان ساغر اجمیری مرحوم

محمد تقی خاں اثر اندوری

ہندوستان کی تاریخ ادب شاہد ہے کہ راجستھان
کی مقدس سرزمین پر ادیب الملک اور امام الشعراء
کا خطاب پانے والے ہندوستان کے ممتاز شعراء
پیدا ہوئے۔ اور آج بھی اس قابل صد افتخار
سرزمین پر آفتاب سخن اور آبروئے غزل کہلانے
والے ان گنت شعراء موجود ہیں۔ حضرت صائب
ٹانکی، شمیم جے پوری، مراد سعیدی، مخمور سعیدی
یار ساکوٹری، راہی شہابی، مشتاق راہی اجمیری
وغیرہ یہ راجستھان کے وہ باکمال شعراء شامل ہیں
جنہیں اردو پاک قبولیت حاصل ہے۔ راجستھان
کی اس مقدس سرزمین سے تعلق رکھنے والے ایک
شاعر اور تھے۔ آبروئے غزل فخر راجستھان ساغر اجمیری
(مرحوم) آپ ۱۱ نومبر ۱۹۱۱ء کو اجمیر شریف کی مقدس
سرزمین پر ایک باوقار دولت مند گھرانے میں پیدا
ہوئے تھے۔ آپ ایک پڑھے لکھے خاندان کے
چشم و چراغ تھے۔ اس لئے آپ کی تعلیم و تربیت
کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ دینی تعلیم مکمل ہونے کے
بعد فوراً آپ کو علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ وہاں آپ نے
میٹرک کا امتحان پاس کیا عربی اور فارسی کی تعلیم بھی
مکمل طور پر وہیں حاصل کی۔ اور وہیں سے آپ کی شاعری
کی ابتدا بھی ہوئی۔ کیونکہ علی گڑھ کے ادبی
ماحول نے آپ کو ضرورت سے زیادہ متاثر کیا۔
علی گڑھ میں تعلیم پوری کرنے کے بعد جب آپ اجمیر
شریف واپس تشریف لائے تو اجمیر شریف کی
ادبی فضا نے بھی آپ کو شعر گوئی کے لئے مجبور کرنے
لگی۔ چنانچہ آپ نے اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے
اجمیر شریف کے مشہور استاد جانشین داغ
دہلوی حضرت آپ ارمان اجمیری (مرحوم) سے
شرف تلمذ حاصل کیا۔ ارمان اجمیری مرحوم نے
آپ کی خداداد شعری صلاحیت کو دیکھتے ہوئے آپ
پر خاص توجہ فرمائی اور چند ہی دنوں میں آپ کا شمار
اجمیر شریف کے نمائندہ شعراء میں ہونے لگا۔
علم عروض ایک مشکل فن ہوتا ہے کیونکہ اس کے
قواعد بہت سخت ہوتے ہیں۔ اس لئے بہت
ہی کم شعراء اس طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ساغر صاحب
کو عروض سے دلچسپی تھی اس لئے آپ نے اس فن
پر بھی بہت جلد دسترس حاصل کر لی اور آپ کا
شمار اساتذہ فن میں ہونے لگا۔ آپ کی استادانہ
صلاحیت سے متاثر ہو کر ارمان اجمیری مرحوم نے
آپ کو اپنی حیات ہی میں اپنا جانشین مقرر
کر دیا۔ اب آپ شاعری کے ساتھ ساتھ اپنی
خاندانی تجارت سنگسازی میں بھی دلچسپی لینے لگے
اور اس میں بھی اپنی محنت اور ذہانت سے بہت
کامیابی حاصل کر لی۔ ہندوستان آزاد ہوا اور
تقسیم وطن کی زبردست آندھی نے آپ کو اپنا
آبائی وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اور آپ اجمیر
شریف کو ہمیشہ کے لئے خیرآباد کہہ کر نیمباہیڑہ چلے
آئے۔ نیمباہیڑہ میں بھی آپ نے سنگ سازی کی تجارت
شروع کی اور اس کام میں آپ نے بہت جلد
کامیابی حاصل کر لی آپ کا شمار کامیاب تاجروں
میں ہونے لگا۔ آپ جس وقت نیمباہیڑہ تشریف
لائے تو مالوہ کے قدیم شہر گلشن آباد (جاورہ)

ادبی ماحول پورے شباب پر تھا۔ والیٔ جاورہ
کے استاد بیدل گلشن آبادی مرحوم کا شہرہ ہمارے
[illegible] میں تھا۔ آپ بھی گلشن آبادی سے بہت
زیادہ متاثر ہوئے اور انھیں سے مشورۂ سخن
فرمانے لگے۔ کیونکہ آپ کے استاد ارمان اجمیری
مرحوم، تقسیم وطن کے بعد پاکستان تشریف لے
جا چکے تھے۔ حضرت بیدل گلشن آبادی نے بھی
آپ کی استادانہ صلاحیت کو دیکھتے ہوئے اپنی
حیات ہی میں آپ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔
اب آپ کا زیادہ تر وقت نیمباہیڑہ میں [illegible] دور
ادبی سرگرمیوں میں گزرنے لگا۔ خدمت ادب
کے جذبے نے آپ کو تجارت کی طرف سے بالکل
بے نیاز کر دیا۔ تجارت کی طرف سے لاپرواہی کا
نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو بہت [illegible] پریشانیوں اور تنگدستی
کا سامنا کرنا پڑا۔ اجمیر شریف کی تمام جائداد
فروخت ہو گئی۔ اور نیمباہیڑہ میں بھی ایک مکان
کے علاوہ کوئی اثاثہ نہ رہا۔ جو آج بھی موتی بازار
نیمباہیڑہ میں "ساغر منزل" کے نام سے مشہور ہے
دوشیزۂ سخن کے الجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوارنے کی
دھن میں آپ نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ یہ کوئی
نئی بات نہیں ہے۔ اردو کے ممتاز شعراء کے
ساتھ بارہا ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں۔
ہندوستان کی تاریخ ادب ایسے ان گنت
واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اس پریشانی اور
کسمپرسی کے عالم میں بھی آپ نے نیمباہیڑہ کے ادبی
ماحول کو برقرار رکھا۔ آپ نیمباہیڑہ میں اچھے اچھے
مشاعروں کا اہتمام فرماتے رہے۔ بیرونی شعراء کرام
نیمباہیڑہ میں تشریف لاتے رہے۔ آپ نے آخری
دم تک اپنی وضعداری اور مہمان نوازی میں
کبھی فرق نہیں آنے دیا۔ آج ساغر اجمیری نہیں
ہیں لیکن ان کی یادیں آج بھی ہر دل و دماغ پر نقش

بن کر ابھرتی ہیں۔ لوگ ساغر اجمیری کو بھلا سکتے ہیں
لیکن ان کے اخلاق ان کی محبت اور ان کی شرافت
و انسانیت کو فراموش نہیں کر سکتے۔ حضرت ساغر اجمیری
کا حلقۂ تلامذہ کافی وسیع تھا۔ جو ہندوستان کے ادبی
مراکز کہلاتے ہیں۔ وہاں آج بھی ان کے شاگردوں
کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ آپ کے بعض ہونہار
شاگرد تو ایسے ہیں جو ایوان ادب کے مضبوط ستون
کہلاتے ہیں۔ آپ نے اپنے ہونہار فرزند مکیش اجمیری
کو اپنی حیات ہی میں اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔
مکیش صاحب میں بھی وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود
ہیں جو ساغر مرحوم میں تھیں۔ ساغر اجمیری میرے
استاد محترم الحاج احسان الحق احسان رتلامی مرحوم کے
ہمعصر تھے۔ آپ جب کبھی رتلام تشریف لاتے تھے۔
زیادہ تر خاکسار ہی کے غریب خانے پر قیام فرماتے تھے
راقم الحروف سے آپ کو دلی محبت تھی۔ گجرات
اور مدھیہ پردیش کے مشاعروں میں بارہا موصوف کے ساتھ
سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ آپ نہایت سادگی پسند
تھے شاعرانہ کروفر آپ میں بالکل نہیں تھا۔ خود
نمائی اور خود ستائی سے ہمیشہ دور رہتے تھے بلکہ دوسروں
سے چھوٹا ہی سمجھتے تھے۔ یہی سادگی اور انکساری
کو اللہ تعالیٰ بھی پسند فرماتا ہے انسان کو چاہئے
خود نمائی اور بناوٹ سے ہمیشہ دور رہے کیونکہ
سستی شہرت کی تمنا فنکار کو گمراہ کر دیتی ہے۔ مجھے
موصوف کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع
ملا ہے۔ وہ جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اچھے
انسان بھی تھے۔ آپ کو شطرنج کھیلنے کا بھی بے حد
شوق تھا۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں بانسواڑہ جو شعر و ادب
کے نام پر ایک [illegible] اور سنگلاخ علاقہ تھا۔ راقم
الحروف نے اپنے کچھ ادب دوستوں کی مدد سے وہاں
پر مشاعرے کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کیا اور جب اپنے
خیالات کا اظہار ساغر صاحب کے سامنے کیا تو وہ

بہت خوش ہوئے اور ہر طرح کا تعاون دینے کا وعدہ بھی فرمایا
جب بانسواڑہ میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا قریب قریب
آپ بانسواڑہ کی سرزمین پر آج بھی فقید المثال مشاعرے منعقد
ہوتے رہتے ہیں۔ امام غزل حضرت شعری بھوپالی جان
مالوہ حکیم شاداں اندوری مرحوم ڈاکٹر شفا گوالیاری حضرت
منظر اندوری، کیف بھوپالی نشتر اندوری ریاض گوالیاری
استاد ظفر کھنڈولی، عطا صدیقی، قیصر اندوری احسان الحق
احسان رتلامی ڈاکٹر خوشتر کھنڈولی، صادق اندوری علامہ
غنی بزمی رونق اندوری، داں گلشن آبادی برادرعزیز
گویا قریشی ساغر چشتی اور جانی خیر گلشن آبادی کاشف
اندوری عاقل مہودی صادق مہدی اور نیاز سرشار وغیرہ
مالوہ کے یہ بھی باکمال اور محترم شعرا آپ کا ادب و احترام
کرتے تھے۔

درسگاہ جنون و عشق دارا لخیر اجمیر شریف اپنی تقدس
سرزمین ہمیشہ ایسے دلیر الذین کی تخلیق فرماتی رہی ہے۔
جو ارباب دانش و خرد کو سوچتی دیتے رہتے اور فرشِ تمام
کائنات کی سر گردش سے ٹکرا کر حیات کو درپیچ درپیچ
حیات سے بننے پر مجبور کرتے رہے زندگی آپ خود حادثوں
کا نام ہے اور ان حادثوں سے گذرنا ہی زندگی کے
منصبی فرائض کو پورا کرنا ہے۔ لیکن بادہ زندگی کے
ایسے ساغر بھی ہماری تجرباتی زندگی نے دیکھے ہیں جن میں
بھری ہوئی لعشق و سرمستی میں خمار آشنا نہیں رہتی۔
بلکہ ایک لطیف نشہ دوام کا عنوان جاویداں بن کر حادثوں
سے کھیلتی رہتی ہے۔ حضرت ساغر اجمیری میرے
نزدیک اس خاندان میکدہ کے فرد عظیم ہیں۔ شعر ان
کے لئے پیدا کیا گیا ہے یا وہ شعر کے لئے پیدا ہوئے ہیں
سوال اپنی جگہ خود جواب کی حقیقت رکھتا ہے ان
کے کلام میں حقائق بصیرت کائنات، عرفان ذات
صفات کی پوری کی پوری دنیا سمولی ہوتی ہیں۔ ان کا ہر
ایک شعر ابدیت کے ادنی اور اعلی مراحل سے گذرتا
ہے ۔۔

میری وحشت کو تماشا بھی تو بننے نہ دیا
جب بڑھا جوش جنوں مل گئے احکام کہ بس
شاعر شہر غزل حضرت کیف بھوپالی لکھتے ہیں
کچھ اتفاق بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ ایسا ہی
ایک عجیب اتفاق ساغر اجمیری کے سلسلے میں میرے
ساتھ ہوا۔ ساغر صاحب کا پہلا اور دوسرا تعارف
بھی جن دو صاحبان نے مجھ سے کرایا اتفاق سے ان
دونوں کا تخلص جگر تھا۔ ایک رئیس المتغزلین جگر
مراد آبادی مرحوم اور دوسرے جگر اجمیری ایک بہت
ان پہلے جگر مراد آبادی میرے سامنے جھوم جھوم کر یہ شعر
پڑھ رہے تھے۔

وحشت کو تماشا بھی تو بننے نہ دیا
جب بڑھا جوش جنوں مل گئے احکام کہ بس

میں نے کہا کوئی تازہ شعر ہوا ہے کیا؟ کہنے لگے
نہیں بھئی! اجمیر کے شاعر ہیں ساغر اجمیری ان کا
شعر پڑھ رہا ہوں۔ جگر صاحب خدا بخشے بہت
کم کسی کے شعر پڑھتے تھے۔ لیکن یہ شعر فی الحقیقت
ایسا ہی ہے کہ دل سے داد نکلتی ہے۔ ساغر
صاحب کی یہ غزل ملک گیر پیمانے پر مشہور ہے
اتنی پسند کی جاتی ہے کہ بیشتر شعرا نے اس زمین
میں طبع آزمائی کی۔ مولانا سیماب اکبرآبادی کتنے
سنگ تراش تھے۔ تقریباً سبھی کو معلوم ہے۔ لیکن
اس شعر پر اور اسی غزل کے ایک اور شعر پر۔

احتمال دل خود دار سمجھ لینا ہے
تو بھی چیخ اٹھے گی اے گردش ایام کہ بس

وہ بھی اس شعر پر بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو گئے
مولانا انور صابری نے تو یہ دونوں شعر سن کر یہاں
تک کہہ دیا کہ ان دو شعروں پر میرے دو دیوان قربان
ساغر صاحب کی ایک اور غزل جس کا مطلع ہے۔

کر گیا طے منزل دشوار اٹھتے بیٹھتے
تیرے در تک آ گیا بیمار اٹھتے بیٹھتے

غزل

زبیدہ اے ہلال سنادہ

اندوہ کے بلائے انساں پہ ہر لمحہ گراں ہوجاتا ہے
جب ٹیس جگر میں اٹھتی ہے تاریک جہاں ہوجاتا ہے

غمناک فضا میں رکھی تھی بنیادِ نشیمن جب ہم نے
اب بادِ سحر کے چلنے پر طوفاں کا گماں ہوجاتا ہے

یہ راہِ عمل ہے لے ہمدم دشواریٔ منزل کیا معنی
خاموش جو ہو کر بیٹھ گیا گم اس کا نشاں ہوجاتا ہے

یہ بات کبھی اب تک ہم سمجھ نہیں سمجھ پائے ہیں
جب کوئی نشیمن جلتا ہے گلشن میں دھواں ہوجاتا ہے

طوفاں میں سفینہ کو لوں تو موجیں بھی سہارا دیتی ہیں
گرداب میں راہیں ملتی ہیں جب عزم جواں ہوجاتا ہے

یہ ضبطِ الم معراج ہی سہی ہے گذرنے والوں کی
محکومی کی حدِ فاصل پہ ہر زخم زباں ہوجاتا ہے

صیاد قفس کے روز و شب پُرکیف سہی لیکن اکثر
پرواز کے قصے چھڑتے ہی دل محوِ فغاں ہوجاتا ہے

سینے میں اشک رواں ہونا یہ لطف کرم ہے ان کا ملال کی
احساس کہ آئینہ ہیں مگر ہر زخم زباں ہوجاتا ہے

مضطرؔ صحرائی صاحب کو صدمہ

میرے رفیقِ کار مضطر صحرائی صاحب کے والدِ محترم قاضی محمد یحییٰ صاحب صدیقی ۱۴؍دسمبر ۸۶ء اتوار کو رات کے دس بجے کچھوچھہ ضلع اٹاوہ میں انتقال فرما گئے انا للہ و انا الیہ راجعون

مرحوم صوم و صلوٰۃ کے پابند اور رحمتِ خداوندی پر پورا بھروسہ رکھنے والے تھے۔ محکمہ پولیس کی ملازمت میں ہوتے ہوئے کبھی رشوت نہیں لی اور اپنے بچوں کو ہمیشہ یہ ہدایت دی کہ اکلِ حلال سب سے بہتر سرمایۂ زندگی ہے۔

مرحوم یو۔پی کے متعدد مقامات پر متعین رہے اور انہوں نے ہر مقامِ ملازمت پر اپنے ایسے نقوش چھوڑے ہیں کہ اُن کے محکمہ کے افسران اور عوام اُنھیں اب تک یاد کرتے ہیں۔ مرحوم نے اپنے اخلاقِ حسنہ اور خلوصِ دل سے کئی عادی جرائم پیشہ لوگوں کو راہِ راست پر لا کر اکلِ حلال سے زندگی گزارنے کی راہ دکھائی۔

مرحوم کے پسماندگان میں اُن کی بیوہ۔ تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں۔ ادارہ شانِ ہند مضطر صاحب اور اُن کے لواحقین کے اس صدمہ میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے

قارئین شانِ ہند سے التماس ہے کہ مرحوم کی مغفرت کے لئے دعا اور ایصالِ ثواب فرمائیں۔

ودیا پرکاش سرور تونسوی

ہریانہ اُردو اکاڈمی فرید آباد کا خبرنامہ

اولین شمارہ شائع ہو گیا ہے جو ہر اندازسے اُردو پرست حلقوں میں پسند کیا جا رہا ہے ادبی فرصت میں طلب فرمائیں

فی پرچہ پچاس پیسے : زرسالانہ پانچ روپے

دفتر ہریانہ اُردو اکاڈمی 465 سیکٹر 16A فرید آباد (ہریانہ)

قیہ: بلبل چہ گفت

ہ جب کہ وہ خود ہی بے استاد ہو تو اوروں کو کیا ٹریننگ
ے گا۔

دوردرشن کے افسرانِ اعلےٰ اگر اردو پرستوں سے مذاق
رنا نہیں چاہتے تو انھیں چاہیئے کہ اردو پروگرام کے لئے
سی موزوں شخص کو بھرتی کریں اور اس کے لئے انھیں اشتہار
ے کر امیدواروں سے درخواستیں طلب کرنی چاہیئے اور
نٹرویو لینے کے بعد کسی موزوں شخص کو اردو پروگرام کا انچارج
قرر کیا جائے۔ اور انٹرویو بورڈ میں ملک کے دو چار مشہور اردو
ان ہونے ضروری ہیں تاکہ صحیح امیدوار کا انتخاب ہو سکے۔

ہریانہ اردو اکاڈمی

عزت مآب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ کا اسم
رامی اردو دنیا کی تاریخ میں زندۂ جاوید رہے گا کہ انھوں
ے اپنے عہدِ گورنری میں ہریانہ اردو اکاڈمی قائم کی۔ ہریانہ
ہمیشہ علم و دانش کا گہوارہ رہا ہے مگر ہماری لسانی
سیاست کے باعث علم و دانش کی آماجگاہ ریاست
ہریانہ میں اردو اکاڈمی کا انعقاد ہمیشہ التوا میں رہا۔
گر جناب برنی صاحب نے اپنی حکمتِ عملی سے آخرکار ہریانہ
یں اردو اکاڈمی قائم کرا ہی دی جس کے لئے انھیں جس قدر
بھی سراہا جائے کم ہے۔

برنی صاحب کی دوررس نگاہوں نے جناب کنہیا
ال پوسوال ایسے اردو دوست کو اردو اکاڈمی کے چیرمین
کے لئے اور جناب پروفیسر جاوید وششٹ صاحب کو اس کا
سکریٹری مقرر کرنے کے لئے انتخاب کیا۔ اور اکاڈمی محدود
ٹ کے باوجود اپنی بساط سے بھی بڑھ کر کام کر رہی ہے
مید ہے کہ برنی صاحب کی کوشش سے حکومت ہریانہ
اکاڈمی کے بجٹ میں آئندہ مالی سال میں اضافہ کرے گی
کہ ہریانہ میں اردو اکاڈمی اپنی کارگذاری کو مزید وسعت
ے سکے۔ شانِ ہند کی آئندہ اشاعتوں میں ہریانہ اردو
اکاڈمی کی علمی، تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں کی تفصیل کا
جائزہ لیا جائے گا۔ بہت جلد ہریانہ اردو اکاڈمی کے
زیرِ اہتمام ایک مجلہ "جمنا تٹ" کا شائع ہونا شروع ہو
رہا ہے جس کے ابتدائی انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمیں یہ گذارش کرنے میں کوئی تامل
دکھائی نہیں دیتا کہ ہریانہ اردو اکاڈمی کو دلی کے ادیبوں
اور شاعروں کی سرپرستی کی بجائے ہریانہ کے شاعروں اور
ادیبوں کو اپنانا چاہیئے کیونکہ دلی کے اردو ادیبوں اور
شاعروں کے لئے اردو اکاڈمی کو پچاس لاکھ روپیہ سالانہ
مل رہا ہے اور دلی کے یہی شاعر اور ادیب دلی اردو اکاڈمی
سے بھی بہر طور مفاد اٹھا رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو یہ بھی
ایک زیادتی ہے کہ ہریانہ اردو اکاڈمی کے جنرل باڈی میں
دلی کے ادیبوں کو ممبر منتخب کیا جائے۔ امید ہے کہ آئندہ
کمیٹی کی تشکیل کے وقت اس بدعت کو دور کر دیا جائے گا۔

غزل

اختر شاہ جہان پوری

وہ جس چہرے پہ کچھ لکھا نہیں ہے
کسی کا ہو مرا چہرا نہیں ہے

ستم کی کشتیاں چلتی ہیں اب بھی
کہ دریا خون کا اترا نہیں ہے

مرے پیروں میں زنجیریں نہ ڈالو
جنوں کا قافلہ رکتا نہیں ہے

صداقت ہے ابھی معتوبِ دنیا
اسی باعث وہ سچ بولا نہیں ہے

سبھی شکوہ گذارِ تیرگی ہیں
کوئی میری طرح جلتا نہیں ہے

اکیلے پن کو سب روتے ہیں اختر
بظاہر کوئی بھی تنہا نہیں ہے

Phone : 275602
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd. No. D. D No 353
DECEMBER 1986
Regd. with the Registrar Newspaper at R. No. 644 57